سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

امہ سرگزشت کراچی

ست 2014

نگران اعلیٰ
معراج رسول

نشان حیدر: ایک کمسن نوجوان کی بہادری کا تذکرہ

واخانی خان: عجیب فطرت کے قبیلے کا احوال جو پاکستان و افغانستان کے درمیان بکھرتا رہتا ہے

آخری راستہ: اس معصوم دوشیزہ کے لیے بس یہی ایک آخری راستہ تھا' دل دکھا دینے والی سچ بیانی

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ستمبر 2014ء

ماہنامہ

سرگزشت

کا ایک معرکتہ الآرا
خاص نمبر

خطا نمبر

خطائے اوّل

انسانی تاریخ کی پہلی خطا، ایک سیر حاصل تحریر

خطائے سیاست

سیاست دانوں کی خطائیں جس نے نقشہ بدل دیا

سائنسی خطائیں

سائنس کی وہ خطائیں جنہیں سچ سمجھا جاتا تھا

فحش خطا

برصغیر کی اس لڑکی نے خطا کی اور امریکا و یورپ کی اہم شخصیات منہ چھپانے لگیں

خطائے ہواباز

یونان کے ساتھ پوری دنیا میں ہلچل مچا دینے والی کتھا

گزشتہ تمام خاص
شماروں سے اہم شمارہ

اس کے علاوہ

بہت سی خطا کی حیرت انگیز، دلچسپ اور رلا دینے والی کتھائیں۔ سچ بیانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

نزدیکی بک اسٹال پر آج ہی اپنا شمارہ مختص کرالیں

ادب کا بابا آدم
سرگزشت
ادارہ
4
ایک صفحے میں مکمل مختصر مختصر
ایک نادرِ روزگار کا تعارف

شہرِ خیال
گفت و شنید
مدیر اعلیٰ
16
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

نشانِ حیدر
[illegible]
ڈاکٹر ساجد امجد
24
ایک بہادر وطن
پرست کا زندگی نامہ

واخانی خان
[illegible]
مختار آزاد
49
پاک افغان سرحد
پر بھٹکتے قبیلے کا تذکرہ

یومِ آزادی
تحقیق
[illegible]
[illegible]
14 یا 15 اگست ہمارا
یوم آزادی کون سا ہے

خونی شیرنیاں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
دو آدم خور شیرنیوں
نے تباہی مچادی

فلمی الف لیلیٰ
فلم و صحافت
علی سفیان آفاقی
[illegible]
فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں
فلم نگری کی باتیں یادیں

مدر ٹریسا دوم
[illegible]
[illegible]
[illegible]
فلمی دنیا سے خدمت
انساں تک کے سفر کی روداد

امید پرست
روداد
[illegible]
122
نا امیدی کے گرداب میں
پھنسے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ تھی

الوداع
جہاز بیتی
[illegible]
131
پی آئی اے کے ایک
ریٹائرڈ افسر کی خودنوشت

اگست
[illegible]
[illegible]
51
عیسوی مہینوں کے ایک اہم
مہینے کا تذکرہ خاص

سراب
معاشرت
کاشف زبیر
142
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

بیت بازی
شعر و ادب — قارئین — 203
شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

علمی آزمائش
انعامی مقابلہ — ادارہ — 204
ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی
تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

آخری راستہ
[illegible] — [illegible] — [illegible]
اس معصوم دوشیزہ کے پاس
ایک ہی راستہ بچا تھا

مرد ناداں
[illegible] — شمس احمد — 225
دور حاضر میں ایسی ہی
نادانی سرزد ہوئی ہے

مجبور
[illegible] — ابرار احمد — 237
بھائی بننے کے چکر میں
وہ حوالات میں پہنچ گیا

رازداں اپنا
[illegible] — [illegible] — 243
رازداں ہی رقیب
روسیاہ بن گیا

علاج
[illegible] — نائلہ — 251
ڈاکٹر نے علاج
کے لیے نادر طریقہ ڈھونڈا

چھوٹا آدمی
[illegible] — [illegible] — 257
وہ عشق کے ہاتھوں کہاں
سے کہاں پہنچ گیا

چھپا ستم
[illegible] — [illegible] — 263
ملک کے خلاف
سازشیں عروج پر تھیں

بازی گر
[illegible] — [illegible] — 271
لوگ ٹھگنے کے لیے کیسے
کیسے راستے نکال رہے ہیں

ڈگڈگی
[illegible] — [illegible] — [illegible]
میاں جی کے تجربے
سے ایک اور سچ بیانی

پارچے
معلومات — [illegible] — [illegible]
دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلومات انکشافاتی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ◆ شمارہ 09 ◆ اگست 2014ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیر اعلیٰ: معراج رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات شہزاد ملک 0333-2256789
نمایندہ کراچی ابوسفیان خان 0333-2168391
ماجد حمید 0323-2895528
نمایندہ لاہور فرخ بخش 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ◆ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن
ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ
کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا ◆ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone : 35804200 Fax : 35802551
E-mail : jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

رمضان المبارک کا مہینا اس بار عالم اسلام کو رلانے آیا ہے۔ غزہ میں جس طرح انسانیت کی تذلیل ہوئی، ظلم و ستم کا بازار گرم کیا گیا، جس طرح چنگیزیت کا مظاہرہ ہوا اور اس پر عالم اسلام کی خاموشی سر شرم سے جھکانے کو کافی ہے۔ صرف ترکی کے صدر نے تھوڑا سا لہجہ تبدیل کرکے اسرائیل کو للکارا ہے یا پھر ایران نے اور آج پاکستان نے، باقی اسلامی دنیا نے اب تک ہونٹ سی رکھے ہیں۔ ایران نے بھی اس لیے زبان کھولی ہے کہ ”حماس“ کی پیٹھ پر اس کا ہاتھ رہا ہے۔ گویا ترکی کے علاوہ کسی میں جرأت نہیں کہ وہ اسرائیل کو للکارے۔ لگتا ایسا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کی حمیت کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے۔ گر یہی صورت حال رہی، مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہر مسلم ملک کا حشر یہود و نصاریٰ ایسا ہی کردیں گے۔ فلسطین میں تین دن سے مسلسل چھ نمازیں ہو رہی ہیں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور نماز جنازہ۔ ہر روز چالیس پچاس قبریں بن رہی ہیں اور عرب دنیا بشمول پاکستان عالمی فٹ بال ٹرافی دیکھنے میں مشغول ہے کیونکہ بے حسی نے ہمیں گھیر لیا ہے اور ہم ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں، عربی عجمی، شیعہ سنی، حنفی وہابی، افریقی ایشیائی۔ اسی پر تو علامہ اقبال نے للکارا تھا

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

معراج رسول

ادب کا بابا آدم

سرگزشت

اس کا نام ابراہیم تھا اور وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جسے نیل کے پانی سے عشق ہوتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت دریائے نیل پر گزارے۔ اس کی بڑی سی کشتی دن رات نیل کے پانی پر تیرتی رہتی۔ یوں بھی مصر اور ایسے ممالک جن کے ساحل نیل سے متصل ہیں۔ وہاں کے لوگ اس دریا کو بہت متبرک خیال کرتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا رزق بھی نیل ہی سے حاصل کریں۔ زیادہ سے زیادہ وقت نیل میں گزاریں، ابراہیم بھی اسی سوچ کا حامل تھا۔ اس کی ایک بڑی سی کشتی تھی جس پر وہ اپنا وقت گزارتا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی ہوتی۔ 1879ء کی بات ہے۔ نیل کی آغوش میں تیرتی اسی کشتی پر اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کی گود میں اس کا وارث دے دیا۔ اولاد نرینہ پا کر وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ اس خوشی میں اس نے اپنے تمام واقف کاروں کو کشتی پر جمع کیا اور ایک چھوٹی موٹی سی تقریب کا اہتمام کرلیا۔ اسی تقریب میں اس نے بچے کا نام حافظ رکھا۔ ننھا حافظ ماں باپ کی محبتوں کے درمیان پروان چڑھتا رہا۔ ابھی حافظ چار سال کا ہی ہوا تھا کہ اس پر مصائب کا کوہ گراں بار ٹوٹ پڑا۔ ابراہیم کو اجل نے تاک لیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ ماں کے ساتھ ماموں کے گھر منتقل ہوگیا۔ اس نے کچھ عرصہ تو قاہرہ میں گزارا پھر وہ طنطا چلا گیا۔ شہر طنطا قاہرہ جیسا بڑا شہر تو نہ تھا مگر یہاں زندگی کی جملہ ضروریات بہ آسانی حاصل ہوجاتی تھیں۔ اس کے ماموں نے طنطا والا گھر اسے دے دیا تھا۔ وہ اسی گھر میں رہنے لگا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے وہ عربی شاعری سے روشناس ہوا اور اشعار کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں سر چھپانے کے لیے مکان تھا۔ وقتاً فوقتاً ماموں کچھ نہ کچھ ارسال کردیا کرتے تھے مگر باقاعدہ روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بے روزگاری دور کرنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے وزارتِ دفاع میں ملازمت کرلی مگر فوجی زندگی اسے راس نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنا تبادلہ محکمہ داخلہ میں کروالیا۔ اس نے ایک عہدے دار کی حیثیت سے مشرقی سوڈان میں لارڈ کچنر کی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ 1906ء میں واپس قاہرہ آگیا اور مفتی عبدہ سے وابستہ ہوگیا۔ یہاں پر اس نے خود کو ادب و شاعری کے لیے وقف کردیا۔ شاعری میں نیا پن تھا، اس لیے اس کی شاعری مقبولیت حاصل کررہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مصر کا ہردل عزیز شاعر کہلانے لگا۔ اسی دور میں سعد زغلول، مصطفیٰ کامل اور قاسم امین جیسے سیاسی قائدین سے اس کی قربت بڑھی۔ اس کا سیاسی شعور پختہ ہوتا گیا۔ 1911ء میں اس کی سیاسی بصیرت سے استفادہ کی خاطر اسے سول سروس کا رکن بنادیا گیا پھر اسے کتب خانہ خدیو کے ادبی حصے کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ اس کی شاعری میں جدیدیت کا عنصر اتنا زیادہ تھا کہ اسے جدید شاعری کا استاد کامل کہا جانے لگا جبکہ اس فکر کا قائد سامی البارودی تھا۔ اس نے اس زمانے کے مصر کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمو لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شاعری الازہر کے علمی حلقوں میں پسند کی جارہی تھی۔ اس نے وکٹر ہیوگو کی MISERABLES میں سے کئی ضمنی قصوں کا ترجمہ بھی کیا۔ اس نے خلیل مطران سے مل کر PAUL-LEROY-BEAULIEU کی تصنیف کا ترجمہ الموجز فی علم الاقتصاد کے نام سے شائع کرایا۔ عربی ادب کے اس جدید بابا آدم کا انتقال 21 جولائی 1932ء کو ہوا اور یہ حافظ ابراہیم کے نام سے مشہور رہے۔

شہر خیال

محمد ایاز راہی نے مانسہرہ سے لکھا ہے "اس بار کا شمارہ بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلی سرگزشت داغ دہلوی کی، واہ۔ ہر ادب شناس کا دل خوش ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جو موٹی موٹی کتابوں میں تھیں اسے آپ نے نہایت خوبصورتی سے صرف ایک صفحے میں سمو دیا۔ یہ کارنامہ صرف سرگزشت کا خاصہ ہے۔ شہر خیال کے دوستو عید کی مبارک باد کیونکہ عید کی اصل خوشیاں تو روزہ داروں کا حق ہے۔ اس بار پورے مہینے میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک ہی دعا کی ہے کہ یہود و ہنود نے جو جال بچھایا ہے، مسلمانوں کی تباہی کا سامان کیا ہے۔ ایک کے بعد ایک مسلمانوں کے ملک کو کھنڈر بنا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو مسلمانوں سے ہی قتل کرا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس افتاد سے نجات دلا دے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہماری بہادر فوج جاگ رہی ہے جو اس نے اس ملک کو تباہی سے بروقت بچا لیا۔ ہم لاکھ گناہ گار سہی مگر وہ غفور الرحیم ہمارے ملک کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی کی امداد ہے کہ ہم سب محفوظ ہیں۔ اب چلتے ہیں دوبارہ سے شہر خیال میں۔ رانا محمد سجاد کا تبصرہ بہت اعلیٰ تھا۔ اعجاز حسین سخا رلور پور فضل اور طاہر مگوہر وحشی عزیز مٹے کے تبصرے تنقید ابتکار و اجلال کا مظہر رہا۔ اعجاز حسین لدھیانہ تسلیم محمد عمران جونائی کا مکتوب و خیال نامہ ذہن و دل کے لیے تقویت کا باعث بنا، مسرت کا سامان بہم پہنچایا۔ باقی احباب نے بھی خوب لکھا ہے لیکن میں نے اگر فرداً فرداً جواب دینا شروع کیا تو خط طویل اور دیگر احباب کا حق غصب ہو جائے گا۔ اس لیے مضامین و قرائتین کی جانب رخ موڑ لیتا ہوں۔ رہنما ایک حوصلہ بخش سوانح حیات تھی۔ ایک اصل رہنما کو اسی طرح مخلص قوم ہونا ضروری ہے۔ تاریکی کا آسیب بھی ایک نامور مصنف کا سوانح تھا۔ خاندان برباد کے بارے میں کیا لکھوں۔ بس ایک مضمون پورے شمارے پر حاوی ہے۔ اسرائیلیوں نے فلسطینیوں پر کم مظالم نہیں توڑے۔ ایسے لاتعداد واقعات ہیں جو مسلمانان عالم کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اب تو اسرائیل نے اسلام دشمن طاقتوں کے اتحاد سے پورے عالم اسلام میں ایسی آگ بھڑکائی ہے جو ہر مسلمان ملک کو خاکستر کیے جا رہا ہے، کھنڈر بناتا جا رہا ہے۔ جنگ و محبت کے باب میں مذکور واقعہ میرے لیے بالکل نیا ہے۔ ہی الف لیلہ اور یرقانی رات مع الوداع اچھی رہی۔ سیل نمبر 14 وزیری کی داستان گزارے لائق تھی۔ جولائی میں بیان کردہ واقعات انتصار کی وجہ سے اچھے سرگزشت ثابت ہوئے۔ سچ بیانیوں میں پھر وہی غلطی بازی لے گئی۔ کالا علم اور تمہیں انکل نہیں، بہت زیادہ پسند آئی۔ درد بھی بہتر رہی۔ بے حس نے تو ذہن کو جھنجوڑ دیا۔ وارث بھی پسند آئی۔"

☆ سرگزشت کے ایک پرانے قاری امتیاز حسین نے ٹنڈو جان محمد میرپورخاص سے "پھر وہی غلطی" کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے بہتر سچ بیانی میں نے نہیں پڑھی۔ جو کام زبان سے لیا جاتا وہ کام اس کہانی سے بہ آسانی لیا جا سکتا ہے۔ میری بیگم نے بطور خاص یہ کہانی بچوں کو پڑھوائی ہے۔

اشفاق سید نے سکھر سے لکھا ہے۔ "اس شمارے میں میری پسندیدہ شخصیت چو این لائی کو دیا۔ یہ مجھ پر ایک احسان ہے۔ ہم سب کو ان کی حالات زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ غربت میں پرورش پانے والے نوجوان نے کس طرح ایک نشے میں ڈوبی قوم کو دنیا کی ترقی یافتہ قوم کے صف میں لا کھڑا کیا۔ رہنما ایسے ہوتے ہیں کہ بستر علالت پر بھی قوم کی ترقی کے لیے کام کرتے رہیں، اسپتال کو بھی دفتر بنا دیا۔"

سیدہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے "ہلکے اور سادہ رنگوں سے سجا سرورق نگاہوں کو بے حد بھلا لگا۔ اداریے کے صفحے پر پہنچے تو انکل کی فکر انگیز باتیں دل میں اتر گئیں۔ واقعی اس ماہ مقدس کا احترام دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ گہما گہمی اور زندہ دلی جو اس ماہ کا حصہ ہوا کرتی تھیں اب ان کا فقدان ہو چلا ہے۔ پہلے تھالوں میں کھانا سجا کر محلے کے غریب اور نادار لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا تاکہ کوئی بھی رب تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم نہ رہ سکے لیکن اب وہ سب تو اک خواب ہو چلا ہے بلکہ اب شو بازی عروج پر ہے۔ ہمارا شمار تو ان لوگوں

میں ہوتا ہے جو مہنگائی کا رونا بھی روتے ہیں لیکن اگر ہم کسی مارکیٹ میں چلے جائیں تو ہمیں وہاں تل دھرنے کو جگہ بھی نہیں ملتی۔ ان حالات میں دوش دیں تو کسے دیں؟ الزام دھریں تو کس کے سر دھریں؟ بس خدا ہمارے حالوں پر رحم فرمائے۔ رانا محمد سجاد کا تبصرہ پہلے نمبر پر رہا اور بے حد شاندار رہا۔ ضمیر احمد تبسم۔ اپنے لبوں پر تبسم سجائیے کہ آپ کو شہر خیال میں جگہ مل چکی ہے۔ کشی عزیز بٹ اپنے خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ عزیز بھائی آپ کی ممی اور ہماری ہم نام بہن کو ہمارا سلام کہیے گا۔ طاہرہ گلزار، کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئیں۔ ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں کہ پاکستانی آرمی سے اگر آپ محبت کرتی ہیں تو ہمارا بھی رواں رواں ان جوانوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ رانا محمد شاہد، طاہر الدین بیگ اور سعید احمد جاند غیر حاضر رہے۔ فلمی الف لیلیٰ میں مسکراہٹ کا موضوع اس قدر بھایا کہ ہم انہی صفحات پر ٹھہر کر آگے بڑھنا ہی بھول گئے۔ خاص کر جنرل آئزن آور کے قصے نے ہمیں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ انگریزوں کی ترقی میں ان کی مسکراہٹ کا بہت بڑا کردار ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آپ اپنی مسکراہٹ سے پوری دنیا فتح کر سکتے ہیں۔ جنگ و محبت میں تیمور کی محبت کا انوکھا ملاپ اچھا لگا۔ ابن کبیر کی تحریر انتقام نے ہمیں لرزا ہی دیا۔ جیری نامی شخص اپنے ماضی پر کتنا ہی پردہ ڈالتا رہا لیکن بالآخر اسی ماضی کی پرچھائیں اس کی کم علمی میں اس کی موت کا سبب بن گئی۔ منظر امام کا معلومات سے بھرا "جولائی" دلچسپ رہا۔ بیت بازی میں صفیہ سلطان کا شعر بازی لے گیا۔ سچ بیانی میں ایمل نے مناسب طریقے سے اپنی بیٹی کو برائی سے بچالیا۔ شاید دنیا کی کوئی بھی ماں ہوتی تو وہ بھی اپنی بیٹی کے لیے یہی کرتی۔ نجانے یہ ساری مائیں آخر ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں؟ رحمدل اور مہربان سا روپ لیے۔ جوانی کے نشے میں جھوٹی اولاد ان کی عمر بھر کی محبتوں کو بھلا کر کسی انجان شخص کے لیے خود کو برباد کیوں کر لیتی ہے؟ کاش کوئی تو اس تحریر سے سبق سیکھ لے تا کہ ایک مرتبہ پھر بھی غلطی دہرانے سے بچ جائے (اس تحریر کی اس بار اتنی پذیرائی ہوئی کہ میں حیران ہوں۔ ایک صاحب نے ای میل کر کے بتایا کہ اس سچ بیانی کی فوٹو اسٹیٹ کر کے انہوں نے پورے مانچسٹر (انگلینڈ) میں تقسیم کیا ہے) وراثت پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ جانے کیوں لوگ وراثت کی خواہش میں اپنے رب کی نافرمانی کر جاتے ہیں وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی تو ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔"

محمد شکیل حیدر، واسو جھنگ سے لکھتے ہیں "میں شہر خیال میں پہلی دفعہ حاضر ہو رہا ہوں لیکن سرگزشت سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ 1992ء میں جب میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا تو ایک دوست نے سرگزشت پڑھنے کے لیے دیا بس پھر وہ دن اور آج کا دن۔ درمیان میں بہت کچھ بدلا بڑے بڑے حالات دیکھے مگر سرگزشت سے میری محبت میں ذرا برابر بھی فرق نہ آیا۔ جو شمارہ میں نے پہلی دفعہ پڑھا اس میں حبیب جالب صاحب کی سرگزشت اور محی الدین نواب صاحب کی حالات زندگی تھی۔ میری آمد کا مقصد فی الحال کہانیوں پر تبصرہ نہیں بلکہ چند فرمائش ہیں۔ اُمید ہے ضرور پوری کریں گے۔ مجھے ہندوستان کا سفرنامہ پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ زکی شاہ صاحب "سیر پاکستان" کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ اگر وادی کاغان اور ناران کے ساتھ ساتھ جھیل سیف الملوک کے حوالے سے معلومات دیں تو مزہ آجائے، اگرچہ یہ سب مقامات میں کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں مگر معلومات کے حوالے سے تشنگی باقی ہے (زکی صاحب وادی کاغان و ناران پر لکھ چکے ہیں) عشق ناکام اور ہیرا نمبر کی طرح یقیناً خطا نمبر بھی لاجواب ہوگا۔ (آپ قارئین کا اعتبار بحال رہے گا) ایک دوسری فرمائش آفاقی صاحب سے ہے۔ آپ کی فلمی الف لیلیٰ میں سب اداکاروں کا تذکرہ ہوتا ہے، براہ مہربانی پاکستان سے غلام محی الدین اور ہندوستان سے ڈسکو ڈانسر متھن چکرورتی کے بارے میں بھی مفصل لکھیں کیونکہ یہ دونوں اداکار تقریباً 40 سال سے فلموں میں کام کر رہے ہیں۔ (اتفاق ہے کہ ان دونوں کا تذکرہ کئی بار ہو چکا ہے پھر بھی فرمائش پوری کی جائے گی) آخر میں شہر خیال کے سب دوستوں سے ایک گزارش ہے کہ اسی طرح سرگزشت سے اپنی محبتوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔ سب احباب اور ادارہ کے عام سے عام اور خاص سے خاص کارکن کو میری طرف سے عید الفطر کی ایڈوانس مبارکباد۔"

بشریٰ افضل، بہاولپور سے لکھتی ہیں "اقبال کی باتیں سنیں ایک پچھلی سرگزشت پڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے تو رانا محمد سجاد کو کرسی صدارت پر بیٹھے پایا، بڑے کروفر سے براجمان ہیں۔ غرور تو آ ہی جاتا ہے اپنی فتح پر۔ بشریٰ افضل خیر سے ڈاک کی کارکردگی کی نذر ہو گئیں تھیں ناں۔ کشی محمد عزیز بٹ میں تو رانا ادیب کی جوالا مکھی، واصف کر تھک گئی۔ افضل اگر آپ کے اسٹاک میں مئی 2005ء کا شمارہ ہے تو مجھے بائی ڈاک بھیج دیں میں رقم ارسال کر دوں گی (افسوس صد افسوس اب یہ ممکن نہیں) طاہرہ گلزار جی آپ کا تبصرہ تو ایک سوال نامہ ہے۔ پہلا یہ کہ اگر ہمارے حکمران کرپشن ختم کر دیں تو ہمارا ملک تمام ملکوں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ دوسرا شوہر کی ذات تو واقعی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ اگر یہی شوہر اپنی بیوی کو پیار دکھائے، اپنی ماں بہن کے سامنے اس سے بھی بڑھ کر، اولاد کو بھی اپنی بیوی کے خلاف استعمال کرے کہ یہ اولاد ماں کی نہ بن کر رہے۔ اولاد ماں کی بے عزتی کرے اور اس سے شوہر کو تسکین ملے۔ ایسے مردوں کے لیے حکومت کو کوئی نہ کوئی سزا ضرور دینی چاہیے اور آپ لوگوں پر غصہ کرنا چھوڑ دیں۔ اپنا ہی دل جلائیں گی۔ رحمان خٹک صاحب خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سب قارئین اور اسٹاف کو روزوں کی مبارک باد۔ میری کہانی "خطا نمبر" میں لگ سکتی ہے (فیصلہ ایڈیٹوریل بورڈ کرے گا)۔ شاہد حسین آرٹسٹ کو خدا صحت کاملہ عطا فرمائے۔ رانا سجاد اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔ کالا علم، اس کہانی نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ واقعی دنیا میں اس علم کا وجود ہے لیکن کچھ لوگ جادو ٹونے کو نہیں مانتے جادو برحق ہے۔ آنحضورؐ کو دشمنوں نے نہیں بخشا اب بے چاری طاہرہ اشکر ہے کہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

رحیمہ بی بی نے اس کا علاج کیا اور شفا ملی۔ کرنے والا تو خدا ہے زمین پر تو خدا نے وسیلے بنائے ہیں جتنا جادو مجھ پر کیا جا رہا ہے اسے لکھوں تو ایک مکمل کتاب بن جائے۔ سکول کی جاب سے ہٹانے کے لیے مجھ پر عمل کروائے جا رہے ہیں۔ خدا سے بڑا تو کوئی نہیں ہوتا نا۔ خدا میرا بہت ساتھ دے رہا ہے لیکن دشمن بھی پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے ہیں، میری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ کرسی حاصل کرنے کے لیے انسان اتنا گر سکتا ہے میرے تصور سے باہر ہے۔ انشاءاللہ خدا آگے بھی مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ بدلہ، میں جو سانپ ہے دراصل وہ ناگ تھا جو صورت دکھائی ہے وہ ناگن، ان کے بچوں کو لاٹھی سے مارا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے ناگ انسانی روپ میں سو سال کے بعد آ جاتا ہے یہ سنا تو تھا آج پڑھ بھی لیا۔ درد، میں بہو کا بہت بڑا ظرف تھا کہ اپنی دشمن کی اتنی خدمت کرتی رہی۔ جمیل جیسے بھیڑیا کے روپ میں ایک ماں کو اولاد کی خاطر بلیک میل کرتا رہا۔ پھر ظلم کی انتہا ماں کی اولاد کو ماں کے علم میں لائے بغیر قتل کر دیا۔ بیت بازی میں نسیم صدیقی کا شعر بازی لے گیا۔ علی سفیان آفاقی نے ترکی کی سیر کرائی۔ کہیں ایسا نہیں، مغربی معاشرے میں بھی غیرت پائی جاتی ہے حیرت ہے۔ وہ تو آزاد معاشرہ ہے۔ بیروان، میں لڑکیوں سے بچ کر رہنے کی تلقین کی ہدایت ہے۔"

عظمیٰ شکور سرگودھا سے لکھتی ہیں "سرگزشت میں پہلا خط ہے میرا۔ امید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ میں لکھتی ہوں۔ بہت سے رسالوں میں تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ خط لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ میں اگر کہانی لکھ کر بھیجوں تو کیا شائع ہو جائے گی (پڑھنے کے بعد فیصلہ ہو سکتا ہے) میں اپنی کہانی بھیجوں تو دوں مگر ڈر لگتا ہے کہ نا منظور ہو جائے تو اس طرح تو دل ٹوٹ جائے گا میرا مگر پھر بھی میں کہانی بھیج دوں گی۔ قسم سے بہت ہی شوق ہے کہ میری کہانی سرگزشت میں شائع ہو جائے۔"

قیصر عباس خان کا دریا خان بھکر سے خط "اداریے میں کوئی نئی بات نہیں تھی، جس کمزوری یا زیادتی کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ اب معمول بن گئی ہے۔ رانا محمد سجاد کرسی صدارت پر تھے، بہت مبارک ہو۔ اچھا اور جاندار تبصرہ تھا۔ اور ساتھ آیا طاہرہ گلزار، [illegible] سے لندن، نصیر اشرفی، عمران انور، عباس شاہ، حاجی امجاد حسین، بشریٰ افضل، ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ بھی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ بہت اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوتی ہیں لیکن اداریے سے متعلق کبھی بھی تحسین رائے بھی نہیں دی۔ جو کہ حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ بہت اچھی رائے دیتی ہیں۔ ہمیں انتظار رہے گا۔ باقی سب کے تبصرے پسند آئے۔ جو لوگ غیر حاضر ہیں وہ حاضر ہوں ہماری التماس ہے۔ ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ پھر وہی قتل پر پروفیسر ڈینئل نے بہت اچھے طریقے سے اپنی بیٹی کو وڈیرہ کے جال سے نکالا جو کہ اس بات کی دلیل ہے، سوکن ہو وہ یا ہمارا غلطی نہیں کرتا۔ کاش ڈینئل کے ماں باپ بھی ایسا کرتے تو ایمل جیسی ہونہار اور باشعور پروفیسر کی زندگی یوں نہ گزرتی۔ والدین کو زور راست نہیں ہارنی چاہیے بلکہ طریقے سے مسئلہ کا حل تلاش کریں۔ دوسرا آج کل اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔ آمین۔ درد اس کہانی کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوا فرشتہ صفت لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ ورنہ جب بھی ہر پرچے کا مطالعہ کیا ہر کوئی اپنی درندگی یا تلخ اور درد بھری کہانی لکھتے ہیں جو کہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے لیکن میرا نوچنے کردار بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ بہت ظرف کی بات ہے کہ درد دینے والے کو راحت پہنچانا جو کہ بہت مشکل ہے اللہ تعالیٰ سب کو ایسا بنائے آمین۔ اجنبیڑا، جمیل کیا انسان تھا۔ مرد تھا، آخر کیا تھا بہت ہی بڑا منحوس اور بے غیرت شیطان تھا۔ انسانیت کی توہین کی ہے، مقدس رشتہ کی توہین کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ایسے انسانوں کو ہدایت دے یا دنیا سے اٹھا لے۔ آمین۔ کالا علم، آج کل کے دور میں لوگوں نے ایمان کو مذاق بنا رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو کچھ سمجھتے نہیں۔ لوگوں کا سکون دیکھا نہیں جاتا اور اپنے مقصد کو پانے کے لیے سب کچھ کر جاتے ہیں۔ اب طاہرہ جیسی معصوم لڑکی کے ساتھ جو ہوا ہے اللہ کرے برباد ہو جائیں کالا علم والے۔ آپ سب لوگوں کو ایڈوانس عید مبارک قبول ہو۔ کیونکہ جب اگست کا پرچہ ملے گا تب عید ہو گئی ہو گی یا ہونے والی ہو گی اللہ کرے عید کی خوشیاں سب لوگ اپنے پیاروں کے ساتھ منائیں۔ ایک بات کروں گا اور رائے بھی مانگوں گا سب زرخیز ذہنوں سے۔ موبائل فون پر ایس ایم ایس اور کال پیکج پر لمبی باتیں کرنا دوستیاں کرنا اور پھر محبت کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا وغیرہ، ہمارا معاشرہ کس سمت جا رہا ہے، کیا ترقی ہے یہ یا پچھتاوا۔ میرے چھوٹے سے گاؤں میں ایسے واقعات بہت ہو رہے ہیں۔ ہم نئی ٹیکنالوجی کا استعمال کس طرح کر رہے ہیں؟ تمام چینلز، پی ٹی وی کے ساتھ سوائے عشق، محبت، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا کے علاوہ کیا پیش کر رہے ہیں جس ادارے میں دیکھو صرف لڑکی کی بات ہے، مجھے وہ پسند نہیں وہ پسند ہے۔ شادی محبت کے علاوہ آدھے کپڑے، کھلے بال، پردہ نہ کرنا اور پردہ کرنے والے کردار کی انسلٹ کرنا کہ یہ بی بی پاکدامن بن رہی ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں مجھے رائے چاہیے۔ اس کا حل کیا مل جائے تو بہتر ہے۔"

وحید ریاست بھٹی، بکر سیداں راولپنڈی سے لکھتے ہیں "ماہ مئی کے شمارے میں محترمی شاہد جہانگیر شاہد کا تحقیقی مضمون شاعر اعظم، دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ یقیناً ماہ مئی ایک ناقابل فراموش تحریر صرف اور صرف آپ کے سرگزشت کا ہی خاصہ ہو سکتی ہے۔ پھر ماہ جون میں شاہد جہانگیر شاہد صاحب کو کرسی صدارت پر بٹھا کر آپ نے ثابت فرما دیا کہ اگر ہم اچھے آپ کو پہچان جائیں تو شاہد جہانگیر بن سکتے ہیں۔ وہ واقعی اس اعزاز کے قابل تھے ماشاءاللہ میری جانب سے اتنی کامیابیوں پر ڈھیر ساری مبارک باد عرض کر دیجیے گا۔ ماہ جولائی کا شمارہ 28 جون کو موصول ہو گیا۔ سب سے پہلے یک کی سرگزشت میں عظیم شاعر داغ دہلوی کا زیست نامہ ملاحظہ فرمایا، بہت لطف محسوس ہوا۔ پھر ہم آگ برساتے موسم میں شہر خیال میں داخل ہوئے۔ پرانے اور نئے دوستوں سے محفل کو سجا ہوا پایا۔ رانا محمد سجاد کو کرسی صدارت پہ جاندار

تبصرے کے ساتھ براجمان پایا۔ مبارکاں جناب، ست ست مبارکاں۔ حاجی اعجاز حسین سٹھار بھی ہمیشہ کی طرح خوبصورت خیالات کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ باجی طاہرہ گلزار کو آپ نے شاملِ اشاعت فرمایا، خوشی ہوئی۔ انجم فاروق ساحلی صاحب کافی عرصے بعد میری طرح موجود پائے گئے مگر مختصر مختصر۔ بشریٰ افضل اور محمد عمران جوہانی کی کھری کھری اور مدلل تحریر نے کافی متاثر کیا۔ سدرہ بانو ناگوری اور انور عباس شاہ بھی ہمیشہ کی طرح زینت شہرِ خیال پائے گئے، سن کر خوشی ہوا۔ ڈاکٹر قرۃ العین تو اب باقاعدگی سے لکھنے پر کمر بستہ نظر آتی ہیں۔ خوشی ہوئی جب ان کی کوئی تحریر بہ رونق سرگزشت ہوگی، چاہے وہ ماورائی واردات کے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی دکھے دل کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت درد بھرے اور درد دل کے ساتھ انہوں نے اپنی تحریر کے سحر میں جکڑے رکھا۔ اے کاش وہ بھی کوئی ماہنامہ تحریر ہم غریب قارئین کے لیے لکھ دیں تو از حد نوازش ہوگی۔ شہرِ خیال کے بعد عظیم چینی لیڈر چو این لائی کی سرگزشت پڑھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے نالائق حکمرانوں کو خوب دعوت فکر دی کہ اگر لیڈر مخلص ہو تو سو سال کا سفر 10 سال میں کٹ سکتا ہے۔ ہمارے حکمران سوئی ہوئی قوم کو کیا جگائیں گے وہ تو اسے ابدی نیند سلانے کے لیے بھاگتے رہتے ہیں۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ اردو اور پنجابی کی مشہور شاعرہ سارہ شگفتہ کے حوالے سے بھی کچھ تحریر فرمائیں تو مہربانی ہوگی مرحومہ نے 4 جون 1984ء کو خودکشی کرلی تھی ان کی شخصیت کے حوالے سے امرتا پریتم نے "ایک تھی سارہ" اور انور سن رائے نے "ذلتوں کے اسیر" کے نام سے کتابیں تحریر فرمائیں اور پاکستان ٹیلی ویژن نے ایک ڈراما سیریل "آسمان تک دیوار" بھی مرحومہ کے حوالے سے پیش کیا تھا (سرگزشت کے خودکشی نمبر میں مفصل مضمون چھپ چکا ہے)۔ قلمی الف لیلہ بھی سامان دلچسپی لیے ہوئے تھی خاص کر نادرہ حسین اور مہ جبیں تو لباس کے حوالے سے کافی کچھ جاننے کا موقع ملا۔ اللہ پاک آفاقی صاحب کو حفظ و امان میں رکھے۔ سچ بیانیوں میں کالا علم عبرت انگیز سچ بیانی تھی مگر مجھے اس کے نام سے بہرحال اختلاف ہے۔ سراج انکل، علم تو ایک روشنی ہوتی ہے، نور ہوتا ہے۔ روشنی اور نور کو کالک اور سیاہی کو مٹانے کے لیے رب ذوالجلال نے پیدا فرمایا ہے۔ اگر اس سچ بیانی کا نام کالا جادو، ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ جناب منظر امام صاحب ماہ جولائی کے ایام میں چھپے واقعات صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے میں انتھک محنت کرتے نظر آئے سب کچھ ٹھیک تھا مگر جب سے خطا نمبر کا اعلان ہوا ہے ان سے بھی ایک خطا سرزد ہوگئی۔ جی ہاں 31 جولائی 1980ء عظیم گلوکار محمد رفیع کا یوم وصال ہے۔ منظر صاحب نے اس اہم واقعہ کا اشارہ نہیں فرمایا۔ آپ کیا کہتے ہیں سراج انکل، میں نے درست سمت میں رہنمائی کی؟ سراج انکل یہ فقیر بھی خطا نمبر، کے لیے ایک آرٹیکل سرد ہوتا، کے نام سے جناب کی بارگاہ میں پیش فرما رہا ہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ آپ نے ہی فیصلہ فرمانا ہے۔ اگر آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی تو قلم محو پرواز رہے گا۔ میرے لکھے آرٹیکل کو خطا نمبر، کا حصہ بنا کر ممنون احسان ہونے کا موقع ایک بار پھر عنایت فرمائیے گا۔ اس آرٹیکل کے ساتھ کچھ پارچہ جات بھی ارسال کررہا ہوں جو اسی آرٹیکل سے Related ہیں۔" (ہم معذرت خواہ ہیں کہ محمد رفیع پر مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے)

اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے "مجھے عرصہ دراز سے کسی ایسے جریدے کی تلاش تھی جس میں آپ بیتیاں، سفرنامے وغیرہ شامل ہوں، جس کی تحریریں دستاویزات کا درجہ رکھتی ہوں ان میں سرگزشت سرفہرست ہے۔ ستمبر 2013ء کو جب میں اخبار لینے گیا تو مجھے سرگزشت میں اوپر لکھے گئے باریک الفاظ "سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں" نظر آئے تو میں نے فوراً رسالہ خرید لیا گھر جاکر پڑھا۔ قارئین کے تجزیوں سے پتا چلا کہ وہ خاص نمبر پچھلے ماہ شائع ہوا تھا، خوش قسمتی سے وہ بھی مل گیا۔ یقین کریں پڑھ کر اتنا لطف آیا کہ الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ایک ماہ میں وہ جرائد میرے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ شمارہ جون بھی جلد مل گیا۔ سچ بیانیوں کو سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ مجھے جس آپ بیتی نے متاثر کیا وہ موت و حیات تھی۔ اس میں ایک سبق موجود تھا کہ کسی کی موت و حیات کا فیصلہ انسان کو ہرگز اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ کسے زندہ رہنا ہے، کس نے زندہ نہیں رہنا، یہ رب کے فیصلے ہیں۔ موت و حیات میں سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے جو کسی کے لیے گڑھا کھودے خود ہی اس میں جا گرے۔ دوسری سچ بیانی "اعترافِ گناہ" تھی۔ مذاق کو کبھی بھی اس نہج تک نہیں آنا چاہیے کہ جس میں خدا کی تخلیق کو نشانہ بنا کر اس کا مذاق اڑایا جائے۔ آج کل ہمارے ہاں یہ وبا عام ہوچکا کہ جب جس کو چاہے کچھ بھی کہہ دیں، یہ کوئی چھوٹا موٹا جرم نہیں بلکہ قرآن نے اس کی سخت وعید فرمائی ہے۔ تیسری سچ بیانی ان دیکھا سودا، تھی یہ سچ بیانی بھی دل کو لگی لیکن ہماری نوجوان نسل کو کون سمجھائے۔ حور کی تلاش میں ہیرا گنوا دیتے ہیں۔ جی ہاں ان دیکھے سودوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ بھوک بھی کافی پسند آئی۔ یہ تھا ہمارا تبصرہ۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے اگر کوئی تحریر بھیجیں تو صفحے کے ایک جانب لکھیں یا دونوں جانب یا پھر ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔" (ایک جانب، ایک سطر چھوڑ کر)

سعید احمد چاند کی آمد کراچی سے "معراج رسول کا اداریہ پڑھا، حالاتِ حاضرہ کے مطابق تھا۔ شعر بھی حسب حال تھا۔ ایک کی سرگزشت میں ہیرو صاحب کے متعلق پڑھا۔ کو ان کا نام تو بچپن سے سنتے آئے تھے مگر مکمل آگہی اب ہوئی۔ اب آتے ہیں شہرِ خیال کی طرف۔ ہمارا نام دوسرے نمبر پر تھا، دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مسندِ صدارت پر شاہد جہانگیر شاہد براجمان تھے۔ ان کا طویل تبصرہ واقعی لاجواب تھا۔ انہوں نے کوزے میں سمندر بند کردیا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ جن کے طویل تبصرے پسند آئے ان کے نام یہ ہیں۔ اعجاز حسین سٹھار، سدرہ بانو ناگوری، ڈاکٹر قرۃ العین، انور عباس شاہ، رانا سجاد، محمد عمران جوہانی، رانا محمد شاہد بورے والا، آفتاب احمد نصیر اشرفی، احمد خان توحیدی، شبانہ حنیف، بشریٰ محمد عزیز سے، ان کے تبصرے واقعی دل میں اتر جانے والے تھے۔ مختصر تبصروں میں عبدالغفور خاں اور بھی

سے اسلم عالم کے تبصرے بھی خوب تھے۔ بشریٰ افضل بہاولپور اور طاہر گجرار پشاور دادی سے پہنچی مگر یہ کیا کم ہے کہ ان کا نام لیٹ کر میں آ گیا۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا چراغ ادب سرفہرست رہا۔ غلام آزاد صاحب کی وہ کون تھے، ماضی کے جھروکوں سے اچھی تحریر تھی۔ ابن کبیر کی تتلیاں، کا بھی جواب نہیں تھا۔ علی سفیان آفاقی کی ترکی ٹوپی والا ہم، کچھ پھیکی رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی جرم ہوتا، میں شیف کا انجام پڑھ کر دل ملول ہو گیا۔ علی سفیان آفاقی فلمی الف لیلہ میں پرتھوی راج کپور کی فیملی گروپ فوٹو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ پشاور کے فنکاروں کا حال بھی پڑھا۔ پشاور کی سنگلاخ زمین میں ایسے ایسے نامور فنکاروں نے جنم لیا۔ جدن بائی کی محفلوں میں پنڈت جواہر لعل نہرو بھی شامل تھے۔ سچ بیانی میں شائستہ شمسی فیصل آباد کی، موت یا حیات، اچھی لگی۔ اشرف لاہور کی ان دیکھا سودا، پسند آئی۔ محمد ظفر حسین کی اعتراف گناہ، واقعی زیر مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر روبی اس دفعہ غائب ہیں۔"

حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگ میانوالی سے لکھتے ہیں "عرصہ بعد شہر خیال میں شرکت کر رہا ہوں۔ دریائے سندھ نے ہمارے گاؤں نورنگ کو نگل لیا ہے اور ہم نقل مکانی کر کے روکھڑی موڑ آ گئے ہیں۔ ہجرت سنت رسول اکرمؐ ہے۔ قارئین اور آپ ہمارے لیے دعا فرمادیں کہ نئی جگہ ہمارے لیے راس آئے۔ قارئین کے محبت نامے سامنے ہیں شاہد جہانگیر شاہد کا طویل خط پڑھا۔ واقعی ڈارون کا نظریہ ارتقا غلط مفروضے پہ مبنی ہے لیکن پھر بھی ہم نے یورپ والوں کے غلط نظریات کو بحث بنا رکھا ہے۔ اعجاز حسین سلطانی روح رواں محفل کے علاوہ سرگزشت کے مستقل لکھاری ہیں۔ سدرہ ناگوری، ڈاکٹر قرۃ العین، انور عباس شاہ بھکر، رانا محمد سجاد، رانا محمد شاہد، احمد خان ندیمی، حاجی محمد عزیز سب کے خوبصورت خطوط پڑھے۔ محمد عمران جونانی آپ کا نمبر ڈیلیٹ ہو گیا ہے۔ ان خطوط میں اپنے ضلع کے ملک رحمت، طاہر گجرار اور اپنے خاص دوست احسان سحر شامل تھے۔ ایک اور دوست ساہیوال کے دلربا تب بھی عرصے سے محفل سے غائب ہیں۔ کچھ دنوں پہلے لاہور کی عدالت میں فرزانہ بی بی کو اپنے شوہر اور قانون کے رکھوالوں کے سامنے اینٹوں سے مار مار کر ہلاک کر دینے والے واقعے پر دل بہت دکھی ہوا۔ مملکت اسلامیہ میں یہ واقعہ انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ کدھر جا رہے ہیں، پولیس اور عوام سب خاموش تماشائی بنے رہے یہ ظلم ہوتے دیکھتے رہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر (اخبار میں) ہمارا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے۔ اور ہم پاکستانیوں کی بے حسی کو اجاگر کرتا ہے۔ اب آتے ہیں سرگزشت کے مضامین کی طرف۔ سرگزشت ایک شاہکار ادبی رسالہ ہے۔ چراغ ادب میں مرزا جعفر علی خان کی زندگی کے حالات کو احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی عمدہ کاوش ہے۔ وہ کون تھے؟ ایک تحقیقی مضمون ہے۔ غلام آزاد صاحب نے زمانہ قدیم کی پُر اسرار ٹیکنالوجی سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اب تک جو کچھ بھی دریافت کیا ہے واقعی اس نے ہمیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ابن کبیر کی تتلیاں لاطینی امریکا کی تین بہنوں کی عمدہ کہانی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی جرم ہوتا واقعی جنگ عظیم دوم کا انوکھا واقعہ ہے۔ جناب علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ میں گلوکار سلیم رضا کے حالات زندگی پڑھے۔ واقعی وہ ایک اچھے گلوکار تھے۔ مگر اپنوں کی بے پروائی اور انسانی غفلت کا شکار ہو گئے کہ زوال میں ہم لوگ اچھے اچھوں کو بھول جاتے ہیں۔ خوشونت سنگھ واقعی تاریخ کا عجیب کردار ہے۔ فلمی الف لیلہ میں ایک بات ہے کہ سفیان صاحب بار بار ایک ہی واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ طویل سلسلہ میں شہباز ملک کو پھر انڈیا میں پھنسا دیا گیا ہے۔ بہرحال مار دھاڑ کا ایک مقبول سلسلہ ہے۔ سچی آپ بیتیوں میں موت یا حیات میں عورت ذات کو بھی فوکس کیا گیا ہے۔ سب نزلہ بے چاری عورتوں پہ ڈال کر مرد حضرات بری ہو جاتے ہیں۔ استادی، اچھی تحریر ہے۔ اندھی سوچ ایک معاشرتی المیہ کو ظاہر کرتی ہے۔ نام نہاد پیروں نے اپنے اڈے چلانے کے لیے جو بھی عورتوں کو دلال بنا رکھا ہے۔ بے چاری شریف عورتیں دولت کے ساتھ ساتھ اپنی عزت بھی گنوا بیٹھتی ہیں۔ یہ ایسے لوگ معاشرہ میں ناسور ہیں۔ آخری کہانی اعتراف گناہ ہے جس میں ایک معاشرتی غلطی کو بیان کیا گیا ہے۔ کچھ صاحب کالے تھے ان کی سمجھ پہ بھی کالی تھی تو ان کو عظیم مصور اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ واقعی صاحب مضمون بھٹک گئے تھے۔ اور پھر اعتراف گناہ کر کے اپنی غلطی کی معافی کے طالب ہوئے۔ معاشرہ میں محتاج اور معذور لوگ ہماری توجہ کے طالب ہوتے ہیں لیکن معاشرہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس معاشرہ کی برائی سے بچائے آمین۔"

ملک جاوید محمد خان سرکانی، بُرہ وزلی جھنگ سے آئے ہیں" جناب شاہد جہانگیر شاہد شہر خیال کی صدارت اور مرزا عبدالقادر بیدل پر لکھے گئے تحقیقی مضمون کی اشاعت پر جہاں اتنی بڑی بڑی مبارک بادیں آپ کو ملی ہیں ان میں ایک ننھی سی مبارک باد ہماری بھی شامل کر لیں۔ ایک بڑے کام کو آپ نے مختصر مگر جامع اور موثر انداز میں قلم بند کیا۔ اگر سوئے ادب نہ ہو تو یہ کہوں گا کہ گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا۔ حق یہی ہے کہ آپ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ ناصر حسین صاحب نے مرزا بیدل کو شاعر ولی یعنی ولی نہیں بلکہ شاعر ولی لکھا تھا۔ ولی اور صوفی عموماً مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ احساس کمتری تو ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو آپ کہہ رہی ہیں یہ احساس محرومی اور احساس شرمندگی ہے۔ اگر یہ احساس امت مسلمہ کے ناخداؤں کے دلوں میں بھی پیدا ہو جائے تو حالات بدلنے میں صدیاں نہیں لگیں گی کیونکہ باقی ہے ابھی رنگ ہمارے خون جگر میں۔ آپ جائزہ لے لیں تمام قدرتی وسائل مسلمانوں کو عطا کیے گئے ہیں لیکن ہمارے میر کارواں ان نعمتوں کو مسلسل جھٹلا رہے ہیں۔ حکیم محمد سعید شہید نے پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ سورہ رحمان کی عملی تفسیر ہے۔ طاہر قریشی صاحب مشاہیر میانوالی کے سلسلے میں ایک مشورہ ہے کہ مولانا اللہ یار خان اور مولانا عبداللہ چکڑالوی کے نام بھی اپنی تحقیق میں شامل کر لیں۔ مولانا اللہ یار خان ایک ممتاز عالم دین، عظیم مناظر، کئی کتابوں کے مصنف اور سلسلہ نقش بندیہ اویسیہ کے شیخ طریقت

تھے۔ 1889ء کو ولادت ہوئی، 18 فروری 1984ء کو وفات پائی اور گاؤں چکڑالہ میں دفن کیے گئے

رانا محمد شاہد کی بورے والا سے آمد "ہمارا یہ فوج کی محبت میں گندھا تھا۔ ویسے بھی فوج ہی ہر ملک کا آخری معتبر ادارہ ہوتی ہے جو آپ کی حفاظت کچھ یوں کرتی ہے کہ آپ میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں اور یہ فوج سرحدوں پر پہرہ دے رہی ہوتی ہے۔ بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے آج ہمیں 65 والے جذبے کی ضرورت ہے۔ جب فوج سے محبت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی فوج کے لیے جان و مال سب کچھ دینے پر تیار تھے۔ شہر خیال میں شاہد جہانگیر شاہد کا طویل خط دلچسپ رہا۔ جہاں ان کے کراچی میں گزرے بچپن کے ایام کا ذکر ہوا وہیں ان کی عمر کا اندازہ بھی ہو گیا، ہاہاہا۔ اعجاز حسین سخارا! سچ بیانیوں پر تبصرہ خوب فرماتے ہیں۔ کسی سچ بیانی کے ساتھ خود بھی میدان میں اتریں نا۔ سدرہ بانو! کوری! جس معاشرے میں تعلیم کو کاروبار بنا لیا جائے۔ وہاں بچوں کو تعلیم کم دی جاتی ہے اور گھروں کے کام زیادہ کروائے جاتے ہیں۔ گلی گلی، محلے محلے میں کھلی یہ ٹیوشن اکیڈمیاں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ خوب کاروبار ہے تعلیم بھی۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ اگر غریب کے بچے بھی تعلیم حاصل کرنے لگے تو سردار، چوہدری اور وڈیرے کہاں جائیں گے۔ کس پر حکومت کریں گے؟ یہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ ہے اور ڈاکٹر قرۃ العین نے سچ لکھا کہ ایڈمیشن فیس کے ساتھ ساتھ سال بھر مختلف تقریبات و تادیبات کے ذریعے غریب والدین سے لاکھوں روپے وصول کیے جاتے ہیں جو بمشکل اپنے بچوں کو تعلیم دلا پاتے ہیں۔ محمد عمران جوہانی ماضی میں اگر امن ہوتا تھا تو ساتھ ساتھ رواداری، وضع داری بھی ہوتی تھی جو کہ آج مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! ابھی حال ہی میں کہیں پڑھ رہا تھا کہ امریکی خلائی ادارے ناسا نے قیامت کی نشانی کو قبول کر لیا ہے۔ قیامت کی نشانی ہے کہ سورج مغرب سے نکلے گا۔ ناسا کی تحقیق کے مطابق 30 جولائی کو اس سیارے کی مشرق کی سمت گردش رک گئی تھی جبکہ اگست اور ستمبر کو مریخ نے اپنے راستے کی سمت تبدیل کر لی تھی۔ ماہرین کے مطابق مریخ سیارے میں گردش میں تبدیلی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ تمام سیاروں کی گردش میں ایک دفعہ تبدیلی ضرور آئے گی۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے۔ اس کی گردش بھی مخالف سمت میں ہو گی اور سورج مغرب سے طلوع ہو گا اور ایسا جلد ہو گا۔ اسلم عالم کا ای میل پڑھ کر خوشی ہوئی کہ بھارت میں سرگزشت جاتا ہے اور وہاں بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ (فیس بک پر انڈین اس پرچے کی جتنی تعریف کرتے ہیں وہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے) منشی محمد عزیز کی سرگزشت کو حاصل کرنے کی تگ و دو خاصی دلچسپ ہوتی ہے۔ سرگزشت سے ان کی محبت ان کے شوق کا پتا دیتی ہے۔ ویسے ڈاکٹر ساجد امجد کو اس بات کی داد دینی ہو گی کہ وہ اکثر ان شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن سے عام آدمی بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ یوں ڈاکٹر صاحب ادب کی خوب خدمت کر رہے ہیں اور چراغ ادب روشن کیے ہوئے ہیں۔ تارا آزادی وہ کون تھے ایک تحقیقی و معلوماتی مضمون تھا۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ میں سب کچھ حقیقت نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ بہت سی باتیں پُراسراریت لیے ہوئے بھی ہوتی ہیں۔ تین بہنوں کی جدوجہد آزادی کی داستان ابن کبیر کی زبانی پڑھ لی۔ یہ سچ ہے کہ آزادی کی قدر اور احساس وہی لوگ جانتے ہیں جو غلامی کے پُرآشوب دور سے گزرے ہوں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دوسری جنگ عظیم کا واقعہ جرم وفا، ایک منفرد و دلچسپ تحریر تھی۔ فلمی الف لیلہ میں اس بار خشونت سنگھ پر جو علی سفیان آفاقی نے لکھا وہ خاصے کی چیز تھا۔ منظر امام جون کے مہینے کی مناسبت سے معلومات بخوبی پہنچا رہے تھے۔ محمد الیاس راہی کی کہانی بھوک آج کے دور کی عکاس تحریر تھی۔ مغربی تہذیب نے مشرقی نوجوانوں کے ذہنوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اور آئے روز ہوس کے مارے یہ بدبخت جو جرائم کرتے نظر آتے ہیں، وہ بھی اخبارات کی سرخیوں پر نظر آتے رہتے ہیں اور ان جرائم کے پیچھے بھی بنیادی وجہ وہ فحاشی و عریانی ہی ہے جو مغرب سے ہمارے معاشرے میں تقریباً سرایت کر چکی ہے۔ اس میں ہمارا ملک ٹاپ پر ہے۔ منفرد سچ بیانیاں ہی سرگزشت کی پہچان ہیں۔ ایک تجویز ہے کہ ڈاکٹر ساجد امجد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، کاشف زبیر، ابن کبیر اور دوسرے معروف رائٹرز کی سرگزشت بھی شائع کیجیے۔ چاہے مختصر ہی ہو (آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے)۔"

منشی محمد عزیز کا لندن سے آخری وقت میں موصول خط "سب سے پہلے آف دی ریکارڈ ایک بات کا جواب ہاں یا نہ میں دے دیجیے گا کہ میری کہانی خط میری ہے؟ آپ میرے ڈاک خرچے پر واپس مجھے بھیج سکتے ہیں (بہت مشکل ہے اس لیے کہ مسترد کہانیاں ردی میں ڈال دی جاتی ہیں، ہر روز 10،15 کہانیاں مسترد ہوتی ہیں اس لیے رکھنا ممکن نہیں) آپ نجانے کب محترمہ شبانہ حنیف کے ساتھ رابطہ کروائیں گے۔ (کسی بھی خواتین ایڈیٹر کا نمبر ہم کسی کو نہیں دیتے بلکہ خواتین کو نمبر دے کر کہہ دیتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر رابطہ کریں۔ ادارہ ذمہ دار نہیں ہے) فہرست کو سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد اداریے تک پہنچے، جی ہاں انکل محترم اشتیاق تو مقید ہیں لیکن ان کے چیلے ان کی جگہ بڑے احسن طریقے سے ڈیوٹی نبھا رہے ہیں۔ شاعر جادو بیاں میں داغ دہلوی کی داستان حیات پڑھ لی۔ شہر خیال کی صدارت رانا محمد سجاد صاحب کے حصے میں آئی۔ مبارکباد۔ رانا محمد شاہد اس مرتبہ غیر حاضر رہے۔ ظہیر احمد تبسم قائم نو کریں، ویلکم جی۔ اعجاز حسین سخارا! کیسے ہیں پیارے بھائی؟؟ آپ کی بات سے میں بھی متفق ہوں کہ شہر خیال کا رتبہ بڑھا دیا جائے۔ چوہدری مدثر حسین اس مرتبہ تبصرے کی بجائے تبلیغ کرتے ہوئے نظر آئے۔ لو جی چلتے چلتے ہم طاہرہ گلزار کے قریب پہنچے تو انہوں نے وینڈز اپ کرا دیا۔ محترمہ آپ کا نام لکھنے میں دراصل ادب مانع تھا، اتنا تھا کہ کہیں "بے ادبی" نہ کر بیٹھوں ورنہ اور تو کوئی وجہ نہ تھی۔ ویسے ماشاءاللہ لگتا ہے پشاور میں سارا "ٹیم کولڈ" ہی ہے یعنی شاہد جہانگیر شاہد، شوکت رحمن خٹک اور طاہرہ گلزار۔ تینوں کے نام بھی زبردست ہیں، کام بھی۔ سدرہ بانو!

آپ کو خوش دیکھ کر ہم خوش ہیں۔ اللہ آپ کو سدا خوش و خرم رکھے آمین۔ آپ کی پُرخلوص محبت کے لیے مشکور ہوں۔ قیصر عباس خان مخلد کی پسندیدگی کا شکریہ۔ قرۃ العین زینب! اصد شکر کہ لیٹ کردہ میں تو آپ کا نام نظر آیا۔ روبینہ نفیس بہنا کی طرف سے پریشانی ہے۔ اللہ کرے وہ خیریت سے ہوں۔ ایم اے خالق بھٹی۔ وحید ریاست بھٹی! آپ صاحبان کہاں غائب ہیں؟ رانا سجاد کے علاوہ طاہرہ گلزار، سدرہ بانو گوندل، انور عباس شاہ اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے خطوط بھرپور تھے۔ مقابلہ بیت بازی میں نورین اسلم، نورین تبسم، نورین اصغر، سعید احمد چوہان اور رانا حبیب الرحمان کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد صاحب نے چین کے عظیم رہنما چو این لائی کے حالاتِ زندگی کا خوب احاطہ کیا۔ شکیل صدیقی صاحب خوفناک اور ڈراؤنی کہانیوں کے مصنف اسٹیفن ایڈون کنگ کی داستان سنا رہے تھے۔ ویسے اسٹیفن کی بیوی بہت اچھی تھی جس نے اپنے شوہر کو منشیات سے باز رکھنے کے لیے اتنے جتن کیے۔ خانماں برباد اگرچہ جاسوسی ٹائپ کہانی تھی لیکن اس میں یہودیوں کے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے متعلق بھی بہت اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔ محبت اور جنگ کا خوشگوار انجام پڑھ کر خوشی ہوئی اور اس بات پر حیرت بھی کہ تیمور، حبیب کی بابت پہلے دن ہی سے سب کچھ جانتا تھا۔ فلمی الف لیلیٰ میں نادرہ حسن، صدیقہ کیانی کے بعد میرے پسندیدہ شاعر ناصر کاظمی کا تذکرہ خوب رہا۔ ان کی "پہلی بارش" مجھے بہت پسند ہے۔ سیل نمبر 14 انتہائی مکروہ اور سفاک قاتل کی کہانی جسے عدالت بھی اتنے سنگین جرائم کے باوجود کوئی سزا نہ دے سکی۔ افسوس، صد افسوس۔ ترکی کا سفر اختتام کو پہنچا۔ اب آفاقی صاحب کہاں لے چلتے ہیں؟ پھر وہی قلفی بیچنے کی کہانی میں عماد کا کردار حیرت انگیز تھا کہ اس نے ایمل کو باعزت طریقے سے اپنایا کیوں، جب یوں چھوڑنا ہی تھا، اپنی بچی کے لیے عماد کا عمل قابلِ غور ہے کہ اپنی بچی اسے کتنی عزیز تھی۔ بے حس، میں نظر کی ستائی کا پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ استغفراللہ۔ درد میں بھی انور کی اعلیٰ ظرفی کو سلام۔ مدیم ایڈووکیٹ صاحب۔ بھیڑیا انسانوں کے روپ میں چھپے درندوں کی کہانی جو ہر قسم کے جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر صرف اور صرف دولت ہوتی ہے۔ وارث میں زرینہ کو وارث تو مل گیا لیکن اس کی ساس بے چاری تو پوتے کو گود میں کھلانے کی حسرت دل میں ہی لے کر قبر میں چلی گئی۔"

ڈاکٹر روبینہ نفیس کا بھکر سے خط "نفیس صاحب کی طبیعت خراب ہے تمام احباب سے دعا کی اپیل۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا خلوص نامہ چیچہ وطنی سے "یک کی سرگزشت میں اعلیٰ بند شاعری کے بانی سید [illegible] کے انداز کو عروج پر پہنچانے والے نواب مرزا داغ دہلوی کی جامع سرگزشت کو پیش کیا گیا ہے۔ "رہنما" ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اس بار عوامی ریاست میں انقلاب کی راہ ہموار کرنے والے سیاست دانوں کو آئینہ دکھانے کے لیے عظیم دوست چین کے لیڈر "چو این لائی" کا تذکرہ لے کر آئے۔ انقلاب کے دعوے داروں کو ایک اہم مضمون پڑھ لینا چاہیے۔ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جب کہیں جا کر وطن میں دیدہ ور پیدا ہوتے ہیں۔ سو عوام کو بیدار کیا جائے تو انقلاب کی جگہ انعام ہے۔ سروش کی کہانی "ہم وہی غلطی" ایک سبق آموز اور اچھی کہانی تھی۔ آفاقی صاحب کی ترکی یاترا بالآخر اختتام پذیر ہوئی۔ "فلمی الف لیلیٰ" میں اس مرتبہ ناصر کاظمی (مرحوم) سے متعلق خوبصورت تحریر سامنے آئی۔ گزشتہ چھ ماہ میں فلمی دنیا کے دو مشہور عالم ریلیز ہوئی اور ہم چوہدری کی سوانح منظرِ عام پر آئی ہیں۔ پاکستان میں چونکہ مذکورہ کتابیں میسر نہیں ہیں لہٰذا آفاقی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنے ادارے سے مذکورہ کتابیں منگوا کر ان کی تلخیص سے قارئینِ سرگزشت کو بھی مستفیض فرمائیں۔ مارو دھاڑ... سے بھرپور سیریل "سراب" ایک ہی جگہ آ کر رک گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر ختم کر دیا جائے اور کوئی نیا سسپنس سے بھرپور سلسلہ شروع کیا جائے۔ مسعود الدین احسن امینی کا "ہمدرد کا رشتہ" "منتظر اور بے قرار" کہانی تھی۔ "کالا علم" کرنے کروانے والوں کے دلوں سے خوفِ خدا جاتا رہتا ہے ان کا انجام ہمیشہ بھیانک ہوتا ہے۔ بیت بازی میں حیات اللہ، افشین مظہر، نعیم شیخ، مجلس فیروز، محمد ذیشان، نیاز کھوسو کے اشعار پسند آئے۔ شہرِ خیال کے دوستوں کو بھی بیت بازی کی محفل میں بھرپور شرکت کرنی چاہیے۔ شہرِ خیال میں رانا محمد سجاد، اعجاز حسین لدھیانوی، بشریٰ افضل، ڈاکٹر قرۃ العین، قیصر عباس خان، آپ سب کا مشکور ہوں تبصرہ پسند کرنے کے لیے۔ ظہیر احمد تبسم اور عمران جونانی، سدرہ بانو گوندل صاحبہ خدا کرے کہ پاکستان اور خصوصاً کراچی کے حالات پھر سے پُرامن ہو جائیں، ہر قسم کی دہشت گردی کے اندھیرے چھٹ جائیں اور آپ سب بھی روشنیوں کے شہر کی خوبصورتیاں دیکھ سکیں جو کہ میں نے اپنے لڑکپن میں دیکھی تھیں۔ رنگ کلاچی کے موجودہ حالات کے بارے میں محمد عمران جونانی صاحب نے بتایا کہ آج بھی تقریباً ویسی ہی ہے۔ کبھی موقع ملا تو ایک بار پھر ان گلیوں اور میدانوں میں گھومنا چاہوں گا۔ انور عباس شاہ آپ کو تجزیہ کا تبصرہ پسند آیا۔ شکریہ لیکن آفاقی صاحب استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذرہ کو آسمان سے کیا نسبت؟ دونوں کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ اللہ آپ کو بھی سلامت رکھے اور بہت سی خوشیاں نصیب ہوں۔ شفیق احمد عزیز سے آپ نے جون کے تبصرہ کو 2014 کی پہلی ششماہی کا بہترین تبصرہ قرار دیا، میں مشکور ہوں۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور۔ مظفر علی خان، لاہور۔ حفصہ احمد، احمد خان توحیدی، کراچی۔ امتیاز حسین، لاہور۔ نفیس احسن، گوجرانوالہ۔ سیدہ ذیشان زیدی، ملتان۔ شیبہ مظہر کاظمی، جھنگ صدر۔ رانا محمد سجاد، مظفر گڑھ۔ احمد باقر باقری، چنیوٹ۔ ناصر سجاد احسن، بذریعہ ای میل۔ ارباب خان، پشاور۔ محمد سراج الدین، وزیر افتاری خان۔ اعجاز حسین، بھمار نور پور تھل۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ رانا محمد شاہد، بورے والا۔

انتقال پر ملال

قارئین سرگزشت کو ہم نہایت دکھ کے ساتھ اطلاع دے رہے ہیں کہ ادارے کے دیرینہ ساتھی معروف مصور **شاہد حسین** طویل علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تمام قارئین سے سورۂ فاتحہ کے لیے التماس ہے۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ماہ اگست 2014ء کے پاکیزہ کا خصوصی عید نمبر بے شمار رعنائیاں سمیٹے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

رفعت سراج کی **امانت** میں عیاں ہوئے کئی راز

ترک وفا میں **نایاب جیلانی** نے اٹھائے کئی سوال

من موہنی سی **مومل شنید** کے ساتھ **رضوانہ پرنس** نے رکھی ایک خوبصورت نشست

عنیزہ سید کے تحریر کردہ ناول **شام شہر یاراں** کا [illegible] اختتام

دس نمبر کا سوال ...... **ناہید سلطانہ اختر** کے قلم کا ایک اور شاہکار

اس کے علاوہ

شائستہ عزیز، شیریں حیدر، عقیلہ حق اور **سمیرا حمید** کے دلکش افسانوں کے ساتھ ساتھ پڑھیے **ام ثمامہ، نیررانی شفق، عذرا فردوس، اُم مریم** اور **حمیرا خان** کی چونکا دینے والی خوبصورت تحریریں

بے حد حسین، دلکش اور متنوع مستقل رنگوں کا دلنشیں امتزاج آپ جیسے پیارے اور باذوق قارئین کے لیے

نشانِ حیدر

ڈاکٹر ساجد امجد

ہر سو دہشت گردی کی فضا ہے اور خون شہداں کو بے توقیر کرنے کی سازشیں ہیں۔ کئی سو سال کی غلامی کے بعد حاصل کردہ آزادی کے خلاف مفاد پرستی کو پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ ایسے نازک وقت کی پکار ہے کہ نئی پود کو جذبۂ حب الوطنی سے سرشار افواج پاکستان کے کارنامے بتائے جائیں۔ جنھوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لیے قربان کیا ہے۔ قوم کے انہی مجاہدین میں ایک اہم نام راشد منہاس شہید کا بھی ہے۔ اس کم سن شہید نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا یہ سب کو پتا ہے مگر کس وجہ سے اس نے قید ہوکر جان بچانے کی بجائے موت کو گلے لگایا اس بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

ایک وطن پرست گھرانے کے ہونہار فرزند کا احوالِ زیست

کالے رنگ کا ایک کتا کمپاؤنڈ میں داخل ہوا اور زمین سونگھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر وہ رک گیا جیسے اس کی مطلوبہ چیز اسے مل گئی ہو۔ اس نے آسمان کی طرف منہ کرکے ایک مخصوص آواز نکالی اور ایک طرف بیٹھ کر اپنے بلاوے کا اثر دیکھنے لگا۔

آشو کو یقین نہیں تھا کہ آج اس کا دوست اس سے ملنے اتنی جلدی آجائے گا۔ اس نے جو یہ آواز سنی تو کمپاؤنڈ کی طرف بھاگا۔ اس کا دوست کمپاؤنڈ میں اُگی جنگلی گھاس پہ لیٹا ہوا تھا۔ آشو کو دیکھتے ہی کتا اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور دم ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرنے لگا۔ اس کے منہ سے اس وقت بھی کچھ آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کہہ رہا ہو' یار تم اتنی دیر سے آئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔

آشو اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسی وقت اس کے والد کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ آج سب کام وقت سے پہلے ہو رہے تھے۔ اس کے والد مجید صاحب بھی کچھ پہلے گھر آگئے تھے۔ انہوں نے یہ نظارہ دیکھ لیا تھا کہ آشو کتے کے قریب بیٹھا ہے اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہا ہے۔

"آشو یہ کیا حرکت ہے۔ کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔"

آشو فوراً کتے کے پاس سے ہٹ گیا۔ کتے نے بھی اسی میں عافیت جانی کہ دم دبا کر کمپاؤنڈ سے باہر نکل جائے۔ ڈھائی سالہ آشو نے باپ کی انگلی تھامی اور گھر میں چلا آیا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن پھر مجید صاحب کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے تو آشو اسی کتے سے کھیل رہا تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے کیونکہ مجید صاحب نے کہا تھا' کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے عجیب وغریب حرکت کی۔ اس نے اپنے ہونٹ کتے کی تھوتھنی سے رگڑ ڈالے۔

"ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔"

"آپ نے کہا تھا کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ میں کتے کو ہاتھ تو نہیں لگا رہا۔"

ڈھائی سال کے بچے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی شرارت کا جواز اس طرح پیش کرے گا۔ انہوں

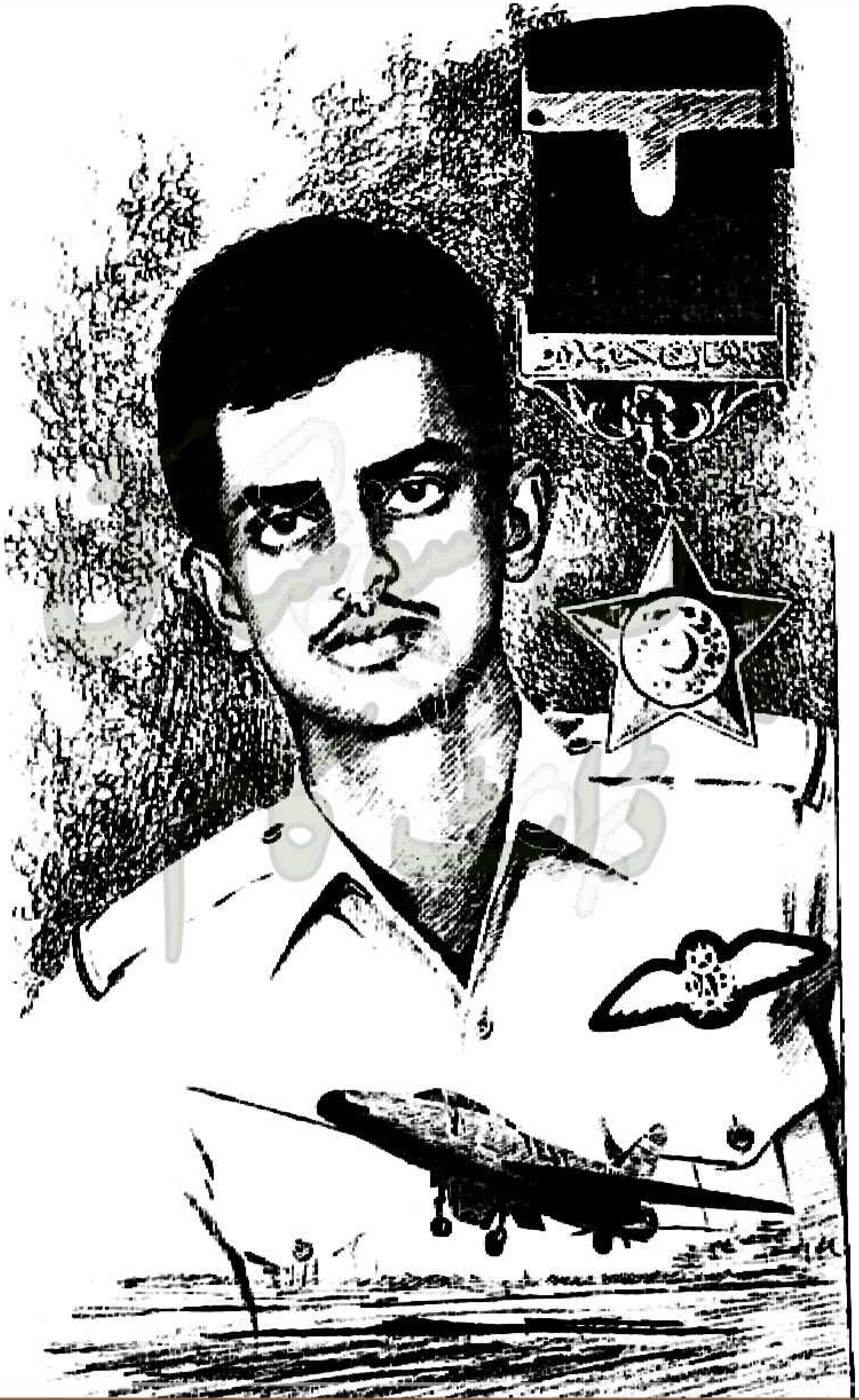

نے یہ واقعہ گھر میں جا کر بتایا تو... سب ہی ہنس پڑے۔

کئی دن تک گھر میں اس کی ذہانت کے چرچے ہوتے رہے۔

مجید صاحب فوج میں سول انجینئر تھے۔ وہ راجپوتوں کے قبیلے "منہاس" سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فوج میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ عراق اور ایران میں بھی گزارا تھا۔ پھر برما اور بنگال و آسام کے محاذوں پر بھی خدمات انجام دیں جہاں جاپانیوں کی تباہ کن افواج کا سامنا تھا۔ جنگ کے اختتام پر انہیں انڈیا میڈل، برما میڈل اور عراق میڈل دیے گئے۔

دنیا کے نقشے پر ایک آزاد مملکت پاکستان کے نام سے وجود میں آئی تو وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کراچی آ گئے۔ جہاں ان کا قیام ڈرگ روڈ پر واقع "ایم ای ایس" کے بنگلوں میں ہوا۔

وہ اپنی تین لڑکیوں کے ساتھ کراچی پہنچے تھے۔ ابھی تک ان کے گھر میں کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔ 1951ء میں ان کے گھر.... ایک لڑکا پیدا ہوا۔ تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے فطری طور پر بے انتہا خوشی منائی گئی۔ اس لڑکے کا نام راشد منہاس رکھا گیا۔ مجید صاحب اسے گھر میں "آشو" کہہ کر پکارتے تھے۔

کراچی میں انہیں پاکستان ایمپلائز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (پی ای سی ایچ ایس) میں ہزار گز کا پلاٹ بھی ملا تھا۔ اس پلاٹ پر انہوں نے تعمیر شروع کرا دی۔ اس کا نام انہوں نے "منہاس ولا" رکھا تھا۔

جب یہ بنگلا تیار ہو گیا تو ان کی پوسٹنگ اس وقت کے مشرقی پاکستان کے شہر "جیسور" میں ہو گئی۔ راشد منہاس اس وقت دو سال کا ہو چکا تھا۔ مجید صاحب نے بنگلا کرائے پر دیا اور خود جیسور پہنچ گئے۔

مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) اپنی دلفریب جھیلوں اور سبزہ زاروں کے باعث دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جیسور کا علاقہ خوبصورت جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ مجید صاحب کو جو رہائش ملی تھی اس کے کمپاؤنڈ میں بھی جنگلی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ کمپاؤنڈ سے باہر بھی دور تک جتنا میدان تھا وہ گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔ میدان میں ایک چھوٹی سی ایئر فیلڈ بھی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی سامان بردار جہاز گھن گرج کے ساتھ اتر جاتا تھا۔ راشد جب بھی جہاز کی آواز سنتا" دوڑتا ہوا آتا اور کمپاؤنڈ کے جنگلے سے لگ کر جہاز کو دیکھتا رہتا۔ اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے بال ہوا میں لہراتے رہتے۔

ان دنوں اس کے دو ہی مشاغل تھے۔ اس کالے کتے سے کھیلنا جو کمپاؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتا تھا اور اس سے اس کی دوستی ہو گئی تھی یا ایئر فیلڈ پر اترتے ہوئے جہاز کو دیکھنا۔

کچھ دنوں کے لیے ایک کھلونا اور اس کے ہاتھ آ گیا تھا اور وہ تھی جیسور کے قیام کے دوران پیدا ہونے والی اس کی چھوٹی بہن جسے وہ کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔

ابھی اس کے یہ معصوم مشغلے جاری تھے کہ مجید صاحب کا تبادلہ بہاول پور (مغربی پاکستان) ہو گیا۔

یہ خاندان مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کے شہر بہاول پور آ گیا۔

راشد کی عمر ابھی بہت کم تھی لیکن اس نے بہت جلد چلنا سیکھ لیا تھا اور عمر سے پہلے ہی خوب بولنے لگا تھا۔ باتیں بھی ایسی ذہانت کی کرتا تھا کہ بہاولپور پہنچتے ہی مجید صاحب نے سوچا اسے اسکول میں داخل کروا دیا جائے۔ والدہ کی محبت ابھی اسے اسکول بھیجنے میں مانع تھی لیکن اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

ملازمت کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ مجید صاحب کو ایک جگہ ٹکنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ بہاولپور میں رہتے ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ تبادلے کے احکامات آ گئے۔

"کیا بات ہے آپ پریشان بھی نہیں ہیں، دکھی بھی نظر نہیں آتے بلکہ فکرمند دکھائی دے رہے ہیں"۔ بیوی نے پوچھا۔

"مجھے فکرمند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میری نوکری کی نوعیت ہی ایسی ہے لیکن فکر یہ ہو رہی ہے کہ آشو (راشد) کو اسکول میں داخل ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ اگر کچھ اور وقت مل جاتا تو اس کی بنیاد مضبوط ہو جاتی۔"

"فوجیوں کا مقدر یہی ہے۔ اب آپ کا تبادلہ لاہور ہوا ہے۔ وہ ایک بڑا شہر ہے۔ راشد کی تعلیم کا وہاں اور بھی اچھا انتظام ہو سکے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ اب تم تیاری کر لو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

اس خاندان نے ایک مرتبہ پھر سامان اٹھایا اور لاہور آ گیا۔ یہاں راشد کو کوئین میری کالج کے "کے جی" سیکشن میں داخل کرا دیا گیا۔

وہ ذہین بھی تھا اور اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اس

معمولی کلاس سے وابستہ بچے عموماً نصاب کی کتابوں تک محدود رہتے ہیں لیکن وہ گھر میں آنے والے اخباروں کی ورق گردانی کرتا رہتا اور ایک دن اس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا جب اس نے انگریزی اخبار "ڈان" کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ اور پھر یہ اس کا معمول ہو گیا۔

ہوائی جہازوں سے اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ یہ شوق اسے اس وقت بھی تھا جب وہ جیسور میں تھا اور گھر کے قریب مال بردار جہازوں کو اترتے اور اڑتے دیکھتا تھا۔ لاہور میں یہ سہولت تو نہیں تھی لیکن لاہور کا آسمان ان جہازوں کی گزرگاہ ضرور تھا۔ وہ ان جہازوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا اور اپنی بڑی بہنوں سے اس عزم کا اظہار کرتا تھا کہ وہ بھی ایک دن ایسا ہی ایک جہاز اڑائے گا۔

"تو تم پائلٹ بنو گے۔"

"جی نہیں۔ مجھے ٹرک چلانے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو فائٹر بنوں گا۔ اپنا طیارہ اڑاؤں گا اور دشمن کا طیارہ مار گراؤں گا۔"

"تم نے خود کو دیکھا ہے؟" دونوں بہنیں ہنسنے لگیں۔

"تم بھی کہنا چاہتی ہو نا کہ میں چھوٹا ہوں۔ بہت جلد دیکھ لوگی کہ میں چھوٹا نہیں ہوں۔ میں تم دونوں سے بڑا ہوں۔ دیکھ لینا تم۔"

وہ بڑی شان سے کہتا اور دوبارہ آسمانوں میں جھانکنے لگتا۔

اس کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے مجید صاحب نے اسے طیاروں سے متعلق چند فنی سی کتابیں لا کر دے دیں۔ اب اسے ایک اور مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔ ان کتابوں کو بار بار پڑھتا رہتا۔ اب اس کے ارادوں میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہو گیا۔ وہ سینہ پھلا کر کہا کرتا تھا کہ میں نے کئی ترکیبیں سیکھ لی ہیں۔ میں اپنا طیارہ خود بناؤں گا۔

اس کی بہنیں اس سے بڑی تھیں اور ظاہر ہے تعلیم میں بھی آگے تھیں۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی اس سے آگے ہو اور وہ بھی لڑکیاں جو ہر وقت اس پر رعب جمائے رہتی تھیں۔ وہ نہ تو عمر میں ان سے آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ تعلیمی کلاسوں میں۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ وہ خود کو ان سے زیادہ سمجھ دار ثابت کرے اور یہ سمجھ بوجھ کتابوں ہی سے آسکتی تھی۔ اسے سب سے زیادہ لطیفے آتے تھے۔ اس کے لیے اس نے مزاح سے بھرپور کتب پڑھنے شروع کر دیے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کی ایک کمزوری گھر والوں اور خاص طور پر بہنوں کے ہاتھ آ گئی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل تھا۔ وہ اکیلے بیٹھے بیٹھے بے اختیار ہنسنے لگتا۔

"تم زور زور سے ہنس کر دوسروں کو کیوں ڈسٹرب کرتے ہو۔ چپ چاپ کیوں نہیں پڑھتے ہو۔"

"میں کیا کروں۔ ہنسی کی باتوں پر مجھے تو ہنسی آجاتی ہے۔"

"دیکھنا ابو کے ہاتھوں کسی روز خوب پٹو گے۔"

"مجھے اس وقت بھی ہنسی آجائے گی اگر انہوں نے الٹے سیدھے ہاتھ مجھ پر اٹھائے۔"

وہ واقعی موقع بے موقع ہنس پڑتا تھا۔ ہنسی کو ضبط بھی کرتا تھا تو اس کی آنکھیں ہنسنے لگتی تھیں۔ ہنسی کو ذخیرہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو وہ دولت تھی جسے لٹانے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس کی یہ عادت ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کی اس عادت نے اسے کئی مرتبہ مشکل میں پھنسایا لیکن وہ ہنستا ہی رہا۔

اسے سب سے آگے رہنے اور بڑا بننے کا شوق تھا۔ وہ چاہتا تھا سب اسے بڑا سمجھیں اور اس کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ وہ ایسا سب کچھ کرے جو دوسرے نہ کر سکیں۔ وہ صرف کہتا ہی نہیں تھا بلکہ ایسے عملی قدم بھی اٹھاتا تھا جس سے اس کی برتری ثابت ہو چاہے اس میں کتنے ہی خطرات ہوں۔

اس کے ماموں غلام سرور کے پانچ بچے تھے۔ وہ جب ملازمت کے سلسلے میں لاہور آئے اور مجید صاحب کے گھر میں کچھ دنوں کے لیے ٹھہرے تو راشد کو ساتھی مل گئے اور ان پر رعب جمانے کا موقع بھی خوب ملا۔ شرارتوں کے نئے دروازے کھل گئے۔

ایک دن تمام بچے صحن میں لگے جامن کے پیڑ کے نیچے جمع تھے اور اوپر کی طرف تک رہے تھے جس پر پکے ہوئے جامن لگے تھے۔ اوپر جائے بغیر یہ جامن اتر نہیں سکتے تھے اور درخت پر چڑھنے کی ہمت کسی کی نہیں تھی۔ درخت کی اونچائی اتنی تھی کہ کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کزن نو سال کا تھا لیکن وہ بھی ہچکچا رہا تھا۔ راشد کی عمر اس وقت سات سال تھی لیکن اسے اونچائی سے ذرا بھی خوف معلوم نہیں ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ درخت پر وہ چڑھے گا۔ سب بچے خوش ہو گئے کہ اب جامن کھانے کو ملیں گے۔ وہ درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخیں ہلاتا رہا۔ جامن ٹپ

لب ہے کر رہی تھیں اور وہ خوشی سے نعرے لگا رہا تھا۔ "کھاؤ بچو خوب جامن کھاؤ۔"

گھر والوں نے جب سنا کہ وہ درخت پہ چڑھا تھا تو اس پر خوب ڈانٹ پڑی۔

"میں یہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ میرے گھر میں جامن کا درخت ہو اور بچے جامن سے محروم ہوں۔"

"اگر تم گر جاتے اور ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی تو کیا ہوتا۔ آئندہ سے تم درخت پر نہیں چڑھو گے۔"

"چلو ہم کوئی اور کھیل کھیلا کریں گے۔"

اس "نئے" کھیل نے یہ شکل اختیار کی کہ راشد نے اپنی چھرے والی بندوق نکالی۔ اپنے کزن شاہد کو ساتھ لیا اور گھر کے صحن میں چڑیوں کا شکار کرنے لگے۔ جب کچھ دیر گزر گئی تو ان کے دل میں ایک انوکھا خیال آیا۔

"چلو صفائی کرنے والی کے کوارٹر پہ اٹیک کریں۔"

دونوں نے پوزیشن سنبھالی اور ملازمہ کے کوارٹر کی طرف بڑھے۔ راشد کے ہاتھ میں چھرے والی بندوق تھی۔ وہ اس کا رخ کوارٹر کی طرف کیے ہوئے دبے قدموں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے ہی دشمن سامنے آئے وہ اس پر اٹیک کر دے۔ اسی وقت ملازمہ باہر نکلی اور راشد کی انگلی ٹریگر پر دب گئی۔ گن سے چھرا نکلا اور ملازمہ کے چہرے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ خیر ہو گئی تھی لیکن ملازمہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ بڑوں نے راشد اور شاہد کی اچھی طرح خبر لی۔ مجید صاحب کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے چھ ماہ تک راشد کو شاہد کے ساتھ کھیلنے پر پابندی لگا دی۔

یہ پابندی برقرار رہتی لیکن ابھی دو دن ہی اس کے ماموں غلام سرور جوہرآباد سے لاہور آ گئے۔ ان کی فیملی لاہور میں تھی لیکن وہ خود جوہرآباد میں تھے۔ پندرہ دن بعد آئے تھے۔ بچوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں لہٰذا یہ پروگرام بنا کہ سب لوگ جوہرآباد چلیں اور وہاں سے سکیسر کے ہل اسٹیشن چلیں۔ بچے پہاڑی مقامات کی سیر کر لیں گے۔ راشد اور شاہد پھر یک جا ہو گئے۔

جوہرآباد پہنچ کر ہل اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے بھر راشد اور شاہد کی شوخیاں سب کا دل بہلاتی رہیں۔ راشد کی ہنسی یہاں بھی اپنا کام دکھا رہی تھی۔ وہ ہنسنے پر آتا تو ہنستا ہی چلا جاتا۔ یہ تفریح کا موقع تھا اس لیے اس کی بے جا ہنسی پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

بچے پہلی مرتبہ کسی پہاڑی سلسلے میں سفر کر رہے تھے اس لیے یہاں کے دلفریب مناظر ان کی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ گاڑی کا شور سن کر خرگوش اور تیتر جھاڑیوں میں ادھر اُدھر چھپتے پھر رہے تھے۔ راشد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاڑی سے کود کر ان کا پیچھا کرتا۔ اس وقت تو صرف تبصروں پر ہی گزارا ہو سکتا تھا۔

وادی سون میں داخل ہوتے ہی سڑکیں نشیب کی طرف اترنے لگیں۔ وہ ڈر بھی رہا تھا اور لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وادیوں میں سفید دھواں نظر آ رہا تھا۔ اس کے بڑوں نے اسے بتایا کہ وہ بادلوں کے اوپر سفر کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع ہی اس کے لیے بڑی دلچسپ تھی۔

"ایک دن دیکھنا میرا طیارہ بھی ان بادلوں سے اوپر سفر کرے گا۔"

"تم اپنے طیارے کا ذکر ضرور بیچ میں لے آنا۔" اس کی بہن نے کہا۔

"کیوں نہ لاؤں۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ طیارہ اڑا سکتا ہوں۔" اس نے کہا اور دوبارہ وادی میں جھانکنے لگا۔

"کاش! میں نیچے چلا جاؤں اور یہاں کے لوگوں کو دیکھوں۔"

اس کی دعا قبول ہوئی۔ جب گاڑی بل کھاتی سڑکوں سے ہوتی ہوئی نیچے وادی میں آئی تو دونوں گاڑیاں بھرے بازار میں رک گئیں۔ راشد کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ یہاں کے لوگ نہایت مہمان نواز ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر فوج میں جاتے تھے۔ کئی ریٹائرڈ فوجی انہیں ملے جو اب دکانیں چلا رہے تھے۔ مجید صاحب کا تعلق بھی فوج سے تھا اس لیے بھی ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔

سکیسر پہنچ کر کئی دلچسپی کی چیزیں نظر آئیں جو اس کے لیے ظاہر ہے بالکل نئی تھیں۔

یہ سفر اس کے لیے معلوماتی سفر ثابت ہوا۔ وہ ایک ایک چیز کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ مجید صاحب کو پہلی مرتبہ اس کی اس خوبی کا علم ہوا کہ وہ ہر بات کی گہرائی تک جانے کا منتظر رہتا تھا۔ بچوں میں یہ "مادہ" ہوتا ہے لیکن اس کی سنجیدگی پر سب کو حیرت ہو رہی تھی۔

واپس آنے کے بعد بھی وہ اس سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر نشست اپنی دادی کے ساتھ

جبی تھی۔ وہ فارسی پر عبور رکھتی تھیں اور ادب کا اچھا ذوق بھی تھا۔ ان کے پاس بچوں کو سنانے کے لیے بہت سی کہانیاں تھیں۔ ان میں سے بیشتر اسلام کے ان بہادر فرزندوں کے کارناموں پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ راشد ان کہانیوں کو سنتا تھا اور یقیناً سوچتا بھی ہوگا کہ وہ بھی وطن کے لیے اپنی جان قربان کردے گا۔

اس کی تعلیم کا سلسلہ لاہور کے کوئین میری اسکول کے پرائمری سیکشن میں ہو رہا تھا۔ یہ ادارہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا لیکن اساتذہ انگریز تھے جبکہ راشد کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اس کی اس کمی کو دیکھتے ہوئے مجید صاحب کے بڑے بھائی عبدالرشید منہاس نے فیصلہ کیا کہ وہ راشد کو اسلامیات اور اردو کی تعلیم دیں گے لیکن جلد ہی مجید صاحب کا تبادلہ کراچی اور پھر راولپنڈی ہوگیا اور پھر راشد کی اردو ہمیشہ کمزور ہی رہی۔

وہ پنڈی میں تھا کہ اسے ٹائیفائڈ ہوگیا۔ علاج کے لیے اسے کمبائنڈ ملٹری اسپتال (سی ایم ایچ) میں داخل کرانا پڑا۔ اتفاق سے انہی دنوں صدر ایوب بھی بیمار ہوئے اور اسی اسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کی عیادت کے لیے ایئر مارشل اصغر خان اسپتال آئے۔ اس بیماری میں بھی راشد کا طیاروں کا شوق عود کر آیا۔ صدر ایوب کو دیکھنے کی خواہش تو نہیں جاگی لیکن وہ یہ ضد کرنے لگا کہ وہ ایئر مارشل کو دیکھے گا۔ ایئر مارشل تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس کا تایا زاد بھائی منظور منہاس اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے اسے کندھوں پر اٹھایا اور ایئر مارشل کی جھلک دکھلا یا۔

"ایک دن میں بھی ایئر مارشل بنوں گا۔" اس نے بستر پر لیٹتے ہی کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کا یہ شوق زبانی نہیں تھا۔ جہازوں سے اس کا عشق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ہر آنے جانے والے سے وہ جہازوں ہی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہازوں کے بارے میں اس کی معلومات بھی بہت وسیع ہوگئی تھیں۔ اس نے کہیں سے جہازوں کے بارے میں بہت سی معلوماتی کتابیں حاصل کرلی تھیں جن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

ان کتابوں میں طیارہ سازی پر بھی کئی کتابیں تھیں۔ ان کو دیکھ دیکھ کر طیاروں کے ماڈل بنانے لگا اور بہت جلد اسے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے جہاز بنانے کے فن پر عبور حاصل ہوگیا۔ اس کے بنائے ہوئے جہاز آہستہ آہستہ حرکت بھی کرتے تھے۔ وہ اپنی دادی کو تو یہ سناتا رہتا تھا کہ جیسے ہی وہ بڑا جہاز بنانے میں کامیاب ہوگیا' انہیں اپنے جہاز میں بٹھا کر مکہ اور مدینے لے جائے گا۔"

اسی جہاز سازی کے شوق نے اسے یہ شعور دے دیا تھا کہ دشمن کو مار دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ گھر میں ایک طوطا پلا ہوا تھا۔ ایک گلہری اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور اکثر اسے تنگ کیا کرتی تھی۔ راشد کے نزدیک وہ دشمن تھی اور دشمن کو مار دینا چاہیے۔ ایک دن اس نے غلیل اٹھائی اور اس کا کام تمام کردیا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر خوش ہوا اور اپنے چچا کے پاس پہنچ گیا۔

"چچا جان! یہ گلہری میرے طوطے کی دشمن تھی۔ میں نے اسے مار دیا۔ دشمن کو مار دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات امی کو نہ بتایئے ورنہ مجھے ڈانٹ پڑے گی۔"

"جب گلہری کو دشمن کہہ ہی رہے ہو تو ڈانٹ سے ڈرتے کیوں ہو؟"

"چلو نہیں ڈرتا۔ بتا دینا۔"

"نہیں تم ڈر رہے ہو۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

اس نے گلہری کو ایک گڑھا کھود کر دفن کردیا۔

اس کے بہن بھائی اس کے ان اشغال کو دیکھ کر کہتے تھے کہ اس کا دھیان کھیل کود پر ہے۔ جہازوں کے ماڈل بنانے کے سوا اسے کچھ آتا ہی نہیں۔

اس کی دوستی اپنے خالہ زاد مظہر سے بہت زیادہ تھی۔ اس کے خالو پنڈی ہی میں تھے لہٰذا مظہر سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ یہ دوستی بھی عجیب تھی۔ مظہر اس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ مظہر کو الیکٹرانکس سے شغف تھا۔ غالباً اس کا یہی شغف راشد کو اس کے قریب لے گیا تھا۔ وہ الیکٹرانکس کے بارے میں ان سے معلومات لیتا رہتا تھا۔

ایک روز وہ خالو کے گھر گیا۔ مظہر کا ایک ہم جماعت آیا ہوا تھا۔ دونوں اپنی کتاب میں شامل سر والٹر اسکاٹ کی ایک نظم پڑھ رہے تھے لیکن اس کے بعض حصے ان کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ راشد کچھ دیر تو ان کی بے بسی کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ دخل دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اگر آپ لوگ کہیں تو اس کی تشریح میں کروں؟"

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تم ابھی یہاں تک کہاں پہنچے ہوگے۔"

"جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں وہ میں سن رہا ہوں اور میرے خیال میں اس کی تشریح میں کرسکتا ہوں۔"

اس نے کتاب ہاتھ میں لی اور تشریح کر دی۔

"جو شخص اپنے وطن سے محبت نہ کرے اسے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جب وہ مرتا ہے تو اس پہ ماتم کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، خواہ وہ زندگی میں کتنا ہی بارسوخ کیوں نہ رہا ہو۔"

اس دن مظہر کو معلوم ہوا کہ اس کا مطالعہ اس کی عمر سے کہیں آگے ہے۔ اس کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ ایسی مشکل نظم کی تشریح کر سکتا تھا۔

وہ مظہر کے دل میں اپنی کامیابی کا سکہ بٹھا کر گھر واپس آیا ہی تھا کہ اس کی بہن نے اسے بتایا کہ خالہ حمیدہ بھی اب پنڈی آ گئی ہیں۔ ان کا مستقل قیام وارسک میں رہے گا۔

خالہ حمیدہ کے شوہر ونگ کمانڈر تھے۔ ان کی وردی اور ٹوپی راشد کو اپنی طرف کھینچتی رہتی تھی۔ وہ بھی سوچا کرتا تھا کہ اگر کبھی اس نے فضائیہ جوائن کی تو ایسی ہی وردی اسے بھی ملے گی۔ وہ والدہ کے ساتھ خالہ کے گھر گیا اور یہ سوچ کر خوش ہوا کہ وارسک اور پنڈی کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ وہ یہاں تک بآسانی آ سکتا ہے۔

وہ ان کے گھر پابندی سے جانے لگا تھا۔ جہازوں اور فضائیہ کے ماحول کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ خالو کے یہاں کوئی بیٹا نہیں تھا لہٰذا وہ اسے اپنا بیٹا سمجھنے لگے تھے اور گھنٹوں بیٹھ کر طیاروں اور جنگوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کس طرح کیڈٹس کی تربیت ہوتی ہے۔ دوران تربیت انہیں کن کن باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس گھر کی صحبت نے اس کے دل میں یہ عزم پختہ کر دیا کہ وہ ضرور فضائیہ جوائن کرے گا۔

ٹائیفائڈ کا مرض اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ تیرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے دو مرتبہ ٹائیفائڈ کا شکار ہو چکا تھا جس نے اسے دبلا پتلا اور کمزور کر دیا تھا لیکن اس کے عزم اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ آرام طلب نہیں بن گیا بلکہ ہمیشہ متحرک رہنے لگا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہوا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتا ہوا۔

فوج میں جانے کا اس کا شوق برابر ترقی کر رہا تھا۔ اس کی عمر بھی اب چودہ سال ہو گئی تھی جو یقیناً ہوش مندی کی عمر ہوتی ہے جبکہ وہ تو ضرورت سے زیادہ سمجھدار تھا۔

فضائیہ اور جنگ اس کے محبوب موضوع تھے کہ ۱۹۶۵ء میں جنگ کو قریب سے دیکھنے کا عملی تجربہ ہوا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے دل میں انڈیا کی طرف سے نفرت کا جو جذبہ موجزن تھا اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

اس کا گھر راولپنڈی میں ملٹری کے جنرل ہیڈ کوارٹر کی حدود میں واقع تھا۔ اس کے گھر سے بمشکل ڈھائی سو گز کے فاصلے پر طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اور ان سے ذرا آگے پاکستان کے فوجیوں کے مورچے قائم تھے۔ اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لیا اور مورچوں پر پہنچ گیا۔ فوجیوں سے جنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا اور ان کی جرأت و حوصلے کی تعریف کرتا رہا۔ اس عزم کا بھی اظہار کرتا رہا کہ اگر اب کبھی جنگ ہوئی تو وہ اپنا طیارہ لے کر جائے گا اور دشمن کے طیاروں کو مار گرائے گا۔

وہ ان مورچوں پر تواتر سے جانے لگا۔ فوجیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی متحرک زندگی کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔

ان دنوں ملک کی فضا ہی دوسری تھی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جنگی ترانے نشر ہو رہے تھے۔ بلیک آؤٹ کے اندھیرے میں یہ ترانے گونجتے تو دلوں میں لہو جوش مارنے لگتا۔ وہ گھنٹوں ریڈیو کے سامنے بیٹھا رہتا اور یہ نغمے سنتا رہتا۔

اے وطن کے سجیلے جوانوں میرے نغمے تمہارے
لیے ہیں۔

فوجیوں کی شان میں جس طرح نغمے گائے جا رہے تھے اور جس طرح پوری قوم ان کی مدح سرائی کر رہی تھی اس سے اس کے دل پر نقش ہوتا جا رہا تھا کہ جو لوگ وطن کے لیے لڑتے ہیں وہ خاص عزت کے مستحق ہوتے ہیں اور جو اس راہ میں شہید ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں۔

اگر سترہ دنوں کی یہ جنگ نہ ہوتی تو اس کا یہ احساس اس قدر پختہ نہ ہوتا۔ اس جنگ نے اس کی ذہنی تربیت میں زبردست حصہ لیا۔ اس جنگ کی یادگاریں زندگی بھر اس کے ساتھ رہیں۔

اس جنگ کے دوران ہی اس کی نظریں خاص طور پر لڑاکا طیاروں پر رہیں۔ عزیز بھٹی کے کارنامے بھی اسے متاثر کرنے کے لیے کم نہیں تھے لیکن ایم۔ ایم عالم کا تو وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔

جنگ ختم ہوگئی تھی۔ اب ان بہادر سپاہیوں کے کارنامے بیان ہو رہے تھے اور ان پر تبصرے کیے جا رہے تھے۔ تفصیلات سامنے آرہی تھیں کہ ان سپاہیوں نے کیا کارنامے انجام دیے۔ راشد ان تبصروں کو غور سے سن رہا تھا۔

"اسکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی اس دستے کی قیادت کر رہے تھے جو ہلواڑہ کے بھارتی فضائی اڈے کو تباہ کرنے روانہ ہوا تھا۔ یہ دستہ صرف تین پرانے سیبر طیاروں پر مشتمل تھا۔ ہدف کو نشانہ بنانے سے پہلے ہی بھارتی فضائیہ کے ایک درجن ہنٹر طیارے اس پر ٹوٹ پڑے۔ رفیقی نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہنٹر مار گرایا اور دوسرے کا نشانہ لے کر ٹوٹ پڑے مگر عین اسی وقت ان کے طیارے کی مشین گنز جام ہوگئیں۔

"یونس اب قیادت تمہارے سپرد ہے۔ میری مشین گنز کام نہیں کر رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے یونس کے عقب میں دفاعی پوزیشن لے لی۔ وہ اس وقت اپنے طیارے کا رخ پاکستان کی طرف موڑ سکتے تھے لیکن انہوں نے خود کو ساتھیوں کے دفاع کے لیے ان کے ساتھ رکھا اور ہوا بازی کے داؤ پیچ آزما کر دشمن کی صفوں میں ابتری پھیلاتے رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھیوں نے تین ہنٹر طیارے مار گرائے مگر اس دوران میں خود رفیقی کا طیارہ بھی دشمن کی زد میں آکر چھلنی ہوگیا اور وہ شہید ہوگئے۔ اس معرکے میں یونس بھی شہید ہوگئے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ سسل چودھری نے ایک اور ہنٹر شکار کرنے کے بعد باقی ماندہ بھارتی ہوا بازوں کو چکر دیے اور بخیر و عافیت واپس آگئے۔"

اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم اپنے پرانے سیبر میں سرگودھا کے نزدیک پرواز کر رہے تھے۔ ان کا اسکواڈرن بھی ان کے ساتھ تھا اور یہ لوگ سرگودھا کے دفاع پر مامور تھے۔ بھارت کے پانچ ہنٹر طیارے فضا میں نمودار ہوئے۔ ایم ایم عالم نے مشین گن کے بٹن پر دباؤ ڈالا اور یکے بعد دیگرے پانچوں ہنٹر مار گرائے۔ یہ ہوا بازی کی تاریخ میں ایک عالمی ریکارڈ ثابت ہوا۔

ایم ایم عالم کے اس واقعے نے راشد کے دل میں شدید تڑپ پیدا کردی تھی۔

"میں ایم ایم عالم سے بھی زیادہ جہاز گراؤں گا۔" وہ اکثر کہتا تھا۔

خود راشد کے گھر میں عزم و ہمت کے کئی فسانے دہرائے گئے تھے۔ اس کے والد کے جاننے والوں میں نوجوان کیپٹن نصیر احمد تھے جن کا راشد کے گھر میں آنا جانا تھا۔ بعد میں کیپٹن نصیر احمد کی شادی راشد کی بہن فریدہ سے ہوئی۔

کیپٹن نصیر احمد نے بھی جنگ ستمبر میں حصہ لیا تھا۔ سیالکوٹ کے نزدیک ظفروال کے گاؤں میں وہ اپنی جان پر کھیل گئے اور نہایت دلیری سے دشمن کا مقابلہ کر کے اس علاقے کو بچا لیا۔ اس دوران میں وہ زخمی بھی ہوئے۔ انہیں ستارۂ جرأت کا اعزاز عطا ہوا۔

جب وہ اسپتال میں تھے راشد اکثر ان کی عیادت کو جاتا تھا اور جنگ کے واقعات سنا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وطن کی حفاظت کے لیے جان کو ہتھیلی پر رکھنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے یہ جنگ نہ ہوئی ہوتی تو اس کے دل میں وطن پر جان قربان کرنے کی تمنا اتنی جلدی بیدار نہ ہوتی۔

یہ جنگ اس کی جذباتی زندگی میں ایک اہم موڑ بن گئی۔ اس کے بعد اس کی زندگی اسی جنگ کے محور پر گھومتی رہی۔

جنوری 1966ء میں مجید صاحب کی پوسٹنگ کراچی ہوگئی۔

وہ چھ سال پہلے کراچی آیا تھا۔ دھندلی دھندلی یادیں اب بھی اس کے دل پر نقش تھیں مگر اب یہ شہر بہت بدل گیا تھا۔ سوسائٹی کا علاقہ بھی پہلے سے زیادہ آباد ہوگیا تھا مگر اب بھی خالی زمین کے ٹکڑے دیکھے جاسکتے تھے۔

مجید صاحب نے ڈرگ روڈ پر سوسائٹی کے قریب انگریزوں کے زمانے میں بنائی گئی بیرکوں میں قیام کیا۔ اس وقت تک وہ بے شمار کتابیں پڑھ چکا تھا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا بلکہ یہ احساس بھی فزوں ہوگیا تھا کہ اب اس کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ نہ کیا جائے۔ اس کی سمجھداری اور ہوشیاری کو تسلیم کیا جائے۔ اس احساس نے اس لیے سر ابھارا تھا کہ اس کی نازک جسامت اور بھولی بھالی صورت کی وجہ سے سب اس کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ بڑی بہنوں کی موجودگی اور ان کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے اس کے مزاج میں لڑکوں کا اکھڑپن نہیں بلکہ لڑکیوں جیسی ملائمت آ گئی تھی۔ اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے وہ

سے نئے طریقے ایجاد کر لیتا تھا تا کہ اسے نہ صرف بڑا لڑکا بلکہ مستعد اور متحرک تسلیم کیا جائے۔ کھیل کود سے وہ ہمیشہ دور رہا تھا۔ اس کی کو وہ کتابوں میں غرق رہ کر دور کر رہا تھا۔ اس کی تشنگی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا کر اپنی اہمیت منوانا چاہتا تھا۔

وہ ایک روز اپنے خالو کے گھر گیا اور اپنے خالہ زاد بھائی مظہر سے ڈائری کی فرمائش کی۔

"بھائی جان! آپ کے پاس کوئی ڈائری بے کار پڑی ہو تو مجھے دے دیں۔"

"تمہیں ڈائری کا کیا کرنا ہے۔"

"میں جو کچھ سوچتا ہوں، جو کچھ پڑھتا ہوں اس ڈائری میں نوٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"اس سے یہ ہوگا کہ جو میرے خیالات ہیں وہ دوسروں تک پہنچ سکیں گے۔ انہیں معلوم تو ہو کہ میں کیا سوچتا ہوں۔"

مظہر نے بھی زیادہ حیل وحجت مناسب نہ سمجھی۔ ان کے پاس پی آئی اے کی ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی وہ انہوں نے راشد کو دے دی۔

کچھ دنوں بعد اس نے وہ ڈائری مظہر کو دکھائی بلکہ مظہر نے خود دیکھنے کی فرمائش کی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس ڈائری میں بڑی بڑی شخصیتوں کے اقوال درج ہیں۔ یہ اقوال زیادہ تر حب الوطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک جگہ عمر خیام کی چند رباعیات کا ترجمہ درج تھا:

میری تشنگی بڑھتی جارہی ہے
اسے بجھایا نہیں جاسکتا
نہ یہ اب مجھے ساحل پر رہنے دے گی،
میرے دل میں یہ آرزو ہے
کہ میری آرزوؤں کے پیروں سے
بیڑیاں اُتار دی جائیں
کیونکہ یہ قید مجھے کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے

1966ء میں اسے سینٹ پیٹرک اسکول کے کیمبرج سیکشن میں داخلہ مل گیا۔ یہ اسکول اس کے گھر سے قریب تھا اور دونوں چھوٹے بھائی راحت اور انجم بھی اسی اسکول میں تھے لہٰذا تینوں بھائی پیدل اسکول پہنچ جاتے تھے۔ اس کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ہر ایک سے دوستوں کی طرح خوش اخلاقی سے ملتا تھا۔ گہرے دوست نہ بننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شرمیلا واقع ہوا تھا لیکن خوش مزاجی نے اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ دوستوں کے درمیان اس کی شخصیت رنگا رنگ اور لطیفہ باز نظر آتی تھی۔ بزرگوں کے سامنے سنجیدہ رہتا تھا لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ کوئی ہنسی کی بات ہوجاتی تو اسے اپنی ہنسی پر قابو نہ رہتا۔

ایک روز گھر میں ایک تقریب تھی۔ تمام بچے جو اب بڑے ہوچکے تھے ایک گوشے میں جمع ہوئے۔ انہوں نے کوئی ایسا کھیل کھیلا جس میں کرسیاں درکار تھیں۔ لڑکوں کے ذمے کرسیاں لانے کی ڈیوٹی تھی۔ راشد بھی ایک کرسی اٹھا لایا اور خاندان کی ایک لڑکی کو پیش کردی۔ اس لڑکی نے کرسی قبول کی اور نہایت دل پذیر انداز میں اس سے کہا "تم اب کافی ہوشیار ہوگئے ہو۔ راشد کو یوں محسوس ہوا جیسے بالآخر اسے تسلیم کرلیا گیا ہو۔ عمر ہی ایسی تھی کہ اس کے لطیف جذبوں میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ گھر آکر اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"میری زندگی کا عظیم ترین دن۔ اب یہ بالکل بدل گئی ہے۔" یہ لڑکی بہت دن تک اس کے اعصاب پر سوار رہی۔ پھر مصروفیات کا انبار ایسا آیا کہ وہ اس کے پیچھے دب کر رہ گیا۔ کبھی کبھی خیال آجاتا تھا کیونکہ وہ لڑکی اس کی زندگی میں پہلے ہوا کے جھونکے کی طرح آئی تھی۔

وطن اس کی پہلی محبت تھی۔ اس کی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔

ہم ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے
ہمیں ایک دفعہ تو مرنا ہے
تو پھر کیوں نہ اپنے وطن کو دے دیں
اپنی جان جو ہم بآسانی دے سکتے ہیں

ایک جگہ لکھا

"میں نے سوچ لیا ہے کہ ہوائی جہازوں کے نقشہ جات حاصل کروں گا اور پھر ایک تیز رفتار جہاز بناؤں گا۔"

وہ عمر کی ایسی منزل سے گزر رہا تھا جہاں عشق اور رغبت روئیے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ بہت سی لائنیں ایک ساتھ چلتی ہیں اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ جذبات اور عقل ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں۔ "اس لڑکی" کا خیال اسے بار بار آرہا تھا لیکن وہ اس خیال میں ڈوب کر اپنے مقاصد سے دست بردار نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے سامنے اس سے بڑے بڑے مقاصد تھے۔ اس کی یہ جھنجلاہٹ نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ذاتی مفاد کا حصول

اس کی زندگی کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"...... میں اس خیال کو ذہن سے نکال دینا پسند کروں گا۔ میں جہاز بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بہت سی چیزوں کے خواب دیکھوں لیکن میں کوشش کروں گا کہ یہ بیماری چھوٹ جائے۔"

وہ اس میں کامیاب رہا اور اپنی زندگی کو متحرک کرتا رہا۔

وہ ایک دن اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر پر اس کی نظر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔

"کراچی میں طیارہ سازی کا پلانٹ لگایا جائے گا۔ اور اگلے سال اس منصوبے پر عمل شروع ہو جائے گا۔"

اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ اب اس کے مستقبل کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

وہ کئی دن تک طیارہ سازی کے خواب دیکھتا رہا لیکن پھر اسے احساس ہونے لگا کہ طیارہ سازی بھی اس کی منزل نہیں۔ پھر وہ کیا کرے؟؟ ایک بے نام تنہائی تھی جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو زندگی کے رنگین گوشوں کی طرف دھکیل دیا۔ یہ رنگین گوشے خوب فلمیں دیکھنا اور اونچے والیوم میں گانے سننا تھے۔ شام کا وقت اسکول کے پلے گراؤنڈ میں گزرتا۔ وہ اچھا کھلاڑی نہیں تھا۔ یہ شامیں سوشل ایکٹیویٹی کے طور پر گزرتا تھا۔ رات ہوتی تو کچھ وقت بہنوں کے ساتھ علمی مباحثے میں گزر جاتا۔ پھر وہ اپنے خوابوں کو اوڑھ کر سو جاتا۔ اس کی پڑھنے کی عادت اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی اس لیے کسی پر ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ کتنا اداس ہے۔ یہ مباحثے کزنز کے ساتھ بھی ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنی ڈائری میں ان مباحثوں کی تفصیل لکھتا رہا۔

"آج ماموں سرور کے یہاں اس موضوع پر بحث ہوتی رہی کہ لڑکیاں عموماً کم عقل ہوتی ہیں۔ اکثر حساب کے مضمون میں بھی کمزور پائی جاتی ہیں۔ ہم بارہ بجے ماموں سرور کے گھر سے لوٹے۔ وقت خوب گزرا۔"

طیارہ ساز ایروناٹیکل انجینئر بننے کا خواب دیکھنا اس نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کیا کرے گا؟ یہ اضطراب اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس بے چینی سے نجات پانے کے لیے اس نے اپنے کزن شاہد کو ساتھ لیا اور کوئٹہ چلا گیا جہاں اس کے بہنوئی کیپٹن نصیر تعینات تھے۔ اس سفر کا مقصد بھی شاید یہی تھا کہ شاید کسی خواب کی تعبیر مل جائے۔ بھورے پہاڑوں میں گھرا ہوا کوئٹہ شہر اسے بہت اچھا لگا۔ چھاؤنی کا علاقہ شہر سے زیادہ خوبصورت تھا۔ صاف ستھری سڑکوں کے کنارے خوبصورت درخت قطار اندر قطار باہر کھڑے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی اس کی اداسی نے ایک فرحت بخش انگڑائی لی۔ وہ اسٹاف کالج کے میوزیم میں گیا اور جدید اسلحہ دیکھا تو اس کے خوابوں نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ بہنوئی کے فوجی دوستوں سے ملا۔ ان سے دفاع وطن کے موضوع پر خوب باتیں کرتا رہا۔ اس کے خواب اسے بار بار بیدار کرتے رہے کہ اسے بھی دفاع وطن کے لیے کچھ کرنا ہے۔ صرف طیارے بنانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وطن کا دفاع تو طیارے اڑانے سے ہو سکتا ہے۔ شہیدوں کے قصے اسے یاد تھے۔ وہ ذہنی طور پر تیار ہو رہا تھا کہ اس راہ میں وہ بھی شہید ہو سکتا ہے۔ یہاں رہ کر اس نے اپنا فوٹو گرافی کا شوق بھی خوب پورا کیا اور بہن بہنوئی کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں بھی دیکھیں۔

وہ کراچی لوٹا تو ہشاش بشاش تھا۔ اسکول کھل گئے۔ زندگی دوبارہ اپنی ڈگر پر آ گئی۔ ماموں سرور کے گھر اس کا آنا جانا بڑھ گیا تھا کیونکہ ایڈیشنل میتھس میں اپنی کمزوری دور کرنے کے لیے وہ شاہد سے پڑھنے کے لیے جانے لگا تھا۔ ایک دن وہ ماموں کے یہاں گیا تو اتفاق سے "اس لڑکی" کے گھر والے آئے ہوئے تھے۔ وہی لڑکی جسے اس نے کھیل کے دوران میں کرسی پیش کی تھی۔ ان لوگوں سے مل کر وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ جسے بھلائے ہوئے تھا وہ یاد آ گئی۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ وہ ایک مرتبہ پھر سوچنے لگا۔ میری منزل "اس" کے گھر تک ہے یا کچھ اور بھی ہے؟؟ اس رات گھر آنے کے بعد اس نے ڈائری میں لکھا۔

"ہم آج ماموں سرور کے گھر گئے۔ آج ان کے گھر میں مجھے کافی عجیب بات محسوس ہوئی اور مجھے خیال آیا کہ میں ایک بڑی غلطی کر بیٹھا ہوں اور اب میں اس کے لیے پچھتا رہا ہوں۔ آج میں نے اپنے دل میں پکا وعدہ کر لیا ہے کہ میں تینوں میں سے کسی ایک فوج میں جاؤں گا اور کہیں نہیں، چاہے کچھ ہو جائے۔"

امتحانات ختم ہو گئے۔ فراغت ہی فراغت تھی۔ اس کا کزن شاہد بھی سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر فارغ تھا۔ دونوں خوب گھوم پھر رہے تھے۔ ہل پارک ان کی سرگرمیوں کے لیے بہترین جگہ تھی۔ ایک دن نسیم بھائی نے اسے دیکھ لیا۔ غالباً ایک آدھ مرتبہ اور بھی دیکھا ہوگا۔ نسیم بھائی اس کی بڑی خالہ کے بیٹے تھے اور عمر میں اس سے میں

سال بڑے تھے اس لیے پورا حق رکھتے تھے کہ اس سے پوچھ گچھ کرتے۔

"میں کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں کہ تم یونہی بے کار گھوم پھر کر اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہو۔"

"بھائی جان کیا کروں۔ اسکول جانا ختم ہو گیا ہے۔ وقت ہی وقت ہے۔"

"اس وقت کو استعمال کیوں نہیں کرتے۔"

"کچھ کتابیں ہیں، گھر پر ان کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔"

"اس وقت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ کسی کالج میں داخلہ لے لو" انہوں نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے "تم کسی دن میرے دفتر آؤ۔ میں کسی کالج میں تمہارے داخلے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ ایک دن شاہد کو لے کر ان کے دفتر چلا گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نسیم بھائی ابھی آئے نہیں ہیں۔

"کیا خیال ہے کہیں بیٹھ کر چائے پی لیں۔ اس وقت تک نسیم بھائی بھی آ جائیں گے۔"

وہ دونوں اٹک روڈ پر ایک پٹھان کے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ چائے پینے کے دوران ہی اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا اور پھر جیسے وہ بے چین ہو گیا۔ کوئی قوت تھی جو اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

"یار شاہد۔ اس طرف مڑیں تو چند قدم کے فاصلے پر ایئر فورس سلیکشن اینڈ انفارمیشن سینٹر ہے۔"

"ہاں ہے۔ تو پھر"

"وہاں تک چلتے ہیں۔ مجھے ایک انفارمیشن لینی ہے۔"

"دیکھ لو۔ نسیم بھائی سے بھی ملنا ہے۔"

"بس یوں گئے اور یوں آئے" اس نے چائے کے کپ کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے چائے کے پیسے ادا کیے اور سینٹر کی طرف چل دیے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کمیشن کے لیے درخواستوں کی وصولیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ درخواست دے سکتا ہے۔

وہ ایسا خوش تھا کہ جیسے اس نے درخواست بھی دے دی اور اس کا سلیکشن بھی ہو گیا۔ نسیم بھائی سے ملنا بھی بھول گیا اور دوڑا دوڑا گھر چلا آیا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے ماں سے ذکر کیا۔

"بیٹا ابھی تو تمہارے سینئر کیمبرج کا رزلٹ بھی نہیں آیا۔"

"درخواست تو دے دیتا ہوں۔ اس وقت تک رزلٹ بھی آ جائے گا۔"

"میں تمہارے شوق سے واقف ہوں۔ تمہیں جہاز اڑانے کا شوق ہے تو پی آئی اے میں پائلٹ بن سکتے ہو۔"

"ٹرک ڈرائیور نہ بن جاؤں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعوں پر وہ یہی کہتا تھا۔ پھر اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی "بات صرف جہاز اڑانے کی نہیں ہے۔ میں دشمن سے لڑنا چاہتا ہوں۔ وطن کا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی میں ایڈونچر نہ ہو تو پھر زندگی ہی کیا۔ بے مقصد زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ میرا مشن ہی یہ ہے کہ میں دفاع وطن میں حصہ لوں۔ اس کے لیے فضائیہ مناسب ہے۔ مجھے امید ہے آپ مجھے وہاں جانے سے نہیں روکیں گی۔"

"میں تمہیں نہیں روکوں گی مگر تم اپنے ابو سے بھی بات کر لو۔"

"مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر میرے پاس کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ آپ پہلے انہیں اچھی طرح سمجھا دیں بلکہ راضی کر لیں پھر وہ مجھے بلا کر پوچھیں گے تو میں بات کر لوں گا۔"

اس کی ماں نے بیٹے کی یہ خواہش باپ تک پہنچا دی۔ مجید صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بیٹا میں تو تمہیں انجینئر بنانا چاہتا تھا۔"

"پہلے میں بھی یہی سوچا کرتا تھا لیکن اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کل کو یہ ارادہ بھی بدل دو گے۔"

"نہیں۔ یہ فیصلہ میں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں برسوں اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں تب اس فیصلے پر پہنچا ہوں۔"

"دیکھ لو اس میں خطرے ہی خطرے ہیں۔"

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ایڈونچر کے بغیر زندگی نہیں۔ آپ خود بھی زندگی بھر خطروں سے کھیلتے رہے ہیں۔ پھر مجھے کیوں روک رہے ہیں۔"

"میں تمہیں روک نہیں رہا ہوں۔ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اپنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح نہیں دے

اپنی جاں نذر کروں......

میجر محمد اکرم شہید 4 اپریل 1938ء کو ضلع گجرات کے قصبہ ڈنگہ میں پیدا ہوئے۔ 13 اکتوبر 1963ء کو وہ (سابق) مشرقی پاکستان میں متعین ہوئے اور میجر بننے پر انہیں فرنٹیئر رجمنٹ فورس کی کمان سونپی گئی۔ 1971ء کی جنگ چھڑنے کے وقت وہ ہلی محاذ کے اگلے علاقے میں جہاں ہندوستان نے زبردست اور مسلسل دباؤ ڈال رکھا تھا' اپنی کمپنی کی قیادت کررہے تھے۔ دشمن کی فضائیہ اس کے توپ خانے اور بکتر بند دستوں کو روکے رکھا اور اسے پاکستان کی سرزمین پر ایک انچ بھی آگے بڑھنے نہ دیا۔ ایک موقع پر تو دشمن بھرپور حملے کے ارادے سے پورے بریگیڈ کی نفری لے کر جس کے ہمراہ ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا اس کمپنی پر چڑھ آیا مگر تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے دشمن کی برتری کے باوجود میجر اکرم اور ان کے جیالے جوانوں نے دشمن کو نہ صرف دو مہینے تک وہیں روکے رکھا بلکہ بھاری جانی نقصان پہنچاتے ہوئے اس کے ہر حملے کو پسپا کیا۔ 24 دسمبر 1971ء کو نشان حیدر کے حق دار ٹھہرے۔

سکتا۔ تم نے ہماری کبھی کوئی بات نہیں ٹالی پھر میں تمہاری بات کیوں ٹالوں۔ تم شوق سے درخواست دے دو لیکن ایک شرط پر کہ اگر درخواست منظور نہ ہوئی تو پھر تمہارا دوسرا آپشن انجینئرنگ ہوگا۔"

"مجھے یقین ہے کہ میری درخواست نامنظور نہیں ہوگی۔"

اجازت ملتے ہی اس نے درخواست دے دی۔

سینئر کیمبرج کا رزلٹ آیا تو وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اس کا رزلٹ شاندار رہا تھا لیکن درخواست کا جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ اس نے ایس ایم سائنس کالج میں داخلہ لے لیا تاکہ پی اے ایف کی جانب سے درخواست کا جواب آنے تک اس کا وقت ضائع نہ ہو۔

مجید صاحب ریٹائر ہوگئے اور یہ خاندان اپنے ذاتی بنگلے منہاس ولا میں منتقل ہوگیا۔

اس نے ایس ایم کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسے خوشی ہورہی تھی کہ کالج میں اردو کا مضمون بھی نصاب میں داخل ہے۔ اب وہ اپنی کمزور اردو کو درست کرلے گا لیکن اسے یہ موقع نہ مل سکا اور فضائیہ کی جانب سے انٹرویو کال آگئی۔

اس نے انٹرویو دیا۔ انٹیلی جینس ٹیسٹ کے علاوہ میڈیکل بھی ہوا۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد اسے اس قابل سمجھا گیا کہ وہ انٹر سروسز سلیکشن بورڈ (آئی ایس ایس بی) کا سامنا کرنے کوہاٹ جائے۔ وہاں دوبارہ انٹرویو ہوا۔ آئی کیو اور جسمانی اہلیت کے علاوہ قائدانہ صلاحیتیں بھی جانچی گئیں اور پھر بورڈ کے سامنے پیش ہونے والے دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسے بھی واپس کراچی بھیج دیا گیا جہاں ماری پور بیس پر ان کا طبی معائنہ ہوا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا جو اسے طے کرنا تھا۔ اس طبی معائنے کا معیار بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ اپنی مختصر سی عمر میں تین بار ٹائیفائیڈ کا شکار ہو چکا تھا، جسمانی اعتبار سے بھی دبلا پتلا تھا۔ اس کی والدہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں اس سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ وہ طبی معیار پر پورا نہیں اترا۔ راشد کو یہ سن کر کتنا دھچکا لگے گا۔ وہ بچپن سے یہ تمنا لیے بیٹھا ہے کہ وہ فضائیہ میں جائے گا۔ اے اللہ! اس کی تمنا پوری کر۔

محکمے نے اسے گھر بھیج دیا کہ مکمل نتائج گھر کے پتے پر ارسال کردیے جائیں گے۔

وہ نتائج آنے کے انتظار میں دن گننے لگا۔ پھر ایک دن اس کی بے پناہ خوشی نے اس کی آنکھوں کو نم کردیا۔ خوشی کے احساس سے تھرتھر کانپنے لگا۔ وہ کیڈٹ منتخب ہوگیا تھا اور اب اسے رسالپور جانا تھا جہاں ایک اور ٹیسٹ سے گزرنے کے بعد یہ طے ہونا تھا کہ اسے کس گریڈ میں رکھا جائے۔

وہ پی اے ایف اکیڈمی رسالپور پہنچ گیا جہاں تربیت سے پہلے کامیاب ہونے والے نئے کیڈٹوں کا ٹیسٹ لے کر ان کی درجہ بندی کی جاتی تھی کہ کون کس قابل ہے۔ وہ کیڈٹ بھی بلائے گئے جو سینئر تھے۔

اسے اس کے کزن نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ یہ جو سینئر کیڈٹ ہوتے ہیں اپنے جونیئرز کے ساتھ نہایت سخت رویہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان سے بچ کر رہنا۔ ان کے ہاتھ میں اپنی کوئی کمزوری نہ دینا ورنہ بڑی درگت بنے گی وہ ایسا رگڑا دیں گے کہ یاد رکھوگے۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سینئرز کو وہاں دیکھ کر وہ سہم گیا تھا لیکن بہت جلد اپنی اصل حالت پر لوٹ آنے کی اسے عادت تھی۔ وہ پھر

سے نارمل ہو گیا اور اکیڈمی کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں ایئر فیلڈ موجود تھی۔ طیارے تھے۔ اسے یہاں چار ہفتے مسلسل قیام کرنا تھا۔ وہ گھر والوں کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

"یہاں مجھ کو پاس ہونے کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی اس لیے شاید آپ کو اتنے خط نہ لکھ سکوں۔"

اب انھیں ایک ہفتہ خصوصی کلاسوں میں جہاز کی ساخت اور مشینری کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں اور پھر دس پندرہ گھنٹے کی اڑان کا دورانیہ چھوٹے چھوٹے وقفوں میں پورا کرنا تھا۔

وہ سمجھتا تھا جہاز کی ساخت اور مشینری کے بارے میں جاننے کے لیے اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی لیکن اس کا یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہو گیا۔ اس نے بچپن سے اب تک جہازوں کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، عملی تیاری اس سے کہیں زیادہ دشوار تھی۔ اسکی سیکڑوں اصطلاحات تھیں جن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ اس نے سخت محنت کی اور جب ایک ہفتے بعد امتحان ہوا تو وہ تمام لڑکوں سے بازی لے گیا۔

اب پروگرام کے مطابق فلائنگ کا آغاز کرنا تھا لیکن موسم کے تیور بدل گئے اور یہ پروگرام کچھ دنوں کے لیے تاخیر کا شکار ہو گیا۔ تمام لڑکے فلائنگ لائن کے پاس جاتے اور دن بھر وہیں پھرتے رہتے۔

اس نے ابھی تک کیڈٹ کٹ بال نہیں کٹوائے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ فیل ہو گیا تو خواہ مخواہ کراچی جا کر بندر بن کر گھومنا پڑے گا اور اگر پاس ہو گیا تو ہمیشہ پائلٹ کٹ رہنا پڑے گا لہٰذا کچھ دن عیش کے ہیں وہ کر لے۔ جونیئرز چونکہ ابھی تک منتخب نہیں ہوئے تھے اس لیے انھیں بہت سی رعایتیں حاصل تھیں۔ اس لیے بھی کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن ایک روز وہ ایک سینئر کے ہتھے چڑھ گیا۔

"ارے ابھی تک تم نے بال نہیں کٹوائے۔"

"میں ابھی منتخب نہیں ہوا ہوں۔ اس لیے میری مرضی۔"

"یہاں تمہاری نہیں ہماری مرضی چلتی ہے۔"

"جب تک میں منتخب نہیں ہو جاتا۔ تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔ تم مجھے وارننگ دے سکتے ہو سزا نہیں۔"

"یہ تم ابھی دیکھ لوگے۔"

کئی سینئرز زبردستی اسے حجام کے پاس لے گئے۔ وہاں سے وہ اس ہیئت میں اپنے کمرے تک واپس آیا کہ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ اس کا روم میٹ طارق اچھل پڑا۔

"یو آر جسٹ لکنگ لائک اے منکی۔"

"اڑا لو میرا مذاق۔ جب تم بھی سینئر کے ہتھے چڑھو گے تب پوچھوں گا۔"

"بیٹا یہ طارق ہے طارق۔ میرا سینئر کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

دوسرے ہی دن طارق ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہا تھا۔ ایک سینئر نے اسے دیکھ لیا۔ وہیں سے پکڑ کر حجام کے پاس بھیج دیا۔ کھانا بھی ادھورا رہ گیا اور بال بھی آدھے چلے گئے۔

راشد کھانا کھانے کے بعد کمرے میں آیا تو طارق کو بندر بنا بیٹھا دیکھا۔

"کیوں طارق صاحب۔ تم تو طارق تھے۔ تمہارا سینئر کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ پھر یہ کیا ہو گیا۔"

"یار اگر ہم کامیاب ہو گئے تو سینئر کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ بس یہ سوچ کر چپ ہو گیا۔"

"ویسے ایک بات ہے تم مجھ سے بڑے بندر لگ رہے ہو۔"

دونوں کے قہقہوں سے کمرا گونجنے لگا۔

فلائنگ ٹیسٹ کا آغاز ہوا۔ طیارہ انسٹرکٹر ہی چلاتا تھا اور امیدوار لڑکوں کو یہ ثابت کرنا ہوتا تھا کہ وہ ہوا کے دباؤ کو برداشت کر سکتے ہیں۔ نئے لڑکوں کے لیے اس دباؤ کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ راشد کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔

تمام مراحل مکمل ہونے کے بعد انھیں واپس بھیج دیا گیا۔ راشد بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ واپس کراچی آ گیا۔

اب اسے حتمی بلاوے کا انتظار تھا۔

گھر پہنچ کر اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں تھا۔ زیادہ تر وقت فلمیں دیکھنے اور مطالعہ میں گزرتا تھا۔ اس کے پاس ڈائری لکھنے کے لیے بھی بہت وقت تھا۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر اداس بھی ہو جاتا تھا کہ اگر فیل ہو گیا تو کیا ہوگا لیکن عادت کے مطابق جلد ہی اپنی اصل حالت پر لوٹ آتا تھا۔

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یقینی اور بے یقینی کے یہ دن بھی گزر گئے اور حتمی بلاوا آ گیا۔ اس کا نام تربیت حاصل کرنے والوں میں شامل کیا جا چکا تھا۔ اسے "لوئر ٹوپہ" جا کر ایک سال کی تربیت حاصل کرنی تھی۔ پھر رسالپور جا کر تیسری، چوتھی اور پانچویں ٹرم کے امتحانات دینے تھے۔ پھر کہیں جا کر اسے بی ایس سی کی ڈگری اور فضائیہ کی گریجویشن کا اعزاز ملتا اور وہ پائلٹ افسر بنتا۔ اسے اپنی قابلیت پر پورا اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کا خواب پورا ہو جائے گا۔

لوئر ٹوپہ پہنچتے ہی اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ گرد و پیش میں پہاڑی جنگل کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ افق پر کشمیر کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور تک بے شمار ندی نالے اور پہاڑی چشمے بکھرے نظر آتے تھے۔ ان دنوں بارشیں ہو رہی تھیں، لہٰذا تمام ندی نالے جولانی پر تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں کیڈٹوں کا ابتدائی ٹریننگ مرکز قائم کیا گیا تھا۔

وہ نہ جانے کب تک ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا لیکن جلد ہی نئے کیڈٹوں کو سینئروں نے آ دبوچا۔ کیڈٹوں کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بکس تھے۔

" اپنے اپنے بکس سروں پر رکھ لو اور فراگ جمپ (مینڈک کی طرح اچھلتے ہوئے) لگاتے ہوئے سامنے والی پہاڑی پر چڑھو۔"

ان سب نے حکم پر عمل کیا۔ راشد نے بھی اپنا بکس اپنے سر پر رکھا اور فراگ جمپ لگاتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا، یہ تقریباً 72 زینے تھے جنھیں طے کر کے اوپر پہنچنا تھا۔ وہ اوپر پہنچتے پہنچتے کئی مرتبہ گرا اور اچھی طرح کیچڑ میں لت پت ہوا۔ یہی حال دوسرے کیڈٹوں کا بھی تھا۔ سینئرز بھی ان کے ساتھ اوپر آئے اور ان سے کئی دردناک مشقتیں کرائیں۔ بقول شخصے جوڑ جوڑ ڈھیلا کر دیا۔

اللہ اللہ کر کے سینئرز سے جان چھوٹی تھکن سے برا حال تھا اب اس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو جایا جائے۔ کمرے میں پہنچ کر اس میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ کپڑے تبدیل کیے جاتے۔ صرف جوتے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ بدن کا ایک ایک جوڑ درد کر رہا تھا۔ برابر والے پلنگ پر اس کا روم میٹ طارق لیٹا تھا۔

"طارق۔"

"ہوں۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ سینئرز رات کسی وقت دوبارہ آ جائیں اور ہمیں دوبارہ رگڑا دیں، ابھی ان کا دل بھرا نہیں ہوگا۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔"

"تو بھائی تمہاری تم جانو۔ میں تو پلنگ کے نیچے سونے جا رہا ہوں تاکہ سینئرز آئیں تو خالی پلنگ دیکھیں۔ میری جان تو بچ جائے گی۔"

طارق سمجھا تھا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن راشد سچ مچ پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ بستر جیسی نیند ننگے فرش پر کہاں آنے والی تھی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند آنکھوں میں چبھ رہی تھی لیکن فرش سونے نہیں دیتا تھا۔ بالآخر رہا نہیں گیا۔ وہ دوبارہ بستر پر آ گیا۔

لوئر ٹوپہ میں یہ اس کا پہلا دن تھا جو نہایت تھکا دینے والا ثابت ہوا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو تمام لڑکوں کو دو اسکواڈرنوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ طارق سے اس کا ساتھ چھوٹ گیا کیونکہ طارق اسکواڈرن نمبر 1 میں تھا لہٰذا اسے دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔

اس کے بعد انٹری ٹیسٹ بھی دینا پڑا جس سے ان کی اہلیت کا اندازہ لگانا مقصود تھا۔ راشد نے اس ٹیسٹ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

پہلی ٹرم کا آغاز ہوا۔ اس ٹرم میں انھیں جسمانی طور پر مضبوط کرنا تھا۔ اس کے لیے ڈرل کے علاوہ شام کے وقت پی ٹی بھی ہوتی تھی۔

ڈرل بہت سخت مرحلہ تھا۔ اگر کسی کیڈٹ کی آنکھ کی پتلیاں بھی ہل جاتیں تو اسے پکڑ لیا جاتا اور سزا کے طور پر اسے تین میل دوڑنا پڑتا تھا۔ راشد اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔ اس کی بچپن کی کمزوری ابھی تک برقرار تھی یعنی وہ اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ اسے ڈرل سارجنٹ کی حرکات و سکنات پر اکثر ہنسی آ جاتی تھی۔ اسے تقریباً روز سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ سینئرز کو اس کی کمزوری معلوم ہو گئی تھی اس لیے اس پر خاص طور پر نظر رکھی جاتی تھی اور وہ پکڑا جاتا تھا۔ شامت تو اس وقت آتی جب سزا کے بعد اسے دوبارہ قطار میں کھڑا کر دیا جاتا اور حکم دیا جاتا کہ اب سب خاموش رہیں گے اور کوئی نہیں مسکرائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پہلے اس کی آنکھیں چمکتیں اور پھر ایک جاندار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی اور وہ پھر سزا کا

مستحق قرار پاتا۔

معائنہ بھی ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ رومال، جوتے، قمیص غرض ہر شے اس کی زد میں آ جاتی۔ رومال پر ذرا سی بھی مٹی ہوتی تو بس شامت آ جاتی۔ کالر ذرا سا میلا ہوتا تو انگلی ڈال کر بٹن توڑ دیا جاتا۔ شیونگ برش اچھی طرح دھلا ہوا ہو۔ سیفٹی ریزر میں ایک بال بھی نظر نہ آئے۔ راشد البتہ ان بکھیڑوں سے آزاد تھا کیونکہ راشد کے ابھی شیو نہیں آئی تھی مگر وہ یہ سوچتا ضرور تھا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

تفریحات کے مواقع بھی نکلتے رہتے تھے لیکن تکلفات یہاں بھی تھے جسے راشد پسند نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر سینئرز کی برتری اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن وہ ان کی حکم عدولی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ اس سخت گیر ماحول کا عادی ہوتا گیا۔

برسات شروع ہوئی تو انہیں کچھ آرام مل گیا۔ یہ عرصہ خوب ہلے گلے میں گزارا۔ البتہ فرصت ہوتی تو گھر بہت یاد آنے لگتا جسے وہ تلخ یادوں کی طرح ذہن سے جھٹکنے لگتا۔ اکیلے میں خوب ہنستا اور اپنا دل خود بہلاتا رہتا۔

اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہ اس کی پہلی ذاتی کمائی تھی اور بڑی محنت کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس میں سے کچھ پیسے بچا کر اپنے گھر بھیجے گا لیکن MESS (میس) کا بل اتنا ہو گیا تھا کہ بل ادا کرنے کے بعد گھر بھیجنے کے لیے پیسے باقی نہ بچے۔

جیسے جیسے وہ پرانا ہوتا جا رہا تھا سینئرز کے رگڑوں کی شدت میں کمی آنے لگی تھی۔ شام کے وقت باہر جانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ وہ ساتھیوں کے ساتھ گھومنے نکل جاتا تھا۔

مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے، ان میں جسمانی ٹیسٹ بھی تھے اور تعلیمی بھی۔ اس کی کارکردگی شاندار رہی۔ وہ گاہے گاہے پنڈی جا کر رشتہ داروں سے بھی مل آتا تھا۔

اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ لاہور آ رہی ہیں۔ ٹریننگ ونگ میں دو دن کی چھٹی بھی تھی لہٰذا وہ جا سکتا تھا۔ فضائی سفر کا انتظام بھی ہو گیا لہٰذا وہ لاہور پہنچ گیا۔ والدہ سے بہت دنوں بعد مل رہا تھا۔ ان کا دل بڑھانے کے لیے اپنی کامیابیوں کے قصے سناتا رہا۔

وہ صرف دو دن کے لیے آیا تھا۔ یہ دو دن یوں گزر گئے کہ پتا ہی نہ چلا اور وہ ٹریننگ ونگ واپس آ گیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

انہی دنوں سینئرز کورس اپنی ٹرم پوری کر کے رسالپور چلا گیا۔ ان کی جگہ نئے کیڈٹ آ گئے۔ اب نئے آنے والے جونیئرز ہو گئے اور راشد اور اس کے ساتھی سینئرز ہو گئے۔

سینئر ہو جانے کے بعد راشد کو نئی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کے ہنسنے مسکرانے کی عادت ابھی تک قابو میں نہیں آئی تھی۔ جس وقت وہ اپنے جونیئرز کو رگڑا دے رہا ہوتا تھا اچانک اس کی ہنسی نکل جاتی۔ اس کے ساتھی بے حد جھلاتے تھے۔ اور پھر یہ ہوا کہ رگڑا دیتے وقت راشد کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔

راشد نے مشکلات پر قابو پا لیا تھا لیکن یہ احساس اسے ستاتا رہتا تھا کہ وہ اب بھی کم عمر نظر آتا ہے کیونکہ اس کے چہرے پر رواں تو آ گیا تھا شیو نہیں آیا تھا۔ اس نے گھبرا کر شیو کرنا شروع کر دیا تاکہ جلدی بال نکل آئیں لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ رواں بھی صاف ہو گیا البتہ چہرہ کم عمر نظر آنے لگا۔ وہ پھر بھی شیو کرتا رہا۔

پہلی ٹرم ختم ہوئی تو وہ چھٹیاں گزارنے کراچی آ گیا۔ پانچ ماہ بعد اپنے گھر میں قدم رکھتے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ کامیابی کا نشہ بھی تھا اور اپنے بڑے ہونے کا احساس بھی۔ گھر کی ہر چیز بھی بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ جس طرح کی زندگی وہ گزار کر آ رہا تھا وہ گھر کی زندگی سے مختلف تھی۔ اس کے دوسرے بھائی اسے غیر مستعد اور ڈھیلے ڈھالے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ سینئر بن کر انہیں رگڑا دیتا۔

عزیز و اقارب اسے پہلے سے زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اب اس کی باتوں کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس سے کیڈٹ لائف کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے اور جو کچھ وہ بتا رہا ہے اسے سب غور سے سن رہے ہیں۔ کوئی اس کا مذاق نہیں اڑا رہا ہے۔

چھ ہفتوں کی چھٹیاں پلک جھپکتے گزر گئیں اور وہ دوبارہ لوئر ٹوپہ پہنچ گیا۔

اب وہ اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا۔

اسے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا لیکن پھر بھی مطالعے کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو خط لکھا۔

"کچھ عرصے سے میں خاصے متنوع موضوعات کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔ میں اب کہانی کے طور پر نہیں پڑھتا جیسے میں پہلے کیا کرتا تھا۔ بلکہ اب میں ذہنی

قابلیت بڑھانے کے لیے پڑھتا ہوں۔ میں اسلام کے بارے میں پڑھنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا ان چیزوں پر کیسے ایمان ہوگا جن کے بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔ ادبیات میں پہلے ہی ڈھیروں روسی ادیبوں کو پڑھ چکا ہوں......"

سیکنڈ ٹرم میں وہ تقریباً ہر مہینے ایک تعلیمی دورے کے لیے راولپنڈی جاتے تھے۔ اس مہینے وہ چھانگا گلی پہنچے۔ کیمپ میں پہنچتے ہی انہیں چھ چھ لڑکوں میں بانٹ دیا گیا۔ رات کے وقت ہر کیڈٹ جاگ کر دو تین گھنٹے پہرا دیتا۔ انہی جنگلوں میں زندہ رہنے کے گُر بتائے جاتے تھے۔ اندھیرے میں پیش قدمی کرنا‘ کہنیوں کے بل رینگ کر آگے بڑھنا‘ اسلحہ استعمال کرنے کا طریقہ۔

جنگلوں میں سانپ بھی موجود تھے لہٰذا انہیں حفاظتی خندقیں کھودنا پڑیں۔ پہاڑی علاقوں کو کھودنا اتنا دشوار تھا کہ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتے تو ہاتھ اٹھانے کی سکت بھی باقی نہ رہتی۔

جب یہ دوسری ٹرم بھی مکمل ہوئی تو وہ ایک مہینے کی تعطیلات گزارنے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہیں رسالپور جانا تھا۔

اس مرتبہ گھر پہنچا تو اسے اتفاق سے اس "لڑکی" سے ملاقات کا موقع ملا جس نے تین برس پہلے راشد کی تعریف کی تھی۔ اسے یہ بھی موقع مل گیا کہ وہ اس لڑکی کو فون کرے۔ اس کے دونوں بھائی راحت اور انجم اس کے پاس بیٹھے تھے اور وہ اس لڑکی کو فون کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"راحت ذرا چائے تو بناؤ۔"

"بھائی جان میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔"

"جو کہا جا رہا ہے وہ کرو اور انجم کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔"

ان کے جاتے ہی اس نے ریسیور اٹھایا۔ شاید وہی فون اٹھائے۔ اس نے دل میں سوچا اور نمبر ملایا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ فون اسی نے اٹھایا۔

وہ ابھی بات کر ہی رہا تھا کہ دونوں بھائی خاموشی سے اندر آ گئے اور غالباً کچھ باتیں انہوں نے سن بھی لی تھیں اور انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس کو فون کر رہا ہے۔ یہ ان دونوں بھائیوں کی مسکراہٹ سے ظاہر ہو رہا تھا۔

''یار کسی کو بتانا نہیں۔" راشد نے گھبرا کر بھائیوں سے کہا۔

''ریسیور رکھ کر وہ خاصا مطمئن ہو گیا۔ وہ خوش تھا کیونکہ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے جس کی پروا ہے اس کا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہے۔

9 اگست 1969ء کو راشد نے زندگی میں دوسری مرتبہ رسالپور اکیڈمی میں قدم رکھا۔ یہاں جہاز تو تھے لیکن اسے افسوس یہ تھا کہ تیسری ٹرم میں فلائنگ شامل نہیں تھی۔ پھر بھی وہ جہازوں کو دیکھ کر بہل سکتا تھا۔

تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اردو کا مضمون نصاب سے خارج کر دیا گیا مگر فلائنگ سے متعلق بے شمار مضامین کا اضافہ ہو گیا تھا۔ الیکٹرانکس ان میں دشوار ترین تھا لیکن دلچسپ تھا یا راشد کو اس میں دلچسپی تھی۔

ہوائی جہاز اس کے سامنے اُڑتے تھے لیکن وہ ان سے محروم تھا۔ یہ بہت بڑی محرومی تھی۔ کب اسے جہاز اڑانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اس کے لیے بوجھل انتظار کی طرح تھا۔ وہ سخت اداس رہنے لگا تھا۔

اداسی کی دیوار میں ایک دن اچانک دراڑ پڑ گئی۔ اسے چند ساتھیوں کے ساتھ ٹی 37 جیٹ تربیتی طیارے کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ ان طیاروں پر صرف غیر ملکی سینئر کیڈٹوں کو ان پر تربیت دی جاتی تھی لیکن یہ افواہ بھی گرم تھی کہ آئندہ پاکستانی کیڈٹوں کو بھی ان پر تربیت دی جایا کرے گی۔ یہ پاکستانی وہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں ایک نئی امنگ محسوس کی۔ اداسی کی برف یکسر پگھل گئی۔ اس نے اسی روز اپنی بہن کے نام خط لکھا۔

"اگر کچھ پاکستانیوں کو یہ موقع ملا تو میں اس بات کو یقینی بنا کر رہوں گا کہ میں ان میں شامل ہوں۔ کم از کم اگر یہ امتحان نصابی قابلیت کی بنا پر ہو۔"

وہ اپنی قابلیت بڑھاتا جا رہا تھا۔ تیراکی کے مقابلے ہوئے تو اس نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ الیکٹرانکس میں اسے نمبر ون تسلیم کیا گیا۔

اپنے چھوٹے بھائیوں کو پابندی سے خط لکھتا رہتا تھا جو نصیحتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس سے اسے یک گونہ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ اب واقعی بڑا ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں انہیں نصیحت کرتا رہا۔

اس کے بھائی ان خطوں کو وصول کرکے بے دلی سے پڑھ بھی لیتے۔ نصیحتوں سے کون خوش ہوتا ہے۔ بارہ تیرہ

سال کے بچے کیسے خوش ہو سکتے تھے۔ پڑھ کر اِدھر اُدھر ڈال دیتے تھے۔ بڑے اس لیے خوش ہو جاتے تھے کہ ان کا بیٹا انھیں بھولا نہیں ہے۔ اتنی مصروفیات میں بھی انھیں یاد رکھتا ہے۔ ان خطوں سے انھیں یہ تسلّی بھی ہوتی تھی کہ ان کا بیٹا ان کا نام روشن کر رہا ہے۔ اس کی ماں نے اسے ایک خط میں لکھا تھا۔

"بیٹے! اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھو اور پوری ایمانداری سے کام کرو تو مایوسی تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکے گی اور جس شوق سے تم ایئر فورس میں گئے ہو، مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے فضل و کرم سے اتنا ہی اعلیٰ اور کامیاب افسر بنائے گا جس پر پورا خاندان ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان فخر کرے گا۔"

یہی نصیحتیں وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو کر رہا تھا۔

"ایک ایسا انسان بنو کہ لوگ تم پر فخر کریں۔ رفیقی' میجر عزیز بھٹی یا پھر قائداعظم کی طرح تم پر فخر کر سکیں۔"

جو کچھ وہ اپنے لیے سوچ رہا تھا دراصل وہی اپنے بھائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ وہ اس سے چھوٹے تھے اور بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے انھیں سمجھانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ جو صفات خود اس میں تھیں وہی اپنے چھوٹوں میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

"مجھے یقین ہے کبھی خود غرضی یا اوچھے پن کا مظاہرہ مت کرو۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کبھی مکاری سے کام مت لو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی اس خوبی سے محروم مت ہونا جو تم دونوں میں موجود ہے یعنی دو ٹوک ہونے کی صفت۔ اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے تو ہوتی ہوگی۔ بھلا کوئی تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے لیکن اگر تمھیں اس پر شرمندگی کا احساس ہو جائے تو اس کا اظہار بھی کرو اور معافی مانگ لو۔"

اس وقت ان خطوں کی اہمیت کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ صرف یہ خط ہی رہ جائیں گے۔

دس جنوری 1970ء کو تیسری ٹرم کا بھی اختتام ہوا۔

اس مرتبہ اسے صرف دس دن کی چھٹی ملی تھی۔ یہ دس دن اس نے بڑے بھائی کی حیثیت سے کراچی میں گزارے اور چھوٹے بھائیوں کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتا رہا۔

فورتھ ٹرم میں فلائنگ بھی شروع ہونے والی تھی۔

راشد کو اس کمزوری کا شدت سے احساس تھا بلکہ یوں کہاں جائے کہ بچپن سے احساس تھا۔

وہ فلائنگ کو آسان سمجھ رہا تھا لیکن یہ اتنی آسان ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے لیے پڑھائی کو پس پشت ڈال کر ساری توجہ ہوا بازی پر مرکوز کرنی پڑی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض کیڈٹوں کو نااہل قرار دے کر فضائیہ سے رخصت کیا جا رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ اتنے مراحل طے کرنے کے بعد کسی کو نااہل قرار دے دیا جائے۔ اسے خود پر اعتماد تھا لیکن پھر بھی وہ کانپ اٹھا۔ اگر وہ اس مرحلے پر گھر چلا گیا تو کس منہ سے جائے گا۔ یہ پروازیں انسٹرکٹر کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس لیے خوف کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ بعض عوارض ایسے تھے جن سے قوتِ ارادی ہی سے قابو پایا جا سکتا تھا۔ وہ پہلے دن تربیت کے لیے روانہ ہوا اور جہاز نے ٹیک آف کیا تو اسے چکر آ گیا۔ ہلکے پن کا احساس ہونے لگا۔ تیزی سے کوئی چیز زمین سے آسمان کی طرف جائے تو اس کیفیت کا ہونا لازمی ہے۔ بعد میں پائلٹ اس کا عادی ہو جاتا ہے لیکن نئے پائلٹ کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس کیفیت پر وہ کتنی جلدی قابو پا لیتا ہے یا چکر آنے کی شدت کتنی ہے۔ راشد کا سر چکرایا ضرور لیکن یہ کیفیت اس کے قابو سے باہر نہیں ہوئی اور وہ انسٹرکٹر کے منفی ریمارکس سے بچا رہا۔ آخر آٹھ دس منٹ کی چند پروازوں کے بعد اس نے اس کیفیت پر قابو پا لیا۔

فلائنگ کے دوران میں الٹے ہو جانا بھی نااہلی کا بڑا سبب تھا۔ بعض کیڈٹ اپنی اس کمزوری پر قابو نہ پا سکے اور نااہل ہو گئے۔ راشد نے اس سے بچنے کے لیے یہ ترکیب وضع کی کہ پرواز کے وقت خالی پیٹ رہنے لگا حالانکہ انسٹرکٹر کی ہدایت تھی کہ کوئی کیڈٹ خالی پیٹ پرواز پر نہ جائے۔

مختلف اوقات میں 180 گھنٹے فلائنگ کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد انھیں "سولو" یعنی تنہا پرواز کی اجازت مل گئی۔

وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا جب اسے پہلی مرتبہ تنہا پرواز کے لیے روانہ ہونا تھا۔ انسٹرکٹر کی موجودگی کے بغیر وہ اکیلا جہاز اڑائے گا۔ یہ خیال ہی اسے خوش کرنے کے لیے بہت تھا۔ دوسرے کیڈٹوں کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ پہلی مرتبہ جب تنہا پرواز کی جاتی ہے تو سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عقل بھی یہی کہتی تھی کہ کچھ نہ کچھ گھبراہٹ ضرور ہوتی ہوگی لیکن اسے ذرا بھی ڈر محسوس نہیں ہوا۔ ہدایت کے

مطابق آٹھ دس منٹ فضا میں رہنے کے بعد اسے نیچے آنا پڑا۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی پروازوں کے بعد اسے پورے ایئربیس کا چکر لگانے کا موقع دیا گیا۔ اسے "سرکٹ" کہتے تھے۔

جب وہ سیدھی سیدھی کئی پروازیں کر چکا تو اسے مختلف کرتب سکھائے گئے۔ یہ بھی تربیت کا حصہ تھا۔ کس طرح جہاز کو قلابازی کھلائی ہے۔ چلتے چلتے کس طرح ایک طرف کو مڑ جانا ہے۔ کس طرح نیچے آنا ہے، کس طرح اچانک اوپر چلے جانا ہے۔

فورتھ ٹرم ختم ہو چکی تھی۔ گویا اب منزل بہت قریب آ گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ اسے ڈیڑھ ماہ کی رخصت ملی تھی۔

اس مرتبہ زیادہ دن رہنا تھا اس لیے اس نے رسالپور کی یاد تازہ کرنے کے لیے فوج اور فضائیہ کے نامور سپاہیوں کی تصویریں اس کمرے کی دیواروں پر چسپاں کر دیں جو تینوں بھائیوں کا مشترکہ کمرا تھا۔ اس کی والدہ نے دیکھا تو بہت خفا ہوئیں۔

"راشد! کوئی دیواروں پر تصویریں چپکاتا ہے۔ اب انہیں اکھاڑو گے تو سب پینٹ خراب ہو جائے گا۔ تمہارا بچپن ابھی گیا نہیں ہے۔ یہ تمہیں آخر سوجھی کیا تھی۔"

"امی جان یہ میں نے بلاوجہ نہیں کیا ہے۔ یہ میں نے راحت اور انجم کے لیے کیا ہے۔ یہ دونوں کھیل کود میں پڑے رہتے ہیں ان تصویروں کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں بہادری کے کام کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔"

وہ جب یہاں تھا تو اپنی بہنوں فرزانہ اور رخسانہ پر اپنی علمیت کا رعب ڈالنے کے لیے ان سے جھگڑتا رہتا تھا۔ اس مرتبہ وہ آیا تو اس میں یہ تبدیلی آئی کہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے لگا۔ اسے یہ احساس شدت سے ہونے لگا کہ بہت جلد یہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں گی۔ یہ تو مہمان ہیں ان سے کیا لڑنا۔ مجھے تو ان کی شادیوں کے لیے بہت سارا روپیا کمانا ہوگا۔ ابو کا بوجھ ہلکا کرنا ہوگا۔ اس دورے میں وہ اکثر ماں کے پاس بیٹھ کر فرزانہ اور رخسانہ کی شادی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔

اس نے ایک دن باتوں باتوں میں والدہ کے سامنے "اس لڑکی" کا ذکر چھیڑ دیا۔ "اس لڑکی" کے گھر والے راشد کی والدہ کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ان گھرانوں کا عرصے سے آپس میں ملنا جلنا تھا لیکن والدہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ راشد اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔

"تم اسے کب سے پسند کرنے لگے ہو۔"

"ایک تقریب میں اس نے میری تعریف کی تھی اور مجھے اہمیت دی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کوئی مجھے اہمیت نہیں دیتا تھا۔"

"بس اتنی سی بات پر تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہوگی۔ اس نے رسماً تمہاری تعریف کر دی ہوگی۔"

"نہیں امی جان وہ جب بھی ملی ہے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھی ہے۔"

"یہ تمہارا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جو ممکن ہے غلط ہو۔"

"میرا اندازہ غلط ہو سکتا ہے لیکن میں غلط نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لیے ایک مناسب لڑکی رہے گی۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو راشد؟"

"میں ہر وقت مذاق نہیں کرتا۔"

"تم ابھی ٹریننگ پر ہو راشد۔ تم یہ خواب ابھی سے دیکھنے لگے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"مجھے جلدی نہیں ہے۔ شادی تو میں فضائیہ کا افسر بننے کے بعد کروں گا۔ ابھی آپ لوگ کوئی بات وات تو کر سکتے ہیں ورنہ اس کی شادی کہیں اور ہو جائے گی۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔ لڑکی تو وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔"

اس وقت اتنی ہی بات ہو سکتی تھی۔ راشد نے ضد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں بڑوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع دینا چاہیے۔

اس کی والدہ نے مجید صاحب سے تذکرہ کیا۔ اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آ گئی۔

"اس عمر میں سارے لڑکے اسی طرح سوچتے ہیں۔ یہ کم عمری کا جنون ہے اور کچھ نہیں۔"

"وہ بہت سنجیدہ ہے۔"

"گھر پر خالی بیٹھا ہے اس لیے سنجیدہ ہے۔ ٹریننگ پر جائے گا تو سب بھول جائے گا۔"

"آپ اسے جانتے ہیں۔ جس بات کی ٹھان لیتا ہے ضرور کرتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ہمارا فرماں بردار ہے۔"

"پھر بھی اس کی خوشی اگر پوری کر دی جائے۔"

"میں نے کب انکار کیا لیکن اسے کسی قابل تو ہونے

www.paksociety.com www.paksociety.com

دو۔"

"وہ کہہ رہا ہے بات پکی کر لی جائے۔ شادی بعد میں ہو جائے گی۔"

"یہ قبل از وقت ہوگا۔ اگر وہ کسی قابل ہو گیا اور پھر اس کا معیار بدل گیا تو ہم خواہ مخواہ چھوٹے پڑیں گے۔ وہ اپنی ٹریننگ مکمل کر کے گھر آ جائے پھر دیکھا جائے گا۔"

اس کے گھر والوں نے اس کی سنجیدگی کو کم عمری کا جنون سمجھا اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ وہ پھر بھی مطمئن تھا کہ گھر والوں نے اس لڑکی کو ناپسند نہیں کیا تھا۔ وہ جب آفیسر بن جائے گا تو پھر اس قصے کو اٹھائے گا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ پانچویں ٹرم پوری کرنے کے لیے رسالپور پہنچ گیا۔

اس ٹرم میں زیادہ تر وقت فلائنگ میں گزرتا تھا۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ کچھ سوچنے یا خط لکھنے کا وقت کم ہی ملتا تھا۔

1970ء کے آخری مہینے چل رہے تھے۔ ایک دن راشد اپنی تنہا پرواز کے لیے فضا میں بلند ہوا۔ دس منٹ گزر گئے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ اس کا طیارہ مستقر سے کافی دور نکل آیا تھا کہ اچانک اسکرین پر کوئی چیز نظر آئی۔ وہ سمجھا کوئی چڑیا اسکرین سے ٹکرائی ہے۔ چند لمحوں بعد یہ بوندیں پھیلنے لگیں۔ یہ چڑیا نہیں ٹکرائی تھی بلکہ انجن آئل لیک ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسکرین تیل سے ڈھک گئی۔ سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس کے اعصاب کا امتحان تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس نے سوچا۔ اس نے کنٹرول ٹاور کو آگاہ کیا۔ وہاں سے حکم ملا کہ طیارے کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور پیراشوٹ کے ذریعے نیچے کود جاؤ۔ اسے لمحوں میں فیصلہ کرنا تھا کہ حکم کے مطابق عمل کرے یا نہیں۔ اگر وہ کود گیا تو طیارہ تباہ ہو جائے گا۔ وہ طیارے کو اتنی آسانی سے تباہ نہیں ہونے دے گا۔ اس نے سوچا اور کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا۔

"میں طیارہ تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے طیارہ واپس لانے کی اجازت دی جائے۔"

اس کی درخواست منظور ہوئی اور ٹاور سے اسے ہنگامی لینڈنگ کے لیے ہدایات ملنے لگیں۔

"اے اللہ اگر میں رن وے پر صحیح سلامت اتر گیا تو دو نفل شکرانے کے ادا کروں گا۔"

وہ پچھلی ہدایت کے مطابق پیراشوٹ کے ذریعے بہ آسانی نیچے اتر سکتا تھا۔ ہنگامی لینڈنگ میں خطرہ تھا۔ اس نے یہ خطرہ مول لیا اور نہایت شاندار لینڈنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے رن وے پر اتر گیا۔

وہ جہاز سے باہر نکلا تو اس کے جوتوں میں تیل لگا ہوا تھا۔ وہ چند قدم چلا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ دوست اسے سنبھالنے آ گئے۔

"یار اوپر تھے تو سب ٹھیک تھا۔ نیچے آئے اور [illegible] ہو گئی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور دل میں کہنے لگا" کوئی بڑی مصیبت اس چھوٹی مصیبت سے ٹل گئی۔

اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے جہاز کو بچا لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے مضبوط اعصاب کا ثبوت بھی دیا تھا۔ وہ اگر طیارے کو تباہ ہونے دیتا تو کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں تھا کیونکہ یہ ایک فنی خرابی تھی لیکن اس نے خود کو بھی بچا لیا اور طیارے کو بھی محفوظ رکھا۔ اکیڈمی میں اس کے اس کارنامے کی بہت تعریف ہوئی اور اسے تعریفی سند ملی۔

اس نے اپنے اس کارنامے کا گھر والوں سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ سن کر پریشان ہوں گے اور اس لیے بھی کہ وہ اپنے کسی کارنامے کا ذکر کرنے کو شیخی بگھارنا کہتا تھا۔

اس کی تربیتی پروازیں چل رہی تھیں کہ ملک میں کئی سیاسی تبدیلیاں آ گئیں۔ صدر ایوب رخصت ہو چکے تھے اور جنرل یحییٰ صدر تھے۔ الیکشن ہوئے تو اس کا بھی جی چاہا کہ ووٹ ڈالے لیکن ابھی اس کی عمر کم تھی۔ ووٹ ڈالنے کے لیے کم سے کم عمر اکیس برس تھی جبکہ اسے بیس سال کا ہونے کے لیے بھی مزید دو ماہ درکار تھے۔

الیکشن تو بہ خیر و خوبی ہو گئے لیکن انتقالِ اقتدار میں پس و پیش ہونے لگی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمن کی عوامی لیگ جیت گئی تھی اور مجموعی طور پر کامیابی حاصل کی تھی۔ بہرحال یہ سیاسی معاملات تھے کہ مجیب الرحمن کو حکومت کیوں نہیں دی جا رہی ہے۔ اکیڈمی میں چہ میگوئیاں ضرور ہو رہی تھیں لیکن کھل کر کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ اندیشے ضرور ظاہر کیے جا رہے تھے کہ یہ معاملہ اگر طول کھینچ گیا تو کشت و خون پر ختم ہوگا۔ یہ اندیشے اس لیے زور پکڑ رہے تھے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دشمن ملک بھارت تھا جو اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مشرقی پاکستان میں خود مختاری کے

نعرے بلند ہونے لگے۔ انہی دنوں اس نے سنا کہ اس کے والد نے ٹویوٹا کورونا خریدی ہے جس کا رنگ سرخ ہے۔ اس کی پانچویں ٹرم ختم ہونے والی تھی۔ وہ خوش ہو گیا کہ گھر جا کر اس گاڑی میں خوب سیر کرے گا لیکن یہ خوشی لمحاتی ثابت ہوئی۔ ٹرم میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اب دو ماہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔

گاڑی کا تو بہانہ تھا۔ اسے یہ بھی جلدی ہو رہی تھی کہ فائنل ٹرم مکمل ہو گئی ہے اب وہ گھر جا سکے گا اور گھر والوں سے اپنی شادی کی بات کر سکے گا لیکن اب دو ماہ مزید انتظار کرنا تھا۔ اس پر تنہائی کا شدید حملہ ہوا۔ وہ سہگل اور حبیب ولی محمد کی گائی ہوئی غزلوں میں پناہ لینے لگا۔ اس نے اپنی ڈائری میں غالب کے یہ اشعار درج کر دیے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اس کی سالگرہ بھی ٹریننگ کے دوران میں آ گئی۔ گھر والوں کی جانب سے برتھ ڈے کارڈ موصول ہوا تو اس کا دل بھر آیا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں انسانی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس نے بہن درخشانہ کو نہایت جذباتی خط لکھا۔

یہ اس کی آخری سالگرہ اور آخری خط ثابت ہوا۔

دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس نے اپنی تربیت مکمل کر لی۔ جب اس نے تربیت کا آغاز کیا تھا اس کے ساتھ 35 لڑکے تھے اور اب صرف سولہ خوش نصیب تھے جو یہاں تک پہنچے تھے۔

13 مارچ 1971ء کو پاسنگ آؤٹ ہوئی۔ اس موقع پر اس کے والدین اور دونوں بہنیں بھی آئیں ان کی آمد نے اسے مسرور کر دیا۔

وہ کراچی آیا تو کراچی کا مسرور بیس اس کے لیے ایک نئی دنیا ثابت ہوا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں امریکی فضائیہ کے لیے عارضی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ جنگ کے بعد برطانوی حکمرانوں نے اسے مستقل صورت دے دی تھی۔ آزادی کے بعد یہ پاکستان فضائیہ کی اوّلین تربیت گاہ ثابت ہوا۔

راشد یہاں پہنچا تو بے انتہا خوش تھا۔ اس لیے کہ اب وہ کیڈٹ نہیں رہا تھا اور اس لیے بھی کہ یہاں رسالپور سے کہیں زیادہ آزادی تھی اور شاید اس لیے بھی کہ اب وہ ہر ہفتے کی شام گھر جا سکتا تھا اور اتوار کا دن چھٹی کے طور پر گھر گزار سکتا تھا۔ رسالپور میں وہ کیڈٹس میس میں کھانا کھاتا تھا۔ یہاں آفیسرز میس میں بہ حیثیت آفیسر کھانا کھا سکتا تھا۔ خود کو آفیسر ظاہر کرنے کے لیے اس نے مونچھیں بھی رکھ لی تھیں اور ہنس کر کہا کرتا تھا "اب میرے وزن میں مونچھوں کا اضافہ بھی ہو جائے گا" پائلٹ آفیسر کی حیثیت سے اس کی تنخواہ میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ تنخواہ ملنے کے بعد اس نے گھر کی کئی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی تھیں۔ چھٹی کے دن بھائیوں کو لے کر نکل جاتا اور ان کی پسند کی چیزیں انہیں دلواتا۔ اس کے اپنے اخراجات بھی تھے۔ کتابوں کا شوقین تھا اور گراموفون ریکارڈ خریدتا تھا۔

مشرقی پاکستان میں حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت موضوع ہی یہ تھا کہ انتقال اقتدار کیسے ہو۔ اس کے گھر میں بھی یہ بحث اکثر چھڑ جاتی تھی۔ اس کی بہن بہنوئی فریدہ اور کیپٹن نصیر کراچی آئے تو یہ بحثیں تواتر سے ہونے لگیں۔ راشد کا خیال تھا کہ اقتدار مجیب الرحمٰن کے حوالے کر دینا چاہیے۔

فریدہ اس سے اکثر کہا کرتی تھی۔ "تم بنگالیوں کے بڑے حامی ہو حالانکہ اگر کبھی تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتیں گے۔"

یہ قبولیت کی ایسی گھڑی تھی کہ بعد میں یہی ہوا۔

فلائٹ لیفٹیننٹ مطیع الرحمٰن ایک تیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم ڈھاکا میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد مغربی پاکستان آ کر اس نے سرگودھا (مغربی پاکستان) میں پی اے ایف کے پبلک اسکول سے بارہویں جماعت پاس کی اور پھر فضائیہ میں شامل ہو کر رسالپور سے کمیشن حاصل کر لیا۔ کراچی سے جیٹ طیاروں کا کورس مکمل کرنے کے بعد اسے پشاور بھیج دیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں تھے لہٰذا وہ مشرقی پاکستان گیا اور اپنی بیوی اور دو شیر خوار بچوں کے ساتھ واپس آ گیا۔

مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونے اور بنگالیوں کی وفاداری پر شک ہونے کی وجہ سے فضائیہ کے بنگالی افسروں کی فضائی خدمات واپس لے لی گئی تھیں اور انہیں زمینی ذمہ داریوں تک محدود کر دیا گیا تھا لہٰذا مطیع الرحمٰن کو بھی مسرور بیس میں ڈپٹی سیکیورٹی آفیسر کر دیا گیا۔

وہ کچھ وقت مشرقی پاکستان میں گزار کر آیا تھا۔ اس کے خیالات بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ اب اس کی ہمدردیاں بنگالی علیحدگی پسندوں کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہونا چاہتا تھا جن کا مقصد مشرقی صوبے کو پاکستان سے الگ کرنا تھا۔ وہ ایک بہترین پائلٹ تھا اور اس ہنر کو کام میں لاتے ہوئے علیحدگی پسندوں کی مدد کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ مکتی باہنی (بنگلہ دیش قائم کرنے کی کوشش کرنے والی فوجی تنظیم) نے بھارت میں کیمپ قائم کیے ہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ پاکستان کا طیارہ اغوا کر کے بھارت لے جائے۔ اس سے دو فائدے اس کے پیش نظر تھے۔ اگر طیارہ بھارت پہنچ جاتا تو پاکستان سے اپنے مطالبات منوائے جا سکتے تھے اور دوسرے وہ مکتی باہنی میں شامل ہو کر پاکستانی فوجیوں سے نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ دنیا کو یہ تاثر بھی ملتا کہ پاکستانی فوجی بھی پاکستان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے ارادے کئی مرتبہ اپنی بیوی پر بھی ظاہر کر چکا تھا اور اب موقع کی تاک میں تھا۔

راشد کو جیٹ ٹرینر 33 اڑانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کی دو تنہا پروازیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ اب تیسری پرواز باقی تھی اس کے بعد اسے پاس آؤٹ کر کے پشاور جانا تھا۔

پشاور جانے سے پہلے اس کے گھر والوں نے ہاکس بے پر ایک پکنک ارینج کی۔ یہ گویا اس کے لیے الوداعی دعوت تھی۔ بہت سے عزیز و اقارب اور جاننے والے اکٹھے ہوئے۔

پکنک کے بعد اس نے اپنے بڑوں کو اپنی فرمائش یاد دلائی۔ وہ ابھی "اس لڑکی" کو بھولا نہیں تھا اور اس کی ابھی کہیں اور شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پائلٹ آفیسر بن چکا تھا۔ یہی اس کا مشن تھا۔ یہی اس کا عہد کہ وہ آفیسر بننے کے بعد اپنا گھر بسائے گا۔ گھر والوں کو اس کی پسند کا علم تو تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی اب بھی اسے ایسی شدت سے یاد ہے۔ انہیں اس کی فرمائش پر حیرت ہوئی۔ وہ جسے لڑکپن کا جنون سمجھ رہے تھے وہ اس کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہے۔ انہیں بھی اب سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

اس کے پشاور جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اسے فائٹر پائلٹ بننا تھا۔ اس نوید کے جواب میں اس کے بے تکلف دوست اسے چھیڑتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ سرور بیٹھک میں دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ ایک دوست نے اس کی جسامت کی طرف اشارہ کیا۔

"یار تم فائٹر پائلٹ ہو؟ اپنا قد دیکھو۔ اپنی عمر دیکھو۔"

راشد کے بولنے سے پہلے اس کا دوست صلاح الدین بول اٹھا۔ "یہ مت کہو۔ جب ایم ایم عالم پشاور گئے تھے اس وقت بھی اسے دیکھ کر لوگوں نے یہی کہا تھا 'یہی آدمی ہے جو پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرے گا؟' اور پھر تم نے دیکھا کہ اسی عالم نے ایک ساتھ پانچ جہاز گرائے۔ دیکھ لینا منہاس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔"

اب راشد کی باری تھی۔ اس نے سینہ پھلا کر کہا۔

"انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔"

ان دنوں وہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی فضائیہ کے کارناموں کے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ایسے دستے کی تاریخ پر مبنی تھی جس کے پائلٹ اپنے طیارے کو دشمن کے بحری جہازوں سے ٹکرا دیتے تھے۔ جیسے جیسے کتاب پڑھتا جا رہا تھا اس کے خون میں حدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ کئی عبارتیں اتنی بھرپور تھیں کہ وہ انہیں بار بار دہراتا رہا۔ کتاب پر جا بجا اپنے ریمارکس بھی لکھتا رہا۔ یہ کتاب کئی دن سے اس کے زیر مطالعہ تھی۔ آخری باب میں ہوا بازوں کے وہ خطوط شامل تھے جو انہوں نے اپنے گھر والوں کو لکھے تھے۔ وہ ان ہوا بازوں کی جگہ خود کو کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان کی قربانیوں۔۔۔ سے جاپان نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ میں بھی ایک ہوا باز ہوں۔ میرا بھی ایک وطن ہے۔ وقت آیا تو میں بھی اپنے وطن کی اسی طرح حفاظت کروں گا۔ موت کی پروا کیے بغیر۔ ایک ہوا باز کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس کے سامنے تھی۔

"انسان تو فانی ہے۔ موت' زندگی ہی کی طرح ایک اتفاقیہ امر ہے۔ کل کی مہم کے لیے مجھے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔"

راشد نے یہ سطریں نشان زد کر دیں۔ گویا یہی اس کا مشن بھی ہے۔

14 اگست کی چھٹی ہوئی تو وہ گھر آ گیا۔ یہ جمعے کا دن تھا۔ اس کے بعد اتوار کی بھی چھٹی تھی۔ یہ دونوں دن اس نے بڑے بھرپور گزارے۔ بیشتر رشتہ دار اس وقت کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ ان سب سے ملاقاتیں ہوئیں۔

جب وہ جانے لگا تو خلافِ معمول یہ فیصلہ ہوا کہ والد اور والدہ اسے چھوڑنے سرور میں تک جائیں گے۔ شام کے وقت جب روانگی ہونے لگی تو اسے قرآن شریف کے نیچے سے گزارا گیا۔ یہ بھی عجیب بات ہوئی کہ اس نے دونوں بہنوں کو باری باری خدا حافظ کہا۔ وہ اس قسم کی رسمی رخصتی کا قائل نہیں تھا۔ دونوں بہنوں کو تعجب ہوا۔ ”شکر ہے اس کو اتنے آداب تو آئے۔“ رخشانہ نے فرزانہ سے کہا۔

سرخ ٹویوٹا تیار کھڑی تھی۔ والد اور والدہ اس کے ساتھ بیٹھے۔ وہ خود ڈرائیو کرنے لگا۔ راحت اور انجم اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ گلی میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بھائی کی بس ایک جھلک دیکھی اور سرخ ٹویوٹا گزر گئی۔ سرور میں پہنچ کر اس نے ممی اور ڈیڈ کو خدا حافظ کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

20 اگست کو اس کی تیسری سولو فلائٹ تھی۔

مطیع الرحمن اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ راشد منہاس اکیلی پرواز پر جانے والا ہے تو اسے اپنی منزل قریب نظر آنے لگی۔ راشد منہاس جسمانی طور پر بہت کمزور اور دبلا پتلا ہے۔ اسے آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔ ابھی زیر تربیت ہے۔ زیادہ داؤ پیچ آتے نہیں ہوں گے۔ میری مہارت کے سامنے بہت جلد ہار مان لے گا۔ ابھی نوجوان ہے، کم عمر ہے۔ بہت سی خواہشیں اور ارمان دل میں ہوں گے۔ ان سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گا اور زیادہ مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ اس نے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی کے جہاز کو اغوا کر کے بھارت لے جائے گا۔ اس سے اچھا شکار اور کوئی نہیں مل سکتا۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ بے چارہ کم سن ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نفرت غالب آ گئی جو مغربی پاکستان والوں کی طرف سے اس کے دل میں تھی۔

سولو فلائٹ کے روانہ ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ راشد کینٹین چلا گیا۔ اس کا دوست طارق قریشی بھی اس کے ساتھ تھا۔ راشد نے کوکا کولا کا آرڈر دیا۔

”یار اس وقت بوتل مت پیو۔ پرواز میں دقت ہو گی۔“ طارق نے اس سے کہا۔

”کوئی نہیں۔ مجھے سرکٹ سے باہر نہیں جانا ہے اس لیے کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا اور زیادہ اونچا اڑنا بھی نہیں ہے۔“ راشد نے کہا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔ یہ تمہاری آخری پرواز ہے۔ اس کے بعد تو تمہیں پشاور چلے ہی جانا ہے۔ آج کیا تاریخ ہے 20 اگست۔ ستمبر کے شروع میں تم پشاور چلے جاؤ گے۔“

”اس آخری فلائٹ کے بعد گھر والوں کے ساتھ خوب وقت گزاروں گا۔“

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک پائلٹ آفیسر وہاں پہنچا۔

”راشد تمہاری باری آ گئی ہے۔“

”اچھا یار طارق۔ بوتل آدھی رہ گئی ہے۔ میری واپسی تک گرم ہو جائے گی۔ کیا یاد کرو گے یہ آدھی بوتل تم پی لینا۔“

راشد فلائٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کئی لڑکے اور بھی تھے جنہیں پرواز پر جانا تھا۔ راشد نے بھی ایک طیارے کی بک اٹھائی اور اس طیارے میں جا بیٹھا۔

مطیع الرحمن دور کھڑا دیکھ رہا تھا کہ راشد کس طیارے کی ”بک“ اٹھاتا ہے۔ جب راشد اپنے طیارے میں بیٹھ چکا تو مطیع الرحمن نے طیارے کا نمبر نوٹ کیا۔ وہ اپنی اوپل کار میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ ٹیکسی انگ ٹریک کی طرف تھا۔ ٹرینر طیارے کو بھی کلیئرنس حاصل کرنے کے بعد ٹیکسی انگ ٹریک سے گزر کر رن وے پر آنا تھا۔ ٹیکسی ونگ کا ایک گوشہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہاں مطیع الرحمن نے اپنی گاڑی روک دی۔ مطیع الرحمن زبردستی پچھلے کاک پٹ میں داخل ہوا۔ طیارے کے کنٹرول پر قبضہ کیا اور ٹیک آف کر کے طیارے کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ راشد نے کنٹرول ٹاور کو وائرلیس پر پیغام دیا۔

”ون سکس سکس اغوا کیا جا رہا ہے۔“

راشد نے اپنا پیغام بار بار دہرایا۔ طیارے نے ٹیک آف کیا اور پھر طیارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

”اے لڑکے طیارے کو انڈیا کی طرف جانے دو۔“ مطیع الرحمن غرایا۔

”یہ غداری ہے۔ میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔“

”تم کنٹرول ٹاور کو پیغام دے چکے ہو۔ تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اب تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔“

”میں اپنے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے تم سے لڑوں گا۔“

”اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔“

"مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں کروں گا۔"

"بے وقوفی مت کرو۔ تم انڈیا کی جیل میں دو تین ماہ سے زیادہ نہیں رہو گے لیکن اگر تم نے نادانی کی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔"

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہوگی۔"

کاک پٹ کے دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار تھی اور ان کا رابطہ صرف ماؤتھ پیس اور ہیڈ فون کے ذریعے ممکن تھا۔ راشد کے دل میں کئی خیال آئے اور چلے گئے۔ اسے گھر والوں کا خیال آیا۔ والدہ کی یاد آئی۔ چھوٹے بھائیوں کا خیال آیا۔ اس نے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے سامنے صرف پاکستان تھا۔ اس بنگالی کے نہ جانے کیا عزائم تھے۔ طیارے کو انڈیا لے جانے کے بعد نہ جانے وہ کس قسم کی شرائط پاکستان کے سامنے رکھے۔ پاکستان کو بلیک میل کرے، میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے مطیع الرحمن کو ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر اپنے طیارے کا کنٹرول واپس لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن مطیع الرحمن کی برتر صلاحیت اور تجربے کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ طیارے کو انڈیا کی سرحد میں ہرگز داخل نہ ہونے دے۔ پاکستانی علاقے ہی میں اسے زمین سے ٹکرا دے۔ اس کی موت یقینی تھی مگر وہ اپنے دشمن کو بھی تو مار دے گا" اس نے سوچا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اسے گلے لگا لینا بڑے حوصلے کی بات ہوتی۔ وہ صرف بیس سال کا تھا۔ اس عمر کا بڑا حصہ ٹریننگ میں گزر گیا تھا۔ جو درخت اس نے لگایا تھا اس کے پھل کاٹنے کا وقت اب آیا تھا۔ وہ آسانی سے سرینڈر کر سکتا تھا۔ انڈیا میں وہ فوجی قیدی ہوتا اور واپس آ سکتا تھا۔ عقل تو یہی کہتی ہوگی لیکن عشق کا نصاب کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی عقل پہ وطن کا عشق غالب آ گیا۔ وہ عشق جو اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ اس کی حدت خون میں بڑھ رہی تھی۔ وطن کی آبرو کا سوال تھا۔ اس نے سوچا میں تو واپس آ سکتا ہوں لیکن وطن کی عزت واپس نہیں آ سکتی۔

بھارت کی سرحد صرف 32 میل دور رہ گئی تھی۔

طیارے کے لیے یہ فاصلہ کچھ نہیں ہوتا۔

دریائے سندھ اور بحیرہ عرب کے سنگم کے قریب شاہ بندر کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام "جنڈ" تھا۔ گاؤں کے باہر درختوں کے جھنڈ تھے اور چاول کے کھیت تھے۔ یہاں کے لوگوں نے بڑی حیرت سے ایک چھوٹے سے طیارے کو دیکھا جو قلابازیاں کھا رہا تھا۔ کبھی ایک طرف جھکتا تھا کبھی دوسری طرف مڑتا تھا کبھی اوپر اٹھتا تھا کبھی نیچے جھکتا تھا۔ پھر یہ طیارہ آخری دفعہ جھکا اور گاؤں سے دو میل باہر بڑی تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف آیا اور زمین سے ٹکرا گیا۔

مسرور میں کئی ٹیمیں طیارے کی تلاش میں روانہ ہو گئیں۔ جنڈ کے قریب طیارے کا ملبہ مل گیا۔ مطیع الرحمن کی لاش بھی مل گئی۔ راشد کا جسم طیارے کی کاک پٹ میں پایا گیا۔ مطیع الرحمن کی لاش کا وہاں ملنا اور جیسی انگ کے قریب اس کی گاڑی کا پایا جانا یہ حقیقت واضح کر رہا تھا کہ طیارے میں ہوا کیا لیکن ابھی کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ تحقیق کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا تھا۔

سرکاری اعلان میں تحقیقات کا خلاصہ پیش کیا گیا۔

"اس یونٹ کا ایک انسٹرکٹر پائلٹ زبردستی پچھلے کاک پٹ میں داخل ہوا۔ طیارے کے کنٹرول پر قبضہ کیا اور ٹیک آف کر کے طیارے کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ پاکستانی علاقے کے صرف 40 میل رہ جانے پر منہاس کے سامنے طیارے کو بھارت میں داخل ہونے سے روکنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اور پاک فضائیہ کی اعلیٰ ترین روایات کا پاس رکھتے ہوئے راشد منہاس نے اپنے طیارے کا کنٹرول واپس لینے کی کوشش کی مگر اپنے انسٹرکٹر کی برتر صلاحیت کی وجہ سے اسے ناممکن پانے پر بھارتی سرحد سے 32 میل دور ایک مقام پر زمین سے ٹکرا دیا۔ ایسا کرنے میں پائلٹ آفیسر منہاس نے جانتے بوجھتے ہوئے پاکستان اور جس فوج سے اس کا تعلق تھا اس کی آبرو کی خاطر عظیم ترین قربانی پیش کر دی۔ فرض کی پکار سے بڑھ کر اس شجاعت کے کارنامے پر صدر پاکستان پائلٹ آفیسر راشد منہاس کو نشانِ حیدر پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

جس روز راشد کی فلائٹ تھی اور اس کا طیارہ غائب ہوا تھا مجید صاحب دوپہر کے وقت مسرور میں آئے ہوئے تھے تاکہ جب وہ واپس آئے تو اسے لے کر گھر چلے جائیں۔ اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ راشد پر کیا بیت

گئی ہے۔ مجید صاحب سے کہا گیا کہ راشد کی پرواز لمبی ہوگئی ہے۔ آپ اس وقت گھر چلے جائیں۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا اسے گھر بھیج دیا جائے گا۔ مجید صاحب مطمئن ہوکر واپس آگئے۔

...... دوپہر گزر گئی۔ شام ہوئی اور پھر رات آگئی۔ راشد اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

"راشد اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔ پرواز کتنی لمبی ہوگئی۔" رشیدہ بیگم (راشد کی والدہ) نے کہا۔

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔ وہ اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں۔ اسے گھر آجانا چاہیے تھا۔"

"میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ آپ اس کے اسکواڈرن لیڈر سے فون کرکے معلوم تو کریں۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہوگیا۔"

"فکرمند ہونے کی بات نہیں۔ کل ہفتہ ہے۔ اس نے سوچا ہوگا ویک اینڈ پر گھر جائے گا۔ انشاءاللہ کل دوپہر کے کھانے تک وہ گھر آجائے گا۔"

رشیدہ بیگم اس وقت تو خاموش ہوگئیں لیکن ماں تھیں۔ رہ رہ کر راشد کا خیال آرہا تھا۔ پوری رات بے چینی میں گزری۔ صبح ہوئی۔ مجید صاحب نے بیگم سے پوچھا۔

"راشد دوپہر کا کھانا گھر آکر کھائے گا۔ آپ آج کیا پکوا رہی ہیں۔"

"میں نے ملازمہ سے پوچھا تھا۔ وہ کریلے گوشت پکا رہی ہے۔"

"تم نے یہ کیا پکوا لیا۔ راشد کو کریلے گوشت بالکل پسند نہیں۔ کچھ اور پکواؤ۔"

"اسے تو پلاؤ اور آلو گوشت پسند ہے۔ میں ملازمہ سے کہتی ہوں وہ ان چیزوں کا اہتمام کرے۔"

کھانا وقت سے پہلے ہی تیار ہوگیا۔ بس اب راشد کا انتظار تھا کہ وہ آئے اور کھانا شروع کیا جائے۔ کھانے کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس دوران میں مجید صاحب میس روم میں کئی بار فون کرچکے تھے لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں آرہا تھا۔ اس صورت حال نے سب کو فکرمند کردیا تھا۔

"میں خود جاتا ہوں اور شریر کو گھر لے کر آتا ہوں۔ چھٹی کا دن بھی دوستوں میں گزار رہے ہیں صاحبزادے۔"

وہ ابھی جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔

یہ اسکواڈرن لیڈر کا فون تھا۔

"آپ گھر پر ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"گھر پر ہی رہیے۔ میں آرہا ہوں۔ راشد کے بارے میں کوئی بات کرنی ہے۔"

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ مجید صاحب نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ راشد سے ڈسپلن کی کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ اسی لیے اسے گھر بھی نہیں بھیجا اور اسکواڈرن لیڈر خود اس کی اطلاع دینے میرے پاس آرہا ہے۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ صرف اسکواڈرن لیڈر ہی نہیں۔ اس کے ساتھ چند دوسرے افسر بھی منہاس ولا پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ خبر سنائی کہ راشد اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے سن لی جاتی۔ اسکواڈرن لیڈر کی زبان سے الفاظ ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ مجید صاحب کے اعصاب جواب دے گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"ہم تو یہ سمجھے تھے کہ اس سے ڈسپلن کی کوئی غلطی ہوگئی ہے۔"

"غلطی کیسی۔ اس نے تو وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آپ کو ایسے بیٹے پر فخر ہونا چاہیے۔"

"کیا میں تفصیلات دریافت کرسکتا ہوں۔"

"میں اس وقت صرف اتنا بتا سکتا ہوں جتنا بتانے کی مجھے اجازت ہے یا اب تک جتنا معلوم ہوسکا ہے۔ ایک سینئر افسر طیارہ ہائی جیک کرنا چاہتا تھا مگر راستے میں طیارہ کریش ہوگیا۔ باقی تفصیلات تحقیق کے بعد سامنے آئیں گی۔"

"میرے بچے کی لاش؟"

"تھوڑی دیر میں تابوت آجائے گا۔ لاش مل گئی تھی۔"

اتنی دیر میں منہاس ولا کے در و دیوار سوگواری کی چادر اوڑھ چکے تھے۔ سب کو معلوم ہوچکا تھا کہ کیسا حادثہ گزر گیا ہے۔ اس کے بھائی اداسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ بہنوں کا برا حال تھا۔ رشیدہ بیگم ساکت تھیں۔

"کیا میں اپنے راشد کا چہرہ دیکھ سکوں گی؟"

اسکواڈرن لیڈر سوچ میں پڑ گیا۔

"عام طور پر ایسے واقعات میں ہلاک ہونے والے

پائلٹس کی لاشیں دکھائی نہیں جاتیں۔ آپ کے لیے خصوصی اجازت کا انتظام کیا جاسکتا ہے لیکن میرا مشورہ پھر بھی یہی ہوگا کہ آپ نہ دیکھیں۔ اس نوعیت کے حادثوں میں لاش اور اس کا چہرہ اتنا بدل جاتا ہے کہ آپ اس کی تاب نہ لاسکیں گی۔ آپ تو بس یہ سوچیں کہ آپ ایک شہید کی والدہ ہیں اور یہ آپ کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔"

رشیدہ بیگم نے آنسوؤں کی چلمن سے مجید صاحب کی طرف دیکھا۔ کیا یہ آفیسر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کیا ہمیں اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہیے۔

"نہیں۔ میں اپنے بیٹے کا آخری دیدار نہیں کروں گی۔ میرا بچہ ہر وقت ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔ میں اس کے اسی چہرے کی یاد کو اپنی آنکھوں میں تازہ رکھوں گی۔" ان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

عزیز و اقارب سے گھر بھر گیا۔ "وہ لڑکی" بھی آئی ہوئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رشیدہ بیگم اپنے بیٹے کی موت کا سن کر اتنا نہیں روئی ہوں گی جتنا اسے گلے لگا کر روئیں۔ یہ راشد کی پسند تھی جسے وہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔

کچھ دیر بعد تابوت آ گیا۔ دیکھنے کو تھا کیا۔ بس ایک رسم تھی جو ادا کر دی گئی تھی۔ یہ بتاتا تھا کہ ویک اینڈ پر راشد گھر آ گیا ہے۔ اب دور جا رہا ہے۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔

منہاس ولا میں کہرام مچا ہوا تھا۔ مجید صاحب سنبھل گئے تھے۔ ایک ایک کو تسلیاں دے رہے تھے۔ شہید کی میت پر رویا نہیں کرتے۔ تابوت رکھا گیا تو تسلیاں بے کار چلی گئیں۔

اس شہید کو فوجی قبرستان میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

جس وقت تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا رشیدہ بیگم اچانک ضبط کھو بیٹھیں۔

"بیٹا میں نے تمہیں فضائیہ میں بھیجا تھا کہ تم نے کہا تھا دشمن کے جہاز گراؤ گے۔ یہ تم نے اپنا ہی جہاز کیوں گرا دیا۔"

ایک مرتبہ پھر اسکواڈرن لیڈر آگے بڑھا۔

"آپ کے بیٹے نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا ہے اور اس کی موت وطن کی خاطر واقع ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ تفصیلات ابھی آپ کو نہیں بتا سکتے لیکن جب وہ آپ کو بتائی جائیں گی تو آپ اپنے بیٹے کے کارنامے پر فخر کریں گی۔"

راشد منہاس کے لیے ابتدا میں ستارۂ جرأت تجویز ہوا تھا لیکن 29 اگست کو ریڈیو ٹیلی وژن پر اعلان ہوا کہ صدر یحییٰ خان نے شجاعت کا سب سے بڑا اعزاز نشانِ حیدر اس کی نذر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسرے دن کے اخبارات ان خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ تفصیلات سامنے آئیں تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ منہاس نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور ملک کو کتنی بڑی رسوائی سے بچا لیا ہے۔ عوام میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ منہاس ولا میں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اب راشد قومی ہیرو تھا۔ طیارے کا گرنا محض حادثہ نہیں تھا۔ لوگ طرح طرح سے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔ دو نوجوانوں نے اپنے لہو سے ایک خط مجید صاحب کے نام لکھا۔

"انشاء اللہ پاکستان کا ہر شہری راشد منہاس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔ اگر ہمارے ملک پر کسی نے بدنیتی کی نظر اٹھائی ہم اس کو نیست و نابود کر دیں گے۔ انشاء اللہ۔"

اس کی قربانی پر شعراء نے نذرانہ ہائے عقیدت پیش کیے

دوستو آج کہ ہر نام و نسب کی باتیں
عیش و عشرت پہ زر و مال پہ دم دیتی ہیں
آؤ ہم جشن منائیں کہ ہماری مائیں
اب بھی راشد سے سپوتوں کو جنم دیتی ہیں (رحمان کیانی)

اے مری ملت کے شہپر بے مثال
تیری قربانی رہے گی لازوال
کام تیرا بے نیازِ صبح و شام
نام تیرا ماورائے ماہ و سال (صہبا اختر)

اخباروں نے کالم لکھے۔ راشد منہاس پاکستان سے منتقل ہو کر تاریخِ پاکستان کے قصرِ دوام میں داخل ہو گیا۔

اس عمر میں نشانِ حیدر پانے والا پہلا سپاہی۔

ماخذ: راشد منہاس
از..... خرم علی شفیق

واخانی خان

مختار آزاد

پھرنا، اور پھرتے رہنا، وادی وادی چکراتے رہنا ہی بنجاروں کا مقدر ہے، خانہ بدوشوں کی زندگی ہے۔ اس علاقے سے اس علاقے تک محوِ سفر ایک خانہ بدوش قبیلے کے بارے میں چشم کشا تحریر جسے بڑی تحقیق کے بعد ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ ایسی تحریریں صرف سرگزشت کا خاصہ ہیں۔

برف پوش پہاڑوں کے دامن میں پھرنے والے ایک قبیلے کا تذکرہ

خان کا خواب ایک کار خریدنا ہے۔ اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا سپنا پورا ہوا تو بھی کار چلانے کے واسطے وہاں سڑک نہیں ہے۔ اُس کے والد علاقے کے پچھلے خان تھے جو ساری عمر وہاں سڑک کی تعمیر کے لیے کوششیں کرتے رہے۔ نیا خان بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وہی سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ مجھے بھی گوری سرکار کا کوئی افسر سمجھ کر سڑک کی تعمیر پر اس طرح قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جیسے میں مان گیا تو اگلے ہی لمحے وہاں سڑک موجود

ہوگی۔

"ایک سڑک ہی اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہاں بسنے والوں کے علاج و معالجے کے لیے ڈاکٹرز اور دوائیں پہنچائی جاسکیں۔ یہاں بیماریوں سے لوگ مرتے چلے آرہے ہیں۔ آج نہیں، صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے مگر اب دنیا بدل چکی لیکن پھر بھی لوگ علاج و معالجے کے بنا ہی مر رہے ہیں۔ یہ مرنے سے بچائے جاسکتے ہیں لیکن نہیں، جانتے ہو کیوں......" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ "اس لیے کہ یہاں سڑک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز اور دوائیں اس علاقے میں پہنچ ہی نہیں پاتے۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "ایک سڑک یہاں کے بیماروں کو مرنے سے بچاسکتی ہے، صرف ایک سڑک۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

"صرف بیماروں کی ہی بات نہیں۔" اس نے جذباتی لہجے میں دوبارہ بات شروع کی۔ "سڑک نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو استاد یہاں کا رخ نہیں کرتے، بچے ان پڑھ تھے، ان پڑھ ہیں اور سڑک نہ بنی تو ہماری آنے والی نسلیں بھی ان پڑھ اور یہ علاقہ اسکول کے بنا ہی رہے گا۔" اس نے توقف کرکے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ "بات صرف صحت اور تعلیم تک ہی محدود نہیں، سڑک نہ ہونے کے سبب یہاں نہ تو سوداگر آتے ہیں اور نہ سیاح، حتیٰ کہ سبزی فروش بھی یہاں کا رخ نہیں کرتے...... یہ ہے ناں ہماری زندگیوں کا المیہ؟"

افغانستان کے انتہائی دور دراز پہاڑی علاقے کے ان کرغز خانہ بدوشوں کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ترقی کے ثمرات سے استفادے کا پورا پورا حق ہے اور نوجوان خان اس سڑک کی تعمیر کے حق میں دلائل دے رہا تھا جس پر وہ اپنے خوابوں کی کار دوڑا سکے۔

"تو یہ ہے ہمارا المیہ...... ایک سڑک تو بہت سے مسئلے حل کرسکتی ہے ورنہ......" اس نے غصے سے منہ دوسری طرف کرلیا۔

ماحول خاصا رنجیدہ ہوچکا تھا، سب خاموش تھے۔ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔ "ویسے خان...... تمہیں کس قسم کی کار چاہیے؟"

یہ سن کر اس کی اوپر کو بل کھاتی مونچھوں میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ہوئی، غالباً وہ مونچھوں تلے مسکرایا تھا۔ "ویسے، تم مجھے کس قسم کی کار دینا چاہتے ہو؟" اس نے سوال کے جواب میں الٹا سوال لوٹا دیا تھا۔

میں اسے کسی بھی قسم کی کار نہیں دینے والا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہاں کوئی سڑک نہیں اور سفر کے لیے کار کی بجائے یاک ضروری ہے اور یہ سہولت صرف اسی کو نہیں، وہاں کے تمام کرغز خانہ بدوشوں کو حاصل تھی اور اس وقت ہم ابھی کے پاس کھڑے تھے۔ ایک یاک کی نکیل کا سرا خان کے ہاتھ میں تھا، وہ اس کے برابر کھڑے تھے۔ وہ روانگی کا دن تھا۔ خان کا جو بھی سامان تھا، اسے باندھ کر یاک کی پشت پر لادا جارہا تھا۔ خان کے مال و متاع میں یاک اور بھیڑوں کے علاوہ، چند سلور کی کیتلیاں، ایک اسٹوو، کچھ مگ، ایک کار بیٹری، دو سولر پینل، چیتا لیس کمبل اور ایک چمڑے سے بنا اور اوپر سے گنبد نما خیمہ شامل تھا۔ یہ خیمہ 'یُرت' کہلاتا ہے اور وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں میں اس کا استعمال عام ہے۔ یہ گرمائی چراگاہ کی طرف نقل مکانی کا وقت تھا۔ اس کے بھائی اور کچھ دیگر ساتھی سامان باندھنے اور لادنے میں مدد کررہے تھے۔

چلنا ہی خانہ بدوشوں کا کام ہے لیکن جہاں تک افغانستان کے کرغز خانہ بدوشوں کا تعلق ہے تو وہ سال میں چار بار نقل مکانی کرتے ہیں لیکن اس کا زیادہ تر دارومدار موسمی حالات اور بھیڑ بکریوں پر مشتمل گلے کے لیے چراگاہوں میں چارے کی فراوانی پر ہوتا ہے۔

افغان کرغز خانہ بدوش اپنے علاقے کو 'بام دُنیا' کے نام سے پکارتے ہیں جس کا مطلب ہے 'دُنیا کی چھت'۔ بلاشبہ یہ نام سننے میں نہایت دلفریب اور شاعرانہ ہے لیکن 'بام دُنیا' کا قدرتی ماحول نہایت سخت اور غیر شاعرانہ جبکہ وہاں انسان کی بقا سخت جوکھم سے بھری ہے۔

کرغزیوں کا 'بام دُنیا' بیرونی دنیا میں 'واخان کی پٹی' کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ دو بہت بڑے اور طویل گلیشیروں کے تل سے جنم لینے والی وادیوں کی سرزمین پر مشتمل ہے۔ یہ گلیشیر وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والے پہاڑی سلسلے پامیر میں واقع ہیں اور اس علاقے کی سطح سمندر سے بلندی چودہ ہزار فٹ کے اریب قریب ہے۔ یہاں چلنے والی انتہائی سرد ترین ہوا رگوں میں لہو جما دیتی ہے اور زمین ایسی کہ جس پر فصل کاشت کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ سال کے تین سو پینسٹھ میں سے تین سو چالیس دن، یہاں کا درجۂ حرارت مستقل طور پر نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ نمی نہیں، ہریالی اور جنگل کا تو تصور ہی نہیں۔ بہت سے کرغز تو ایسے ہیں

جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی درخت کو دیکھا تک نہیں۔

افغانستان کے انتہائی شمال مشرق میں واقع یہ ویران، سرد ترین اور خوف زدہ کردینے والی سرزمین دو بڑی گلیشیریائی سلسلے کے درمیان چٹنے کی مانند ہے۔ اسی لیے شاید پٹی اس کے نام کا حصہ بنا۔

'واخان کی پٹی'...... اس خطے کا یہ نام انیسویں صدی کے دوران میں روس اور برطانوی سلطنتوں کے درمیان وسط ایشیا پر تسلط کے لیے لڑی گئی اُن جنگوں کی دین ہے، جسے نام نہاد "گریٹ گیم" کہا گیا تھا۔ اُس وقت کی دنیا کی ان دو عظیم طاقتوں نے 1873ء سے لے کر 1895ء کے درمیان طے شدہ معاہدوں کے ایک سلسلے کے نتیجے میں اس رہ گزر کو بطور 'بفرزون' درجہ دیا۔

ان معاہدوں کے ذریعے دراصل تاج برطانیہ زارِ روس کو ہندوستانی سرحدوں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے قبل، ماضی میں واخان کی یہ پٹی بھی اُس شاہراہِ ریشم یا سلک روٹ کا حصہ تھی جو اُسے چین سے ملاتا تھا جبکہ مغربی خطے پر یہ فوجوں، عیسائی مبلغین اور بعض نئی جغرافیائی کھوج کرنے والے مہم جوؤں کا راستہ تھی۔ سن بارہ سو کے اواخر میں تاریخ کے معروف مہم جو مارکو پولو نے بھی واخان کی پٹی عبور کی تھی لیکن 1917ء میں روس کے کمیونسٹ اور 1949ء میں چین کے سرخ انقلاب کے بعد سے یہ سرحد اور راستہ تقریباً متروک ہوچکا ہے۔

بیسویں صدی ختم ہونے سے بہت پہلے دنیا سے نوآبادیاتی دور گزر چکا، تاریخ کا ایک باب مکمل ہو کر بند ہوا اور اب نیا دور ہے۔ آج کی دنیا میں واخان کی پٹی کی سرحدیں شمال میں تاجکستان، جنوب میں پاکستان اور مشرق میں چین سے متصل ہیں۔ اس سرزمین کا بنیادی حصہ افغانستان ہے جو پٹی کے مغرب میں واقع ہے لیکن اس سے کہیں دور محسوس ہوتا ہے۔ لگ بھگ دو سو میل طویل اس افغان پٹی کو بعض کرغز اپنی گفتگو میں بطور حوالہ 'غیر ملک' قرار دیتے ہیں۔

آج کے واخان کی یہ پٹی ماضی کی طرح سنگلاخ مگر برف پوش اور دشوار گزار پہاڑوں، بیابانوں اور گلیشیروں کی ہمسائی وہ سرزمین ہے جو تاریخ میں سیاست اور جغرافیائی تسلط کے تنازعات کے بوجھ تلے دبی لیکن اس کا ماحولیاتی ماضی حال میں بھی زندہ ہے۔ بالادستی کے لیے عالمی طاقتوں کی کشمکش کب کی ختم ہوچکی۔ افغانستان بیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی ڈیڑھ عشرے تک، سوویت تسلط سے شروع ہونے والے عدم استحکام اور خانہ جنگی کا شکار ہے اور علم نہیں کہ یہ اور کب تک جاری رہے مگر الگ تھلگ واقع 'افغان واخان کی پٹی' ان تمام تر اثرات سے کہیں دور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو واخی کرغزوں کے لیے افغانستان 'غیر ملک' ہے۔

تنگ اور پُرپیچ پہاڑی رہ گزاروں سے، یہاں کی قریب ترین سڑک بھی تقریباً تین دن کی پیدل مسافت پر ہے۔ ان راستوں سے ہوتے ہوئے وہاں تک پہنچنا کسی طور خطرے سے خالی نہیں۔ پہاڑی راستوں پر ایک طرف بلند و بالا پہاڑ تو دوسری طرف گہری کھائیاں اور تنگ درّے ہیں۔ اگر چلتے چلتے پاؤں ذرا سا ڈگمگایا تو کھائی میں گرنا یقینی اور زندگی بچنے کی کوئی اُمید نہیں ماسوائے اللہ کے!

یہ وہی سڑک ہے جسے توسیع دلوا کر خان اُس علاقے تک لانے کی کوشش کررہا ہے جہاں یہ آباد ہیں۔ اگرچہ موسم کے ساتھ ہجرت اب بھی اس قبیلے کا مقدر ہے لیکن وہ جہاں بھی جائیں، لوٹتے یہیں ہیں۔ اب ان کے قدم بھی زمین پکڑنے لگے ہیں۔ شاید اسی لیے سڑک بھی اس کے لیے اتنی زیادہ اہم ہوچکی ہے۔

سڑک میں توسیع کی جستجو خان کو باپ سے ترکے میں ملنے والی میراث ہے۔ موجودہ خان سے پہلے اس کا والد قبیلے کا خان تھا۔ اُس نے بھی سڑک میں توسیع کرانے کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ مگر جستجو اور کوششیں، دونوں جاری ہیں۔ خان کے مرنے سے اُمید نے دم نہیں توڑا۔ حالات دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ موجودہ خان بھی یہ میراث اپنے بڑے بیٹے اور اس قبیلے کے مستقبل کے خان کو سونپ کر ہی دنیا سے سکندر کی طرح خالی ہاتھ ہی لوٹ جائے گا۔ 'فاتح سڑک' ہونا نہ جانے کس خان کا مقدر ہے۔

خان کے گاؤں سے قریب ترین قصبہ بھی سڑک سے مزید ایک روز کی دشوار گزار پیدل مسافت پر ہے۔ اس قصبے کی اہمیت، وہاں کا ایک چھوٹا سا اسپتال اور چند دکانیں ہیں۔ صحتِ عامہ کی سہولتوں تک رسائی سے انتہائی دور، نہایت الگ تھلگ سرزمین پر بسنے والے کرغز خانہ بدوشوں میں اموات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ نہ ڈاکٹر نہ اسپتال،

صرف چند دوائیں ان کی رسائی میں ہیں۔ جس سخت اور شدید موسمی اثرات میں یہ کرغزی زندہ ہیں، وہاں بڑی آسانی سے معمولی نزلہ اور سر درد بھی وبا کی صورت پھیل جاتا ہے۔ یہاں کے حالات دیکھتے ہوئے اس پر کوئی شک نہیں کر سکتے کہ اکثر یہ بھی اموات کی وجہ بن جاتی ہے۔

واخان کی پٹی کے کرغزیوں میں بچوں کی اموات کی شرح، شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ نومولود بچوں کی بمشکل نصف تعداد ہی پانچ سال کی عمر تک پہنچ پاتی ہے۔ پانچ، چھ یا پھر سات بچوں کا شیر خواری یا کمسنی میں مرجانا کرغز والدین کے لیے غیر معمولی بات نہیں۔ زچگی کے دوران میں ماؤں کی اموات کی شرح خطرے کی گھنٹی سے کسی طور کم نہیں۔

میں ایک جوڑے بلچہ خان اور عبدالمطلب سے ملا، جن کے گیارہ بچے تھے۔ عبدالمطلب کا کہنا تھا کہ ہر سال اس کا ایک بچہ مرجاتا ہے۔ اس کے بچے زیادہ تر شیر خواری یا گھٹنوں کے بل چلنے کی عمر میں فوت ہوئے۔ یہ بچے جن معمولی بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا سے جانے پر مجبور ہوئے، ان کا علاج نہایت آسانی سے ممکن تھا۔ بلچہ کا کہنا تھا کہ بچوں کی موت نے انہیں جیتے جی مار دیا ہے۔ ان کا صرف ایک بیٹا پانچ سال کی عمر تک جیا اور اس کے بعد وہ بھی قبرستان میں جا سویا۔ بچوں کی موت کا غم بھلانے اور اپنا دکھ بھلانے کے چکر میں میاں بیوی افیون کے عادی ہو چکے۔ منشیات، بخصوص افیون کی با آسانی دستیابی کے سبب کرغزیوں میں افیونیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

کرغزیوں کی زندگی بہت محدود ہے۔ زیادہ تر کے لیے پوری دنیا صرف وہی ہے، جہاں تک اُن کے قدم پہنچے ہوں مگر خان کی بات دوسری ہے۔ اس نے واخان کی اس پٹی کے باہر کی دنیا بھی کسی حد تک دیکھی ہے۔ وہ دو بار اس علاقے سے باہر کا سفر کر چکا۔ وہ کاروباری مواقعوں کی تلاش میں کرغز سرزمین پر آنے والے تاجروں سے بھی ملتا رہا ہے۔ یہ وہ تاجر ہیں جو زیورات، افیون، دھوپ کے چشمے، جوتے، کپڑے، قالین اور اب موبائل فون تک بیچنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ واخان سرزمین پر سر اٹھا کر کھڑے بڑے بڑے برفیلے پہاڑوں کو موبائل فون کے کمزور سیٹلائٹ سگنلز عبور نہیں کر پاتے لیکن اس کے باوجود یہاں موبائل فون فروخت ہوتے ہیں اور وہ بھی اچھی خاصی تعداد میں۔ یہاں موبائل فون سے بات نہ کی جاسکے تو کوئی بات نہیں۔ موسیقی سننے اور تصویر لینے کے لیے ملٹی میڈیا اور کیمرے والے موبائل فون اچھی خاصی تعداد میں بک جاتے ہیں۔ یہاں موبائل فون کا صرف یہی استعمال ہے۔

خان کو اس تکلیف دہ حقیقت کا اعتراف ہے کہ دنیا روز بہ روز اس کے لوگوں کو پیچھے، بہت پیچھے چھوڑتی چلی جارہی ہے۔ تیزی سے بڑھتی آبادی والی دنیا میں، تیزی سے سمٹتے کرغز خانہ بدوشوں کی کل تعداد گیارہ سو رہ گئی ہے اور ان کا تعلیمی نظام نہایت ہی بنیادی اور سینہ بہ سینہ چلنے والے علوم پر مشتمل ہے۔ خود خان بھی لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اب دنیا بھر میں ہر شخص فوری طور پر صحت کی سہولتوں تک رسائی رکھتا ہے اور اس کا بنیادی سبب، خان کے مطابق، کار اور کمپیوٹر کے ناتے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کا باہم منسلک ہو جانا ہے۔

وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ اب صحت کی سہولتیں عام ہونے کے باعث دنیا بھر میں عام سی بیماریوں سے اتنے زیادہ بچے نہیں اور نہیں مرتے جتنے کرغز خانہ بدوشوں کے۔ ''اگر ہمیں بھی صحت کی سہولتیں ملیں تو ہمارا قبیلہ بھی بہت بڑا ہو لیکن اب تو ہم معدوم ہوتے جارہے ہیں۔'' اس روز وہ نہایت حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہہ رہا تھا لیکن میرے پاس افسوس کرنے اور خاموش رہنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

کرغزیوں کے اس خطے میں بہت کچھ ایسا ہے جسے قبیلے کے اس نوجوان رہنما کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ خان کی عمر چھتیس برس ہے لیکن وہ اپنے لوگوں کی حالت اور ان کے مسائل پر کڑھتا رہتا ہے۔ وہ ترقی کا خواہشمند ہے مگر اس دشوار گزار سرزمین تک ترقی کا پہنچنا بھی کم دشوار بات نہیں۔ اس کی ذات اپنے خوابوں کی تعبیر نہ ملنے کے افسوس سے مالا مال ہے۔ واقعی، کم عمری میں ہی نوجوان سردار بہت کچھ جان چکا ہے۔

پانچ فٹ سات انچ لمبا خان مضبوط کسرتی جسم کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں گہری کشتی، بال سیاہ اور گھنگریالے، رنگت زرد مائل ہے۔ اس کے ہاتھ مضبوط لیکن سخت محنت کے باعث کھردرے ہو چکے۔ جب وہ مصافحہ کرتا ہے تو جوش اور محبت سے ان ہاتھوں کی گرفت اور سخت ہو جاتی ہے۔

خان کی سرزمین پر غسل کرنا کسی تہوار سے کم اہمیت کا

حال نہیں۔ وہ ہر وقت فر کی موٹی جیکٹ، موٹے کپڑے کی پتلون اور دستانے پہنے رکھتا ہے ماسوائے اپنے یُرت کے۔ خیمے کے اندر ہر وقت دہکتے چولہے کی حرارت سے موسم اتنا خوشگوار ہوتا ہے کہ فر کی جیکٹ اور دستانوں کے بغیر بھی انسان کو کچھ خاص ٹھنڈ محسوس نہیں ہوتی۔ اندر بیٹھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ باہر کا موسم نقطۂ انجماد ہی نہیں بلکہ اس سے ڈیڑھ درجن ڈگری نیچے ہوگا۔

خان اپنے لوگوں کے حالات اور انھیں درپیش مسائل کے باعث اکثر افسردہ رہتا ہے لیکن بڑا ہی زندہ دل بندہ ہے۔ جب وہ لطیفے سنانے پر آئے تو سناتا ہی چلا جاتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے، دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ تب اس وقت وہ سارے غموں سے دور، حتیٰ کہ سڑک اور کار، دونوں کے خیال سے بھی بہت دور پہنچ چکا ہوتا ہے۔

خان کا اصل نام حاجی روشن خان ہے۔ یہاں 'حاجی' سے مراد وہی ہے جو برصغیر میں اس لفظ سے لی جاتی ہے اور نسبت مکہ سے حج کرکے لوٹنے کی ہے۔ خان کی بیوی کا نام طوئی لک ہے اور وہ چار بیٹیوں کے والدین ہیں۔ مذہبی اعتبار سے کرغز سنی مسلمان ہیں۔ سن دو ہزار آٹھ میں روشن خان نے اپنے والد کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ وہ اپنے چودہ بچوں کے ساتھ سفرِ مبارک پر گئے تھے۔ بیرونی دنیا سے خان کے رابطے کا یہ سب سے پہلا موقع اور اس کی زندگی کا سب سے طویل سفر تھا۔

دوسری بار اس نے گزشتہ موسمِ بہار میں واخان کی سرزمین سے باہر قدم رکھا تھا۔ اس سفر میں خان کی منزل کابل تھی، جہاں اس نے ایک وزیر کے علاوہ افغان صدر حامد کرزئی سے بھی ملاقات کی تھی۔ افغان صدر سے ملاقات میں خان کی درخواست تھی کہ اس کے علاقے میں ایک اسپتال، چند اسکول اور یقیناً ایک سڑک تعمیر کی جائے۔ سڑک کو وہ بھلا کیسے بھلا سکتا تھا۔ کار اس کا خواب ہے اور سڑک اس کے پورا ہونے کی بنیادی ضرورت۔

روشن خان کا والد بھی قبیلے کا سردار تھا۔ یہاں سردار کی مخالفت روایت نہیں، جو خان کا فیصلہ وہ پورے قبیلے کا۔ سن دو ہزار نو میں جب عبدالرشید خان کا انتقال ہوا تو سب ہی یہ جانتے تھے کہ اب نیا خان کون ہوگا، سردار کا سب سے بڑا بیٹا۔

وہ موسمِ گرما کا ایک خوشگوار دن تھا جب کرغز خانہ بدوشوں کی نہایت معزز اور بزرگ شخصیت ایر علی بھائی نے قبیلے کے تمام عمائدین کو اپنے یُرت میں آنے کی دعوت دی۔ وہ مرحوم سردار کے ہم عمر اور ان کے قریبی ساتھی تھے۔

یُرت کو کرغز باشندوں کی سماجی زندگی میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ دو تین خانہ بدوش خاندان اکٹھے نقل مکانی کرتے ہیں۔ ان کے مال بردار یاک اور پالتو مویشیوں کے گلے، سب سانجھے ہوتے ہیں۔ ایک احاطے کے اندر ان کے الگ الگ یُرت ہوتے ہیں، جنھیں کیمپ کہا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح سے محلہ بن جاتا ہے۔ اُس دن ایر علی بھائی نے عمائدین کو اپنے کیمپ پر بلایا تھا۔

اگرچہ کرغزیوں میں کاغذی کرنسی کا رواج نہیں لیکن اس کے باوجود یہ غریب نہیں۔ ان کے پالتو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، گھوڑے، یاک، مال بردار گدھے اور خچر دراصل خاصی بھاری مالیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کرغز خانہ بدوشوں میں کرنسی کی بنیادی مالیت ایک بھیڑ ہے۔ اس کی تعداد جتنی بڑھاتے جاؤ، قیمت میں اضافے کا تعین ہوتا جائے گا۔

یہاں ایک موبائل فون کی قیمت ایک بھیڑ جبکہ ایک یاک کی مالیت دس بھیڑیں ہیں۔ اعلیٰ نسل کا ایک گھوڑا چار بھیڑوں کے عوض خریدا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ کرغزیوں میں بیوی کی مالیت بھی طے شدہ ہے۔ شادی کے لیے دلہن کے عوض دولہا کو سو بھیڑیں لڑکی والوں کو پیش کرنا ہوتی ہیں۔

یہ روزمرہ زندگی میں شے کی مالیت کا تعین ہے لیکن جب کسی کی امارت کا تعین کرنا ہو تو اس کی نشانی اونٹ ہے، وہ بھی دو کوہان والا۔ جس خاندان کے پاس یہ ہے، وہ سب میں مالدار تصور ہوتا ہے۔

دو کوہانی اونٹ یہاں 'باختری' کہلاتا ہے۔ ستاون سالہ ایر علی کے پاس چھ عدد دو کوہانی اونٹ ہیں۔ اُن کے گلے میں پیتل سے بنی گھنٹیاں لٹکی ہیں، جب وہ کہیں سے گزرتے ہیں تو یہ آواز سننے والا سمجھ جاتا ہے کہ ایر علی کا قافلہ گزر رہا ہے۔ پہلے یہ گھنٹیاں ایر علی کی آمد کا اعلان کرتی تھیں لیکن اب ایک سے دوسرے کیمپ تک رابطے کے لیے واکی ٹاکی متعارف ہوچکی ہیں۔ یہ بھی نوٹ کمانے کے لیے 'بام دُنیا' کا رخ کرنے والے چالاک تاجروں کی دین ہے۔ اب ایر علی بھی واکی ٹاکی کا استعمال کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔

نقل مکانی کے سفر میں، واکی ٹاکی سے تیز رفتار اور

فوری رابطے کے باعث آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ شاید واخانی خانہ بدوشوں کے لیے اس کی اہمیت اُس موبائل سے کسی طور کم نہیں، جنہیں دنیا بھر کے زیادہ تر حصے میں، شہری ہو یا دیہاتی مدنیت کا لازمی جزو مان لیا گیا ہے۔

اربلی بھائی کی ایک اور خوبی بھی ہے۔ اُن کے پاس دنیا کی انتہائی منفرد مرغیوں کا جوڑا تھا۔ یہ نسل کرغزیوں کی پہچان تھی۔ مرغا ہو یا مرغی، ان کی صرف ایک ٹانگ ہوتی ہے۔ ایک مرغ شدید ٹھنڈ کے باعث مر چکا، دوسرے کی حفاظت وہ دل و جان سے کرتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اربلی کے کیمپ پر کرغز عمائدین کی دعوت کی..... سب کو علم تھا کہ دعوت کیوں ہے اور کوئی ایسا نہ تھا کہ جو آنے سے انکار کرتا۔ اگلے دن یہاں وہ سب موجود تھے جنہیں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کل چالیس افراد تھے جنہیں باہمی مشاورت سے 'نئے خان' کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ یُرت کے اندر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اور ان کی ضیافت کے لیے کرغز روایت کے مطابق بھیڑیں ذبح کی گئی تھیں۔ خواتین کھانا تیار کر رہی تھیں۔

کرغز باشندوں میں بھیڑ کے گوشت سے تیار کردہ ڈش دعوت کا لازمی جزو ہے۔ یہ نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ ان کے ہاں اسے روایت کا درجہ حاصل ہے۔ بھیڑ کے گوشت کو اسی کی چربی میں پکایا جاتا ہے۔ اس کی تیاری میں بہت وقت لگتا ہے۔ گوشت کو اس وقت بدستور مدھم آنچ پر پکایا جاتا ہے، جب تک چربی پگھل کر زرد رنگ کے شوربے جیسی صورت اختیار نہ کر لے۔

میں نے یہ ڈش کھائی ہے۔ روایتی مصالحوں اور قدیم طریقوں سے تیار کردہ یہ ڈش سادہ مگر نہایت لذیذ تھی۔ اسے پکنے کے لیے تقریباً آٹھ گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔

وہ کرغزیوں کی روایت کے عین مطابق دعوت تھی۔ کھانے کے بعد قہوہ پیش کیا گیا اور پھر سہ پہر کے قریب سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب تک یہ طے ہو چکا تھا کہ مرحوم عبدالرشید کی جگہ ان کا بڑا بیٹا حاجی روشن خان کرغز خانہ بدوشوں کا نیا خان ہوگا۔

اگرچہ قبائل کے بزرگوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا لیکن ضروری نہیں کہ نئے سردار کو سب کی حمایت حاصل ہو۔ حقیقت یہ تھی کہ قبیلے والوں میں نامزد خان کی شہرت ٹھیک نہیں تھی اور اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں۔ سرکشی اور آزاد روحیت میں کرغز بدنامی کی حد تک مشہور ہیں۔

کیلھن ماہرِ بشریات ہیں اور گزشتہ کئی سالوں سے کرغز خانہ بدوشوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ وہ ان کی بود و باش پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ کرغزیوں کے ہاں خان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی روایت نہیں لیکن آزادی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ان کی زندگی خان کے گرد نہیں گھومتی، وہ اپنی سوچ کے تابع ہیں۔ انہوں نے کرغزیوں کے بارے میں... ایک حکایت بھی سنائی جو لطیفے کی حد تک مشہور ہے" کہتے ہیں کہ کسی ایک یُرت میں تین کرغزیوں کو بٹھا کر چھوڑ جاؤ، ایک گھنٹے بعد پلٹو گے تو وہاں پانچ خان ملیں گے۔

نئے خان پر بعض کو اعتراض تھا کہ ابھی وہ کم عمر ہے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ 'سنگین' نہیں۔ سنگین..... کرغزیوں میں جرات، ہمت اور بہادری کا استعارہ ہے۔ 'سنگین' صفات کا حامل چٹان کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ کرغزی، ہمیشہ سے 'سنگین' ہونے کی چاہ رکھتے ہیں اور وہ اپنے خان میں بھی یہ صفات دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنگلاخ، بے آب و گیاہ اور سنگین موسموں میں رہنے والے کرغزی خانہ بدوشوں کی یہ خواہش بھی کچھ کم سنگین نہیں۔

'کمسن خان' پر معترض بعض افراد کی یہ بھی رائے تھی کہ اگر سب متفق نہ ہوئے تو پھر وادی کے دور دراز اور انتہائی سرے پر رہنے والا ایک سرکش اور مرحوم خان عبدالرشید کا دشمن، روشن اس کی جگہ نیا خان بن سکتا ہے۔ کچھ اس پر مصر تھے کہ بس! اب وقت بدل چکا، خان کا عہد ختم، اب انہیں کسی خان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ان سب آرا کے باوجود بنیادی حقیقت یہ تھی کہ اربلی، نئے نامزد خان کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔ اس وقت کچھ رائے یہ بھی تھی کہ نیا خان سفید مونچھوں والا کوئی بزرگ ہونا چاہیے۔ ویسے اُس وقت آوازیں اربلی کی حمایت میں بھی اٹھ رہی تھیں۔ اس کی مونچھیں داڑھی سفید تھی۔ اس کے پاس دو کوہانی اونٹ بھی تھے، اور وہ بھی ایک یا دو نہیں، پورے چھ کے چھ۔ بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا گلہ بھی اس کے پاس تھا۔

ان سب سے مختلف اور منفرد رائے کیلھن کی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ "اگر سفید داڑھی اور مونچھیں سردار کی قابلیت اور اہلیت کا اظہار ہے تو پھر ہمیں ایک بکرے کو خان منتخب کر لینا چاہیے۔ پہاڑی بکرے کی داڑھی اور مونچھیں،

دونوں ہی سفید ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "جب ایسا ہی ہے تو پھر وہ بکرا بھی ان سرکشوں کا سردار بن سکتا ہے۔"

خان کی بدنامی کا سب سے بڑا سبب افیون لینا ہے۔ اگرچہ خان کا دعویٰ ہے کہ وہ افیون ترک کر چکا مگر زیادہ تر یہ ماننے کو تیار نہیں۔ امیر علی کی ضیافت میں طے کردہ فیصلے کے مطابق اگرچہ اب حاجی روشن علی ہی کرغز خانہ بدوشوں کا خان ہے لیکن پھر بھی اس کی 'عوامی' مشکلات میں کمی نہیں آئی۔ خان بننے کے بعد بھی اس کے خلاف آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے لوگوں کو یہ باور کرانے میں مصروف رہتا ہے کہ منصب کے لیے اس سے بہتر کوئی اور کرغز ہو ہی نہیں سکتا۔

دنیا کے نہایت کٹھن قدرتی ماحول میں زندگی بسر کرنے والے کرغزیوں کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان کے حل کی خاطر خان کی کوششیں بھرپور ہیں۔ یہ خود کو سب سے بہتر ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اسی کی خاطر وہ افغان صدر اور وزیر سے ملا تھا لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اسپتال، اسکول اور وہاں سڑک بھی۔۔۔ کسی کے کچھ آثار نہیں۔

☆☆☆

نقل مکانی کے دوران تیاری کی نگرانی خان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ اس کا ذمہ ہے کہ قبیلے کے تمام مال بردار، خچر، گدھے، گھوڑے، اور یاک اس کے موسم گرما کے کیمپ کے سامنے مقررہ وقت تک پہنچ چکے ہوں، تاکہ ایک ساتھ مال بردار جانوروں کا قافلہ روانہ کیا جا سکے۔

اگرچہ وہ جون کا مہینہ تھا لیکن آسمان تب بھی ابر آلود تھا۔ کبھی کبھار اچانک ہلکی برف بھی پڑنے لگتی لیکن خان کو اس کی قطعی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے سرمائی ٹھکانے پر طویل سردیاں گزارنے کے لیے اپنے مویشیوں کے واسطے، ہر حال میں چارے کا خاطر خواہ ذخیرہ لگانا تھا۔

خان اور اس کا خاندان، یوں تو سال کا بیشتر حصہ یرت میں ہی بسر کرتے ہیں، البتہ سرمائی ٹھکانے پر، سردیوں کے دوران میں وہ گارے سے بنی موٹی دیواروں والے کچے گھر میں رہتے ہیں۔ صرف خان ہی نہیں، تمام کرغز خانہ بدوشوں کی نقل مکانی اور خود کو گرم رکھنے کے واسطے سرمائی ٹھکانوں میں رہائش کا یہی انداز ہے۔

سردیوں میں وہ وادی کے جنوبی حصے کی طرف ہجرت کرتے ہیں اور پھر موسم گرما شروع ہوتے ہی سبزے کی تلاش میں چند میل کی دوری سے پڑاؤ ڈالتے ہوئے شمال کی جانب، آہستہ آہستہ اوپر کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اس بار سرمائی پڑاؤ کی طرف نقل مکانی کے سفر میں، میں بھی شریک تھا۔ مجھے سواری کے لیے خان کے ریوڑ کا ایک یاک مل گیا تھا۔

نقل مکانی کے اس راستے میں ہی نہیں، پوری واخانی پٹی میں جدھر نظر ڈالو، پہاڑوں کی برف پوش بلند و بالا چوٹیاں اور ان کے اوپر تیرتے بادل ہی نظر آتے ہیں۔ یہ آسمان تک پہنچنے والی نظر کی راہ روکے رہتے ہیں۔ لگتا ہے کہ انسانوں کو اتنا قریب دیکھ کر آسمان بھی پردہ کرنے پر اتر آیا ہو۔

یہاں، دنیا کی اس چھت پر، دنیا کے کئی بڑے پہاڑی سلسلے باہم گلے ملتے ہیں، جن میں ہندوکش، قراقرم اور پامیر شامل ہیں۔ واخان کی یہ پٹی اور اس پر ایستادہ برف پوش پہاڑی سلسلے، مشرق و مغرب کی سمت بہنے والے کئی بڑے دریاؤں کی جنم بھومی بھی ہیں۔ انہی میں سے ایک دریائے آمو "یا" آمو دریا" بھی ہے۔ دریائے آمو وسط ایشیا کا ایک اہم آبی وسیلہ ہے۔

چلتے چلتے ہمارا کارواں دریائے عکسو کے کنارے پہنچا۔ سال کے ان ایام میں برف اور گلیشیروں کے پگھلنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، جس سے دریاؤں میں پانی کی مقدار بہت زیادہ اور بہاؤ خاصا تیز ہو جاتا ہے۔ اس وقت دریائے عکسو میں بھی طغیانی جیسا ماحول تھا۔ شفاف اور ہلکا سبز مائل پانی شور مچاتا تنگ گھاٹیوں سے گزر رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر خان نے کچھ دیر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ بھاری بوجھ سے بوجھل یاک تھک چکے ہیں، انہیں بھی کچھ آرام اور پانی کی ضرورت ہے۔ یاک بھی ہانپ رہے تھے، ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں پھٹی پھٹی لگ رہی تھیں۔ پیاس کی شدت اور ہانپنے کے باعث ان کے نتھنے بار بار تیزی سے کھل بند ہو رہے تھے۔

تمام بار بردار جانور کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تھوڑا سا آرام بھی ہو چکا تھا۔ اب باری دریا پار کرنے کی تھی اور وہ بھی ہانک کے۔ میرے لیے تو خیر یہ تجربہ نیا تھا لیکن ان کے لیے نہیں۔ خان کے برادر نسبتی کی ذمہ داری گھوڑوں اور دیگر مال بردار جانوروں کو دریا پار پہنچانے کی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگامیں اور دوسرے سے یاک کی نکیل تھامی اور ٹھنڈے بہتے پانی میں کود گیا۔ جانور اور وہ تیرتے

ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچے۔ جانور دریا پار کر گئے تو اب باری تھی بچوں کو دریا پار کرانے کی۔

خان کی سواری کے واسطے ایک گھوڑا تھا۔ اس نے اپنی پانچ سالہ بچی رابعہ کو سامنے بٹھایا۔ ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل کر کے مضبوطی سے اسے تھاما۔ اس کے پیچھے بیوی اور دو سالہ بچی عارفہ تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے لگام تھام کر گھوڑے کو دریا میں اتار لیا۔ بھیگنے سے بچنے کے لیے اس نے پاؤں اوپر اٹھا لیے تھے۔ اس کا چھ سالہ بیٹا کشن علی اور تین سالہ جوانشا اپنے ایک اور ماموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار دریا پار کر رہے تھے۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ تاحد نظر سرسبز چراگاہ، دریا کا شفاف پانی اور ویرانہ..... ایسے میں خانہ بدوش کے قدم خود بخود تھم جاتے ہیں۔ سرمائی ٹھکانے تک پہنچنے سے پہلی ہی خان کی سرداری میں کرغز خانہ بدوشوں کا عارضی پڑاؤ تھا۔ جب تک موسم سازگار اور چراگاہ ہری بھری تھی، تب تک یہی ان کا مسکن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پالتو مویشیوں کے ریوڑ بھی دریا میں تیرتے ہوئے پار اترنے لگے۔

خان اور اس کا برادر نسبتی مال بردار یاک، خچروں اور گھوڑوں پر لدا سامان اتار کر یرت لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گھرداری خاتون کی ذمہ داری، لہٰذا خان کی بیوی کی پوری توجہ یرت لگانے پر تھی۔ اگرچہ تکنیکی طور پر یہ موسم گرما تھا اور خان کے مطابق خوشگوار بھی لیکن سچ پوچھو تو سرد کاٹ دار ہوا جسم کو سن کیے جا رہی تھی۔

”یہ واخان ہے، اس کے مزے لو۔“ خان نے مجھے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو باہم رگڑتے دیکھا تو ہنس کر مشورہ دیا۔

”وہی کر رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ سرد موسم میں رہنے کے سبب میرے ہاتھوں کی کھال بھی کافی سخت ہو چکی تھی۔

خان کی بیوی بندھا سامان کھول رہی تھی، بچے اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے جبکہ مرد موبائل فون ملٹی میڈیا پر بجتے کسی کرغز گانے کی دھن میں مگن، یرت لگانے میں جتے تھے۔ موسیقی کسی زبان کی پابند نہیں، مجھے بھی دھن اچھی لگ رہی تھی۔ وہ تین تاروں پر مشتمل ستار یا گٹار جیسے کسی ساز سے نکل مسحور کن دھن تھی۔ یہ کرغز باشندوں کا روایتی ساز تھا جو افغانستان اور پاکستان میں پختونوں کے روایتی ساز ”رباب“ سے مشابہ ہے۔ کرغزیوں کا روایتی ساز شاید اس سے ذرا سا مختلف ہوگا۔ اس ساز کو کرغز زبان میں قموز کہتے ہیں۔

یرت لگانا بھی ایک فن ہے۔ یہ ٹکڑوں میں بٹی کسی تصویر کو درست طور پر جوڑ کر مکمل تصویر بنانے جیسا ہی ہے۔ اس کام میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ یرت کھڑا کر لینے کے بعد، یہ باہر سے بالکل غیر متاثر کن اور کسی لمبوترے آلو کی مانند بے کشش نظر آتا ہے۔ خود یرت کی طرح کرغز خانہ بدوش بھی بڑی حد تک غیر متاثر کن اور سماجی میل ملاپ سے دور رہ کر زندگی بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ زیادہ ہنستے بھی نہیں، مسکرانے میں بھی بہت کنجوس ہیں۔ ان کی کوئی کتاب نہیں، جس پر دعویٰ کر سکیں کہ ہم یہ میراث رکھتے ہیں۔ نہ وہ تاش کھیلتے ہیں نہ ہی بورڈ پر کھیلے جانے والا کوئی دوسرا روایتی کھیل البتہ خوشی کے موقع پر دائرے میں جمع ہو کر مرد ایک روایتی رقص ضرور کرتے ہیں۔ ہر رقص کرنے والے مرد کے ہاتھوں میں رومال ہوتا ہے جو اس کے تھرکتے قدم کے ساتھ ساتھ ہوا میں لہراتا ہے۔ یہ پاکستان اور افغانستان میں آباد پختونوں کے خٹک ڈانس سے مماثلت رکھتا ہے۔

کرغز خانہ بدوشوں کے ایک نوجوان کے سوا، جسے پنسل سے پورٹریٹ بنانے کا شوق تھا اور اس کے پاس ایک ڈرائنگ بک بھی تھی، جس میں اس کے بنائے نہایت عمدہ پورٹریٹ تھے، مجھے ایسا کوئی کرغزی نہ ملا، جسے فائن آرٹس میں دلچسپی ہوتی۔ میں نے کرغزیوں کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں بھی شرکت کی تھی مگر وہ بھی مکمل طور پر بے لطف رہی۔

عام طور پر کرغز خانہ بدوشوں کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں البتہ بزکشی ان کا روایتی کھیل ہے اور وہ ذوق و شوق سے اسے کھیلتے ہیں۔ یہ وسط ایشیائی ممالک اور خود افغانستان میں بھی کھیلا جانے والا صدیوں پرانا روایتی کھیل ہے، جس میں حصہ لینے والی ٹیموں کو میدان کے بیچوں بیچ ذبح کیے بے سر کے مینڈھے کو گھوڑا دوڑاتے ہوئے اٹھانا اور فتح کے لیے متعین منزل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ ترکی اور افغانستان سمیت وسط ایشیا کی متعدد ریاستوں میں آج بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور ریاستی سطح پر اس کے ٹورنامنٹ بھی منعقد ہوتے ہیں۔ اس روز شادی کی تقریب تھی اور مردوں کی تفریح طبع کے لیے بزکشی کا مقابلہ جاری تھا۔

عمومی طور پر کرغزیوں کو بد اخلاق کہا جا سکتا ہے۔ اگر راہ چلتے، باتیں کرتے کرتے کوئی کرغز بے تکلفی سے آپ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر سے کوئی شے باہر نکال لے تو

اسے غیر معمولی خیال مت کرنا۔ خیال کرتے ہو تو یہ آپ کا ہی خیال ہوگا۔ ان کے لیے یہ معمولی بات ہے۔ خود میرے ساتھ ایک سے زائد مرتبہ ایسا ہوا کہ باتیں کرتے کرتے کسی کرغز نے میرے کوٹ کی جیب میں یہ دیکھنے کے لیے ہاتھ ڈال دیا کہ اندر کیا رکھا ہے۔ ایسا بھی کئی بار ہوا کہ مخاطب نے باتیں کرتے کرتے، بلا اجازت میری ناک پر ٹکا دھوپ کا چشمہ اُچک کر، یہ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر چڑھا لیا کہ اس سے دھوپ کیسی نظر آتی ہے۔

کرغز گوشت خور ہیں اور بہت زیادہ گوشت کھاتے ہیں۔ وہ گوشت کو پتلے پتلے پارچوں کی شکل میں کاٹ کر بھونتے ہیں۔ ایک کرغز سے یہ بعید نہیں کہ وہ گوشت کا ایک پارچہ لے کر کھا رہا ہو اور جب اُس سے کھایا نہ جائے تو وہ جیب میں رکھ لے، اگلی بار بھوک لگنے کی صورت میں فوری کھانے کے واسطے۔

کرغزی موبائل فون پر موسیقی سننے کے بہت شوقین ہیں لیکن روایتی طور پر ان خانہ بدوشوں کو گیت گنگنانے سے کچھ خاص رغبت نہیں۔ اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ بقول خان "یہ وہ سرزمین ہے، جہاں کوئی بچہ پیدا ہو کر مرنے سے بچ جائے تو بہت تیزی سے بوڑھا ہونے لگتا ہے۔"

واخان کی پٹی کے سخت ترین موسمی جبر نے، کرغز خانہ بدوشوں کو زندگی کی بقا کے سوا کچھ اور سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ سال کا زیادہ تر حصہ، یہاں درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے نہیں بلکہ بہت نیچے رہتا ہے۔ ٹھنڈ اور برف باری کے سبب ہر وقت لہو رگوں میں جمتا محسوس ہوتا ہے۔ مویشیوں کے گلّے ان کا معاش ہی نہیں، خوراک بھی ہے۔ ان کی کھالیں سرد ترین موسموں سے بچاؤ کے لیے یُرت بنانے سمیت کئی کاموں میں استعمال ہوتی ہیں۔ رگوں میں لہو جماتی، تقریباً سال بھر کی ٹھنڈ میں اگر انہیں کہیں سازگار ماحول میسر آتا ہے تو وہ یُرت ہے۔ بقائے حیات، ان کا اوّل و آخر مقصدِ حیات ہے۔ یہاں زندگی مشکل نہیں، مشکل ترین ہے۔ ایسے میں کسی واخانی - کرغز خانہ بدوش کی جمالیاتی حس کیسے پروان چڑھ سکتی ہے، البتہ جہاں تک ان کے یُرت کا معاملہ ہے تو وہ نہایت خوبصورت اور لہو گرما دینے والے رنگوں سے سجا اور اُن کے ایسے جمالیاتی جذبے کا مظہر ہے جو صرف یُرت کے اندر بیدار ہوتا ہے۔

باہر سے بے کشش نظر آنے والے یُرت کے داخلی دروازے پر چڑھے نہایت موٹے اور بھاری پردے کو اٹھا کر

دنیا کے کسی بھی کونے میں [illegible]

گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 35895313 فیکس: 35802551

جب تک اندر قدم نہ رکھا جائے، جب تک کرغزیوں کے جمالیاتی ذوق کا احساس ہی نہیں ہوتا لیکن پہلا قدم اندر رکھتے ہی جو احساس جنم لیتا ہے، وہ خوشگوار حدت کا ہے۔ دوسری نظر یُرت کے اندرونی ماحول پر پڑتی ہے اور اگر آپ میری طرح اجنبی ہیں اور باہر کے موسم کی سختیوں سے لڑتے ہوئے پہلی بار کسی یُرت میں قدم رکھ رہے ہیں تو پھر آپ کے لیے سب کچھ یک دم تبدیل ہو جاتا ہے۔ بیرونی دنیا اور واخان کا سخت موسم، لمحہ بھر میں ذہن و دل سے محو ہو جاتا ہے اور آپ کرغز خانہ بدوشوں کی سرزمین کا قلب میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یُرت کی اندرونی چار دیواری رنگین اور دلکش نقش و نگار والے قالینوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ پھول، مناظر، گھوڑے، اقلیدسی نمونے...... یہ سب ان سجاوٹی قالینوں کی منفرد شناخت ہے۔ ان کے شوخ رنگ سرد موسم والے واخانی باشندوں کے لہو میں دوڑتی حرارت کا استعارہ ہیں۔ یہ صرف سجاوٹی اشیا ہی نہیں بلکہ اس سے یُرت کے اندر کا درجۂ حرارت خوشگوار رکھنے اور حرارت کے اخراج کو روکنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے یُرت والے کھانا کھانے، باتیں کرنے اور آرام کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔ یہی ان کا بیڈروم، ڈرائنگ روم، لیونگ روم اور ڈائننگ ہال ہوتا ہے۔

ہر یُرت کے اندر ایک الاؤ روشن رہتا ہے یا پھر لوہے کی بنی انگیٹھی ہر وقت دہکتی رہتی ہے۔ واخان میں لکڑی موجود نہیں۔ الاؤ اور انگیٹھی دہکانے کے لیے یاک کے گوبر سے بنے اُپلے استعمال کیے جاتے ہیں، جس سے یُرت کے اندر ہر وقت ایک عجیب سی بو پھیلی رہتی ہے مگر اسے ناقابلِ برداشت ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

الاؤ ہو یا انگیٹھی، اُن پر ہر وقت ایک کیتلی دھری رہتی ہے، جس میں قہوہ اُبلتا رہتا ہے۔ قہوہ یا چائے، واخانیوں کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ وہ چائے میں شکر کی بجائے نمک استعمال کرتے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دودھ یاک کا ہی ہوتا ہے۔ وہ قہوے کے شوقین نہیں بلکہ یہ اُن کی ایک لت ہے۔ ایرجل نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ تقریباً ایک سو بیس پیالی قہوہ نوشِ جاں فرماتے ہیں۔ اس تعداد پر دوسرے شک کی انگلی اٹھا سکتے ہیں لیکن جس طرح میں نے کرغزیوں کو قہوہ حلق میں انڈیلتے دیکھا، اس کے پیشِ نظر کہہ سکتا ہوں کہ وہ پیالیوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کر رہے تھے۔

کرغز باشندے یاک کے دودھ سے بنا دہی بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہمارے استعمال والے دہی کے مقابلے میں کچھ سخت ہوتا ہے۔ وہ یاک کے دودھ سے پنیر بھی بناتے ہیں لیکن یہ بھی خاصا ٹھوس ہوتا ہے۔ وہ اسے گروت کہتے ہیں۔ یہ بڑی مزیدار چیز ہے۔ آپ اسے توڑیں اور ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر کئی منٹ تک چیونگم کی طرح چباتے رہیں۔ آہستہ آہستہ وہ منہ میں ہی گھلنے لگتا ہے۔ اُن کی روٹیاں پیزا سے مشابہ ہوتی ہیں۔ گوشت عام خوراک میں شامل ہے مگر مہمانوں کی تواضع کے لیے خاص طور پر بھیڑ ذبح کی جاتی ہے۔ ان کے کھانوں میں جنگلی سبزیوں بالخصوص پیاز کا استعمال بھی عام ہے۔ عام طور پر یہاں پائی جانے والی سبز پیاز لمبائی میں خاصی چھوٹی ہوتی ہے۔

یہاں کرغزیوں کے یُرت کے علاوہ دیکھنے کی ایک اور چیز بھی ہے۔ یہ ہے یہاں کی خواتین کے زیرِ استعمال روز مرہ کا لباس۔ مرد تقریبات کے موقع پر خاص لباس زیب تن کرتے ہیں لیکن کرغز خواتین کا عام لباس بھی فن سلائی و کڑھائی کا شاہکار ہوتا ہے۔ وہ سر پر ایک لمبوتری ٹوپی پہنتی ہیں، جس کے پیچھے ایک بڑا سا دوپٹا ہوتا ہے جو سینے اور گردن سے نیچے کمر تک کے حصے کو ڈھانپے رکھتا ہے۔ یہ ٹوپی شادی شدہ اور کنواریوں کے درمیان فرق کا اظہار بھی کرتی ہے۔ کنواری سفید جب کہ شادی شدہ خواتین سرخ رنگ کی ٹوپی اوڑھتی ہیں۔

عام طور پر کرغز خواتین کھلتے سرخ رنگ کے کپڑے پہننا پسند کرتی ہیں، جس کے اوپر واسکٹ ہوتی ہے۔ یہ واسکٹ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ کالر پر پلاسٹک کے رنگ برنگ مختلف سائز کے بہت سارے بٹن، کوڑیاں اور سیپیاں تک ٹانک دی جاتی ہیں۔ میں نے ایک خاتون کو دیکھا جس نے اپنی واسکٹ پر پرفیوم کی ایک ننھی سی چھوٹی بوتل کو بڑے سلیقے سے آرائش کی خاطر ٹانک رکھا تھا۔ واسکٹ کے بالائی حصے پر سورج کی شکل کا سرخ بروچ بنایا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ چمڑے کا ایک چھوٹا سا پرس بھی لٹکا ہوتا ہے۔ اس پر عموماً آیاتِ قرآنی کشیدہ کی جاتی ہیں۔ میں نے بعض خواتین کی واسکٹ پر مختلف ملکوں کے سکے بھی ٹنکے دیکھے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک کرغز خاتون کی واسکٹ کے سامنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مُکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مُکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

والے حصے پر کئی ناخن کٹے لٹکے دیکھے تو بہت حیرت ہوئی۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ نظر بد اور ماورائی طاقتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے ٹانکا گیا تھا۔ یہ سب دیکھنے کے بعد بھی اگر میں کرغز خواتین کے جمالیاتی ذوق اور آرائشی اختراع کی داد نہ دیتا تو بڑی زیادتی ہوتی۔

کرغز خواتین کا ایک اور پہلو آرائش گیسو ہے۔ لمبے بالوں کی ایک نہیں کئی کئی چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں، جن پر چاندی کے آرائشی زیورات لٹکائے جاتے ہیں۔ انہیں سنگھار کے ساتھ ساتھ ہار کا بھی بہت شوق ہے۔ میں نے کوئی خاتون ایسی نہ دیکھی جس کی گردن خالی ہو۔ سب کے گلے میں ہار تھے اور ایک سے زیادہ۔ انہیں سنورنے کے ساتھ ساتھ سجنے کے لیے زیورات پہننے کا جو شوق ہے اس کی عمدہ مثال انگوٹھیاں ہیں۔ درمیانی انگلی کو چھوڑ کر، کرغز خواتین کے ہاتھ کی ہر انگلی حتیٰ کہ انگوٹھے تک میں بھی، رنگ برنگے پتھروں کی جڑاؤ انگوٹھیاں نظر آتی ہیں۔ بات یہیں تک محدود نہیں، کنگن بھی عام استعمال میں ہے۔ بندے لازم ہیں لیکن بڑے سائز کے ہوں، ہندوستان کے جھمکوں جیسے اور گھڑی تو ایک کافی نہیں، دو تین ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک خاتون کی دونوں کلائیوں پر گھڑیاں بندھی تھیں۔ گنا تو وہ چھ تھیں۔ شاید اسے یہ تعداد مناسب لگی ہو پھر بھی بہتری کی گنجائش ضرور موجود تھی۔

ان کی روز مرہ زندگی سخت مشقت سے عبارت ہے۔ کرغز خواتین کے روز مرہ معمولات میں سلائی، کڑھائی، بنائی، کھانا پکانے، صفائی ستھرائی، بچے پیدا کرنے اور انہیں پالنے کے علاوہ، دن میں دو بار یاک کا دودھ دوہنے، ان سے دہی اور پنیر بنانا بھی شامل ہے۔ پالتو جانوروں کے اصطبل کی صفائی ستھرائی میں بھی یہ حصہ لیتی ہیں اور نقل مکانی کی تیاری ان کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ بہت شرمیلی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مرد ان کے قریب موجود ہو تو کھل کر بات نہیں کرتیں۔ مجھے ایک کرغز خاتون سے صرف یہ جاننے میں ایک گھنٹا لگا کہ آخر اس نے ہاتھ کی ایک کلائی میں تین گھڑیاں کیوں باندھ رکھی ہیں۔ کافی رد و قدح کے بعد شرماتے ہوئے اس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ "یہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔"

ان کے شرمانے کا عالم یہ ہے کہ میں خان کے کیمپ میں اس کے ساتھ کئی ہفتے رہا لیکن مجال ہے کہ اس کی بیوی نے کبھی مجھ سے ایک لفظ بھی کہا ہو۔ میں نے اتنی زیادہ شرمیلی خواتین پہلے کہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان کی زندگی بہت محدود ہے۔ اگر ایک اوسط عمر کی کرغز خاتون کی زندگی کا احاطہ کریں تو وہ جہاں پیدا ہوتی ہیں، وہاں سے صرف چند میل کی دوری تک ہی، اس کا سفر حیات محدود رہتا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے طویل سفر ماں باپ کے گھر سے بیاہ کر شوہر کے یُرت تک پہنچنے کا ہے۔ یہ بھی چند میل سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد، ان کی زندگی کا دائرہ اور بھی سمٹ جاتا ہے۔ بقول خان "ہم اُن احمق لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ہر جگہ بیوی کو دُم چھلا بنائے پھرتے رہتے ہیں۔"

کرغز باشندوں میں کم عمری کی شادیوں کا رواج ہے۔ لڑکی ہو یا لڑکا، دس سے پندرہ برس کی عمر تک شادیاں کردی جاتی ہیں۔ جب خان کی شادی ہوئی تو وہ پندرہ جب کہ اس کی بیوی تیرہ برس کی تھی۔ عموماً ان شادیوں میں 'لو میرج' کا تصور دور دور تک نہیں۔ شادیاں گھر کے بڑے طے کرتے ہیں، جن میں 'بچوں' کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

جن چند کرغز خواتین نے مجھ سے کھل کر بات کی، اُن میں ایک بزرگ خاتون یاز بی بی بھی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور اُن کا اندازہ تھا کہ عمر ستر برس تو ہوگی۔ اُن کی پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ وہ سب کے سب اس جہان سے گزر چکے تھے۔ یاز بی بی کا کہنا تھا کہ "مرد یاک کا دودھ نہیں دوہتے، وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا نہیں بنا سکتے، بچوں کی دیکھ بھال تو درکنار وہ تو خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اگر عورت نہ ہو مرد تو ایک دن بھی دنیا میں نہیں جی سکتا۔"

کرغز باشندوں کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اپنی پوری تاریخ میں وہ کبھی بھی کسی حکومت یا کسی ایک بادشاہ کے تابع نہیں رہے۔ ہمیشہ اُن کی زندگی آزادی سے عبارت رہی ہے۔ ایک کرغز باشندے نے بڑے فخر سے بڑی اہم بات مجھ سے کہی تھی۔ "ہم وہ آزاد اور جنگلی گھوڑے ہیں جس پر آج تک کوئی شکاری اپنی کمند ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔" کرغزیوں کی اصل حقیقت کیا ہے، یہ بات اب تک تاریخ کے تاریک پردوں میں لپٹی ہے۔

کرغزیوں کا سب سے اولین تذکرہ دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی چینی دستاویزات میں ملتا ہے، جس میں ان کا تعلق التے سلسلہ کوہ سے بتایا گیا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ آج روس، سائبیریا اور منگولیا میں واقع ہے۔

ماہر بشریات نازف شاہرانی لفظ 'کرغز' کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "یہ ایک سے زائد الفاظ کا مجموعہ بھی ہوسکتا ہے جیسے 'کیرک جس' کا مطلب ہے 'چالیس' اور 'کیز' جس کا مطلب لڑکی ہے۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ چالیس ماؤں کی اولاد ہوں جو اتنی پھلی پھولی کہ اسی مناسبت سے 'کرغز' کہلانے لگی ہوں۔"

وجہ تسمیہ دلچسپ اور لوک کہانیوں جیسی ہے لیکن اس پر اکتفا کرلینا کچھ بہتر نہیں۔ تاریخ کو کھنگالنے اور تحقیق کرنے کی یہاں بہت گنجائش موجود ہے۔

تعداد کے لحاظ سے افغان کرغز خانہ بدوش قبیلہ بہت بڑا نہیں۔ یہ صدیوں سے وسط ایشیائی چراگاہوں میں پھرتے رہے ہیں۔ تاریخ میں یہ لوگ وسط ایشیا سے گزرنے والے 'سلک روٹ' یا شاہراہ ریشم کے تجارتی قافلوں کو لوٹنے کی بھی شہرت رکھتے ہیں۔

سن سترہ سو کے دوران میں انہوں نے افغانستان کی اس وادی میں اپنے قدم جمانے کا آغاز کیا جو آج موسم گرما کے لیے ان کے مویشیوں کی چراگاہ ہے۔ سخت سردیوں سے بچاؤ کے لیے وہ یہاں سے وادی کی ترائی میں اتر جاتے ہیں لیکن جونہی طویل اور سخت موسم سرما ختم ہونے لگتا ہے، وہ ایک بار پھر بلندی پر واقع گرمائی چراگاہوں کے لیے نقل مکانی کی تیاریاں شروع کردیتے ہیں، جہاں وہ اگلے موسم سرما کے شروع ہونے تک ڈیرا ڈالے رکھتے ہیں۔

آزاد منش کرغز قبائل کو بیرونی تسلط سے آزاد رہنے پر فخر ہے جو کچھ غلط بھی نہیں لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کے اندر جاری نوآبادیاتی لہر اور کمیونزم کے ٹکراؤ سے برطانیہ اور روس کا جو 'گریٹ گیم' شروع ہوا تھا، کرغز خانہ بدوش اور ان کا یہ خطہ بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

1950ء میں ان پر تمام سرحدیں بند کردی گئیں اور نیڈ کیلمن نے کہا کہ "تکنیکی طور پر کرغز افغان باشندے بن چکے ہیں۔" اس کے بعد وہ کئی سالوں تک واخان کی پٹی تک ہی محدود رہے۔

1978ء میں، کابل میں بغاوت ہوئی اور اس کے نتیجے میں سابق سوویت یونین نے فوجی مداخلت کی۔ کرغز خانہ بدوشوں کو خوف لاحق ہوا کہ اس کے نتیجے میں افغانستان بھی کمیونسٹ ملک بن جائے گا۔ اس وقت تقریباً تمام کرغز باشندوں، جن کی کل تعداد تیرہ سو کے لگ بھگ تھی، نے متفقہ طور پر رحمان قل کو اپنا پہلا خان منتخب کیا اور پاکستان میں شمالی ہندوکش سلسلہ کوہ کی جانب ہجرت کر گئے۔

ہجرت کے پہلے ہی سال کرغز مہاجرین وبا کا شکار ہوئے اور بیماریوں نے ایک سو سے زائد چھوٹوں اور بڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگرچہ اس صورت حال نے انہیں واپسی پر مجبور کیا لیکن ان کے خان رحمان قل نے زور دیا کہ وہ پاکستان میں ہی رہیں۔ اس نے خبردار کیا کہ سوویت فوج صرف ان کی آزادی ہی سلب نہیں کرے گی بلکہ ان کے ایمان پر بھی حملے کرے گی۔ ایسے میں بہت سارے کرغزیوں کو قیادت کی سوچ پر شک ہو رہا تھا۔

وہ دنیا کی چھت پر زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے۔ ہجرت کے اس عرصے میں انہیں اپنی وادی کی یاد بُری طرح ستاتی رہی تھی۔ بس! یہیں سے پاکستان ہجرت کرنے والے کرغزیوں میں تقسیم شروع ہوئی۔ وہ دھڑے بن گئے۔ ایک، متفقہ منتخب رحمان قل کی حمایت کر رہا تھا، دوسرے کی سربراہی موجودہ خان کے والد عبدالرشید کررہے تھے۔ بات بڑھ گئی۔ عبدالرشید نے تین سو کرغزیوں کے ساتھ افغانستان لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ساتھ واخان لوٹنے والوں میں ابرعلی بھی شامل تھے۔ یہ وہ موقع تھا کہ جب لوٹنے والوں نے رحمان قل کو مسترد کرکے عبدالرشید کو اپنا نیا خان منتخب کیا۔

کابل پر سوویت تسلط مضبوط ہو چکا تھا۔ ان کے واپس لوٹنے پر سوویت فوج کمال مہربانی سے پیش آئی۔ پاکستان ہجرت کرنے والے تین سو کرغزی اپنی سرزمین پر لوٹ آئے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوچکی تھی۔ اگرچہ کرغزیوں میں، شیر خوار اور کمسن بچوں میں شرح اموات خطرناک حد تک زیادہ ہے لیکن پھر بھی، گزشتہ تین دہائیوں کے درمیان ان کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ آج ان کی تعداد ایک ہزار نفوس سے تجاوز کرچکی ہے۔

عبدالرشید کے برعکس، جنہوں نے رحمان قل کی سربراہی میں پاکستان کے اندر ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ بھی نذر کے۔ انہوں نے بھی نقل مکانی کی۔ اس وقت وہ مشرقی ترکی کے ایک گاؤں میں آباد ہوچکے ہیں، جس کا نام موکی کنز ہے۔ اس گاؤں میں پکے مکانات ہیں۔ جہاں ان باشندوں کو بجلی، کیبل ٹی وی نیٹ ورک، پختہ سڑکوں اور کار جیسی تمام سہولیات حاصل ہیں۔ ان کرغز خانہ بدوشوں کی زندگی اب نئے رخ پر ہے۔ وہ اپنے نام کے آخر میں

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیئر فیس

FAIR FACE

www.facebook.com/toptreatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو
گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

GROTALL

HELPLINE ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دواخانہ پر دستیاب

TT

042-35789145 6.0334-4266255

Email toptreatments@gmail.com Website www.toptreatments.net

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ترک شناخت استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بچے اس زندگی کے عادی ہو چکے۔ وہ گھڑ سواری اور بزکشی کے بجائے وڈیو گیم سے لطف اندوز ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کے غسل خانوں میں فراہمی و نکاسیِ آب کا جدید نظام ہے اور وہ ٹوائلٹ کے لیے فلش سسٹم کی سہولت سے استفادہ کرتے ہیں۔

کابل کے تازہ ترین دورے کے دوران میں اچانک ایک دن خان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ اسپتال گیا۔ ڈاکٹروں نے اپینڈکس کی سوزش تشخیص کی۔ آپریشن تجویز ہوا اور کامیاب بھی رہا۔ اگرچہ یہ نہایت معمولی نوعیت کا آپریشن ہے لیکن اس کے لیے ہرگز معمولی نہیں۔ وہ اسے اپنی زندگی کے لیے بہت اہم تصور کرتا ہے۔ "اگر یہ مسئلہ میری وادی میں پیش آتا تو پھر بچنا محال تھا۔ میں نے اپنے کئی ساتھیوں کو اس تکلیف کے باعث مرتے دیکھا ہے۔"

اکثر اوقات، بالخصوص رات کو یرت کے خوش گوار ماحول میں آگ کے گرد بیٹھ کر، قہوے کی چسکیاں بھرنے والے کرغزیوں کی گفتگو کا پسندیدہ موضوع یہ ہے کہ آباد ہونے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور بھی جگہ ہو سکتی ہے؟ اکثر وہ اس معاملے پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہجرت کے لیے تیار ہیں لیکن اس [illegible] آزادی کو خطرہ لاحق ہے نہ ایمان [illegible] بار معاملہ ہے سہولتوں تک رسائی [illegible]

[illegible] امت کے بعد سے آج تک، افغانستان [illegible] تیس برس [illegible] ملک کے مختلف حصوں میں [illegible] خانہ جنگی جاری ہے لیکن کرغزیوں کے واخان میں ایسا کچھ نہیں۔ یہاں امن و امان مستحکم ہے لیکن واخان کے [illegible] کرغزی اب واخانی پٹی تک محدود زندگی کے دائرے سے باہر قدم نکال کر دیکھ چکے۔ شاید وہ صدیوں تک چراگاہوں کی تلاش میں چل چل کر تھک چکے اور اب مٹی پر پاؤں جمانا چاہتے ہیں۔ ہجرت کا تجربہ ان کے پاس ہے اور نقل مکانی خون میں رچی بسی۔ یہ لوگ اب واخان کی بجائے کہیں اور جا کر بسنا چاہتے ہیں۔ گو کہ معاملہ اب تک صرف گفتگو کی حد تک ہے مگر گفتگو جاری ہے اور یہ تحریک بھی بن سکتی ہے۔

واخان کے بہت سارے کرغزی اب سابق سوویت یونین کی آزاد ریاست کرغزستان کی ہجرت پر سوچ رہے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ زبان ایک ہے اور صدیوں پرانے ثقافتی رشتے اور نسلی تعلق بھی۔ فی الحال تو اس کے آثار نہیں لیکن یہ آپشن ہے جسے وہ کبھی بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ آخر ہیں تو آزاد منش خانہ بدوش!

افغان کرغزیوں کے نوجوان خان کو بھی ضروریات کے حل اور سہولتوں کی تلاش میں ہجرت کے اس خیال سے مفر نہیں۔ خود اس نے بھی یہ حقیقت تسلیم کی۔ "میں بھی اکثر سوچتا ہوں کہ واخان چھوڑ کر افغان سرزمین کے کسی چھوٹے سے شہر میں جا کر بس جاؤں۔ میرے خاندان کے مسائل تو حل ہوں گے۔ ہمیں وہ سہولتیں تو ملیں گی جنھیں ہمارے جیسے دوسرے انسان استعمال کر کے اپنی زندگی آسان بنا رہے ہیں۔"

جب خان نے یہ اعتراف کیا، اس وقت ہم موسمِ گرما کی چراگاہ میں بیٹھے تھے۔ سامنے بھیڑوں کا گلہ سرسبز میدان میں گھاس چر رہا تھا۔ خوش گوار موسم میں کئی یرت ہمارے سامنے تھے لیکن اس کی بات سننے کے بعد میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

سہولتوں کی تلاش میں جب کرغز اپنی صدیوں قدیم سرزمین چھوڑنے پر خود کو آمادہ کر بیٹھے ہوں تو پھر یہ کہنا مشکل نہیں کہ شاید آنے والی کسی دہائی میں، واخان کی اس پٹی میں شاید ہی کوئی کرغز خانہ بدوش اپنے ریوڑ سمیت چراگاہوں کا رخ کرتا نظر آئے۔ کسی بلند پہاڑ پر چڑھ کر دیکھو تو سبز میدان میں لگے یہ یرت کسی [illegible] کے ماتھے پر [illegible] جھومر کی مانند نظر آتے ہیں۔ اگر کرغز نقل مکانی کر گئے تو [illegible] واخان کی اس پٹی کے ماتھے کا جھومر چھینا جائے گا۔ کچھ نہیں کہہ سکتے!

ایک ہزار سے کچھ زیادہ کرغز خانہ بدوش صدیوں سے اس سرزمین پر آباد ہیں۔ انہی کے دم قدم سے دنیا کے اس انتہائی بلند مقام پر زندگی کی رمق نظر آتی ہے۔ شاید واخان کی پٹی ان کے بعد بھوتوں کی بستی بن کر رہ جائے گی۔ "ایسا نہ ہو۔" میرے منہ سے نکلا۔ پلٹ کر دیکھا تو میری خود کلامی پر خان حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے مسائل کا حل چاہتا ہے۔ تعلیم، علاج کی بنیادی سہولتیں، پکی سڑک اور ہاں..... ایک کار بھی۔

"کیا ہوا۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... بس اور اپنے دھیان میں منہ سے کچھ نکل گیا۔" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے بات ٹال دی۔ بتا دیتا تو وہ برا مان جاتا۔ میری دعا شاید اسے بددعا لگتی۔

اتنے دنوں سے اُس کا نمک کھا رہا ہوں، نمک حرامی کا یوں برملا اعتراف اچھا نہیں لگتا!!

خان کی گرمائی چراگاہ میں یہ دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ جب ایک اہم خبر پہنچی۔ کابل سے دو سرکاری انجینئر سروے کے لیے آئے تھے۔ وہ موجودہ سڑک کو اس کے اختتام سے لے کر کرغز پہاڑوں تک توسیع دینے کی خاطر ایک سروے کرنا چاہتے تھے۔ یہ خبر خان کے لیے بہت خوش کن تھی۔

”سڑک تعمیر ہو گئی تو پھر گھوڑوں کے ذریعے تین دن کا سفر چند گھنٹے کا رہ جائے گا اور میں کار بھی خرید لوں گا۔“ یہ خبر سن کر اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ خان کو ایک بار پھر اپنا خواب تعبیر سے قریب تر دکھائی دے رہا تھا۔ اسے انجینئروں سے ملاقات کے لیے جانا تھا۔ یہ ملاقات خان کی حیثیت سے ہونی تھی۔

ہم یُرت میں بیٹھے تھے۔ دوسرے دن خان کو انجینئروں سے ملاقات کے لیے نیچے جانا تھا۔ اس کی بیوی لوہے کے صندوق سے خان کا بہترین لباس نکال رہی تھی۔ اسے خان کے سفر کی تیاری کرنا تھی۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ جانے والی تھی۔ اس نے اون سے بنا سرخ رنگ کا بہترین لباس نکالا۔ واقعی اس پر بہت خوبصورت اور دلکش پھول بوٹے کشید کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی چمڑے کے لمبے سفری جوتے، پرفیوم کی ایک چھوٹی سی بوتل اور سیاہ و سفید رنگوں سے بنا دوپٹا۔ وہ نسوار کی ڈبی رکھنا نہیں بھولی تھی۔ دوسری کرغز خواتین کی طرح وہ بھی نسوار استعمال کرتی تھی۔ سڑک بننے کی خوشخبری، شوہر کے ساتھ پُرلطف سفر یا گھٹی بندھی زندگی سے تھوڑا سا فرار..... وہ بہت خوش تھی مگر میں اس کے خوش ہونے کی حقیقی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”سڑک بننے کی خبر سے سب ہی بہت خوش ہیں۔“ خان نے قہوے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ صندوق پر سر جھکا کر کھڑی اس کی بیوی بھی سر ہلا کر شوہر کی تائید کر رہی تھی۔

دوسرے دن وہ سویرے سویرے سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ روانگی کے لیے گھوڑے پر سوار تھے۔ میں خدا حافظ کہنے کے لیے کھڑا تھا۔ ”اس بار سڑک بننے کے امکانات سو فیصد ہیں۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”دعا کرنا..... اللہ حافظ۔“ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

اس کا یہ سفر کم و بیش آٹھ دس روز کا تھا۔ اس دوران میں مجھے تنہا ہی اس علاقے میں گھومنا پھرنا تھا۔ میں نے اسے جاتا دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ دعا کر رہا تھا کہ سڑک بن جائے ورنہ کرغز جا بھی سکتے ہیں۔ میں نے وادی پر نظر ڈالی۔ ”اتنی اونچائی، سخت سردی اور مشکل ترین قدرتی ماحول میں کرغز خانہ بدوش ہی رہ سکتے ہیں۔ یہ بھی چلے گئے تو اب کوئی اور یہاں آ کر آباد نہیں ہونے والا۔ ”اے اللہ..... اس بار تو سڑک بنا دے ورنہ.....“ مجھے یقین تھا کہ آگے کی بات اوپر والا سمجھ چکا ہوگا۔ اتنی بلندی پر ویسے ہی اللہ اور فطرت سے انسان کا تعلق زیادہ گہرا، قریبی اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

میں ایک پہاڑی کے اوپر پہنچا۔ وہاں سے میں خان کو نیچے اترتا دیکھ سکتا تھا۔ وہ بہت اعتماد سے آڑے ترچھے پہاڑی راستوں پر گھوڑا آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی رفتار دیکھ کر لگا کہ منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ نظر آ رہا تھا کہ وہ جس سڑک کے سپنے دیکھتا تھا، اس بار حقیقت میں بدلنے جا رہا ہے لیکن ایک ایسا ملک جہاں سخت غربت اور پسماندگی ہو، جہاں امن کی حالت پتلی اور خانہ جنگی کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں، تجارتی سرگرمیاں کم اور صنعتی پیداوار نہ ہونے کے برابر ہو، جہاں درآمدات تو بہت مگر برآمدات کچھ خاص نہ ہوں، وہاں ایک سڑک کی تعمیر اور وہ بھی خان کی سوچ کے عین مطابق [illegible] ملک کی ضروریات اور ترجیحات کا کچھ شمار نہیں۔ خان کی سڑک کس فہرست کی ہونی تھی۔

ویسے بھی افغانستان جیسے ملک میں ایک سڑک کی تعمیر سہل کام نہیں، وہ بھی ایسی سڑک جسے دشوار گزار پہاڑی علاقے میں چٹانوں کو تراش کر بنانا ہو۔ اس پر لاکھوں شاید کروڑوں ڈالر کا خرچ ہوگا۔ خرچ کم نہیں لیکن اس سے جو سہولتیں ملیں گی، ان کی قیمت بھی کم نہیں، خاص طور پر ان کرغزیوں کے لیے جو ایک سڑک نہ ہونے کے باعث تعلیم سے دور اور علاج کی سہولتوں سے محروم ہیں، جس کے باعث وہاں شرح اموات خطرناک حد تک زیادہ ہے۔ شاید ایک سڑک ان کی زندگی اور واخان کی پٹی کے اس حصے میں موجود کرغز خانہ بدوش ثقافت کو بچا سکے۔ شاید..... یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ ہنوز سڑک دور است!

اُس روز خان کی غیر موجودگی میں سڑک کی بات

ہو رہی تھی اور ایرعلی بھی ساتھ تھے۔ "سڑک کی تعمیر کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔" میں نے اُن سے اتفاق کیا۔

"وہ بتا رہے تھے کہ جب موجودہ خان کے والد زندہ تھے تب بھی ان کی کوششوں سے ایک بار کابل کے سرکاری انجینئر سڑک بنانے کے لیے سروے کرنے پہنچے تھے مگر......"

انہوں نے سامنے پہاڑ کی طرف غور سے دیکھا اور پھر چہرہ میری طرف کیا۔ "اُس وقت بھی سروے ہوا تھا، وہ خان بھی بہت خوش تھا لیکن ......" اس نے کھائی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم اب بھی تھوڑا ڈرتے ہیں۔ اس بار بھی سروے ضرور ہو گا مگر سڑک کا بننا آسان نہیں۔" وہ نئے خان کا جوش جانتے تھے۔ ان کی دعائیں اُسی کے ساتھ تھیں مگر پرانے خان کا تجربہ یادداشت سے محو نہیں ہوا تھا۔ "سڑک کا بننا اتنا آسان نہیں۔" یہ سن کر میں نے بھی سر ہلا دیا تھا۔ اب یہ علم نہیں کہ تائید میں ہلا تھا یا تردید میں۔

ویسے ایرعلی اور خان کی سوچ میں کافی فرق تھا۔ خان کے لیے سڑک اور کار اہم تھی لیکن یہ کچھ اور بھی سوچتے تھے۔ "سڑک آسانیوں کے ساتھ اپنے مسائل بھی لے کر آتی ہے۔" انہوں نے قہوے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ "یقیناً سڑک بنے گی تو سہولتیں ملیں گی مگر اس کے ساتھ ہی یہاں فوج اور اجنبی سیاح بھی پہنچیں گے۔ زندگی کی نئی سہولتیں [illegible] تو جلد سے نوجوان اور آنے والی نسلیں بھی شہریوں کی [illegible] تن آسان اور سست ہو جائیں گے۔ ہمارے کھانے پینے، رہنے سہنے، رشتے تعلق...... سب کچھ بدل سکتا ہے۔ سڑک انسانی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اتنا گہرا کہ وہ صدیوں پرانی اجداد کی روایات اور اپنی ہزار ہا برس قدیم ثقافت...... آہستہ آہستہ سب سے لاتعلق ہوتا چلا جاتا ہے۔"

میں سمجھ گیا تھا۔ اسے عام طور پر جنریشن گیپ (نسلوں کے درمیان سوچ کا فرق) کہتے ہیں۔ خان کے لیے کار اہم [illegible] لیے سڑک لیکن [illegible] تک جھک پوری زندگی [illegible] والے جہاں دیدہ ایرعلی کے واسطے اب سہولتیں نہیں، اپنی ثقافت اور اجداد کے ریت رواج زیادہ عزیز تھے۔ ایرعلی اور خان ساتھ ساتھ تھے مگر دونوں کی سوچیں اپنے اپنے دائرے میں تھیں۔

اس کے بعد کافی دیر تک یُرت میں خاموشی طاری رہی۔ آخر قہوے کی مہک ہمیں حقیقت کی دنیا میں واپس لائی۔ بھاپ اڑاتے خوشبودار گرما گرم قہوے کی پیالی سامنے تھی۔ ایرعلی نے ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھا۔ "یہاں کے لوگ سڑک چاہتے ہیں تاکہ گھوڑے کی پیٹھ کی بجائے کار کی نرم نرم گدیوں پر بیٹھ کر سفر کریں۔ سمجھتے ہیں کہ اس سے انہیں خوشی ملے گی مگر......"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑی تو میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

وہ سمجھ گئے تھے، دوبارہ بات شروع کی۔ "یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم ایک بڑے خاندان کی صورت یہاں امن اور پیار سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے پُرامن مقام ہے۔"

یہ سننے کے بعد میرے چشم تصور میں خان ابھر آیا۔ سرخ گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیزی سے دوڑاتے ہوئے وہ سڑک کا سروے کرنے والے انجینئروں سے ملنے جا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحے میں نے آنے والے زمانے میں پہاڑی راستوں پر بل کھاتی، ہموار اور خوبصورت سڑک دیکھی، جس پر خان اپنی کار دوڑا رہا تھا۔ گاڑی کے شیشے نیچے تھے۔ تیز ہوا سے اس کے لمبے بال لہرا رہے تھے۔ اندر میوزک بج رہا تھا۔

ایرعلی کی باتیں سننے کے بعد میں بھی اب کسی اور انداز سے سوچ رہا تھا۔ چلو! خان کا خواب پورا ہو جائے۔ سڑک بن جائے، وہ اس پر اپنی کار بھی دوڑائے لیکن...... ان کرغز خانہ بدوشوں کا کیا ہو گا...... بھیڑوں، یاک، رنگ برنگ قالین اور یُرت والے آزاد منش کرغز جنہیں اپنی ثقافت پر ناز ہے۔ وہ جو پچھلے دو ہزار برس سے دنیا کے سخت ترین سرد موسم والے علاقے میں خانہ بدوش زندگی بسر کرنے کے باوجود اب تک خود کو محدودی سے محفوظ رکھے بیٹھے ہیں۔ کیا ایک سڑک بننے کے بعد، ہزار ہا سال سے محفوظ یہ خانہ بدوش قبیلہ تبدیلیوں کی زد سے خود کو محفوظ رکھ پائے گا۔

"[illegible]" میں ایرعلی کی آواز سن کر چونکا۔ میری طرف قہوے کی پیالی بڑھائی۔ "ہم اب تک محفوظ ہیں اور اس کی وجہ بیرونی دنیا میں خود کو گم نہ کرنا ہے مگر ایک سڑک...... ہمیں افغانستان پر روسی تسلط نے ختم نہیں کیا مگر کابل کے حکمرانوں کے یہ دو انجینئر شاید ہمارے خاتمے کا آغاز کر دیں گے۔"

سامنے بیٹھے بزرگ ایرعلی کا چہرہ گرما گرم قہوے سے اٹھنے والی بھاپ میں دھندلا رہا تھا۔

◆ ◆ ◆

اہلِ علم کے لیے ایک اہمیت کی حامل تحریر

یومِ آزادی

14 یا 15 اگست

عقیل عباس جعفری

ہم عرصہ سے اسی الجھن میں گرفتار ہیں کہ پاکستان کی تاریخ آزادی کون سی ہے۔ 14 اگست 1947ء بروز جمعرات بمطابق 26 رمضان یا 27 رمضان یعنی 15 اگست؟ اس معما کو حل کرنے کے لیے تحقیق کا باب کھولا گیا۔ اب آپ خود ملاحظہ کریں کہ اصل تاریخ کیا ہے۔ تمام ثبوت وشواہد سامنے رکھ دیے ہیں۔

پاکستان کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں ہم اپنی تاریخ کے کتنے ہی گوشوں سے ناواقف رہے۔ ہم اپنی یوم آزادی کی تقریبات ہر سال 14 اگست کو اور ہمارے ساتھ آزاد ہونے والا ہمسایہ ملک بھارت اپنی یہی تقریبات 15 اگست کو مناتا ہے۔ ہر سال یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ ملک جو ایک ساتھ آزاد ہوئے ہوں ان کے یوم آزادی میں ایک دن کا فرق کیسے آ گیا؟ اپنی اس تحریر میں ہم نے اسی معمے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے

ہمارے بزرگ ہمیں بتاتے ہیں کہ پاکستان رمضان کی 27 ویں شب کو آزاد ہوا اور یہ کہ جس دن پاکستان آزاد ہوا اس دن جمعتہ الوداع کا مبارک دن تھا پھر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس دن 14 اگست 1947ء کی تاریخ تھی اور ہم اپنے ساتھ آزاد ہونے والے ملک سے ایک "دن بڑے" ہیں۔ جب ہم 14 اگست 1947ء کی تقویم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دن تو جمعرات تھی اور ہجری تاریخ بھی 27 نہیں 26 رمضان تھی۔ پھر ہم پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ دیکھتے ہیں جو پاکستان کی آزادی کے 11 ماہ بعد 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوئے تھے۔ ان ڈاک ٹکٹوں پر واضح طور پر پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست 1947ء چھپا ہوا ہے۔ ہم پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کا یوم آزادی بھی 14 نہیں بلکہ 15 اگست 1947ء ہے مگر پھر یوم آزادی کی پہلی سالگرہ 14 اگست 1948ء کو کیوں منائی گئی؟ یوں ذہن ایک مرتبہ پھر الجھ جاتا ہے کہ پاکستان آزاد کب ہوا تھا۔ 14 اگست 1947ء کو یا 15 اگست 1947ء کو......

اگر ہم 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوئے تو آزادی کے گیارہ ماہ بعد شائع ہونے والے ڈاک ٹکٹوں پر یوم آزادی کی تاریخ 15 اگست 1947ء کیوں چھپی ہوئی اور اگر پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تو ہم نے آزادی کی پہلی سالگرہ 15 اگست کی بجائے 14 اگست 1948ء کو کیوں منائی؟ اور آج تک یہ سالگرہ 15 کی بجائے 14 اگست کو کیوں مناتے چلے آرہے ہیں؟

آج ہم اپنی اس تحریر میں اسی "معمے" کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ پاکستان اصلاً آزاد کب ہوا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم دستاویز Indian Independence Act 1947ء ہے جسے برطانوی پارلیمان نے منظور کیا اور جس کی توثیق شہنشاہ برطانیہ جارج ششم نے 18 جولائی 1947ء کو کی۔ اس قانون کی ایک نقل پاکستان کے سیکریٹری جنرل چودھری محمد علی نے (جو بعد ازاں پاکستان کے وزیراعظم بھی بنے) 24 جولائی 1947ء کو قائداعظم کو ارسال کی۔

یہ قانون 1983ء میں حکومت برطانیہ کی شائع کردہ دستاویز The Transfer of Power کی جلد 12

15 اگست 1947ء، قائداعظم
پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھاتے ہوئے

کے صفحہ 234 پر اور اس کا ترجمہ قائداعظم پیپرز پروجیکٹ، کیبنٹ ڈویژن حکومتِ پاکستان اسلام آباد کے شائع کردہ جناح پیپرز (کے اردو ترجمے) کی جلد سوم کے صفحہ 45 سے صفحہ 72 تک ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون میں واضح طور پر درج ہے۔

1-(1) 15 اگست 1947ء سے برطانوی ہندوستان میں دو آزاد و فرماں روا مملکتیں قائم کی جائیں گی جو بالترتیب انڈیا اور پاکستان کے نام سے موسوم ہوں گی۔

(2) بعد ازاں اس قانون میں "ان مملکتوں" سے مطلب نئی مملکتیں اور "مقررہ دن" سے مراد 15 اگست کی تاریخ ہوگی۔

ٹرانسفر آف پاور جلد 12 کے صفحہ نمبر 234 پر اصل تحریر کچھ یوں ہے:

Indian Independence Act,1947

1-(1)As from the fifteench day of August, nineteen hundred and forty seven, two independent Dominions shell be set up in India, to be known respectively as India and Pakistan.

(2)The said Dominions are hereafter in the Act referred to as "the new Dominions", and the said fifteench day of August is hereafter in this Act referred to as "the appointed day."

اس قانون کے سلسلے میں جاری ہونے والے چند اور احکامات ملاحظہ ہوں جن کے اقتباسات اور ترجمہ ضیاءالدین لاہوری نے اپنے مضمون "یوم آزادی: جمعۃ المبارک 27 رمضان یا 15 اگست" مشمولہ جریدہ 36۔ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی میں شامل کیا ہے۔

☆7 اگست 1947ء: اقوام متحدہ میں برطانیہ کے مستقل نمائندے کے نام دفتر خارجہ کا تار:

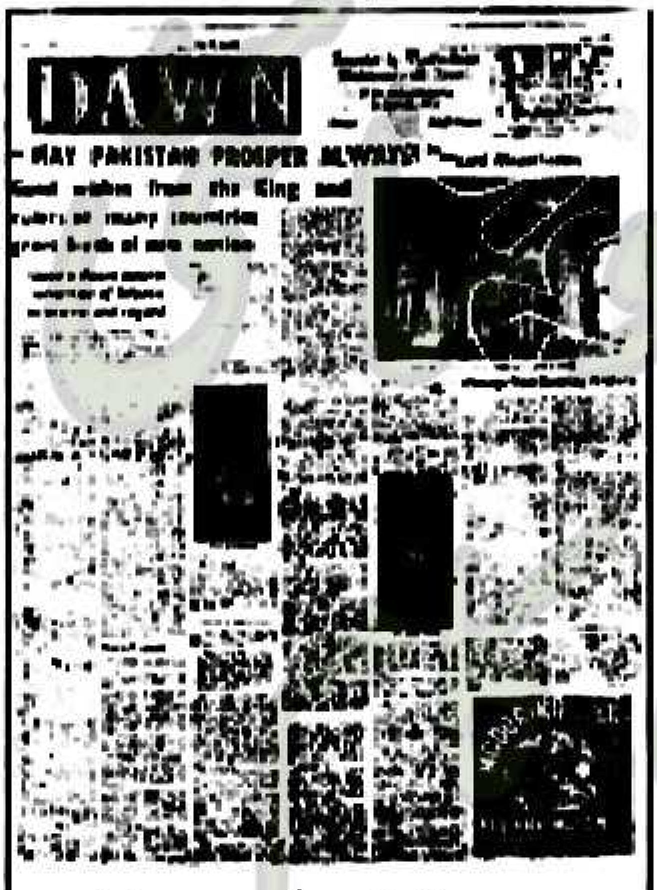

DAWN

MAY PAKISTAN PROSPER ALWAYS

Good wishes from the King and rulers of many countries greet birth of new nation

روزنامہ ڈان، کراچی کا 15 اگست 1947ء کا شمارہ

"اب وائسرائے نے تار بھیجا ہے کہ مسلمان قائدین اقوام متحدہ کی رکنیت کے لیے درخواست دینے کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ برطانیہ فوری طور پر پاکستان کی طرف سے درخواست دائر کرے اور جب پاکستان 15 اگست کو ایک آزاد مملکت بن جائے گا تو وہ اس کی توثیق براہ راست خود کرے گا"۔ (صفحہ: 570)

☆12 اگست 1947ء (ہندوستان اور پاکستان کی رکنیت کے استحقاق پر سیکریٹریٹ اقوامِ متحدہ کے میمورنڈم کی پریس ریلیز سے ایک اقتباس)

www.paksociety.com www.paksociety.com

”قانون آزادیٔ ہند قرار دیتا ہے کہ اگست 1947ء کی 15 تاریخ کو ہندوستان میں دو آزاد مملکتیں بالترتیب ہندوستان اور پاکستان کے نام سے قائم ہوں گی“۔ صفحہ:685

حکومت برطانیہ نے یہ اعلان تو کردیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ایک ہی وقت یعنی 15 اگست 1947ء کو صفر ساعت پر آزاد ہوں گے مگر مسئلہ یہ ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب نئی دہلی میں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرنا تھا، منتخب حکومت کو اقتدار منتقل کرنا تھا اور خود آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنا تھا۔

مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن 13 اگست 1947ء کو کراچی تشریف لائیں اور 14 اگست 1947ء کی صبح پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے انتقالِ اقتدار کی کارروائی مکمل کریں اور یہ اعلان کریں کہ اس رات یعنی 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب پاکستان ایک آزاد مملکت بن جائے گا۔

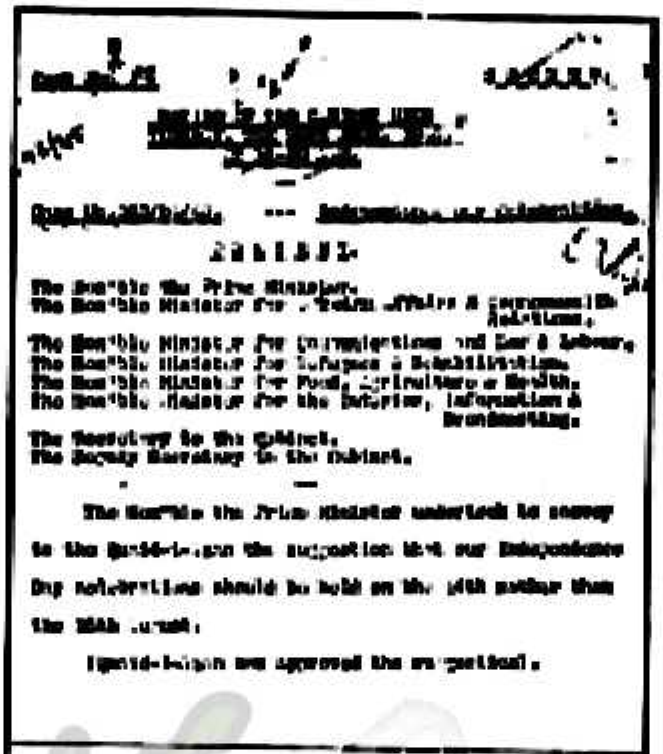

PRESENT.

The Hon'ble the Prime Minister.
The Hon'ble Minister for Foreign Affairs & Commonwealth Relations.
The Hon'ble Minister for Communications and Law & Labour.
The Hon'ble Minister for Refugees & Rehabilitation.
The Hon'ble Minister for Food, Agriculture & Health.
The Hon'ble Minister for the Interior, Information & Broadcasting.
The Secretary to the Cabinet.
The Deputy Secretary to the Cabinet.

The Hon'ble the Prime Minister undertook to convey to the Quaid-i-Azam the suggestion that our Independence Day celebrations should be held on the 14th rather than the 15th August.

Quaid-i-Azam has approved the suggestion.

کیبنٹ ڈویژن فائل نمبر 393/54/48 میں موجود وہ تحریر جس کے تحت یہ

پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست کی بجائے 14 اگست منانا طے قرار پایا

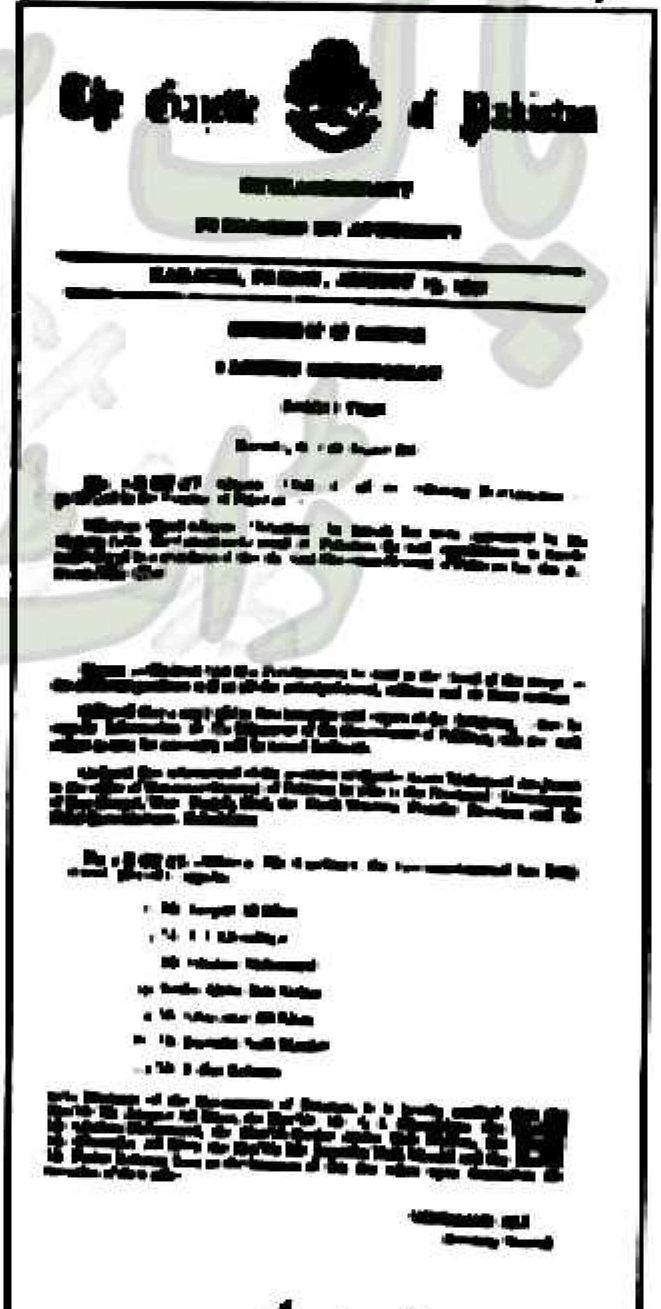

The Gazette of Pakistan

پاکستان کا پہلا گزٹ

چنانچہ ایسا ہی ہوا 13 اگست 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی تشریف لے آئے اور اسی رات کراچی کے گورنر جنرل ہاؤس میں ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا گیا جس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا:

”میں ملک معظم کی صحت کا جام تجویز کرتے ہوئے بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں۔ یہ ایک نہایت اہم اور منفرد موقع ہے۔ آج ہندوستان کے لوگوں کو مکمل اقتدار منتقل ہونے والا ہے اور 15 اگست 1947ء کے مقررہ دن دو آزاد اور خودمختار مملکتیں پاکستان اور ہندوستان معرض وجود میں آجائیں گی۔ ملک معظم کی حکومت کے اس فیصلے سے وہ اعلیٰ و ارفع نصب العین حاصل ہو جائے گا جو دولت مشترکہ کے قیام کا واحد مقصد قرار دیا گیا تھا“۔

اگلے روز جمعرات 14 اگست 1947ء مطابق 26 رمضان المبارک 1366ھ کی صبح 9 بجے موجودہ سندھ اسمبلی بلڈنگ میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا خصوصی اجلاس شروع ہوا۔

صبح سے ہی عمارت کے سامنے پرجوش عوام جمع تھے۔ جب پاکستان کے نامزد گورنر جنرل قائداعظم محمد علی

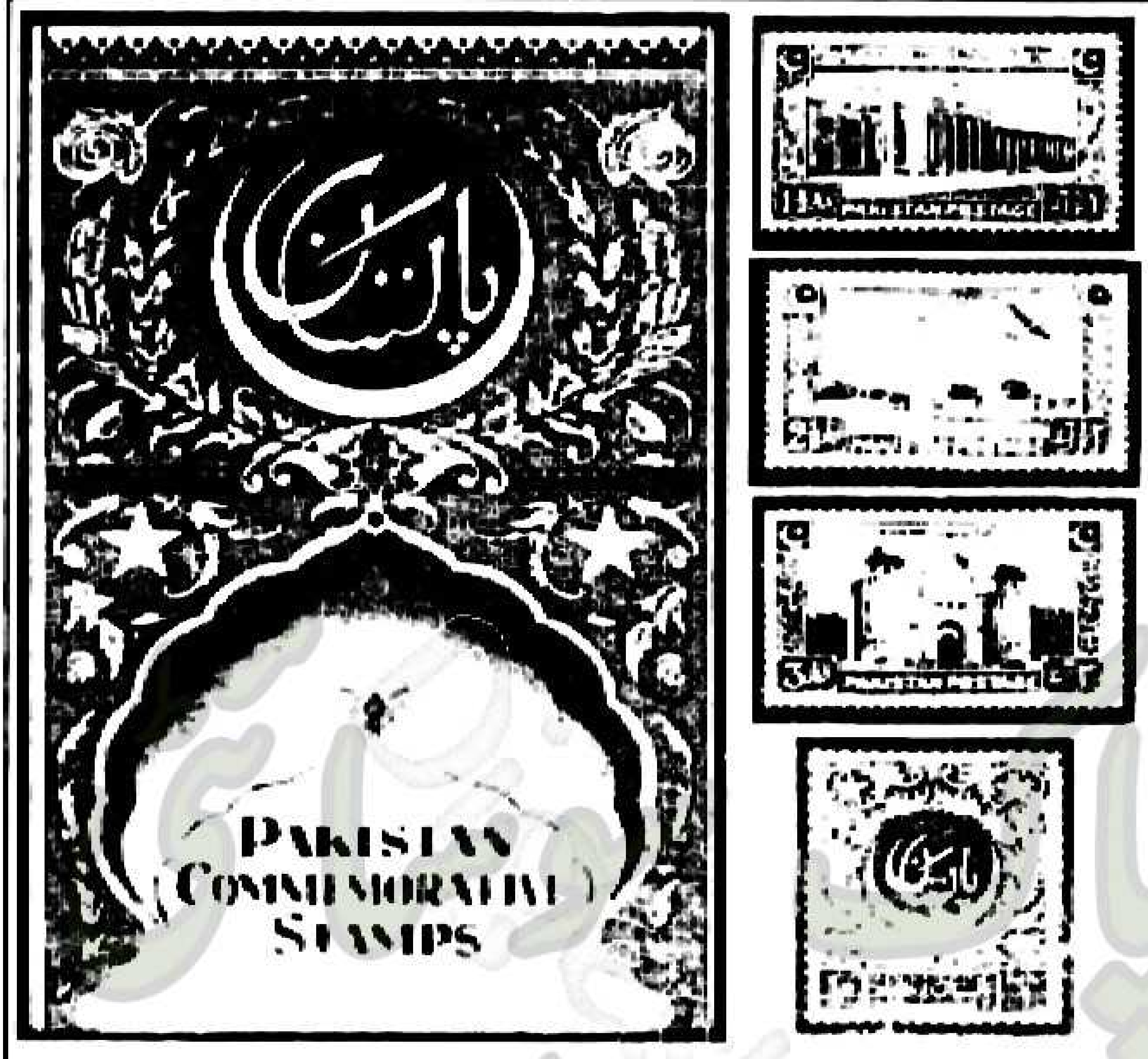

پاکستان [illegible] 15 [illegible] 1947 [illegible]

جناح اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک مخصوص بگھی میں سوار اسمبلی ہال پہنچے تو عوام نے پرجوش نعروں اور تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اسمبلی کی تمام نشستیں پر تھیں۔ گیلری میں ممتاز شہریوں، سیاست دانوں اور ملکی اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ کرسی صدارت پر دستور ساز اسمبلی کے صدر قائداعظم محمد علی جناح تشریف فرما تھے اور ان کے برابر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نشست تھی۔ دونوں اکابرین نے جب اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں تو کارروائی کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔

سب سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شاہ انگلستان کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں قائداعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا

"برطانوی دولت مشترکہ کی اقوام کی صف میں شامل ہونے والی نئی ریاست کے قیام کے عظیم موقع پر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے جس طرح آزادی حاصل کی ہے وہ ساری دنیا کے حریت پسند عوام کے لیے ایک مثال ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ برطانوی دولت مشترکہ کے تمام ارکان جمہوری اصولوں کو سربلند رکھنے میں آپ کا ساتھ دیں گے۔"

اس پیغام کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے الوداعی تقریر کی اور پاکستان اور پاکستانی عوام کی سلامتی کے لیے دعا کی۔ اپنی اس تقریر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واضح الفاظ میں کہا:

"آج میں آپ سے آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں۔ کل نئی ڈومینین پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومینین آف انڈیا کا آئینی سربراہ بنوں گا۔ دونوں حکومتوں کے قائدین نے مجھے جوائنٹ ڈیفنس کونسل کا غیر جانبدار چیئرمین بننے کی دعوت دی ہے یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے جس پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔

کل دو نئی خودمختار ریاستیں دولت مشترکہ میں شامل ہوں گی۔ یہ نئی اقوام نہ ہوں گی بلکہ یہ قدیم قابل فخر تمدن :

وارث اقوام ہیں۔ ان مکمل طور پر آزاد ریاستوں کے لیڈر بڑے مدبر ہیں، دنیا بھر کی نگاہوں میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں، ان کے شاعروں، فلسفہ دانوں، سائنس دانوں اور افواج نے انسانیت کی خدمت کے لیے ناقابل فراموش خدمات سر انجام دی ہیں۔ ان ریاستوں کی حکومتیں ناتجربہ کار اور کمزور نہیں ہیں بلکہ دنیا بھر میں قیام امن اور ترقی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔"

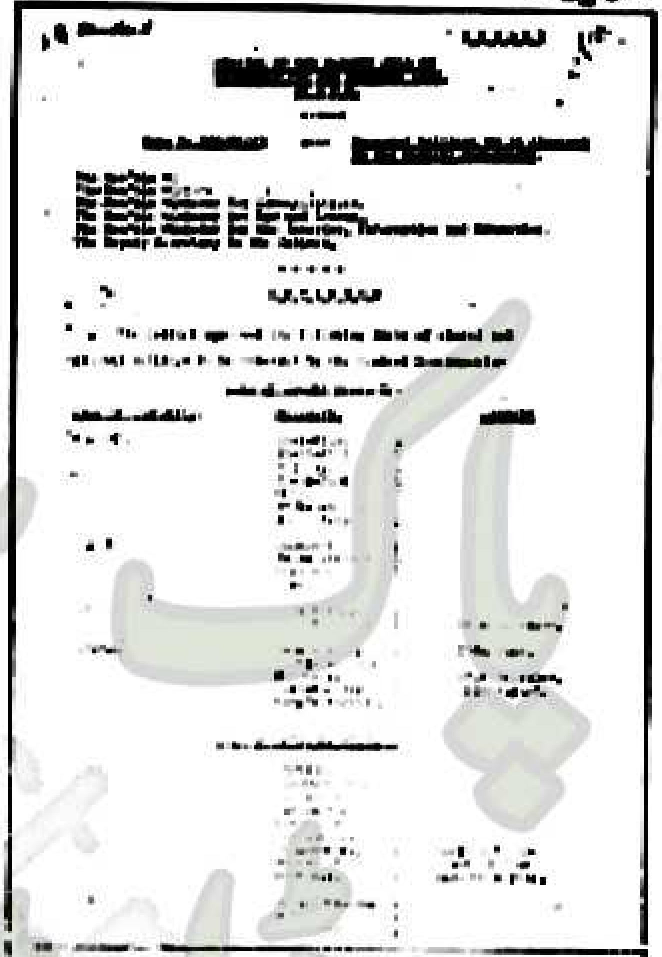

[illegible] 1947ء [illegible] 1948ء [illegible] 1948ء [illegible] 15 اگست 1948ء [illegible]

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر کا آغاز کیا انہوں نے سب سے پہلے شاہ انگلستان اور وائسرائے کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ:

"ہمارا ہمسایوں سے بہتر اور دوستانہ تعلقات کا جذبہ کبھی کم نہ ہوگا اور ہم ساری دنیا کے دوست رہیں گے۔"

اسمبلی کی کارروائی اور اعلان آزادی کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ شاہی بگھی میں گورنر جنرل ہاؤس واپس ہوئے۔ دوپہر دو بجے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئی دہلی روانہ ہوگئے جہاں اسی رات 12 بجے بھارت کی آزادی کے اعلان کے ساتھ انہیں بھارت کے گورنر جنرل کا منصب سنبھالنا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعلان آزادی کے مطابق 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب رات 12 بجے دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اور خود مختار اور دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مملکت کا اضافہ ہوا۔ جس کا نام پاکستان تھا۔

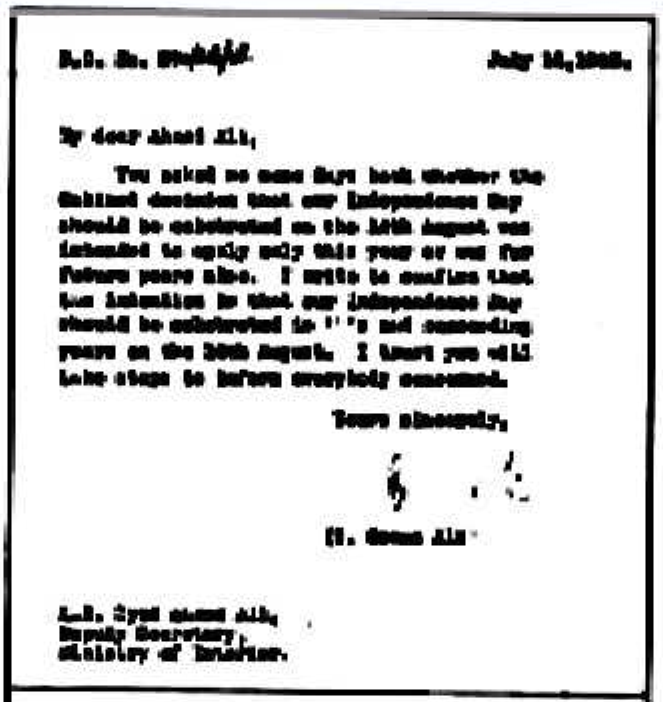

D.O. No. [illegible] July 14, 1948.

My dear Ahmad Ali,

You asked me some days back whether the Cabinet decision that our Independence Day should be celebrated on the 15th August was intended to apply only this year or for future years also. I write to confirm that the intention is that our Independence Day should be celebrated in 1948 and succeeding years on the 14th August. I trust you will take steps to inform everybody concerned.

Yours sincerely,

M. Osman Ali

A.S. Syed Ahmad Ali,
Deputy Secretary,
Ministry of Interior.

ڈپٹی سیکریٹری سید احمد علی کے نام سید عثمان علی کا مراسلہ جس میں مطلع کیا گیا ہے کہ 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو یوم آزادی منائے جانے کا فیصلہ ہمیشہ کے لیے

ٹھیک اسی وقت لاہور، پشاور اور ڈھاکا سے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس سے پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اس سے قبل 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی رات لاہور، پشاور اور ڈھاکا اسٹیشنوں سے رات 11 بجے آل انڈیا ریڈیو سروس نے اپنا آخری اعلان نشر کیا۔ 12 بجے سے چند لمحے پہلے ریڈیو پاکستان کی شناختی دھن بجائی گئی اور ظہور آذر کی آواز میں انگریزی زبان میں فضا میں ایک اعلان گونجا کہ آدھی رات کے وقت پاکستان کی آزاد اور خود مختار مملکت معرض وجود میں آجائے گی۔ رات کے ٹھیک 12 بجے ہزاروں سامعین کے کانوں میں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں یہ الفاظ گونجے

"یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس ہے"۔

انگریزی میں یہ اعلان ظہور آذر نے اور اردو میں مصطفیٰ علی ہمدانی نے کیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد مولانا زاہر القاسمی نے قرآن مجید کی سورہ فتح کی آیات تلاوت فرمائیں۔ جس کے بعد ان کا ترجمہ نشر کیا گیا بعدازاں خواجہ خورشید انور کا مرتب کیا ہوا ایک خصوصی سازینہ بجایا گیا پھر سنتو خاں اور ان کے ہم نوا نے قوالی میں علامہ اقبال کی نظم ساقی نامہ کے چند بند پیش کیے۔ ان نشریات کا اختتام حفیظ ہوشیار پوری کی ایک تقریر پر ہوا۔ آدھی رات کے وقت ہی ریڈیو پاکستان پشاور سے آفتاب احمد بسمل نے اردو میں اور عبداللہ جان مغموم نے پشتو میں پاکستان کے قیام کا اعلان کیا جبکہ قرآن پاک کی تلاوت کا شرف قاری

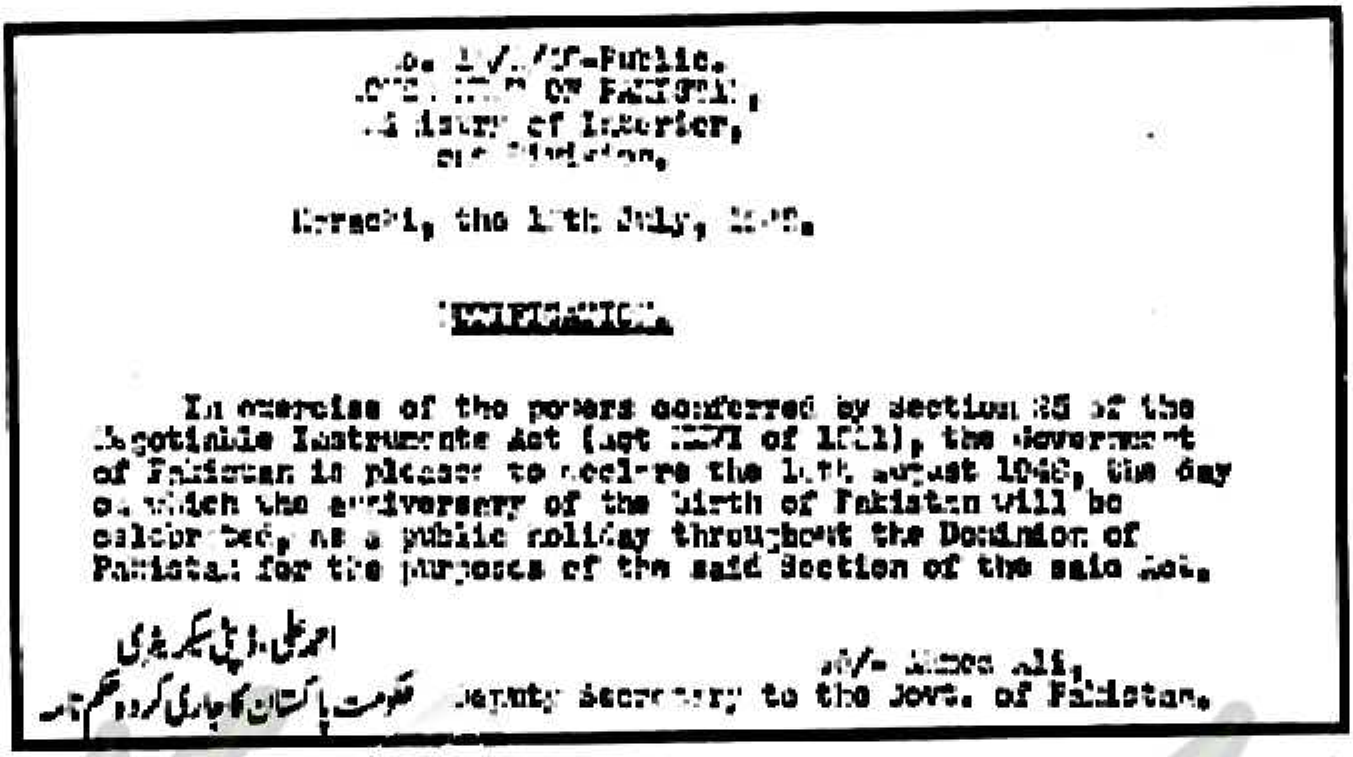

No. ..//48-Public.
GOVERNMENT OF PAKISTAN,
Ministry of Interior,
... Division.

Karachi, the 1.th July, 1948.

NOTIFICATION.

In exercise of the powers conferred by section 25 of the Negotiable Instruments Act (Act XXVI of 1881), the Government of Pakistan is pleased to declare the 15th August 1948, the day on which the anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, as a public holiday throughout the Dominion of Pakistan for the purposes of the said Section of the said Act.

Sd/- Ahmed Ali,
Deputy Secretary to the Govt. of Pakistan.

احمد علی، ڈپٹی سیکریٹری
حکومت پاکستان کا جاری کردہ حکم نامہ

فدا محمد نے حاصل کیا۔ ان نشریات کا اختتام جناب احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے ایک نغمے پر ہوا جس کے بول تھے "پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو"۔

اسی وقت اسی نوعیت کا اعلان ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے انگریزی میں کلیم اللہ نے کیا جس کا ترجمہ بنگلہ زبان میں نشر کیا گیا۔

15 اگست 1947ء کی صبح ریڈیو پاکستان لاہور کی ٹرانسمیشن کا آغاز آٹھ بجے ہوا ..... آل عمران کی چند آیات سے ہوا ...... آیات قرآنی کی تلاوت کے بعد انگریزی خبروں کا آغاز ہوا ..... نے پڑھیں۔ خبروں کے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے قائداعظم کی آواز میں ایک پیغام سنوایا گیا۔ جو پہلے سے ریکارڈ شدہ تھا۔ (قائداعظم کے اس خطاب کی آڈیو کلپ یوٹیوب پر موجود ہے۔) قائداعظم کی تقریر کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا:

"It is with feelings of greatest happiness and emotion that I send you my greetings. August 15 is the birthday of the independent and sovereign State of Pakistan. It marks the fulfilment of the destiny of the Muslim nation which made great sacrifices in the past few years to have its homeland."

(ترجمہ: بے پایاں مسرت اور احساس کے جذبات کے ساتھ میں آپ کو تہنیت کا پیغام دیتا ہوں۔ 15 اگست آزاد اور خود مختار پاکستان کی پیدائش کا دن ہے۔ یہ مسلم قوم کی منزل مقصود کی علامت ہے جس نے پچھلے چند برسوں میں اپنے وطن کے حصول کے لیے عظیم قربانیاں پیش کیں)

اپنے اس خطاب میں قائداعظم نے پاکستان کے تمام شہریوں کو پاکستان کی خود مختار مملکت کے قیام کی مبارک باد پیش کی اور کہا کہ اس نئی مملکت کے وجود میں آجانے سے پاکستان کے باشندوں پر بے حد و بے انتہا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اب انھیں دنیا کو یہ ثابت کروانا چاہیے کہ کس طرح ایک قوم جس میں مختلف عناصر شامل ہیں آپس میں مل جل کر صلح و آشتی سے تعمیر و ترقی کر سکتی ہے۔

اسی دن یعنی 15 اگست 1947ء کی صبح اخبارات پاکستان کے یوم آزادی کے حوالے سے خصوصی شمارے شائع

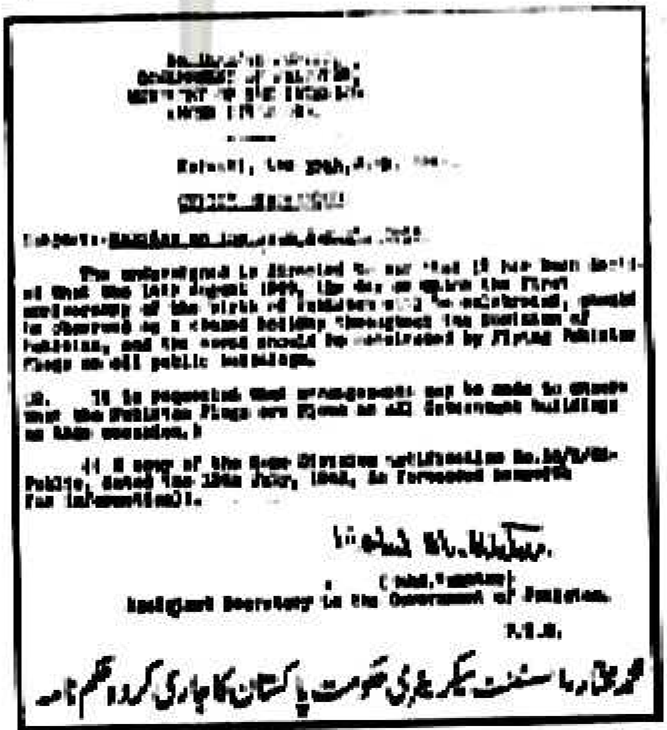

OFFICE MEMORANDUM

Subject:- Holiday on 15th August, 1948.

The undersigned is directed to say that it has been decided that the 15th August 1948, the day on which the first anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, should be observed as a closed holiday throughout the Dominion of Pakistan, and the event should be celebrated by flying Pakistan Flags on all public buildings.

2. It is requested that arrangements may be made to ensure that the Pakistan Flags are flown on all Government buildings on that occasion.

3. A copy of the Home Division notification No. ...-Public, dated the 12th July, 1948, is forwarded herewith for information.

Assistant Secretary to the Government of Pakistan.

محمد مختار، اسسٹنٹ سیکریٹری حکومت پاکستان کا جاری کردہ حکم نامہ

کیے اور انگریزی کے مشہور اخبار "ڈان" نے کراچی سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس خصوصی اشاعت کی سرخی تھی "May Pakistan Prosper Always" Lord Mount Batten. اس سرخی کے نیچے جو خبر شائع ہوئی تھی اس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس تقریر کا مکمل متن درج کیا گیا تھا جس کا اقتباس اوپر تحریر کیا جاچکا ہے۔ روزنامہ ڈان نے اس موقع پر 32 صفحات پر مشتمل ایک خصوصی ضمیمہ بھی شائع کیا تھا جو ہمارے ذاتی کتب خانے میں بھی محفوظ ہے اور یہ نیٹ پر بھی Dawn15/8/1947 لکھ کر تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ڈان کے اس ضمیمے میں قائداعظم محمد علی جناح کا ایک پیغام بھی شامل تھا جو 10 اورنگ زیب روڈ نئی دہلی سے جاری کیا گیا تھا۔ اس پیغام پر اس کے اجرا کی تاریخ درج نہیں ہے مگر یہ بات یقینی ہے کہ یہ پیغام 7 اگست 1947ء سے پہلے جاری ہوا تھا۔ اس پیغام میں قائداعظم محمد علی جناح نے کہا:

"The first issue, I am informed will appear from Karachi, the capital of Pakistan on the 15th of August, the appointed day."

(ترجمہ: مجھے بتایا گیا ہے کہ (روزنامہ ڈان کا) پہلا شمارہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی سے 15 اگست کو، جو مقررہ دن ہے، شائع کیا جائے گا)

اسی دن یعنی 15 اگست 1947ء کو پاکستان کا پہلا گزٹ بھی جاری ہوا جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی بطور گورنر جنرل پاکستان تقرر کیے جانے اور اسی دن سے ان کا یہ عہدہ سنبھالنے کی اطلاع درج تھی۔ اسی روز لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس میاں عبدالرشید نے قائداعظم محمد علی جناح سے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف لیا اور اسی روز نوابزادہ لیاقت علی خان کی قیادت میں پاکستان کی پہلی کابینہ کے ارکان نے بھی اپنے عہدوں کے حلف اٹھالیے۔

ان تمام معروضات اور دستاویزی شہادتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو نہیں بلکہ 15 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے پہلے برس کسی کو اس معاملے میں ابہام نہیں تھا کہ پاکستان کب آزاد ہوا؟ اس بات کی تقویت اس چیز سے بھی ملتی ہے کہ 19 دسمبر 1947ء کو پاکستان کے محکمہ داخلہ نے اپنے مراسلے 17/47 کے ذریعے 1948ء کی جشن سالانہ تعطیلات کا اعلان کیا ان میں 1948ء کے لیے یوم پاکستان کی تعطیل کے آگے 15 اگست 1948ء کی تاریخ درج تھی (یہ مراسلہ نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، اسلام آباد میں محفوظ ہے۔)

1948ء کی پہلی سہ ماہی میں پاکستان کے محکمہ ڈاک نے پاکستان کے ابتدائی ڈاک ٹکٹوں کی ڈیزائننگ اور طباعت کے کام کا آغاز کیا۔ یہ چار ڈاک ٹکٹوں کا سیٹ تھا جن کے ابتدائی تین ڈاک ٹکٹ ایکسٹرنل پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کے مصوروں رشید الدین اور محمد لطیف نے مشترکہ طور پر ڈیزائن کیے تھے جبکہ چوتھا ڈاک ٹکٹ اور اس کے ساتھ شائع ہونے والا فولڈر ملک کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی تخلیق تھا۔ یہ ڈاک ٹکٹ برطانیہ کے طباعتی ادارے میسرز ٹامس ڈی لا رو میں طبع ہوئے تھے۔ یہ ڈاک ٹکٹ 9 جولائی 1948ء کو فروخت کے لیے پیش کیے گئے اور ان پر بھی پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ 15 اگست 1947ء شائع کی گئی تھی۔

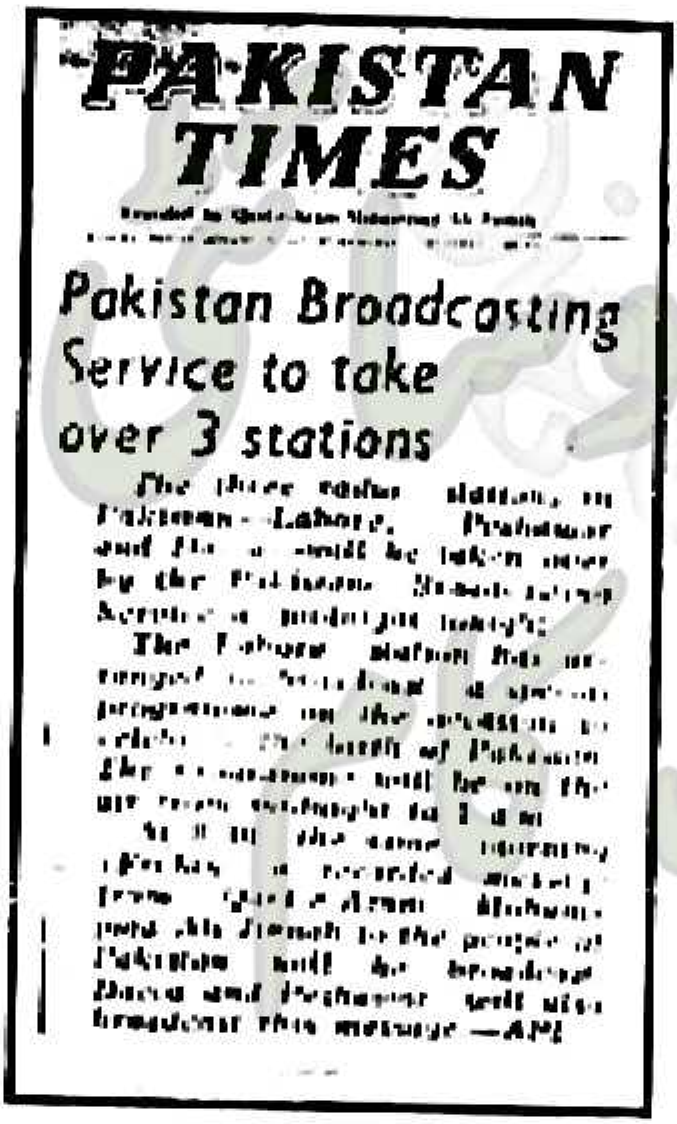

PAKISTAN TIMES

Founded by Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah

Pakistan Broadcasting Service to take over 3 stations

گویا 9 جولائی 1948ء تک یہ بات طے تھی کہ پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔ پاکستان کا یوم

قاری زبیر قاسمی

ظہور آذر

مصطفیٰ علی ہمدانی

ایس عثمان علی

آزادی 15 اگست سے 14 اگست کب ہوا، یہ معلوم کرنے کے لیے ہم نے نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کیبنٹ ڈویژن، اسلام آباد کے دروازے پر دستک دی۔ وہاں ہماری ملاقات اس سینٹر کے ڈائریکٹر جناب قمر الحسان سے ہوئی۔ جن کی مدد سے ہماری رسائی اس سینٹر میں محفوظ ان فائلوں تک ہوئی جو ایک طویل عرصے تک خفیہ رہنے کے بعد اب عوام کے لیے کھول دی گئی ہیں۔

ان فائلوں کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ منگل 29 جون 1948ء کو کراچی میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کابینہ کے ایک اجلاس میں، جس میں وزیر خارجہ، وزیر مواصلات، قانون و محنت، وزیر مہاجرین و آبادکاری، وزیر خوراک، زراعت و صحت اور وزیر داخلہ، اطلاعات و نشریات موجود تھے، فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست 1948ء کی بجائے 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں۔ وزیراعظم لیاقت علی نے کابینہ کو بتایا کہ یہ فیصلہ حتمی نہیں ہے وہ یہ معاملہ قائداعظم محمد علی جناح کے علم میں لائیں گے اور جو بھی حتمی فیصلہ ہوگا وہ قائداعظم کی منظوری کے بعد ہوگا۔

وہ فائل جس میں یہ تفصیل درج ہے اس کا نمبر ہے 196/CF/48 اور کیس کا نمبر ہے 393/54/48۔ اس فائل میں انگریزی میں درج کارروائی میں تحریر ہے:

The Hon'ble the Prime Minister undertook to convey to the Quaid-I-Azam the suggestion that our Independence Day celebrations should be held on the 14th rather than the 15th August.

(ترجمہ: معزز وزیراعظم نے یہ ذمہ داری سنبھالی ہے کہ وہ قائداعظم تک یہ تجویز پہنچائیں کہ ہماری یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو منائی جائے)

اس فائل میں یہ تحریر نہیں کہ اس تجویز کا محرک کون تھا اور یوم آزادی کی تقریبات 15 کی بجائے 14 اگست کو منائے جانے کے حق میں کیا دلائل پیش کیے گئے تھے۔ کارروائی کے آخر میں بریکٹ میں تحریر ہے:

Quaid-I-Azam has approved the suggestion.

(قائداعظم نے تجویز کو منظور کرلیا)

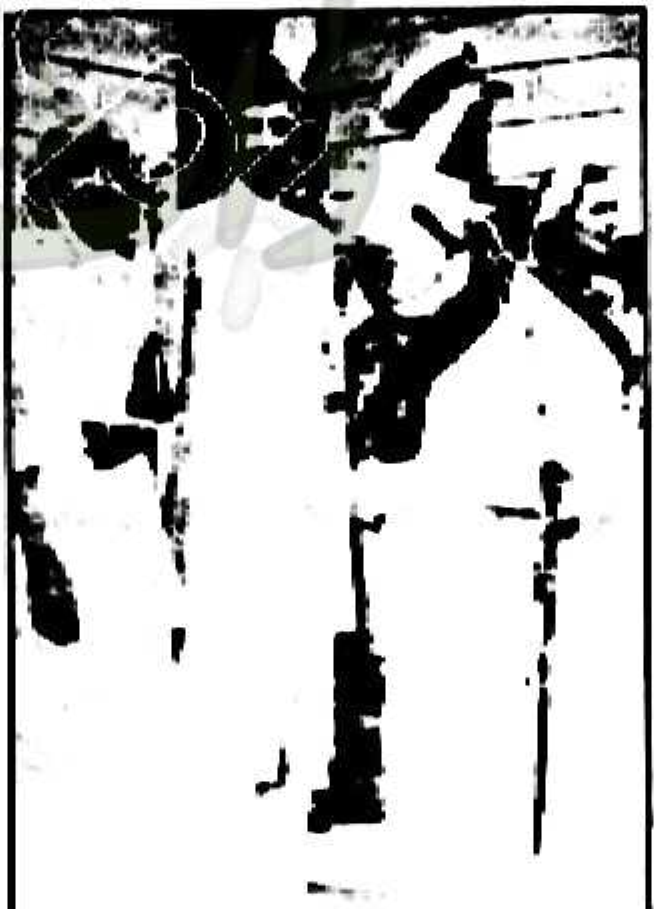

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اعلان آزادی کے بعد سلامی لیتے ہوئے

The Times of India

BIRTH OF INDIA'S FREEDOM

ٹائمز آف انڈیا کا 15 اگست 1947ء کا شمارہ

فائل آگے چلتی ہے اور اگلے صفحات میں کیس نمبر 54/CM/48 مورخہ 12 جولائی 1948ء کے تحت کابینہ کے ڈپٹی سیکریٹری ایس عثمان علی کے دستخطوں کے ساتھ تحریر ہے کہ انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ وزیراعظم کی زیر صدارت 29 جون 1948ء کو منعقد ہونے والی کابینہ میٹنگ کے فیصلے سے تمام وزرا اور ان کی وزارت کے متعلقہ سیکریٹریوں کو آگاہ کردیں تاکہ اس فیصلے پر عملدرآمد ممکن بنایا جاسکے۔

فائل میں اگلے حکم نامے کا نمبر 15/2/48 ہے جو 13 جولائی 1948ء کو جاری ہوا۔ اس حکم نامے پر حکومت پاکستان کے ڈپٹی سیکریٹری احمد علی کے دستخط ہیں۔ حکم نامے میں کہا گیا تھا کہ ملک کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں گی۔ اس دن ملک بھر میں عام تعطیل ہوگی اور تمام سرکاری اور عوامی عمارتوں پر قومی پرچم لہرائے جائیں گے۔ اسی تسلسل میں ایک حکم نامہ اور بھی ہے جس پر حکومت پاکستان کے اسسٹنٹ سیکریٹری محمد مختار کے دستخط ہیں۔ اس حکم نامے کا نمبر بھی 15/2/48 ہے اور اس میں بھی وہی حکم دہرایا گیا ہے جو سابق حکم نامے میں درج تھا۔ اس حکم نامے میں جو بات اضافی تھی وہ یہ تھی کہ اس فیصلے سے حکومت پاکستان کی تمام وزارتوں، تمام ڈویژنوں، کیبنٹ سیکریٹری، دستور ساز اسمبلی، قائداعظم کے پرائیویٹ اور ملٹری سیکریٹری، اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان ریونیوز، آڈیٹر جنرل آف پاکستان اور بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو مطلع کردیا جائے۔

فائل میں محفوظ اگلا حکم نامہ 14 جولائی 1948ء کو جاری ہوا اور اس کا ڈی او نمبر ہے 390/CB/48۔ اس میں ایس (شجاعت) عثمان علی نے (ڈپٹی سیکریٹری ٹو دی کیبنٹ) نے وزارت داخلہ کے ڈپٹی سیکریٹری خان بہادر سید احمد علی کو مخاطب کیا ہے اور انہیں مطلع کیا ہے۔

(ترجمہ): ''آپ نے چند روز قبل کابینہ کے اس فیصلے کے بارے میں کہ پاکستان کی یوم آزادی کی تقریب 14 اگست کو منائی جائے گی، دریافت کیا تھا کہ کیا یہ فیصلہ صرف اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے۔ میں آپ کو بالصراحت بتانا اور تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف اس سال بلکہ آئندہ ہمیشہ یہ تقریب 14 اگست کو منائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہر متعلقہ شخص کو اس فیصلے سے مطلع فرما دیں گے۔''

کابینہ کے اس فیصلے پر عمل درآمد ہوا اور ملک بھر میں پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی گئیں۔ تاہم روزنامہ ڈان نے یوم آزادی کے حوالے سے اپنا پہلا سالنامہ جو 100 صفحات کے خصوصی ضمیمے کی صورت میں شائع کیا گیا تھا 14 کی بجائے 15 اگست 1948ء ہی کو شائع کیا۔

(شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ اس سال 15 اگست کو اتوار کا دن تھا اور یہ دن کسی اخباری ضمیمے کی اشاعت کے لیے نہایت موزوں تھا)

نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر میں ایک فائل 360/CF/48 بھی محفوظ ہے جس میں 1948ء میں منائی جانے والی سالانہ تعطیلات کی تفصیل درج ہے۔ اس فائل کے مطابق 1948ء میں یوم پاکستان کی چھٹی 14 اگست 1948ء کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس برس روزنامہ ڈان نے بھی 92 صفحات پر مشتمل اپنا خصوصی ضمیمہ 15 کی بجائے 14 اگست 1948ء کو شائع کیا تھا۔

پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو منانے کا یہ دستور آج تک جاری ہے اور یوں آہستہ آہستہ بات راسخ ہوگئی کہ پاکستان 15 اگست 1947ء کو نہیں بلکہ 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔

انتقالِ اقتدار کی تقریب کے بعد کھینچی گئی ایک نادر تصویر

کیمرہ مین نے تصویر کھینچنے کے لیے لائن عبور کی تو ایک افسر اسے واپس کھینچ رہا ہے، ماؤنٹ بیٹن اپنی اہلیہ سے محوِ گفتگو ہیں، محترمہ فاطمہ جناح اپنا پلو ٹھیک کر رہی ہیں صرف قائداعظم کیمرہ مین کی طرف متوجہ ہیں۔

حالانکہ محولہ بالا دستاویزات کے مطالعے سے یہ بات بڑی حد تک طے ہو جاتی ہے کہ پاکستان کی پہلی کابینہ نے پاکستان کی تاریخ آزادی تبدیل نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 کی بجائے 14 اگست کو منایا جایا کریں گی اور قائداعظم نے بھی اسی فیصلے کی توثیق کی تھی۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری اس تحقیق اور اس تحریر کی اشاعت کے باوجود پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ میں سرکاری طور پر کوئی فرق نہیں آئے گا مگر یہ حقیقت نہ جھٹلائی جاسکتی ہے اور نہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست 1947ء ہے۔ اس دن جمعۃ الوداع تھا اور اسلامی تاریخ 27 رمضان المبارک 1366ھ تھی۔ اپنا یوم آزادی 15 اگست 1947ء کی بجائے 14 اگست 1947ء قرار دینے سے نہ صرف ہم اپنے یوم آزادی کی تاریخ بدلنے کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ جمعۃ الوداع اور 27 رمضان المبارک کے اعزاز سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل مضامین

کتب اور دستاویزات سے مدد لی گئی ہے

(1) دی ٹرانسفر آف پاور، جلد 12۔ ہر میجسٹی اسٹیشنری آفس، لندن۔

(2) جناح پیپرز، مدیر اعلیٰ ڈاکٹر زوار حسین زیدی، تخلیص و ترجمہ سید نصرت اللہ شاہ، قائداعظم پیپرز پروجیکٹ، کیبنٹ ڈویژن حکومت پاکستان، اسلام آباد، جلد سوم۔

(3) قائداعظم محمد علی جناح، روز و شب کا تاریخ وار اشاریہ، مدوین ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ترجمہ خواجہ رضی حیدر، قائداعظم اکیڈمی، کراچی۔

(4) پاکستان کا تاریخی انسائیکلوپیڈیا، زاہد حسین انجم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

(5) پاکستان کرونیکل، عقیل عباس جعفری، ورثہ پبلی کیشنز، کراچی۔

(6) روزنامہ پاکستان ٹائمز، لاہور، 5 1جولائی 1947ء تا 15 اگست 1947ء کے شمارے۔

(7) روزنامہ ڈان، کراچی، 15 اگست 1947ء۔

(8) روزنامہ ڈان، کراچی، 15 اگست 1948ء۔

(9) روزنامہ ڈان، کراچی، 14 اگست 1949ء۔

(10) مضمون، یوم آزادی: جمعۃ المبارک 27 رمضان یا 15 اگست، ضیاء الدین لاہوری، مشمولہ جریدہ 36، (غیر مطبوعہ کتابیں نمبر) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

(11) خفیہ فائل نمبر 48/CF/360، نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کابینہ ڈویژن، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

(12) خفیہ فائل نمبر 48/CF/196، نیشنل ڈاکیومینٹیشن سینٹر، کابینہ ڈویژن، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

خونی شیرنیاں

انجم فاروق ساحلی

عام طورپر شیر آدم خور نہیں ہوتے مگر جب کسی شیر کے منہ کو انسانی گوشت کا ذائقہ لگ جائے تو پھر وہ حد سے زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے مگر وہاں تو بیک وقت دو شیرنیاں تھیں۔ دونوں مل کر شکار پر نکلتی تھیں۔ انہیں آدم خور ان کی ماں نے بنایا تھا۔ ایسی شیرنیوں کا شکار آسان نہیں۔

شکاریات پڑھنے والوں کے لیے ایک تحفہ

یہ ذکر ہے ملایا کے شمال مشرقی جنگلوں کا۔ اس زمانے میں بسلسلہ ملازمت میں ریاست ترنگانو میں تعینات تھا۔ جدید ترین آسائشوں سے ناآشنا اس ریاست میں زمانہ قدیم کی رسمیں رائج تھیں۔ باشندے اگرچہ مسلمان تھے۔ اکثر قرآن کے حافظ اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، تاہم ان میں توہم پرستی زوروں پر تھی اور خصوصاً ربڑ کے جنگلوں میں کام کرنے والے مزدوروں میں توہمات کا مرض اس قدر شدید تھا کہ خدا کی پناہ۔ ہر شخص نیک وبدشگون پر یقین رکھتا۔ بدروحوں اور بھوتوں کے

قصے سبھی کی زبان پر رہتے۔ درندوں کی یہاں کثرت تھی۔ جن میں شیر اور چیتے قابلِ ذکر ہیں۔ ملایا کے جنگلوں میں پلنے والے شیروں کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا کہ پیدائشی آدم خور ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے پیشتر ریاست جوہور میں ایک آدم خور کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جسے میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

آدم خوروں کی نفسیات اور عادتیں جاننے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ میری مصروفیات کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ دن رات کا بیشتر حصہ جنگل میں گزرتا تھا، اس لیے بہت جلد جنگل کی زندگی اور یہاں کے قانون سے واقف ہو گیا۔ تاہم اکیلے کسی خطرناک مقام پر جاتے ہوئے اب بھی ڈر لگتا تھا۔ میں نے اپنے تین سالہ قیام کے دوران میں مقامی باشندوں سے خاصا ربط و ضبط بڑھا لیا تھا اور ان کی زبان بھی نہ صرف بخوبی سمجھنے لگا تھا بلکہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بھی بیان کرنے پر قادر ہو گیا تھا۔ ملایا کے شہروں میں رہنے والے لوگوں کے برعکس جو جدید تہذیب و تمدن سے آہستہ آہستہ آشنا ہوتے جا رہے تھے۔

توہمات سے قطع نظر ان لوگوں میں سچائی، بہادری، محنت اور جفاکشی، مہمان نوازی کی روایتیں اپنی اصلی شکل میں ملتی ہیں۔ ہر شخص اپنے مذہب کے احکامات پر چلتے رہنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ خدا اور رسولؐ سے محبت ان کا جزو ایمان ہے۔ دھوکا، فریب، عیاری اور دھونس دھاندلی سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ یہ لوگ ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں صدیوں سے کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ جو کام باپ دادا کے زمانے سے ہوتا چلا آرہا ہے اس میں کسی کو ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل نہیں۔

ریاست جوہور میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اچانک مجھے کیہال کے علاقے میں ربڑ کے جنگلوں کی نگرانی اور مزدوروں سے کام لینے کے عہدے پر ایک برطانوی ٹھیکیدار کمپنی کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ کیہال میں ربڑ کے انتہائی وسیع و عریض گھنے جنگل، دلدلی زمین اور نہایت خطرناک گھاٹیاں تھیں۔ کہیں کہیں ان جنگلوں میں سو دو سو افراد پر مشتمل آبادی کے آثار نظر آ جاتے ورنہ ہر جگہ درندوں کی حکومت تھی۔ ندی نالے بکثرت تھے جو برسات کے موسم میں خوب چڑھ جاتے۔ ان کا پانی نہ صرف اردگرد کی بستیوں میں تباہی مچا دیتا بلکہ درندوں کو بھی ان کی کمین گاہوں سے نکال کر بستیوں کی طرف دھکیل دیتا۔

درندوں کے علاوہ دوسری بڑی مصیبت سانپ، بچھو، کن کھجورے اور اس طرح کے دوسرے حشرات الارض تھے جو چیونٹیوں کی طرح راستوں، پگڈنڈیوں اور پلوں پر رینگتے نظر آتے تھے۔ لوگ مویشیوں کو پالنے کے بڑے شوقین تھے کیونکہ انہی کے گوشت اور دودھ پر ان کا گزارہ تھا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ درندے دن دہاڑے بستیوں میں گھس آتے اور مویشیوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ یہاں بندوق کسی کسی کے پاس تھی وہ بھی پرانی جسے مزل لوڈنگ کہتے ہیں اور جس میں نال کی طرف سے بارود بھر کر فائر کیا جاتا ہے۔ یہ بندوق نہایت خطرناک ہوتی ہے اور اگر چلانے والا احتیاط سے کام نہ لے تو اس کو زخمی یا ہلاک کر ڈالتی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اپنے قصے کی طرف آتا ہوں۔

جڑواں آدم خور ابتدا میں مویشی اٹھالے جاتے تھے ان کا باپ کیہال کے جنگلوں میں رہنے والا انتہائی خونخوار شیر تھا۔ اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ کئی من وزنی بھینس کو پنجے کی ایک ہی ضرب سے ہلاک کر ڈالتا اور اسے دانتوں کی مدد سے گھسیٹ کر کئی میل دور لے جاتا۔ یہ شیر بھینسوں کا خصوصاً دشمن تھا۔ بعض اوقات وہ دو دو بھینسوں کو پکڑ کر گھسیٹ لے جاتا۔ لوگ اس کی حرکتوں پر پریشان اور جھنجلائے ہوئے تھے۔ لیکن کچھ بس نہ چلتا تھا۔ خیر گزری کہ ابھی اس نے کسی آدمی کے گوشت اور خون کا ذائقہ نہیں چکھا تھا ورنہ قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

اس شیر کو میں نے کس طرح ہلاک کیا یہ داستان الگ ہے۔ اس وقت تو میں جڑواں آدم خوروں کی کہانی بیان کروں گا۔

وہ شیر جب مارا گیا تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ ان کے مویشی اب محفوظ ہو گئے۔ اور لوگ بھی آزادی سے ایک دوسرے کے کام کرنے لگے تھے مگر ایک ماہ بعد مجھے پتا چلا کہ شیرنی میدان میں آگئی ہے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کیونکہ ملایا کی شیرنیاں عام طور پر خونخوار اور مردم آزار نہیں ہوا کرتیں۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ اس شیرنی کو اپنے دو جڑواں بچوں کی پرورش کے لیے بہرحال گوشت کی ضرورت تھی اور چونکہ وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے قابل نہ تھی اس لیے مویشیوں پر ہاتھ صاف کرنا اسے آسان نظر آیا۔

میں ایک دن اس شیرنی کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ ایک جھاڑی کے اندر سے کچھ کھڑبڑ کی آواز آئی۔ میں رک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ شیرنی تو نظر نہ آئی البتہ بھورے

بھورے رنگ کے دو ننھے ننھے بچے ضرور دکھائی دیے۔ یہی جڑواں بچیاں تھیں۔ میری آہٹ پا کر وہ نجانے کہاں غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد کئی ماہ تک میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس دوران اس شیرنی نے چار پانچ بھینسیں اور کچھ بکریاں مار ڈالی تھیں۔ ایک دن شیرنی ایک مقامی باشندے کی مزل لوڈنگ بندوق کا نشانہ بن کے زخمی ہو گئی۔ زخمی ہونے کے بعد اس کے لیے مویشیوں کو ہلاک کرنا بھی ممکن نہ رہا اور پھر اچانک ایک روز وہ جنگل میں اس جگہ نمودار ہوئی جہاں مزدور ربڑ کے درختوں پر کام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ دونوں بچے بھی تھے۔ جو جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے ہی والے تھے۔

شیرنی نے ایک مزدور کو پکڑ لیا اور گھسیٹ کر جھاڑیوں میں لے گئی پھر اس نے دور کھڑے دہشت زدہ مزدوروں کے سامنے لاش کو چیرا پھاڑا اور ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ شیرنی کا آدم خور بن جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ مزدوروں نے نہ صرف کام پر جانا چھوڑ دیا بلکہ خوف و دہشت کی لہر نے سراسیمگی پیدا کر دی۔ ایک ہفتے بعد شیرنی نے دوسرا انسان شکار کیا۔ اس مرتبہ ایک بدنصیب عورت اس کے ہتھے چڑھی۔ وہ ندی سے پانی کا گھڑا بھر رہی تھی کہ گھاس میں چھپی ہوئی شیرنی نے عورت پر حملہ کر دیا۔ عورت کی چیخیں سن کر کچھ لوگ نیزے اور تلواریں لے کر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ شیرنی نے عورت کو چوہے کی مانند منہ میں دبا رکھا ہے اور اس کے ساتھ دو چھوٹے شیر بھی اچھلتے کودتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شیرنی آدم خور بن چکی ہے بلکہ اس نے اپنے بچوں کو بھی انسانی گوشت اور خون کی چاٹ لگا دی ہے اور اگر ان کا صفایا نہ کیا گیا تو یہ تمام بستیوں کا صفایا کر دیں گے۔

تیسرے ہفتے شیرنی نے ایک اور شخص کو ہلاک کیا مگر لاش کو لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت بستی کے سو ڈیڑھ سو آدمی جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے خون میں لت پت شخص کو دیکھا تو رک گئے۔ وہ مر چکا تھا۔ چنانچہ اسے بھی چند لوگوں نے چادر میں لپیٹا اور ساتھ لے چلے۔ شیرنی اور اس کے بچے قریبی جھاڑیوں میں چھپے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ شیرنی نے جب لاش کو ہاتھ سے جاتے دیکھا تو تڑپ اٹھی اور گرج کر جھاڑیوں سے باہر نکل آئی۔ لوگ اندھا دھند بھاگ اٹھے اور انہوں نے جنازہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور درختوں پر چڑھ گئے۔ شیرنی دیر تک مضطرب اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ لیکن اسے لاش کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوئی پھر وہ ایک طرف کو چلی گئی۔

اگلے روز یہ قصہ میرے کانوں میں پہنچا۔ میں نے فوراً چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لاش ابھی تک اسی حالت میں پڑی تھی اور کسی جانور نے اسے چھیڑنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ وہ ایک بوڑھا اور عبادت گزار شخص تھا جس کے بارے میں مقامی لوگ کہتے تھے کہ وہ خدا رسیدہ اور ولی آدمی ہے۔ اس کی کئی کرامتیں مشہور تھیں مگر شیرنی کے سامنے اس کی کوئی کرامت کام نہ آئی۔ دراصل اس کی موت اسی بہانے لکھی تھی۔ میں بھی اسے جانتا تھا لیکن وہ خدا رسیدہ تھا یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک پرہیزگار اور متقی شخص ضرور تھا۔ مجھے اس کی اندوہناک موت کا صدمہ ہوا۔ بستی والے بھی اس کا ماتم کر رہے تھے مگر جنگل جا کر اس کی لاش اٹھانے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ شیرنی نے اسے ہڑپ نہیں کیا تو یہی بات ہے کہ مجھے اس شخص کے ولی ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ لاش ساری رات جنگل میں پڑی رہی اور بھوک سے بے تاب شیرنی اور اس کے بچے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔ میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ لاش کو وہیں پڑا رہنے دیں۔ میں ایک رات اس کے قریب ہی کسی درخت پر مچان باندھ کر شیرنی کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔ سورج غروب ہونے سے آدھا گھنٹا پیشتر میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر مچان پر پہنچ گیا۔ شمال کی جانب سے آہستہ آہستہ کالی گھٹائیں امڈ رہی تھیں اور ہوا کی تیزی اور تندی میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اگر ہوا اس طرح چلتی رہی تو مچان کا خدا ہی حافظ ہے۔ میرے ساتھ آنے والے سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر واپس جا چکے تھے۔ اب میں تھا اور جنگل کی ہیبت ناک فضا جس میں تین آدم خور گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یک لخت گھٹائیں اٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان تاریک ہو گیا۔ پھر بجلی کی کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مچان سے اترنا محال تھا۔ بارش کا پانی ننھے ننھے کنکروں کی مانند میرے چہرے پر آ کر لگ رہے تھے اور سردی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میرے سامنے کچھ فاصلے پر بوڑھے کی لاش پڑی پانی میں بھیگ رہی تھی اور میں اپنی

اس حماقت پر ندامت محسوس کر رہا تھا کہ محض اپنے شوقِ مہم جوئی کی خاطر ایک مسلمان بزرگ کی میت کی بے حرمتی کر رہا ہوں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی پاداش میں خدا مجھے اس شیرنی کا نوالہ بنا دے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم کا رواں رواں فرطِ خوف سے کانپ گیا۔ جسم تو پہلے ہی لرز رہا تھا۔ اس بھیانک تصور نے میرا دل و دماغ مفلوج کر دیا۔ اب میں خدا سے اپنے اس قصور کی دل ہی دل میں معافی مانگ رہا تھا۔

بارش اور ہوا کا شور، الامان والحفیظ، ہر طرف گھپ اندھیرا جسے کبھی کبھی بجلی کی چمک دور کرتی تھی۔ میں جس درخت پر مچان باندھ کر خرگوش کی مانند دبکا بیٹھا تھا وہ کچھ زیادہ اونچا نہ تھا۔ کپڑے تر ہو چکے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس حالت میں اگر شیرنی نمودار ہو گئی تو میں فائر کیسے کروں گا۔ ادھر بارش کی یہ کیفیت کہ گویا نہ رکنے کی قسم کھائی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد کچھ اُمید بندھی کہ یہ قیامت خیز طوفان بادوباراں رک جائے گا۔ موسلا دھار بارش آہستہ آہستہ پھوار میں بدلنے لگی۔ مطلع صاف ہونے لگا اور آسمان پر اکا دکا تارے نمودار ہونے لگے۔ درختوں سے گرتے ہوئے پانی کی آوازیں اب بھی کانوں میں آ رہی تھیں اور میں نے مدھم سی روشنی میں دیکھا کہ بارش کا پانی میرے دائیں جانب ایک نشیب میں جمع ہو رہا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جانور درخت کے عین نیچے حرکت کر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے شیرنی کی گرج سے جنگل کا چپہ چپہ بیدار ہو گیا اور میرا دل یک لخت اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے بدحواس ہو کر برقی ٹارچ روشن کر دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قدآور شیرنی کچھ فاصلے پر کھڑی للچائی نظروں سے لاش کی طرف دیکھ رہی ہے۔

ٹارچ روشن ہوتے ہی شیرنی نے میری طرف گھور کر دیکھا اور پھر گرجتی ہوئی اس طرف آئی لیکن وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ غالباً اس کا دایاں پنجہ بے کار ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی اور رائفل سے نشانہ لیے بغیر فائر کر دیا۔ شیرنی دھاڑتی ہوئی جھاڑیوں میں جا چھپی اور دیر تک اِدھر اُدھر پھرنے اور غرانے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس موقعے پر میں پڑھنے والے دوستوں کو سچ سچ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں جم کاربٹ، کینتھ اینڈرسن، جے اے ہنٹر یا کرنل پیٹرسن کی طرح تجربے کار اور نڈر شکاری ہرگز نہیں ہوں۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ مجھے رائفل سنبھالنی پڑی اور وہ بھی اس لیے کہ جس علاقے میں میرا کام تھا وہاں رائفل کے بغیر گزارہ ہی نہیں تھا۔ ابتدا میں ایک دو شیر مارنے کے بعد مجھے خوش فہمی ہو گئی تھی کہ میں اچھا شکاری بن سکتا ہوں۔ چنانچہ اس زعم میں آدم خوروں سے دو دو ہاتھ کرنے کی جرأت ہوئی۔ لیکن اب پتا چلا کہ یہ کام کتنے جان جوکھوں کا ہے اور شکاری کی ذرا سی حماقت اسے کس طرح آدم خور کے پیٹ کا ایندھن بنا سکتی ہے۔

میں جس مچان پر بیٹھا تھا، زمین سے اس کی اونچائی سات آٹھ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور اگر شیرنی کی اگلی دائیں ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ یقیناً اتنی بلندی تک جست لگا کر مجھے پکڑ سکتی تھی اور ممکن ہے کہ اگر طوفان بادوباراں نہ نازل ہوتا تو وہ ایسا کر بھی گزرتی تاہم خدا نے بال بال بچایا۔ میں نے شیرنی کو خوف زدہ کرنے کے لیے مزید دو فائر کیے اور یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ چند منٹ گرجنے اور غرانے کے بعد وہ دور چلی گئی اور پھر رفتہ رفتہ اس کی آواز معدوم ہو گئی۔

مجھے یقین تھا کہ اگر میں یہیں بیٹھا رہوں، تو صبح سے پہلے کوئی شخص میری خبر لینے نہیں آئے گا اور ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔

شیرنی جا چکی تھی اور خطرہ ٹل گیا تھا۔ کیا سیاہ بادل دوبارہ جمع ہو رہے تھے۔ میں پہلے ہی بارش میں اس قدر بھیگ چکا تھا کہ مزید بھیگنے سے بیمار پڑنے کا خدشہ تھا۔ جوں توں کر کے مچان سے اترا اور واپس گاؤں کی طرف چلا۔ لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ اور انہوں نے فائروں کی آوازیں بھی سنی تھیں لیکن جب پتا چلا کہ شیرنی ابھی مری نہیں تو غصے اور مایوسی سے ان کے چہرے لٹک گئے۔ غصہ اس بات پر کہ میری وجہ سے پہنچے ہوئے ایک بزرگ کی لاش بے گور و کفن جنگل میں پڑی رہی اور مایوس یوں کہ شیرنی پھر بچ کر نکل گئی۔ لوگوں نے اگرچہ مجھ سے کچھ کہا تو نہیں لیکن پھر بھی ان کی ناراضگی کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔

اگلے روز ان بزرگ کو نہایت عزت و احترام سے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جنازے میں دور نزدیک کی بستیوں کے مرد و زن شریک ہوئے۔ میری حالت چوروں کی سی تھی اور بلاشبہ مجھے اپنے کیے پر شرم محسوس ہو رہی تھی مگر میں معذرت کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ پانی میں بھیگنے اور سردی لگنے کے سبب مجھے کئی روز تک ہلکا ہلکا بخار بھی رہا۔

لیکن اس دوران میں بھی شیرنی کی کھوج میں برابر لگا رہا۔ آخر معلوم ہوا کہ اسے دو بچوں سمیت اس علاقے کی مشہور کیجال پہاڑی کے جنوبی حصے میں گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔

کیجال پہاڑی کے بارے میں مقامی باشندے طرح طرح کی کہانیاں بیان کرتے تھے۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس پہاڑی پر صدیوں پہلے کوئی بزرگ آکر ٹھہرے تھے اور انہوں نے چلا کشی کی تھی۔ چلے کے دوران میں جس کی مدت چالیس روز تھی۔ ان بزرگ نے کچھ کھایا نہ پیا۔ لیکن انہیں جسمانی کمزوری یا نقاہت مطلق نہ ہوئی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ جنگل کے تمام جانور اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکلے اور پہاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں درندے، چرند، پرند بھی شامل تھے۔ وہ ان بزرگ کو سلام کرنے آئے تھے لیکن بزرگ نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ سبھی جانور خاموشی سے چلے گئے۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ درندے اس پہاڑی کے گرد ساری ساری رات پہرہ دیتے۔ بعد میں وہ بزرگ اچانک غائب ہو گئے۔ لیکن ان کی برکت کا اثر ابھی تک اس پہاڑی پر موجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص پہاڑی کی چوٹی پر پناہ لے لے۔ اسے کوئی درندہ یا دوسرا جانور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

کیجال پہاڑی کے گرد و نواح میں تین بستیاں بڑی مشہور اور خوب آباد تھیں۔ ایک کا نام تیلوک پنچور، دوسری کا تیلوک کالونگ تیسری کو تیلوک مینکو انگ کہتے ہیں۔ ملائی زبان میں تیلوک کا لفظ بستی یا گاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زیادہ تر باشندے درختوں سے ربڑ نکالنے، کٹائی کرنے، گھاس جمع کرنے اور اس طرح کے بہت سے کام کیا کرتے تھے۔ نہایت صابر و شاکر تھے۔ جو مل جاتا اس پر قناعت کرنے والے، فائدہ ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور اگر نقصان ہو جاتا تو خدا کی طرف سے کوئی بہتری سمجھ کر بھول جاتے۔

جنگلی درندے آئے دن ان کے جانور اٹھا اٹھا کر لے جاتے مگر ان لوگوں کو مطلق پروا نہ تھی۔ میں نے کئی آدمیوں کی زبانی سنا کہ یہ درندے بھی خدا کی مخلوق ہیں اور انہیں رزق دینا بھی اللہ کا کام ہے۔ لہٰذا مہینے دو مہینے میں چند مویشی ان کی خوراک بن جائیں تو کیا حرج ہے۔ ان لوگوں نے خود بھی جنگلی درندوں سے چھٹکارا پانے کی کبھی کوشش نہیں کی غالباً یہ روایت وہاں تھی ہی نہیں کہ جو ہمیں نقصان پہنچائے اسے مار ڈالنے، بھگانے کی کوشش کرو۔ بس چپ چاپ ظلم سہنا ان کی فطرت بن چکی تھی۔

کیجال کی یہ آدم خور شیرنی نہ معلوم کہاں چھپ گئی تھی۔ بہت عرصے تک اس کا کچھ پتا نہ چلا اور اس دوران میں کسی نئی واردات کا بھی تذکرہ سننے میں نہ آیا۔ بہرحال لوگوں نے سکون کا سانس لیا اور اطمینان سے اپنے روزمرہ کے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن میرے دل میں پھانس سی اٹکی ہوئی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا آخر شیرنی اور اس کے بچوں پر کیا بیتی۔

کیجال کے گرد و نواح میں ایک ایک چپہ چھان مارا مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ البتہ بعض لوگوں نے یہ اقرار کیا کہ انہوں نے رات کے ہولناک سناٹے میں پہاڑی کی طرف سے شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں ضرور سنی ہیں۔

کیجال کے چاروں طرف نہایت گھنا اور تاریک جنگل تھا جسے ایک اور برطانوی کمپنی نے خرید لیا تھا اور چند روز کے اندر اس میں کام شروع ہونے والا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے، میں اپنے دوست سے ملنے پنچور کی طرف گیا۔ جس جگہ میں رہتا تھا وہاں پنچور کا فاصلہ تقریباً بیس میل تھا اور گھوڑے کے سوا اور کوئی سفر کا چارہ نہ تھا۔ صبح کا وقت تھا اور سنہری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے گھوڑے پر محو سفر تھا۔ راستے میں جا بجا مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ سبھی مجھے جانتے پہچانتے تھے۔ ان سے شیرنی اور اس کے بچوں کے بارے میں پوچھتا آگے بڑھ گیا۔ کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔

جب پہاڑی کے دامن میں پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے گھوڑا ایک ٹیلے کے پاس روکا اور اسے گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر میں نے اپنا ناشتے دان نکالا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ تیسرے پہر تک پنچور پہنچ جاؤں گا۔

ابھی بمشکل میں نے چند نوالے ہی کھائے تھے کہ گھوڑا زور سے ہنہنانے لگا پھر دوڑ کر میرے پاس آیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور گردن ہلا ہلا کر ہنہناتا جاتا۔ میں سمجھ گیا ضرور کوئی بات ہے فوراً رائفل سنبھالی اور چوکنا ہو کر اپنے اردگرد دیکھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک بلند ٹیلے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھائی تھی اور اس میں کسی جانور کے آہستہ آہستہ حرکت کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی گھاس میں چھپ گیا۔

گھوڑا ایک بار پھر ہنہنایا اور یک لخت ایک طرف اندھا دھند بھاگ اٹھا اور ابھی میں اسے حیرت اور خوف کی

ملی جلی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ کھائی میں سے دو غراتی، گرجتی نہایت خوبصورت شیرنیاں برآمد ہوئیں اور گھوڑے کے تعاقب میں روانہ ہو گئیں۔ چشم زدن میں انہوں نے گھوڑے کو جالیا اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ سمجھ سکوں۔ وہ گھوڑے کو گھسیٹ کر جنگل میں غائب ہو گئیں۔

دیر تک پتھر کے بے جان بت کی مانند میں بھی گھاس میں بے حس و حرکت پڑا رہا پھر ہمت کر کے اٹھا اور کھائی کی طرف چلا۔ شیرنیوں کے قدموں کے نشانات اور تازہ لید کثرت سے پڑی تھی اور جانوروں کی ہڈیوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ تعفن اور سڑاند برداشت سے باہر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ شیرنیاں ابھی تک مل جل کر رہتی ہیں اور شکار یہاں لا کر ہڑپ کرنے کی عادی ہیں۔ کھائی کے پرلے سرے پر مجھے ایک جانور کی لاش پڑی دکھائی دی اور یہ وہی بوڑھی شیرنی تھی جس کی تلاش میں میں حیران پریشان پھر رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی پھٹی ہوئی تھی۔ نامعلوم کیا حادثہ پیش آیا کہ شیرنی اس بلند ٹیلے سے نیچے کھائی میں گری۔ ایک بڑے پتھر سے اس کا سر ٹکرایا اور وہ وہیں مر گئی۔

گھوڑا تو ہاتھ سے جا چکا تھا مگر مجھے ان جوان شیرنیوں کے ٹھکانے کا پتا چل گیا تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے۔ پہلا تو یہ کہ سیدھا نیچور جاؤں۔ اپنے دوست سے تذکرہ کروں پھر اسے ساتھ لے کر یہاں آؤں اور ان شیرنیوں کو ٹھکانے لگادوں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ چھپ کر شیرنیوں کا انتظار کروں۔ دیر تک سوچتا رہا۔ یہ طے کر کے کہ ان موذیوں کا ٹھکانا تو معلوم ہو چکا ہے۔ نیچور جانا چاہیے۔

میں تیز قدموں سے اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیجال پہاڑی اپنی پوری عظمت اور شان شوکت کے ساتھ میرے سامنے تھی اور جوں ہی میں چڑھائی طے کر کے پرلی ڈھلان پر نکلا نیچور کی خوبصورت بستی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ ان دنوں نیچور میں میرے ایک انگریز دوست جنہیں مسٹر ولسن کہہ لیجیے۔ تعینات تھے اور جنگلوں کے ایڈمنسٹریٹر آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سیدھا ان کے بنگلے پر پہنچا۔ وہ لکڑی کے برآمدے میں بیٹھے سہ پہر کی چائے پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت تپاک سے ملے۔ آدم خور شیرنی کی داستانیں ان کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں اور اگرچہ انہیں کبھی شکار سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن تھے جی دار آدمی۔ میرا قصہ سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ "خدا کا شکر ادا کیجیے کہ گھوڑے پر بات ٹل گئی ورنہ وہ شیرنیاں آپ کو بھی پکڑ کر لے جاتیں۔"

"جی ہاں بس معجزہ ہی ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ سمجھ لیجیے کہ اب پھر اس علاقے پر کوئی آفت آیا ہی چاہتی ہے۔ آدم خور شیرنی تو مر چکی ہے۔ میں اس کی لاش کھائی میں پڑی ہوئی دیکھ چکا ہوں۔ وہ بلند چٹان سے اتفاقیہ طور پر گری اور مر گئی۔ اس کے دو بچے جوان ہو چکے ہیں اور دونوں مادہ ہیں، انہی نے میرے گھوڑے کو پکڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے انہیں بچپن سے ہی آدمی کے خون اور گوشت کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ ابھی تو وہ مویشیوں کے پیچھے ہیں لیکن جلد ہی آدمیوں کی بھی باری آئے گی اور علاقہ بھی آپ کا ہے۔"

مسٹر ولسن یہ سن کر متفکر ہو گئے۔ چند لمحے تک خاموش بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ "واقعی بات تو تشویش کی ہے۔ آج کل کام کا زور ہے۔ اگر ان دنوں کچھ گڑبڑ ہوئی تو خاصا نقصان ہو گا۔ ان درندوں کا ابھی سے انتظام ہونا چاہیے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"جناب میرے علاقے میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ اب خدا خدا کر کے کچھ سکون ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ سکون عارضی ہے حالات تبدیل ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ آپ حکومت کی طرف سے مجھے کیا کیا سہولتیں پہنچا سکتے ہیں۔"

"سہولت تو جو آپ کہیں مل سکتی ہے۔" مسٹر ولسن نے کہا۔ "لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے عجیب ہیں۔ ان سے آپ کو تعاون بمشکل ملے گا اور لوگوں کی مدد کے بغیر کوئی قدم اٹھانا خطرناک ہو گا۔ بہرحال آپ آج آرام کیجیے۔ صبح میں اپنے چند کارندوں کو بلاؤں گا۔ ان میں چند لوگ نڈر اور جنگلوں سے واقف ہیں۔ روپے کا لالچ کام کر جائے گا۔ شاید ان میں سے ایک آدھ آدمی بندوق چلانا بھی جانتا ہو۔"

اگلے روز علی الصباح میں بیدار ہوا۔ مسٹر ولسن کے اردلی سے معلوم ہوا کہ صاحب دورے پر چلے گئے ہیں اور شام تک لوٹیں گے۔ میں نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور گاؤں کی سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ یہ گاؤں تین طرف سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ آبادی مشکل سے پانچ چھ سو نفوس پر مشتمل ہوگی۔ مکان سب کے سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ مرد کام پر جا چکے تھے۔ بچے گھروں اور گلیوں میں کھیل رہے تھے اور عورتیں آپس میں گپ شپ

میں مگن تھیں۔ میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ کچھ بوڑھے لوگوں سے سلام دعا ضرور ہوئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا گھوم پھر کر بنگلے کی طرف لوٹا۔ یکایک پندرہ بیس آدمیوں کا ایک گروہ شمال سے گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ لوگ بے وقت واپس آ رہے تھے۔ اس لیے میں رک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ یقیناً کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ جب یہ گروہ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ چیخ چیخ کر اپنی زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جنھیں میں پہچانتا تھا اور وہ میری شکل سے آشنا تھے۔ چنانچہ بستی کی طرف جانے کی بجائے سیدھے میری طرف آئے اور آتے ہی کہنے لگے۔ "جناب، جلدی جائیے، کالونگ والی سڑک پر پندرہ فٹ لمبا اور پانچ فٹ اونچا شیر گھوم رہا ہے، اس نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر خدا نے بچالیا ہم کام پر جا رہے تھے اور وہ ہمارے انتظار میں وہاں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا اور دانت نکال کر غرایا"۔

"شیر نہیں شیرنی تھی۔" دوسرے نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ شیرنی تھی۔"

میں سمجھ گیا کہ انہوں نے جڑواں شیرنیوں میں سے کسی ایک کو دیکھ لیا ہے۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ دن نکلنے کے بعد بھی اس نے انہیں ادھر سے گزرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"آؤ تم لوگ میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "ڈرو مت میرے پاس بندوق ہے۔ میں اس شیرنی کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔" بڑی مشکل سے میں نے انہیں ساتھ لیا۔ ان سب کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور جسمانی طور پر بھی سب ہٹے کٹے تھے۔ اگر چاہتے تو شیرنی کو گھیر کر چند لمحوں میں تکہ بوٹی کر ڈالتے۔ اس معاملے میں یوگنڈا، کینیا اور نیروبی کے جنگلی خاصے تیز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نیزوں، برچھوں، تیر کمانوں سے ہی شیروں، چیتوں، گینڈوں اور ہاتھیوں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ اگر چہ ایسی مہموں میں کئی لوگ مارے بھی جاتے ہیں۔ بہرحال میں ان سب افراد کو نصیحت کرتا اور بہادر لوگوں کے قصے سناتا ہوا اس پگڈنڈی کی طرف چلا جدھر سے وہ لوگ آ رہے تھے۔

یہاں جنگل زیادہ گھنا نہ تھا۔ زمین نرم اور دلدلی تھی اور جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے اگا ہوا تھا۔ ان جھاڑیوں کو عبور کرنا انسان کے بس میں نہ تھا۔ کیونکہ تین تین انچ لمبے اور سوئیوں کی مانند نوکیلے کانٹے تھے۔ میں نے ان آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اونچی آواز میں باتیں کرتے یا کوئی گیت گاتے ہوئے چلیں تاکہ شیرنی اگر اب بھی ہوئی تو اپنے آرام میں خلل پا کر دوبارہ متوجہ ہوگی۔ تقریباً ڈھائی تین میل چلنے کے بعد اچانک ایک شخص چلایا "دیکھیے جناب، یہ ہے اس کے پنجوں کے نشان۔"

میں نے ان نشانات کو غور سے دیکھا اور دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ شیرنی ہے۔ مجھے ان لوگوں نے بتایا تھا کہ اس کا قد پندرہ فٹ لمبا اور پانچ فٹ اونچا ہے۔ لیکن اس کے قد وقامت کا جو اندازہ کیا وہ یہ تھا کہ قدم سے لے کر ناک تک سات فٹ لمبا اور اونچائی تقریباً ڈھائی فٹ تھی۔ نرم زمین پر اس کے گہرے پنجوں کے نشانات بھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس کا وزن عام شیرنیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہے۔ بہرحال ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ حد نظر تک خاردار جھاڑیاں بے حس وحرکت کھڑی تھیں۔ کہیں کہیں جنگلی چوہوں اور نیولوں کے غول بھی پھرتے نظر آئے۔ مگر ہمارے قدموں کی آہٹ پا کر چشم زدن میں غائب ہو جاتے۔ شیرنی کے پنجوں کے نشان جھاڑیوں کے ساتھ سیدھے مشرق کی طرف چلے گئے تھے۔

اب ہم... یہ اجاڑ اور ویران حصہ عبور کر کے ایک سرسبز وشاداب پہاڑی کے دامن میں داخل ہوئے جس کے اوپری جانب ایک گھنا اور ہیبت ناک ربڑ کے درختوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا اور یہ مزدور اسی جنگل میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے بے شمار لوگوں کے باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ ایک جانب لکڑی کا چھوٹا سا مکان بنا رہے تھے۔ شیرنی اس جنگل میں کسی جگہ چھپی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والے ایک آدمی نے اسے اس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس شیرنی کو بچپن سے انسانی خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ بہرحال میں نے اس موقعہ پر یہ خبر سنا کر افراتفری پھیلانے کو مناسب نہ سمجھا۔ البتہ نگران کو بتا دیا کہ شیرنی کا خاص خیال رکھے کہ وہ آدم خور ہے اور کسی وقت بھی مزدوروں پر حملہ کرسکتی ہے۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر دہشت کے آثار نمودار ہوئے، اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر یہ خوفناک خبر سارے جنگل میں پھیل چکی تھی اور مزدور کام بند کر کے ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ غضب یہ ہوا کہ اس خبر کی تصدیق میرے ساتھ آنے والے مزدوروں نے بھی کر دی۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو

بھی یہ معلوم نہ تھا کہ جڑواں شیرنیاں آدم خور ہیں۔ اس جنگل سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی مزدوروں کے اچانک کام چھوڑ دینے سے مجھے تشویش ہوئی کہ جب ذمے دار لوگوں کو پتا چلے گا تو وہ مجھے قصوروار ٹھہرائیں گے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مزدور دوبارہ کام شروع کردیں مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ سب اپنے اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے سوچا ممکن ہے مسٹر ولسن آگئے ہوں وہی اس معاملے میں کوئی قدم اٹھا سکیں گے۔ لہٰذا نجھور واپس چلنا چاہیے۔ چنانچہ نجھور میں رہنے والے مزدوروں کی ایک جماعت کے ساتھ واپس ہوا اور سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر قبل بستی میں پہنچ گیا۔

مسٹر ولسن کے بنگلے کے سامنے مزدوروں، عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا اور ان میں سے بعض کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ کہیں مسٹر ولسن کو کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ مجمع مجھے دیکھ کر کائی کی طرح پھٹ گیا۔ مسٹر ولسن کا اردلی دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے بچوں کی طرح چلا چلا کر رو رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔ "مسٹر ولسن کہاں ہیں؟"

"انھیں شیر پکڑ کر لے گیا ہے۔" اردلی نے جواب دیا اور میرا دل جیسے بیٹھنے لگا۔ "شیر پکڑ کر لے گیا ہے؟ کہاں؟ کس جگہ۔" اردلی نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔ مسٹر ولسن اپنی پرانی جیپ گاڑی میں گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی بندوق یا پستول نہیں تھا۔ شام سے پہلے نجھور کی طرف واپس آرہے تھے کہ ایک جگہ جیپ خراب ہوگئی۔ انھوں نے اسے ٹھیک کرنے کی بڑی کوشش کی مگر بے سود چنانچہ جیپ وہیں چھوڑ کر پیدل چلے۔ اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔ نجھور ابھی پانچ میل دور تھا۔ یکایک انھوں نے دیکھا ایک شیرنی اور شیر تعاقب میں چلا آتا ہے اور اس سے پیشتر کہ وہ بچاؤ کے لیے کسی درخت پر چڑھتے شیر نے جست بھر کر انھیں دبوچ لیا اور منہ میں دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حضور میں نے یہ منظر ایک درخت کی اوٹ سے دیکھا اور خوف سے زمین پر گر پڑا میرے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ میں اس طرف پیشاب کرنے گیا تھا ورنہ کم بخت دوسرا شیر مجھے بھی پکڑ کر لے جاتا۔"

میری گرفت رائفل پر سخت ہوگئی وہ رات انتہائی ڈراؤنی اور بھیانک تھی۔ بار بار مسٹر ولسن کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگتا۔ گاؤں کے لوگ بھی ان کی موت پر افسردہ اور خاموش تھے۔ بچے سہمے ہوئے، عورتیں لرزاں و ترساں اور مرد حیران پریشان تھے۔

میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ گاؤں سے چند ہٹے کٹے اور جی دار قسم کے لوگ جمع کیے اور مسٹر ولسن کی لاش کے بچے کھچے اجزا کی تلاش میں روانہ ہوا۔ راہنمائی کے لیے اردلی کو ساتھ لے لیا۔ نجھور سے پانچ میل شمال کی جانب ایک جگہ جنگل کے عین وسط میں مسٹر ولسن کی جیپ کھڑی دکھائی دی۔ کچھ فاصلے پر شیرنی کے پنجوں کے نشانات بھی واضح تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کافی دور سے جیپ کے تعاقب میں بھاگتی آئی تھی اور یہ حرکت شیرنی کی فطرت سے بعید ہے۔ ممکن ہے جیپ خراب نہ ہوتی تو مسٹر ولسن پر اسے حملہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ جب میں نے جیپ کو معائنہ کیا تو وہ فوراً اسٹارٹ ہوگئی۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ شیرنی نے جس جگہ مسٹر ولسن کو گرایا تھا وہاں جما ہوا خون بڑی مقدار میں بکھرا ہوا تھا اور ان کے کپڑوں کی دھجیاں بھی جابجا بکھری نظر آئیں۔ یہ منظر اتنا دل دوز تھا کہ میں اپنے آنسو ضبط نہ کرسکا۔ اور اردلی کی تو روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

مسٹر ولسن کی لاش ڈھونڈنے میں کچھ زیادہ وقت نہ ہوئی۔ ایک گھنی جھاڑی سے ان کی کھوپڑی، ہاتھوں پیروں کی انگلیاں، چند پسلیاں، ایک ٹانگ اور آنتیں وغیرہ پڑی نظر آئیں۔ شیرنی غالباً کئی دن کی بھوکی تھی، اس نے جی بھر کر پیٹ بھرا تھا۔ میں نے ان اعضا کو وہیں رہنے دیا اور اِدھر اُدھر جائزہ لے کر اندازہ کیا کہ کون سی جگہ مناسب ہے جہاں چھپ کر میں شیرنی کا انتظار کروں۔ یہ تو طے تھا کہ وہ دوبارہ اِدھر ضرور آئے گی۔

تقریباً پچیس فٹ کے فاصلے پر ایک ٹیلا نظر آیا جس کے اردگرد جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے اگا ہوا تھا۔ یہ ٹیلا بہترین کمین گاہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد رات اس ٹیلے پر گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ ممکن ہے میں ایسی حماقت آمیز جرأت نہ کرتا لیکن مسٹر ولسن کی دردناک موت سے میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور میں ہر قیمت پر اس شیرنی کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو واپس بھیج دیا اور خود اردلی کے ساتھ ٹیلے کے گرد حفاظتی اقدامات کرنے لگا۔ اردگرد سے مزید خاردار جھاڑیاں کاٹ کاٹ کر

ٹیلے کے چاروں طرف پھیلا لیں تاکہ شیرنی اگر اس پر چڑھنے کی کوشش کرے بھی تو ناکام رہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے شیرنی کے پنجوں کے نشانات تلاش کیے۔ معلوم ہوا کہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد وہ جنگل کے اندرونی حصے میں چلی گئی ہے۔ پنجوں کے نشان سیدھ میں چلے گئے تھے۔ اردلی نے بتایا دو تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی چشمہ ہے اور شیرنی اپنی پیاس بجھانے وہیں گئی ہوگی۔ میں نے چشمہ دیکھنے کا ارادہ کیا تو وہ کچھ پس و پیش کرنے لگا۔ غالباً ڈر رہا تھا لیکن ہمت بندھانے پر اور مسٹر ولسن کی مہربانیوں کا خیال کرکے آخر چل ہی پڑا۔ تاہم خوفزدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے رائفل سنبھالے جا رہا تھا۔ شیرنی نے چشمے تک پہنچنے کے لیے نہایت چالاکی سے کام لیا تھا وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے چکر کاٹ کر وہاں تک پہنچی تھی۔ بہرحال ہم نے بہت جلد وہ چشمہ تلاش کرلیا۔ چشمہ کیا تھا۔ ایک بلند اور سرسبز پہاڑی ٹیلے کے چند ننھے سوراخوں سے پانی رس رس کر ایک نشیبی گڑھے میں جمع ہوتا جاتا تھا۔ اس گڑھے کے گرد شیرنی کے علاوہ اور جانوروں کے پیروں کے نشانات بھی دکھائی دیے۔ پانی پینے کے بعد شیرنی نے اپنا رخ یکایک مشرق کی طرف کرلیا تھا۔ اب میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور مجھے پورا یقین تھا کہ شیرنی اس جنگل میں کسی جگہ موجود ہے اور رات کو لاش پر ضرور آئے گی۔ واپسی پر ہم ایک اور راستے سے گزرے۔ یہاں بھی ہم نے شیرنی کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ شیرنی کو بیک وقت دو مختلف راستوں پر آنے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ لیکن جب غور سے ان نشانوں کو دیکھا تو حیرت کا ایک نیا باب کھل گیا۔ یہ نشان ان نشانوں سے مختلف تھے جو میں نے مسٹر ولسن کی لاش اور چشمے کے ارد گرد دیکھے تھے۔ یکایک خیال آیا کہ یہ اس کی جڑواں بہن ہوگی۔ گویا وہ دونوں شیرنیاں یہاں جمع ہو گئی تھیں۔

میں ایک بار پھر مسٹر ولسن کے بچے کھچے اعضا کو دیکھنے پہنچا اب وہاں بھی یہ انکشاف ہوا کہ لاش کو دونوں شیرنیوں نے مل کر کھایا ہے۔ ورنہ ایک شیرنی خواہ کتنی ہی بھوکی کیوں نہ ہو لاش کا بیشتر حصہ ہڑپ نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

وہ رات ساری عمر نہ بھول سکوں گا۔ تاریک جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر ان آدم خور شیرنیوں کو قتل کرنے کا موقع مل گیا تو اس کے کتنے بھیانک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہر طرف ہولناک سناٹا طاری تھا اور کبھی کبھی مغرب کی جانب سے مینڈکوں کے ٹرانے کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ درختوں کے پتے ساکن اور شاخیں بے حس و حرکت تھیں۔ میرے پاس رات کاٹنے کا پورا سامان تھا۔ تمباکو کی تھیلی، پائپ، قہوے سے بھرا ہوا تھرماس، شکاری چاقو، ٹارچ اور طاقتور رائفل۔ وقت کاٹنے کے لیے میں نے پائپ بھرا لیکن ماچس کی تیلی جلاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ اس کا شعلہ روشن ہوتے ہی شیرنیاں قریب ہوئیں تو چونک کر فرار راہ اختیار کریں گی۔ چنانچہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ آسمان پر مطلع صاف تھا اور ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ میں نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نظر ڈالی، چمکتی ہوئی سوئیوں نے بتایا کہ بارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ یکایک ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا میرے پاس سے گزر گیا اور پھر ایسی آہٹ ہوئی جیسے کوئی جانور بے پاؤں قریبی جھاڑیوں میں حرکت کر رہا ہے۔

ابتدا میں ایسا محسوس ہوا جیسے آوازیں بائیں جانب سے آئی ہیں پھر دائیں جانب سے۔ میرے حواس پوری طرح بیدار تھے اور اعصاب چاق و چوبند، رائفل سختی سے تھام کر میں نے ذرا سا سر اوپر اٹھایا اور ادھر ادھر دیکھا۔ آواز چند لمحے تک رکی رہی اور پھر وہی کھڑ بڑ۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یک لخت میں نے تاروں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ دونوں شیرنیاں دائیں بائیں سے نکلیں اور مسٹر ولسن کے اعضا کی طرف بڑھیں۔ ان کا قد و قامت ایک جیسا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے ہڈیاں چٹخنے اور گوشت چبانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اب میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا اور اس کے ساتھ ہی میری رائفل سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں۔ خدا کی پناہ فائر کے دھماکے، شیرنیوں کی گرج، جنگلی پرندوں اور جانوروں کی آوازوں سے گویا حشر برپا ہو گیا۔ چند لمحے ان بھیانک آوازوں سے جنگل کی فضا لرزتی رہی پھر حسب معمول خاموشی چھا گئی۔

میں نے ٹارچ کی روشنی جھاڑیوں پر ڈالی اور یہ دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ دونوں گولیاں نشانے پر بیٹھی تھیں اور دونوں شیرنیوں کے بھیجے اڑ گئے تھے اور اس طرح کمبال کی آدم خور شیرنیوں کا قصہ پاک ہوا جو اگر زندہ رہتیں تو جانے کتنے انسانوں کا لہو پی جاتیں۔

فلمی الف لیلیٰ

قسط نمبر: 230

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

آیئے آج آپ کو پنجاب کی پرانی داستانیں سنائیں۔ کہنے کو تو یہ پنجاب کی لوک کہانیاں ہیں لیکن سارے برصغیر میں مشہور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہیر رانجھا، مرزا صاحباں کی داستانیں سارے ہندوستان میں فلمائی گئیں اور بے حد پسند کی گئیں۔ پنجابی رومانی داستان "ہیر رانجھا" سب سے پہلے 1928ء میں لاہور میں بنائی گئی تھی۔ یہ ایک خاموش فلم تھی کیونکہ ابھی بولتی فلموں کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ ہیر رانجھا کلکتہ میں فلمائی گئی تھی اور اس کو بنانے

والے بھی ایک پنجاب کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ کاردار صاحب کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ دراصل نوجوانی ہی سے ان کی پہلی اور آخری محبت فلم سازی اور ہدایت کاری ہی رہی۔ ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن بدقسمتی سے برصغیر کی فلمی صنعت میں انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اسے آپ ہندو اکثریت کا تعصب سمجھ لیجیے یا مسلمانوں کی بے حسی اور لاعلمی، لاہور میں برصغیر کا پہلا فلم اسٹوڈیو بھی انہوں نے ہی راوی کنارے بنایا تھا۔ اسٹوڈیو کیا تھا بس ایک چار دیواری تھی۔ ساؤنڈ سسٹم اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ اس اسٹوڈیو کی چھت نہیں تھی کیونکہ دن میں سورج کی روشنی میں یہاں فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

ایک اور فلموں کے دیوانے ہیمانسو رائے بھی تھے جنہوں نے لاہور میں ایک اسٹوڈیو بنایا تھا مگر پھر حالات کے تقاضے کی وجہ سے بمبئی چلے گئے تھے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ذہین اور خوش شکل انسان تھے۔ انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی تھی۔ اپنے زمانے کی حسین ترین اور ذہین اداکارہ دیویکا رانی سے شادی کرلی تھی اور بمبئی ٹاکیز کو ایک یادگار فلم ساز ادارہ بنا دیا تھا۔ اشوک کمار، دلیپ کمار جیسے فنکاروں کی تلاش کا سہرا بھی دیویکا رانی کے سر ہے۔

وہ حسن پرست تھیں۔ جب پنجاب سے نجم الحسن اداکار اور ہیرو بن کر بمبئی گئے تو دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد باہمی دوستوں نے ہیمانسو رائے اور دیویکا رانی کی صلح کرادی۔ نجم الحسن منظر سے غائب ہوگئے، بعد میں وہ اداکاری تو کرتے رہے مگر عروج حاصل نہ کرسکے۔ لاہور میں ہم نے انہیں فلم کے ایک سیٹ پر دیکھا تھا۔ قدرے موٹے ہوگئے تھے مگر بہت خوبصورت اور شاندار انسان تھے اور وضعداری کی مثال تھے۔ لاہور میں انہوں نے چند فلموں میں معاون کردار کیے لیکن پھر فلمی صنعت سے کنارہ کش ہوگئے۔ کھاتے پیتے خوشحال گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ پرانی وضع داری، اصولوں اور اخلاق کا نمونہ تھا۔

دیویکا رانی قیام پاکستان سے قبل لندن میں فلم اور اداکاری کی تعلیم حاصل کرکے آئی تھیں جس سے ان کی روشن خیالی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اشوک کمار کے ساتھ ہیروئن کی حیثیت سے فلم ”اچھوت کنیا“ میں کام کیا تھا جس نے سارے ہندوستان میں کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ ان کا تعلق رابندرناتھ ٹیگور کے خاندان سے تھا۔ اس ادارے نے اچھوتے اور ایسے موضوعات پر فلمیں بنائی تھیں جنہیں کوئی فلمانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

42 سال کی عمر میں ہیمانسو رائے ہارٹ فیل کے باعث انتقال کرگئے۔ بمبئی ٹاکیز جیسے مثالی ادارے کو دیویکا رانی ہی نے چلایا۔ اس ادارے میں سبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی فلمیں اور نغموں میں ندرت تھی جو کسی اور فلم ساز کو حاصل نہ تھی ماسوائے نیو تھیٹرز کے جو کلکتہ میں فلم سازی کی نئی روایات قائم کررہا تھا۔ معروف گلوکار کے ایل سہگل تھے تو جالندھر کے مگر ان کی زیادہ تر مشہور اور کامیاب فلمیں نیو تھیٹرز ہی نے بنائی تھیں۔

دیکھیے قصے کا آغاز کہاں سے ہوا تھا اور بات کہاں پہنچ گئی۔ ”ہیر رانجھا“ مرزا صاحباں، سوہنی مہینوال وغیرہ ایسی داستانیں ہیں جو تھیٹرز کے زمانے سے پہلے بھی محفلوں میں زبانی سنائی جاتی تھیں۔ چوپالوں اور محفلوں میں رات گئے لوگ اکٹھے ہوکر داستان گو حضرات سے ساری ساری رات یہ داستانیں سنا کرتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔

ہیر رانجھا کی موت اور ان کی قبروں کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ضلع جھنگ کے قریب ایک گاؤں کھیوہ میں ان دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ دونوں ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے۔ کم از کم کہا یہی جاتا ہے۔ قبریں گاؤں کے پرانے قبرستان میں ہیں لیکن ان کے مزار کی عمارت علیحدہ نظر آتی ہے اور امتداد زمانہ نے اس پر نقوش تو ضرور چھوڑے ہیں مگر مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے بعد مقبرے کی عمارت کا ایک حصہ اور محرابیں تو آج بھی پرانی طرز تعمیر کی یادیں تازہ کرتی ہیں مگر عمارت کی ٹوٹ پھوٹ اور عمارت کی اینٹیں بکھری نظر آتی ہیں۔ عمارت موسم اور طویل عرصے تک دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اپنا پرانا رنگ کھو چکی ہے۔ یہ مزار کے درمیان میں ایک چھوٹے سے کھلے میدان میں ہے جس میں جابجا پرانے درخت موجود ہیں۔

کھیوہ گاؤں شکستہ حالت میں ہے اور موسموں، بارشوں کے باعث اب یہ ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ گاؤں میں واحد صحیح سلامت عمارت ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی گاؤں میں ایک صدیوں پرانا درخت بھی ہے جو ایک طرف کو جھک گیا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی درخت کے نیچے مرزا اور صاحباں کو قتل کیا گیا تھا جس کے غم میں یہ درخت

دربار عاشق صادق
مائی ہیر سیال رانجھا

ہیرا نجھا کا مزار

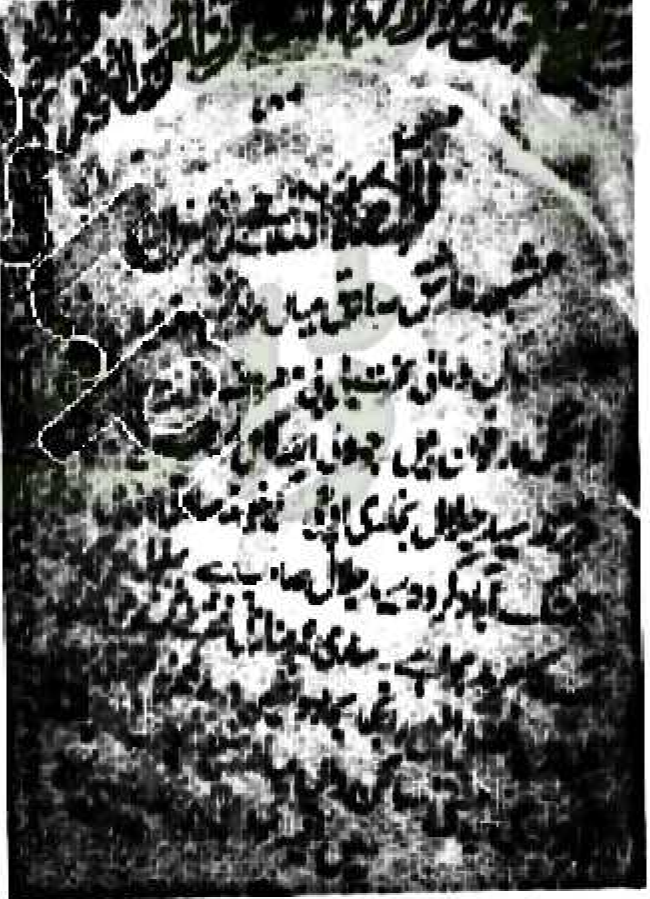

ایک طرف کو جھک گیا ہے۔

مرزا صاحبان کی محبت کے بارے میں ایک تاریخ یہ بھی ہے کہ ان کا عشق لیلیٰ مجنوں اور سسی پنوں کی طرح پاکیزہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ایک گاؤں میں پڑاؤ کیا تو صاحباں کے بھائیوں کو علم ہو گیا اور انہوں نے مرزا کو ہلاک کر دیا۔ صاحباں بھی شدید زخمی حالت میں تھی اس کی لاش کو موجودہ مقبرے تک کیسے پہنچایا گیا یہ بھی ایک معما ہے کیونکہ وہ جس جگہ ہلاک ہوئی تھی اس کا مقبرہ اس جگہ سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس بارے میں حقائق اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس بات پر بھی یقین نہیں ہے کہ مرزا اور صاحباں ایک ہی قبر میں دفن ہیں۔ ان دونوں کے پرستاروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ ایک محقق نے یہ بھی کہا ہے کہ مرزا صاحباں کی داستان ایک فرضی کہانی ہے حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ گاؤں کھیوہ کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے صاحبان کے بھائیوں نے غصے میں گاؤں کو آگ لگا دی۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں سیال نے (جس قبیلے سے صاحباں کا تعلق تھا) بیٹیاں پیدا کرنا بند کر دی تھیں تاکہ کوئی اور ان کی صاحباں کی طرح قبیلے کی بدنامی اور رسوائی کا سبب نہ بن جائے۔ صاحباں کی کہانی پنجاب کی رومانی لوک کہانیوں میں آخری کہانی ہے۔ اس کے بعد ایسی کوئی اور رومانی داستان سامنے نہیں آئی۔

☆☆☆

ساون کے نظارے ہیں آہا
شہر کی لونڈیا نینوں کے تیر چلا گئی

ہماری گلی آنا۔ اچھا جی

ایک زمانے میں یہ فلمی گانے کشمیر سے راس کماری تک ہندوستان کے طول و عرض میں بچے بچے کی زبان پر تھے۔ گلی کوچوں میں جسے دیکھیے یہی گیت گاتا پھرتا تھا۔ شہر کی لونڈیا تو اس قدر مشہور اور مقبول ہوا کہ انگریزی حکومت کو نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا اور حکومت کو اس پر پابندی لگانی پڑی۔ یہ گیت جس شخص نے ترتیب دیے تھے اس کا نام موسیقار جی اے چشتی تھا۔ آخر الذکر دونوں گانے فلم ''شکریہ'' کے تھے۔ یہ فلم 1944ء میں بنی تھی۔ اس قدر مقبولیت بابا چشتی کی موسیقی کو پہلی بار حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ان کے نغمے مقبول عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔ گانے تو ہر ایک کے لب پر تھے مگر موسیقار کا نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں موسیقار کے نام کو زیادہ نمایاں نہیں کیا جاتا تھا۔ بابا چشتی کے مقبول نغموں کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ ان میں سے کئی گیت خود ان ہی کے تحریر کیے ہوئے تھے۔

بابا چشتی نے اپنے کیریئر کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔ تلاش معاش کے سلسلے میں کلکتہ چلے گئے اور کئی فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ اس سے پہلے لاہور میں انہوں نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں بھی کمپوزر کے طور پر ملازمت کی۔ ان سے پہلے یہ فرائض عظیم موسیقار استاد جھنڈے خان کے سپرد تھے۔ جب انہوں نے ضعیف العمری کے باعث کمپنی سے استعفیٰ دیا تو ان کی سفارش پر جی اے چشتی کو کمپوزر کے طور پر ملازم رکھ لیا گیا۔ بابا چشتی نے استاد جھنڈے خان کے ساتھ معدودے چند روز ہی کام کیا مگر ان سے بہت کچھ سیکھا۔ جھنڈے خان جتنے بڑے موسیقار تھے اتنے ہی مذہبی اور خدا ترس انسان بھی تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ چشتی صاحب نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں کام شروع کیا تو ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ انہوں نے ایک روز میں چھ سات گانے ریکارڈ کرانے کی جو مثال قائم کی بعد میں بھی وہ ریکارڈ کوئی نہیں توڑ سکا اور یہ بلاشبہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

اس دور میں بابا چشتی نے بے شمار مقبول گیت ریکارڈ کرائے اور اس زمانے کے قریب قریب تمام بڑے گانے والوں اور گانے والیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ فلمی دنیا سے چشتی صاحب کا رابطہ 1937ء میں قائم ہوا اور پچاس سال تک قائم رہا۔ لاہور میں پنجابی فلم ''سوہنی کمہارن'' کا آغاز ہوا تو موسیقار کے طور پر چشتی صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ادھر کلکتہ میں ''سوہنی مہینوال'' کے نام سے ایک فلم کا آغاز ہوا اور دونوں فلمیں ایک ساتھ ہی ریلیز ہوئیں۔ ''سوہنی مہینوال'' کے موسیقار مشہور موسیقار شیام سندر تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ چشتی صاحب کی فلم کے نغمے اس فلم کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئے۔ ان کی شہرت کلکتہ تک پہنچ گئی تو وہاں سے ایک فلم ساز ان کو تلاش کرتے ہوئے لاہور پہنچے اور ہمراہ لے گئے۔ کلکتہ میں انہوں نے دو پنجابی فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ چشتی صاحب کی پہلی اردو فلم ''خاموشی'' تھی جو 1942ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے چار پانچ نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے چند اور اردو فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ ''شکریہ'' کے گیتوں کا تذکرہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اس کامیابی کے بعد چشتی صاحب کو ہدایت کار کیدار شرما کلکتہ سے بمبئی لے گئے۔ یہ فلم ''کلیاں'' تھی مگر نمائش کے لیے پیش ہوئی تو فلاپ ہوگئی۔ ان کی اگلی فلم ''ریلی'' کی موسیقی بے حد مقبول ہوئی۔ بمبئی میں چند فلموں کی موسیقی بنانے کے بعد قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آگئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم ہدایت کار لقمان کی ''شاہدہ'' تھی۔ یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے تین چار گانے بے حد مقبول ہوئے۔

پاکستان میں آنے کے بعد بابا چشتی کی موسیقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ پاکستان کی صنعت فلم سازی کا ابتدائی دور تھا۔ بہت کم تعداد میں فلمیں بنائی جاتی تھیں اور فلموں کا معیار بھی زیادہ بلند نہیں تھا۔ مگر فلم ساز و ہدایت کار نذیر نے ''پھیرے'' اور ''لارے'' بنا کر ایک نئے دور کا ڈول ڈالا۔ بابا چشتی نے ان فلموں میں ایسی موسیقی مرتب کی جو آج بھی روز اول کی طرح تر و تازہ ہے۔ بابا چشتی نے ''پھیرے'' میں ایک اور نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ انہوں نے ایک ہی دن میں چھ فلمی نغموں کی طرزیں مرتب کیں اور وہ ریکارڈ کرا دیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ گانے اپنی نغمگی اور خوبصورتی کے باعث آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ پھر تو فلموں کا تانتا بندھ گیا اور انہوں نے ایک کے بعد ایک بے شمار فلموں کی موسیقی بنائی اور ان میں سے بیشتر فلموں کی موسیقی نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ ان میں سے چند فلموں کے نام یہ ہیں:

چن، انوکھی داستان، پھیرے، لارے، بیکے والی، ماہی منڈا، گھبرو، ہیر، بلو، اکی، لخت جگر، سردار، دلا بھٹی، ذلفاں،

ونگاں، گڈی گڈا، پلکاں، دلبر، ہلو، مغل، نوکر، چنگا، موہنی، سوتیلی ماں، جی، بس 56، ماماجی، تیرا انداز، ان پڑھ، جٹ جوڑی، سیتی، رانی خاں، ذیلدار، مکھڑا چن ورگا، رانی خاں وغیرہ۔ بابا چشتی نے جن فلموں کی موسیقی ترتیب دی ان کی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ ہے۔ ہمارے ملک میں اعداد وشمار اکٹھے کرنے کا کوئی بندوبست نہیں ہے مگر ایک اندازے کے مطابق بابا چشتی نے تیس ہزار کے قریب اردو اور پنجابی گانوں کی دھنیں بنائی ہیں جن میں سے مقبول ہونے والے نغموں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ یہ ایک ایسی کارکردگی ہے جو کسی بھی اعتبار سے قابل تحسین وافتخار ہے۔ بابا چشتی کے ذہن رسا کی توانائی میں عمر گزرنے کے ساتھ کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر ہماری فلمی صنعت نے کئی سال پہلے ہی انہیں عملی طور پر ریٹائر کر دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کی جگہ جن نئے موسیقاروں نے لی انہوں نے بابا چشتی کی دھنیں انتہائی فراخدلی سے استعمال کیں اور بعض طرزیں تو ہو بہو اپنا لیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی مقبول دھنوں میں زیادہ تعداد بابا چشتی سے مستعار لی ہوئی دھنوں کی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی بزرگی، تجربے اور خدمات کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ ان کے سامنے میں نے بڑے بڑوں کو مودب دیکھا ہے مگر جب بابا چشتی نے فلمی موسیقی سے "بے دخل" کرنے پر احتجاج کیا اور فلم سازوں سے شکوہ کیا کہ وہ انہیں موسیقی بنانے کا موقع کیوں نہیں دیتے تو کسی نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ لوگوں کے پاس یہ بہانہ تھا کہ بابا چشتی بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا چشتی کی عمر 90 سال ہے مگر ان کی ذہنی استعداد اور قوت تخلیق میں انحطاط نظر نہیں آتا۔ اگرچہ جسمانی طور پر وہ عمر کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں لیکن دس بارہ سال قبل تو وہ بالکل تازہ دم تھے۔

پاکستان میں عموماً موسیقاروں کا تعلق ایسے گھرانوں سے رہا ہے جو پشت ہا پشت سے اسی فن سے وابستہ رہے ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں جب عام گھرانوں کے لوگوں نے موسیقی کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی ذہانت، صلاحیت اور کارکردگی کے حوالے سے انتہائی بلند مقام حاصل کیا۔ خواجہ خورشید انور، خلیل احمد، سوہن گھوش، سہیل رانا، نثار بزمی وغیرہ اس ضمن میں چند نام ہیں۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ برصغیر پاک وہند کے مایہ ناز موسیقار بابا جی اے چشتی بھی ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ساز و موسیقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے والد ایک درویش صفت انسان تھے اور اپنے قصبے گنا چور کی بڑی مسجد کے امام تھے۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں راگ رنگینیوں اور ساز و آواز سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بابا چشتی جو موسیقی اور فلم کی دنیا میں جی اے چشتی کے نام سے مشہور ہیں ان کا پورا نام غلام احمد چشتی ہے۔ مگر انہیں پورے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وہ بابا جی اے چشتی کے نام سے مشہور ہیں اور یہی نام ان کی شناخت بن چکا ہے۔ کون جانتا تھا کہ ایک قدامت پرست، مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ ایک دن برصغیر کی دنیائے موسیقی میں ہلچل مچا دے گا اور اس کا نام بطور موسیقار ثبت ہو جائے گا۔ غلام احمد نے اسکول میں داخلہ لیا تو مطالعہ اور شعر و ادب سے بہت زیادہ وابستگی رہی۔ والد صاحب کے ایما پر انہوں نے مذہبی تعلیم بھی حاصل کی۔ خوش الحان تھے اس لیے نعت گوئی کے میدان میں قدم رکھا۔

جی اے چشتی

دراصل یہ ان کے شوق موسیقی کا آغاز اور ابتدائی ذریعہ اظہار تھا۔ انہیں ذاتی طور پر بھی نعت گوئی سے دلچسپی تھی اور انہوں نے عنفوان شباب میں اپنی شاعری کا آغاز نعت نویسی سے کیا تھا۔ والد کی خواہش تھی کہ انہیں اعلیٰ تعلیم دلائیں مگر قضا نے مہلت نہ دی۔ ابھی غلام احمد دسویں جماعت میں تھے کہ درویش صفت والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چند ماہ بعد ان کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی انتقال کر گئیں اور وہ دنیا میں تنہا رہ گئے۔ ان حالات میں تعلیم جاری رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ان پے در پے صدموں نے انہیں اس قدر مایوس اور افسردہ کیا کہ دنیا سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ مگر پھر دوستوں کی محبت اور ہمدردی کی بدولت انہوں نے جینے کی طرف توجہ دی۔ تعلیم تو مکمل نہیں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے نعت گوئی کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے میاں احمد بخش کی شاگردی اختیار کی۔ میاں صاحب بہت اچھے نعت گو تھے اور موسیقی کے بھی استاد مانے جاتے تھے۔ اس طرح جی اے چشتی نے اپنی موسیقی کی تربیت کا آغاز کیا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صدموں اور تنہائی کے باعث وہ

ایک مایوس، دل گرفتہ اور غمزدہ انسان بن جاتے مگر بابا چشتی کی فطری خوش مزاجی اور ظرافت طبع نے ان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ ایک ہنس مکھ بلکہ ایک حد تک مزاحیہ آدمی تھے۔ اس کا اظہار ان کی روز مرہ گفتگو میں بھی ہوتا رہتا تھا۔ فقرہ چست کرنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ ذہانت اور قدرتی صلاحیتوں نے انہیں نہ صرف موسیقی کے میدان میں سربلند کیا بلکہ شاعری میں بھی انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے بے شمار گیت لکھے جن میں سے کچھ ان کے نام سے مگر بیشتر دوسروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ اس بارے میں وہ اتنے فراخدل اور فیاض تھے کہ اچھے سے اچھے مکھڑے تخلیق کرنے کے بعد دوسروں کے حوالے کر دیتے اور پیشانی پر بل تک نہ آتا۔

ان کا کہنا تھا کہ میں ایک موسیقار ہوں۔ شاعری میرا شعبہ اور پیشہ نہیں ہے۔ اگر توجہ دیتا تو ہوسکتا ہے باقاعدہ شاعر بھی بن جاتا۔ گاہے گاہے اشعار کہہ لینے اور کچھ اچھے مکھڑے تصنیف کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں شاعری کے میدان میں بھی قدم رکھ دوں۔ انہوں نے جن نغمات کی دھنیں مرتب کی ہیں ان میں ایسے گیتوں کی خاصی تعداد ہے جو ان ہی کے تخلیق کردہ ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا تھا کہ اگر شاعر کے خیالات کی رو میں تعطل پیدا ہو گیا تو بابا چشتی نے انترہ لکھ کر حوالے کیا اور نغمے کو مکمل کردیا۔ ان کی تخلیقی قوت بے مثال تھی۔ کام کی کثرت، وسائل کی کمی، وقت کی نایابی ان کی قوت کار پر مطلق اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔

بابا چشتی نے یوں تو اردو پنجابی دونوں زبانوں کی موسیقی ترتیب دی ہے۔ مگر زیادہ تعداد پنجابی دھنوں کی ہے۔ پنجابی فلموں میں ان کی موسیقی معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے ممتاز اور قابل تعریف ہے۔ ان کے بارے میں ایک زمانے میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ وہ پنجابی فلموں کی موسیقی بنانے میں یکتا ہیں، اردو فلموں میں وہ ایسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرسکتے۔ بابا چشتی نے "لخت جگر" کی موسیقی بنا کر تنقید کرنے والوں کے منہ بند کردیے۔ اس سے پہلے فلم "نوکر" میں ان کی موسیقی نے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ افسوس کہ بابا چشتی کے ساتھ نہ زمانے نے انصاف کیا نہ فلمی صنعت نے۔ مگر اس کے باوجود ان کی خدمات کو یکسر نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہیں نگار فلم ایوارڈ اور ایکنا ایوارڈ کے علاوہ نیشنل فلم ایوارڈ بھی دیا جاچکا ہے اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ بابا چشتی کی قرار واقعی قدر نہیں کی گئی۔

بابا چشتی 1901ء میں ضلع جالندھر کے ایک قصبہ گونا چور میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے موسیقی سے لگاؤ کی بنا پر وہ راگ اور سُر کی دنیا میں چلے آئے۔ موسیقی سے ان کی رغبت اور لگن کی بدولت راستے خود بخود ہموار ہوتے گئے۔ بابا چشتی نے ابتدائی زمانے میں محکمہ آبپاشی میں بھی ملازمت کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موسیقی کی بنا پر یہاں بھی وہ نہروں اور راجباہوں کی بجائے موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اس طرح بابا چشتی نے اپنی موسیقی کے بل پر ملازمت حاصل کی اور محکمے میں بھی موسیقی کی محفلیں سجاتے رہے۔ معاش کی طرف سے بے فکری ہوئی تو انہوں نے باقاعدہ موسیقی سیکھنے پر توجہ دی اور کلاسیکی موسیقی کے بڑے بڑے اساتذہ کے پاس جاکر تعلیم حاصل کی۔ پنجاب کے لوک گیتوں پر انہیں جو عبور حاصل تھا وہ پاکستان کے کسی اور موسیقار کے حصے میں نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نغموں اور طرزوں کی بنیاد عموماً لوک دھنوں پر استوار ہوتی ہے اور یہ موسیقی لازوال حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ بابا چشتی کو موسیقی کے ساتھ ساتھ گانے کا بھی شوق رہا ہے اور یہی شوق انہیں آغا حشر کاشمیری مرحوم تک لے گیا تھا۔ آغا حشر جن دنوں ڈراما "پریم پرتگیا" بنا رہے تھے اسی زمانے میں چشتی صاحب کی ان تک رسائی ہوئی اور آغا صاحب نے ان کی ذہانت اور صلاحیت سے متاثر ہوکر انہیں اپنے ادارے میں ملازم رکھ لیا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آغا حشر نہ صرف بہت اچھے شاعر تھے بلکہ کمپوزر بھی تھے۔ اپنے ڈراموں کی موسیقی وہ مختار بیگم کے تعاون سے ترتیب دیا کرتے تھے۔ موسیقی کی دھنیں بنانے اور انہیں موزوں سازوں سے سجانے کا فن بابا چشتی نے آغا حشر ہی سے سیکھا تھا۔ آغا حشر نے اپنے اس ڈرامے کو فلم کے روپ میں ڈھالا تو وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکا۔ آغا حشر کی وفات کے بعد ہی بابا چشتی نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں میوزک کمپوزر کے طور پر کام شروع کیا تھا۔

اپنی طویل فلمی زندگی میں بابا چشتی نے طرزوں، بولوں اور سازینوں میں نئے نئے تجربے کیے اور نئی راہیں تراشیں، راگ راگنیوں اور لوک دھنوں کے علاوہ انہوں نے پنجاب کے روایتی اور مقبول سازوں کو بھی فلمی آرکسٹرا سے روشناس کرایا۔ ان کی موسیقی کا ایک حسین اور دلکش پہلو ردھم بھی ہے۔ انہوں نے ڈھولک اور گھڑے کو انتہائی خوبصورتی سے استعمال کیا۔ آج بھی یہی ردھم پنجابی نغموں

کی جان تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی موسیقی انتہائی سادہ اور پُراثر ہوتی تھی۔ روزمرہ کے الفاظ اور معمولی سازوں کے خوبصورت استعمال سے وہ طرزوں کو عام فہم اور دلنشین بنا دیتے تھے۔ شاعرانہ ذوق کی بدولت نغموں کا انتخاب بھی انہوں نے بہت اچھے انداز میں کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے نغمے بھی خود ہی لکھ دیے۔ بطور نغمہ نگار متعارف ہونے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا اور وہ بڑی فیاضی سے اپنے لکھے ہوئے گیت دوسروں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

بابا چشتی کو میں نے جب بھی دیکھا ہمیشہ تازہ دم اور زندہ دل ہی پایا۔ عموماً سفید لباس ان کا مرغوب پہناوا رہا۔ پہلی بار میں نے انہیں ہدایت کار لقمان کی پنجابی فلم "پتن" کی موسیقی ترتیب دیتے ہوئے دیکھا۔ یہ 1955-56ء کی بات ہے۔ وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور دھنوں کا ڈھیر لگا دیا کرتے تھے۔ کئی مکھڑے بھی خود ہی بنا دیتے۔ فلم "پتن" میں انہوں نے ایک ہی دن میں تین گانوں کی طرزیں بنا کر صدابند بھی کرا دیا۔ میں ان کا یہ کارنامہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا مگر مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اس سے پہلے ایک ایک دن میں چھ سات گانے تحریر کر کے اور ان کی دھنیں بنا کر ریکارڈ کرانے کا ریکارڈ بھی قائم کر چکے ہیں۔ انہیں دھن بنانے میں کبھی مشکل پیش نہیں آئی بلکہ ان کی دھنوں کے مقابلے میں گانے کم پڑ جایا کرتے تھے۔ وہ حیران کن حد تک تیزی سے کام کرنے کے عادی تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ ہدایت کار نے فلم کی سچویشن بیان کی، ابھی شاعر نے پورا نغمہ بھی قلم بند نہیں کیا کہ بابا چشتی نے طرز بنا کر تیار کر دی۔ اس ضمن میں کچھ لطیفے بھی مشہور ہیں۔ ایک بار فلم ساز آغا جی اے گل کی چند فلموں کے لیے بابا چشتی اور ماسٹر عنایت دونوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بابا چشتی نے ایک ہفتے کے اندر فلم کے تمام گانے ریکارڈ کرا دیے۔ ماسٹر عنایت اپنے انداز میں آہستہ روی سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ دو مہینے گزر گئے اور ماسٹر عنایت ایک گانا بھی ریکارڈ نہ کرا سکے تو ایک دن بابا چشتی سے کہنے لگے "بابا جی۔ دو تین دھنیں تو ادھار دے دیں تاکہ میں بھی فلم ساز کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔ بن جائیں گی تو آپ کو دے دوں گا۔"

ایک زمانے میں فلمی حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ بابا چشتی صرف پنجابی فلموں کے موسیقار ہیں۔ بابا چشتی نے سنا تو بہت ناراض ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ موسیقی زبان کی پابند نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص واقعی میوزک کمپوزر ہے تو وہ اخبار کی خبروں کی بھی دھن بنا سکتا ہے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے سامنے پڑے ہوئے اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر کی دھن بنا کر دے دی۔ یہ واقعہ ان کی ہنرمندی اور دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پنجابی فلم "دلا بھٹی" ریلیز ہوئی اور بے حد کامیاب ہوئی۔ بابا چشتی پہلے ہی دن شام کے شو پر اپنے بہت سے بچوں کو لے کر پہنچ گئے۔ ہاؤس فل ہو چکا تھا۔ باہر سیکڑوں ہزاروں کا مجمع تھا جو ٹکٹ حاصل کرنے سے محروم رہا تھا۔ مگر بابا جی کا اصرار تھا کہ ان کے سارے خاندان کو فلم دکھانے کا بندوبست کیا جائے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ بالکل ناممکن ہے اس وقت آپ جائیے۔ آپ کے لیے اگلے شو میں بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس پر وہ برہم ہو کر بولے "اچھا تو پھر فلم میں سے میری میوزک نکال دو تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ ورنہ نہیں" اس ہنگامے کی خبر آغا جی اے گل کو بھی پہنچ گئی اور ان کی ہدایت پر سینما والوں نے کسی نہ کسی طور بابا چشتی کی ضد پوری کر دی۔

ای۔ ایم۔ آئی ریکارڈنگ کمپنی کی جانب سے مقبول موسیقاروں اور گلوکاروں کو "گولڈن ڈسک" پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو بابا چشتی اس سے محروم رہے۔ بابا کو بہت غصہ آیا۔ کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر کے پاس گئے اور بولے "میں نے ایک ہی کبوتر چھوڑا تھا جو آج تک لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو میری قدر نہیں ہے۔" ان کا اشارہ اس مقبول نغمے کی جانب تھا جس کے بول یہ تھے۔

واسطہ ای رب دا تو جاویں وے کبوترا

اس نغمے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف گونج رہا تھا اور اس کے ریکارڈوں کی فروخت نے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں رائلٹی اور کاپی رائٹ کا بھی نظام مروج نہ ہونے کی بنا پر بابا جی کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ بابا جی ایک سادہ مزاج، سادہ لوح انسان ہیں مگر انہیں یہ احساس ہمیشہ رہا ہے کہ ان کے قدوقامت کے مطابق ان کی قدر نہیں کی گئی۔ انہیں فلمی دنیا اور زمانے سے بھی شکوہ رہا جس میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کارناموں کے مقابلے میں ان کی شہرت، عزت اور پذیرائی بہت کم رہی ہے۔ غالباً اس میں ان کی سادگی، درویش صفتی اور کم آمیزی کا بھی دخل رہا ہے۔ ایک بار انہوں نے یہ لطیفہ خود سنایا تھا کہ ان کے بیٹے نے کسی بہت مہنگی چیز کی فرمائش کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے تو اپنے لڑکپن میں ان چیزوں کا تصور

تک نہیں کیا تھا۔ بیٹے نے جواب دیا۔ "ابا جی۔ میرا اور آپ کا کیا مقابلہ ہے۔ آپ بابا چشتی جیسے موسیقار کے بیٹے تو نہیں ہیں۔" بابا جی لاجواب ہوگئے اور چپکے سے اس کی فرمائش پوری کردی۔

"وہ تو ساری زندگی سبھی کی ضرورتیں اور فرمائشیں پوری کرتے رہے مگر کوئی ان کی ایک معصوم خواہش تک نہیں پوری کرسکا اور وہ یہ کہ جب تک وہ موسیقی بنانے کے قابل تھے ان سے کسی نے کام نہ لیا۔ شاید یہی غم انہیں لے بیٹھا اور وہ ایک دل شکستہ اور مایوس انسان کی طرح دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایسے بے بہا فنکار کی ہم نے کیا قدر کی کاش انہیں اس شوق اور خدمت سے محروم نہ کیا جاتا۔" یہ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

☆☆☆

ایک وقت تھا جب فلموں میں احمد رشدی کے گانے ایک لازمی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ ریڈیو سے ان کی میٹھی آواز ہر وقت گونجتی رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی گلوکاری کا آغاز اسٹیج پر نغمہ سرائی سے کیا تھا۔ بچپن ہی سے انہیں گانے کا شوق تھا، حالانکہ ان کے خاندان میں کوئی گانے والا یا موسیقی سے دلچسپی رکھنے والا نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کے ایک بھائی ارسلان بھی بطور معاون ہدایت کار اور اداکار فلمی دنیا سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا تعلق ------ حیدرآباد (دکن) سے تھا۔ کم عمر ہی تھے کہ والدین کے ہمراہ پاکستان آگئے اور کراچی میں قیام کیا۔ انہوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس کا ایک سبب تو معاشی حالات تھے مگر اصل بات یہ بھی کہ انہیں پڑھنے، پڑھانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ محض گانے کا شوق تھا۔ جو گانا سنتے یاد کرلیتے اور پھر اسی طرز اور ادائیگی کے ساتھ گاتے۔ پہلے ان کی اس خصوصیت کا چرچا ان کے قریبی دوستوں میں ہوا۔ پھر واقف کاروں میں اور پھر یہ بات پھیلتی چلی گئی مگر اس شوقین گلوکار کو کسی نے منہ نہیں لگایا۔ اول تو کسی کو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں تھا نہ انہوں نے باقاعدہ گانا سیکھا تھا نہ راگ راگنیوں سے واقف تھے اور نہ ہی ریاض کیا تھا۔ کسی نے انہیں یہ نہیں سکھایا تھا کہ راگ داری کیا ہوتی ہے اور ایک راگ میں کتنے سُر ہوتے ہیں۔ بس قدرت نے انہیں خداداد صلاحیتوں سے نوازا تھا اور دیوانگی کی حد تک گانے کا شوق تھا۔ ان کے پاس لے دے کر بس یہی دو استاد تھیں۔

موسیقی ایک ایسا سمندر ہے جس میں بڑے بڑے مگر مچھ، مچھلیاں اور تیراک غوطہ زن رہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی اجنبی کو اس سمندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر کسی کا تعلق گانے والوں اور موسیقاروں کے گھرانے سے ہے پھر تو کچھ آسانی ہے مگر جو شخص اس برادری سے باہر کا ہے پھر موسیقی کے رموز و اسرار سے باقاعدہ واقف اور تربیت یافتہ بھی نہیں ہو تو اسے کون سمندر میں کودنے کی اجازت دیتا ہے مگر احمد رشدی نے اللہ کا نام لے کر موسیقی کے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ بہت غوطے کھائے۔ کبھی ڈوبے، کبھی نکلے مگر سانس اور آس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ پہلے اسٹیج پر، پھر تقاریب میں اور اس کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے گانے لگے۔ رشدی نے باقاعدہ اور باضابطہ گانا نہیں سیکھا تھا مگر قدرت نے بے حد سریلی اور شیریں آواز عطا کی تھی۔ سوز، تاثر اور شوخی یہ تینوں چیزیں رشدی کی آواز میں یکجا ہوگئی تھیں۔ اگر گانا کانوں کو بھلا لگے تو کون پوچھتا ہے کہ گانے والے نے باقاعدہ موسیقی کے سبق لیے ہیں یا نہیں چنانچہ بہت جلد رشدی کی آواز تقاریب میں گونجنے لگی۔ ریڈیو پاکستان سے انہوں نے کمرشل گیت بھی گائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ وہ ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے لگے اور ایسے ایسے نغمے گائے جو بعد میں یادگار بن گئے۔

بندر روڈ سے کیماڑی، میری چلی ہے گھوڑا گاڑی
بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر

یہ نغمہ اس قدر مقبول ہوا کہ بچے بچے کی زبان پر آگیا۔ وہ جو سیانوں نے کہا ہے کہ عطر وہ ہوتا ہے جس کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ محض عطار کی تعریفوں سے تو کوئی عطر اچھا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو خود اپنے منہ سے بولتا ہے چنانچہ احمد رشدی کی صلاحیتوں کا چرچا بھی ان کی آواز کے ساتھ ساتھ پھیلنے لگا۔ کراچی میں فلم سازی کا ابتدائی دور تھا۔ ایک فلم ساز نے "کارنامہ" بنائی تو اس میں احمد رشدی کی آواز کو شامل کرلیا۔ فلم ساز کے لیے یہ سستا سودا تھا اور آواز بھی اچھی تھی۔ اس کے بعد ان کی فلم "بڑا آدمی" ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بہت زیادہ کامیاب تو نہیں ہوئی مگر رشدی کی آواز سننے والوں کے دلوں میں اتر گئی۔ پھر تو کراچی کی اکثر فلموں میں احمد رشدی گلوکاری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اپنا پرایا، ہوا اور بے زمانے، انصاف، دو استاد، سہارا، ساتھی، زمانہ کیا کہے گا، یہ دنیا، ہمراز، ہر فلم میں احمد رشدی کی آواز شامل تھی۔ ان میں سے بعض فلموں کی شوٹنگ لاہور میں

گلوکار مجیب عالم اور احمد رشدی

ہوئی۔ صدا بندی کے لیے بھی انہیں لاہور آنا پڑا۔ ان کا تذکرہ ان سے پہلے ہی لاہور پہنچ چکا تھا۔ اس لیے لاہور کے فلم سازوں نے بھی احمد رشدی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا مگر لاہور والوں کے لیے مستقل طور پر کراچی میں رہنے والے فنکاروں کی خدمات حاصل کرنا اکثر اوقات پریشانی کا سبب بن جایا کرتی تھی مگر رشدی تو خود پاکستان کے فلمی ہالی ووڈ میں آنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک وہ لاہور کی فلموں میں نہیں گائیں گے مستند گلوکار کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

جب انسان کوشش اور شدید خواہش کرتا ہے تو قدرت بھی ساتھ دیتی ہے۔ شباب کیرانوی اپنی جدت پسندی اور نئے نئے فنکار متعارف کرانے کے لیے مشہور ہیں۔ احمد رشدی کو کراچی سے لاہور بلانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ وہ بھی ابھرتے ہوئے فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ نوخیز اور تر و تازہ چہروں، آوازوں اور خیالوں کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے میوزیکل فلم ''مہتاب'' کا آغاز کیا تو لاہور کے ممتاز اور سکہ بند گلوکاروں کو چھوڑ کر احمد رشدی کا انتخاب کیا۔ احمد رشدی نے ''مہتاب'' کے لیے پہلا گانا ریکارڈ کرایا اور یہ گانا فلم کی نمائش سے پہلے ہی مقبول ہو گیا اور اس مقبولیت میں آج تک کمی واقع نہیں ہوئی۔

چندا سا مکھڑا گورا بدن
گوری لگائے جل میں اگن

آج بھی اتنا ہی اچھا لگتا ہے جتنا 1960ء میں لگتا تھا۔ قسمت زوروں پر تھی۔ اس نغمے کو 1961ء کے لیے بہترین گلوکار کا نگار ایوارڈ دیا گیا اور رشدی کی خوش نصیبی اور مقبولیت پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ اس کے بعد تو احمد رشدی کی مصروفیات کا یہ عالم ہوا کہ کبھی لاہور میں گا رہے ہیں تو کبھی کراچی میں نغمے ریکارڈ کرا رہے ہیں۔ وحید مراد نے اپنی پہلی فلم ''ہیرا پتھر'' کا آغاز کیا تو اپنے لیے احمد رشدی کی آواز کا انتخاب کیا۔ اس فلم کے گانے ہٹ ہو گئے۔ وحید مراد کو احمد رشدی کی آواز اس قدر راس آئی کہ اسکرین پر یوں لگتا تھا جیسے وہ خود ہی گا رہے ہیں۔ اس کے بعد احمد رشدی کی آواز اور وحید مراد کی اداکاری ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی مگر رشدی نے جب محمد علی کے لیے پس پردہ گلوکاری کی تو ان کی آواز محمد علی کو بھی سوٹ کر گئی۔ محمد علی ہی کیا، پاکستان کا کوئی ہیرو ایسا نہیں تھا جسے احمد رشدی کی آواز سوٹ نہ کرتی ہو۔ یہ نہ صرف ایک حسن اتفاق تھا بلکہ احمد رشدی کی فنکاری اور تخلیقی صلاحیتوں کا واضح ثبوت بھی تھا۔ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر احمد رشدی کی آواز گونجنے لگی۔ انہوں نے مزاحیہ، رومانی، المیہ ہر قسم

کے گیت گائے اور ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا۔ اپنی آواز کی مٹھاس، اتار چڑھاؤ، تاثر اور اظہار احساس پر قدرت کے باعث وہ ہر قسم کے نغمے گاتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نغمے اور اداکار کے لیے احمد رشدی کی آواز ہی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ یہ ایک قابلِ تعریف بات تھی جس کا احمد رشدی کو بہت فائدہ پہنچا۔

احمد رشدی نے کسی تنہا جنگل میں نغمہ سرائی کا آغاز نہیں کیا تھا یہ بھی نہیں کہ وہ پاکستان میں اکیلے ہی گلوکار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب رشدی نے اس میدان میں قدم رکھا تو وہ موسیقی اور گلوکاروں کی ورائٹی کے لحاظ سے پاکستان کی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ ذرا غور فرمایئے کہ کیسے کیسے مایہ ناز گلوکار ان کے ہم عصر تھے۔ مہدی حسن، سلیم رضا، منیر حسین، مسعود رانا، مجیب عالم، رجب علی، اخلاق احمد جیسے گانے والے پاکستان کی فلمی صنعت کو اپنی آوازوں کے حسن سے مالا مال کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی انفرادیت اور مخصوص انداز تھا۔ اس کے باوجود احمد رشدی نے اپنی گلوکاری کا لوہا منوالیا۔ انہوں نے اپنی آواز کو کسی ایک انداز یا مخصوص سانچے میں نہیں ڈھالا بلکہ وہ ہر قسم کے نغمے گانے پر قدرت رکھتے تھے اور اس طرح گاتے تھے کہ حق ادا کر دیتے تھے۔ ان تمام آوازوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو سجایا سنوارا تھا اور احمد رشدی کی آواز ان سب میں ایک ممتاز اور منفرد آواز تھی۔

احمد رشدی نے قریب قریب ہر قابلِ ذکر موسیقار کے لیے نغمے گائے۔ اس زمانے میں فلم سازی کے تین مراکز تھے۔ لاہور، کراچی اور ڈھاکا۔ احمد رشدی نے ان تینوں مراکز کے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور ناقابلِ فراموش نغمے تخلیق کیے۔ وہ شاعر کے الفاظ کو معنی اور موسیقار کے سروں کو زندگی بخش دیتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے چند پنجابی نغمے بھی گائے اور وہ بھی مقبول ہوئے لیکن ان کے بیشتر نغمات اردو فلموں کے لیے ریکارڈ کیے گئے۔ انہوں نے بعض فلموں میں نامور آوازوں کے ساتھ دوگانے بھی ریکارڈ کرائے اور بعض ایسے نغمے بھی ہیں جو ہیروئن کے لیے زنانہ آواز میں اور ہیرو کے لیے مردانہ (احمد رشدی کی آواز میں) ریکارڈ کیے گئے۔ ان کے مقابل گانے والوں میں بہت بڑے بڑے نام شامل ہیں مگر میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ انہوں نے اکثر گانے بہتر انداز میں گائے اور وہ مقبول بھی ہوئے۔ یہاں تک کہ جو گانے ان کی اور میڈم نور جہاں کی آوازوں میں بیک وقت صدا بند کیے گئے ان میں بھی وہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب رہے ہے جو ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

احمد رشدی سے میری ذاتی ملاقات اس وقت سے تھی جب وہ کراچی میں گایا کرتے تھے۔ وہ بہت ملنسار، منکسر المزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ بہت جلد گھل مل جاتے تھے۔ لطیفے سنانے پر آئیں تو بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ حاسد نہیں تھے۔ اپنے تمام ہم عصر گلوکاروں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے ان کی زبان پر کبھی کسی دوسرے گلوکار یا کسی موسیقار کی برائی نہیں سنی۔ لحاظ و مروت کا عنصر ان کے مزاج میں حد سے زیادہ تھا جس کے باعث انہوں نے مالی نقصانات بھی اٹھائے۔ مروت کے مارے وہ بہت سے فلم سازوں سے کم معاوضہ لینا قبول کر لیتے تھے اور اگر کوئی وہ بھی گول کر دے تو تقاضا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی جبکہ ان کے دوسرے ہم عصر گلوکار پوری رقم وصول کرتے تھے۔ احمد رشدی اس مقام پر تھے جہاں وہ منہ مانگا معاوضہ حاصل کر سکتے تھے مگر اخلاق کے مارے بولتے تک نہیں تھے جس سے بہت سے فلم ساز ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ احمد رشدی کو اداکاری کا بھی شوق تھا۔ ایک دو فلموں میں انہوں نے بہت اصرار کر کے اپنے گانے خود اپنے آپ پر فلم بند بھی کرائے تھے۔ میں نے بطور فلم ساز پہلی فلم ”کنیز“ بنائی تو اس میں کالج کے مناظر میں رشدی کو بھی ایک طالب علم کے طور پر پیش کیا اور انہوں نے بے ساختہ اور بے تکلفانہ اداکاری کا مظاہرہ کیا مگر اس سے زیادہ اداکاری ان کے بس کی بات نہ تھی۔

رشدی حیدر آباد (دکن) سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدر آباد کے لوگ ہر گزشتہ واقعے اور ہر آنے والے واقعے کو ”پرسوں“ کا واقعہ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر دس برس پہلے بھی کوئی واقعہ ہوا ہے تو کہیں گے کہ ”پرسوں کی بات ہے“ اس طرح آنے والے زمانے کے لیے بھی ”پرسوں“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے حالانکہ اردو زبان اور قواعد کے اعتبار سے پرسوں تیسرے دن کو کہتے ہیں۔ ایک بار میں نے کسی کام کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ آپ کا یہ کام پرسوں ہو جائے گا۔ وہ پوچھنے لگے ”یہ پرسوں حیدر آباد والوں کی پرسوں تو نہیں ہے؟“ حیدر آباد کے لوگ کھٹائی بہت پسند کرتے ہیں۔ اچار اور چٹنیوں کے علاوہ ہر کھانے میں کھٹائی

ضرور موجود ہوتی ہے۔ حیدرآبادیوں کے بگھارے بینگن اور سادہ چاول ایک بے حد لذیذ اور مقبول ڈش ہے۔ رشدی جب بہت مہربان ہوتے تو دوستوں کو گھر سے بگھارے بینگن اور چاول منگا کر کھلاتے تھے۔ ان کا ابتدائی دور کا ایک گانا بھی کافی مشہور ہوا تھا۔ جس کے بول ہیں۔

کھٹی کڑی میں مکھی پڑی
ہائے میری اماں

دراصل یہ حیدرآباد دکن کا لوک گیت ہے۔ اصولاً تو یہ گانا کسی زنانہ آواز میں ہونا چاہیے تھا مگر رشدی نے اپنی گائیکی سے اس میں جان ڈال دی اور یہ گانا بھی ان کے ہٹ گانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

رشدی خوش اخلاق، ہنس مکھ اور صلح جو آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتے تھے۔ مگر ایک بار انجانے میں وہ ایک بہت خوفناک لڑائی کا سبب بن گئے تھے۔ محمد علی نئے نئے کراچی سے آئے تھے۔ رات گئے میں اور احمد رشدی مال روڈ کے ایک ریستوران میں کھانا کھانے گئے جہاں اداکارہ حسنہ کے شوہر رشید بھٹی بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ موجود تھے۔ رشدی کی ایک بے ضرر سی حرکت پر ان لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ محمد علی جیسا ہیرو بھلا کیسے یہ گوارا کر لیتا۔ یہ فوراً ان کی امداد کو پہنچا اور دھواں دھار جنگ شروع ہو گئی۔ پلیٹیں، ایش ٹرے، چمچے، کانٹے ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ ریستوران میں موجود لوگ اور ویٹر چشم زدن میں رفوچکر ہو گئے۔ بات اتنی بڑھی کہ مخالف پستول لے کر آ گئے۔ محمد علی نے دفاع کے لیے باورچی خانے سے سبزی کاٹنے والی لمبی چھری اٹھالی۔ بھگدڑ تو پہلے ہی مچ گئی تھی۔ ہم مخالفین کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے اور حمایت علی شاعر پچھلی گلی میں جا کر "پولیس پولیس" پکارتے رہے مگر رات کو بارہ ایک بجے کون آتا؟ آخر میں جیت ہیرو کی ہوئی۔ مخالف گروپ پسپا ہو گیا۔ بیرے خانساماں دوبارہ نمودار ہو گئے اور دیواروں پر سے ٹماٹو کیچپ کے نشانات صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس ہنگامے سے نجات ملی تو ہم نے احمد رشدی کو تلاش کیا جو نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اگلے دن وہ ملے تو سر پہ معمولی سی چوٹ کا نشان تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ریستوران سے باہر نکلے تو ایک ٹیکسی مل گئی۔ وہ سیدھے گھر پہنچ کر سو گئے۔ انہیں کچھ پتا نہیں کہ بعد میں جو لوگ ریستوران میں رہ گئے تھے ان پر کیا گزری تھی؟ اس کے بعد بھی عرصے تک ہم لوگ اس جنگ کے حوالے سے ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے اور محمد علی کو "جنگجو" ہیرو کا خطاب دے دیا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ لاہور میں نووارد محمد علی کی اس واقعے کے بعد لاہور کی فلمی دنیا میں دھاک بیٹھ گئی۔

احمد رشدی کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ میری فلم "جاگیر" کے ایک گانے کے لیے موسیقار نثار بزمی صاحب نے رشدی کو ریہرسل کرائی تھیں۔ گانے کی ریکارڈنگ کا دن آیا تو عین وقت پر معلوم ہوا کہ بیک سنگرز ایسوسی ایشن نے نثار بزمی صاحب کا بائیکاٹ کر دیا ہے اور جب تک مصالحت نہ ہوگی ایسوسی ایشن کا کوئی رکن نثار بزمی صاحب کے لیے گانا ریکارڈ نہیں کرائے گا۔ میری مشکل یہ تھی کہ گانا ریکارڈ کرنے کے دو دن بعد اس کو فلمانا بھی تھا۔ اگر گانا ریکارڈ نہ ہوتا تو آرٹسٹوں کی تاریخیں ضائع ہو جاتیں۔ میں نے جنرل سیکریٹری مسعود رانا کو یہ صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی۔ رشدی کو بھی صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ رشدی بے چارہ تو تیار تھا مگر ایسوسی ایشن سے ڈرتا تھا۔ مسعود رانا نے کہا کہ آپ دو دن کا گانا رکھ لیں مگر یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے بزمی صاحب سے کہا کہ کسی نئے گانے والے کی خدمات حاصل کی جائیں ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ عالمگیر اس زمانے میں گٹار ہاتھ میں لیے پھرتے تھے۔ روبن گھوش اور شبنم کے گھر میں بھی عموماً نظر آجاتے تھے مگر کسی نے فلم میں گانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بزمی صاحب نے کہا کہ اس گانے کے لیے عالمگیر بہت موزوں ہیں۔ چنانچہ عالمگیر کو فوراً تلاش کیا گیا۔ ریہرسل کرائی گئیں اور رات کو ریکارڈنگ کا بندوبست ہو گیا۔ رشدی کو پتا چلا تو پھر مسعود رانا کو لے کر آ گئے۔ اب ان کا یہ کہنا تھا کہ چلیے میں ایسوسی ایشن کو منالوں گا مگر گانا میری ہی آواز میں ریکارڈ کریں۔

انہیں گمان بھی نہ تھا کہ ہم کسی اور کی آواز میں گانا ریکارڈ کر لیں گے۔ مگر اب اصول کا مسئلہ بن چکا تھا۔ عالمگیر ایک نوآموز اور نووارد گلوکار تھا۔ اس کی دل شکنی ہمیں منظور نہ تھی چنانچہ یہ گانا عالمگیر کی آواز میں ریکارڈ کر لیا گیا۔ ندیم اور دیبا پر اس کی فلم بندی ہوئی اور یہ بہت مقبول ہوا

ہم چلے تو ہمارے سنگ سنگ نظارے چلے

آج بھی ایک مقبول گانا ہے۔ کئی سال پہلے میں ٹورونٹو میں تھا۔ پتا چلا کہ پاکستانی فنکاروں کا ایک شو منعقد ہو رہا ہے۔ ہال میں گئے تو تھا، عالمگیر، مہناز نے اپنے اپنے

فن کا مظاہرہ کیا۔ عالمگیر نے وہی نغمہ سنایا۔ وقفے کے دوران میں ان سے ملاقات ہوئی۔ عالمگیر نے بتایا کہ وہ اسٹیج شو میں اپنے پروگرام کا آغاز ہی اس نغمے سے کرتے ہیں جو ان کے لیے لکی ثابت ہوا اور جس نے فلمی دنیا میں ان کے لیے دروازے کھول دیے۔

رشدی کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا۔ عالمگیر کا گایا ہوا نغمہ مقبول ہوا اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دکھ اس بات کا تھا کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کو مایوس کیا۔

رشدی نے ایک فلم سازی کا آغاز بھی کیا تھا اور محمد جاوید فاضل کو اپنی فلم "امانت" کے لیے ہدایت کار منتخب کیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ بھی شروع ہوگئی تھی مگر نامکمل ہی رہی۔ اپنی اداکاری کا شوق بھی وہ پورا کرلیا کرتے تھے۔ جان محمد جمن کی فلم "دیکھا جائے گا" آخری فلم تھی جس میں رشدی نے اداکاری کی تھی۔ یہ 1976ء کا ذکر ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ احمد رشدی کے ستارے گردش میں آچکے تھے۔ ان کی فلموں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی۔ فلم سازی کا تجربہ ناکام ہوگیا تھا اور اس میں انہیں مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ انہوں نے چار سو کے قریب فلموں میں ہزاروں گانے گائے مگر مالی اور معاشی طور پر بھی خوشحالی سے ہمکنار نہ ہوسکے۔ مایوسیوں نے احمد رشدی کے ذہن و دماغ پر اثر انداز ہونا شروع کردیا تھا۔ لاہور میں فلموں کی تعداد کم ہوگئی تو وہ کراچی چلے گئے۔ 1979ء میں ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ تقریباً ایک سال تک بیمار رہے۔ صحت یاب تو ہوگئے مگر 1980ء میں انہوں نے گانا قطعاً بند کردیا۔ غالباً ڈاکٹروں نے انہیں مشورہ دیا تھا یا بہت ممکن ہے کہ دل شکستگی کے عالم میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہو۔ اس زمانے میں ان سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔ میں ملک سے باہر آنے جانے میں مصروف رہا۔ "ہیرو" آخری فلم تھی جس میں احمد رشدی نے نغمے گائے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ "ہیرو" وحید مراد کی بھی آخری فلم تھی۔ جنہوں نے غالباً کسی ایک فلم میں بھی احمد رشدی کی آواز کے بغیر کام نہیں کیا تھا۔ پہلے شدید ہارٹ اٹیک کے بعد رشدی پھر بھی سنبھل نہیں سکے آخری دورہ انہیں گیارہ اپریل کو پڑا اور اس قدر شدید ثابت ہوا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔ گانا ان کا شوق تھا جو انہوں نے ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ بستر علالت پر دراز ہوئے تو دوستوں کی ملاقات سے بھی گئے۔ پھر مالی پریشانیاں بھی لاحق رہیں۔ وہ علاج کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتے تھے مگر پیسے کا بندوبست نہ ہوسکا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مشکلات نے ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک طویل عرصے تک پاکستان کے مقبول ترین مغنی رہے تھے کیونکہ ہر قسم کا گانا انتہائی سہولت اور خوبصورتی کے ساتھ گا لیتے تھے۔ ان کی گلوکاری کا عرصہ 25 طویل سالوں پر محیط ہے۔

رشدی کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اچھے وقتوں کا انتظار نہ کرسکے۔ آنے والے سالوں میں پاکستان میں تقاریب اور کیسٹوں کے باعث گلوکاروں کی آمدنی میں بے انتہا اضافہ ہوگیا۔ ایسے گلوکار بھی ہیں جو کسی ایک تقریب میں گانے کا معاوضہ بیس پچیس ہزار وصول کرتے ہیں۔ احمد رشدی نے تو کبھی سپنوں میں بھی اتنی رقم نہیں دیکھی ہوگی۔ بے چارہ رشدی.....!

☆☆☆

آج آپ کو برصغیر کی دو معروف ہستیوں کی داستان سناتے ہیں۔ وفا، جفا، بے وفائی، وفاداری کے ساتھ ساتھ یہ عروج و زوال کی ایک ایسی داستان ہے جسے اب بھارتی فلمی صنعت (بالی وڈ) کے لوگ بھی بھول چکے ہیں۔

شروع کرتے ہیں ایک پری چہرہ ہیروئن سے۔ ان کا نام گوہر بائی تھا۔ اس زمانے میں انہیں مس گوہر کہا جاتا تھا۔ مس گوہر یا گوہر بائی لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ صورت شکل ادائیں اور اداکارانہ صلاحیتوں سے مالامال تھیں۔ جب عنفوان شباب میں قدم رکھا تو ایک قیامت برپا کردی۔ سارے شہر میں ان کا چرچا ہوگیا۔ لاہور میں فن کاراؤں کی اس وقت کمی نہ تھی لیکن گوہر بائی نے جیسے ہی اس میدان میں قدم رکھا سارا لاہور (مطلب لاہور کے فن کے دلدادہ) نے ان کے نام کی مالا جپنا شروع کردیا۔ اداکاری، رقص اور گانے کی صلاحیتیں وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ لائی تھیں۔ اداکاری کا بھی بچپن سے شوق تھا۔ وہی بات تھی کہ

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔

فلمی دنیا میں انہوں نے اپنا سفر خاموش فلموں سے شروع کیا تھا کیونکہ اس وقت خاموش فلمیں ہی بنا کرتی تھیں اور ان کے شیدائی انہیں دیکھ کر ہی خوش ہوجاتے تھے اور انہیں یہ بھی اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان میں کون اسٹار ہے اور کون سپر اسٹار۔

اداکارہ گوہر

مس گوہر کی پہلی فلم ''بلو اسکل عرف جگت سوہاس، تھی جس میں وہ پہلی بار پردہ اسکرین پر نمودار ہوئی تھیں۔ اس فلم نے تہلکہ مچادیا تھا۔ پہلی ہی فلم کی نمائش کے بعد ان کے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ یہ فلم انڈین فلم کمپنی نے بنائی تھی۔ اس زمانے میں برصغیر میں خاموش فلم سازی کا نیا نیا آغاز ہوا تھا۔

1920ء میں مس گوہر کی دوسری فلم ''راما یامایا'' کی نمائش ہوئی۔ 1922ء میں انہوں نے دو اور خاموش فلموں میں کام کیا۔ ان دو فلموں کی نمائش کے بعد وہ کلکتہ چھوڑ کر بمبئی چلی گئیں کیونکہ وہاں فلمی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ وہ بمبئی کی ایک کمپنی کوہ نور فلمز سے وابستہ ہو گئیں۔ بمبئی جانا ان کے لیے خوش قسمتی کا آغاز ثابت ہوا۔ 1925ء میں مس گوہر کی تین فلموں کی نمائش ہوئی۔ فلم ''باپ کی کمائی'' کرشنا کمپنی کی فلم تھی۔

اب انہوں نے بمبئی کی فلمی صنعت میں پاؤں جما لیے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1925ء میں انہوں نے دس فلموں میں کام کیا۔ ان میں ''ٹائپسٹ گرل، میں کیوں عیسائی بنی، دہلی کا ٹھگ، شیریں فرہاد، عظیم قربانی (اس میں انہوں نے سلوچنا کے ساتھ کام کیا تھا) رکاوٹ، پرتھوی چترا، ممتاز محل، مینا کماری، لکھو ونجارہ شامل تھیں۔ ان فلموں میں دوسرے اداکار بھی بہت مشہور تھے اس لیے زیادہ تر فلموں نے کامیابی کا منہ دیکھا۔

1927ء میں ان کی چار فلموں کی نمائش ہوئی۔ پڑھی لکھی بیوی کے ہدایت کار چندو شاہ تھے۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہندوستانی عورت اپنے حقوق کے لیے کس طرح جان کی بازی لگاتی ہے عورت کے لیے یہ ایک پکار تھی جس میں اس کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے لڑنے اور جنگ کرنے کا سبق دیا تھا۔ فلم پڑھی لکھی لڑکی، میں بھی ہندو خواتین کو بتایا گیا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کریں اور دوسروں کی محتاج ہو کر نہ رہ جائیں۔ پڑھی لکھی ماں ہی اولاد کو اچھی تربیت دے سکتی ہے۔ دیکھا جائے 7 1927ء میں بنائی جانے والی فلم ایک انقلابی فلم تھی کیونکہ اس زمانے میں ایسے موضوعات کوئی فلم ساز سوچ بھی نہیں سکتا۔

یہ انقلابی فلم بنانے کا سہرا فلم ساز و ہدایت کار چندو لال شاہ کے سر تھا۔ ایسے ہی انقلابی موضوعات وہ پہلے بھی فلماتے آ رہے تھے۔

جب کامیابیوں نے قدم چومے تو مس گوہر نے 1928ء میں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرلی۔ انہوں نے ان فلموں میں مرکزی کردار بھی ادا کیے تھے۔ ایک فلم کا نام وشوا موہنی تھا۔ اس فلم میں مس گوہر نے بیک وقت تین کردار ادا کیے تھے جو کہ اس زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی سال انہوں نے بھکاری شہزادی میں کام کیا۔ یہ بھی بہت کامیاب تھی۔ چندو لال شاہ اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔

ان کامیابیوں سے متاثر ہو کر ان دونوں نے مل کر ایک فلم ساز ادارہ قائم کر لیا۔ جس کا نام رنجیت مووی ٹون تھا۔ اس دوران میں ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے گوہر اور چندو لال شاہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ فلمی دنیا میں ایک دن اس خبر نے ہلچل مچادی کہ مس گوہر اور چندو لال شاہ نے شادی کر لی ہے۔ واقعی یہ ایک حیران کن بات تھی مس گوہر ایک حسین و جمیل اداکارہ تھیں جبکہ چندو لال شاہ سیاہ رنگ کے موٹے تھے۔ گوہر کو اس وقت ہندوستان میں بڑے بڑے دولت مند بلکہ راجا مہاراجا بھی ہر قیمت پر اپنانا چاہتے تھے مگر عشق نے اپنا کام کر دکھایا اور مس گوہر نے چندو لال شاہ جیسے سیاہ رنگ موٹے اور بھدے آدمی سے شادی کر لی۔ یار لوگوں نے اس پر کہا۔

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت

کا فقرہ بھی چست کیا تھا مگر ان دونوں کی شادی کامیابی سے جاری رہی۔

اس فلم کمپنی میں دونوں برابر کے حصے دار تھے اور مس گوہر کا حکم بھی چلتا تھا۔ رنجیت مووی ٹون اس اعتبار سے ایک کامیاب کمپنی ثابت ہوئی۔ اس کمپنی نے ہر ماہ ایک فلم بنا کر پیش کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔

مس گوہر نے بھی اس سال چھ فلموں میں کام کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد یہ شادی دونوں کے لیے بہت مبارک قرار دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رنجیت مووی ٹون ایک بہت کامیاب ادارہ بن گیا جس نے ہر ماہ ایک فلم بنا کر بڑے بڑے نامور اداکاروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مس گوہر اپنی پسند کے کرداروں میں اداکاری کرتی تھیں۔ دولت اور شہرت کی دیوی ان دونوں پر بہت مہربان تھی۔ اس دوران میں مس گوہر دوسری کمپنیوں کی فلموں میں بھی کام کر کے شہرت حاصل کرتی رہیں۔

1936ء میں جب ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ”عالم آرا“ کی نمائش ہوئی تو اس فلم نے دھوم مچا دی۔ رنجیت مووی ٹون کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔

1931ء میں رنجیت نے بھی بولتی فلم ”دیوی دیویانی“ بنا کر پیش کی جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ یہ ایک دھارمک (ہندو مذہبی) فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار چندولال شاہ اور موسیقار اس زمانے کے مقبول ترین فنکار استاد جھنڈے خان تھے۔ یہ اس کمپنی کی پہلی بولتی فلم تھی جو بے حد کامیاب رہی۔ اس زمانے میں چندولال شاہ کو بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بہت بلند مقام حاصل ہو گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ کسی بھی اداکار کی تقدیر بنا یا بگاڑ سکتے ہیں۔

1932ء میں مس گوہر نے تین فلموں میں کام کیا۔ یہ تینوں رنجیت مووی ٹون کی فلمیں تھیں اور بے حد کامیاب ہوئی تھیں۔ رنجیت کی اکثر فلموں کے ہدایت کار چندولال شاہ اور موسیقار استاد جھنڈے خاں ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بمبئی فلمی صنعت کے باہمی جھگڑے طے کرنے کے لیے فلم ساز چندولال شاہ کے پاس جاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بمبئی کی فلمی دنیا کے بادشاہ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ مس گوہر کی خاموش فلم ”وشواموہنی“ میں مس گوہر نے بیک وقت تین کردار ادا کیے تھے۔ اس بار انہوں نے اسی نام سے اس فلم کو بولتی فلم بنایا اور وہ بھی بہت کامیاب ہوئی۔ کامیابی کی دیوی مس گوہر پر مہربان ہو گئی تھی۔ رنجیت مووی ٹون سے وہ بے شمار دولت حاصل کر رہی تھیں اور فلموں میں اداکاری کر کے بھی خوب دولت کما رہی تھیں۔

چندولال شاہ فلموں کی ہدایت کاری کرتے رہے مگر مس گوہر نے ان سے شادی کرنے کے بعد کسی اور فلم کی اور ہدایت کاری میں کام نہیں کیا۔ مس گوہر اب اداکاری کی بجائے فلمیں بنانے پر زیادہ دھیان دینے لگی تھیں۔ اس زمانے میں رنجیت مووی ٹون ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ساز ادارہ تھا۔

چندولال شاہ اب کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں گنتی کے لوگ ہی کروڑ پتی تھے۔ وہ مس گوہر کے لیے خاص طور پر کردار لکھواتے تھے اس لیے ہر فلم میں مرکزی کردار مس گوہر کا ہی ہوتا تھا۔

لیکن ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے اور فلمی صنعت میں تو لوگ راتوں رات دولت مند یا غریب ہو جاتے ہیں۔ رنجیت پر برا وقت آیا تو کمپنی کی فلمیں فلاپ ہونے لگیں چونکہ بہت سے نئے، ذہین اور اچھے ڈائریکٹرز اور فلم ساز سامنے آ گئے تھے۔ ان دنوں چندولال شاہ نے مس گوہر کے لیے خاص طور پر ایک کہانی لکھوائی اس فلم کا نام ”اچھوت“ تھا۔ گوہر بائی کے ساتھی موتی لال، چارلی، مظہر خان بھی اس فلم میں کام کر رہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار گیان دت تھے۔ مس گوہر کی لاجواب اداکاری نے سب کو چونکا دیا۔ اس فلم کی موسیقی اور گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ چند گانے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

1۔ رگھوپتی راگھو راجا رام
2۔ اے پنچھی سے کو پہچان
3۔ دور ہٹو جی دور ہٹو
4۔ نہیں بولوں لاکھ منائے۔

یہ فلم گجراتی زبان میں بھی بنائی گئی تھی۔

اس فلم کی بے پناہ کامیابی نے رنجیت فلم مووی ٹون کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اداکارہ کی حیثیت سے یہ مس گوہر کی آخری فلم تھی مگر یادگار تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے جسم کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا اور موٹاپا ان پر چڑھ گیا۔ مس گوہر اور مس سلوچنا اپنے زمانے کی دو سپر ہیروئنیں تھیں اور ان میں مقابلہ جاری رہتا تھا۔

ان کامیاب فلموں کے بعد رنجیت مووی ٹون ایک بار پھر زوال کا شکار ہو گئی۔ چندولال شاہ کا دیوالیہ نکل گیا اور وہ قرضوں کے بوجھ تلے دب گئے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ چندولال شاہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے۔ ادھر مس گوہر کو لوگ بھول چکے تھے وہ لوگ جو دن رات ان کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

SHREE RANJIT MOVITONE Co.
Motilal
Khurshid
Pardesi
परदेसी
SHREE RANJIT MOVITONE CO.

چندو لال شاہ اور ان کی فلموں کے پوسٹر

خوشامد کرتے تھے اور ان کی جھلک دیکھنے کے لیے منتظر رہتے تھے اب ان سب نے منہ موڑ لیا۔

25 نومبر 1978ء کو چندو لال کا انتقال ہوا تو ان کی غربت اور بے کسی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان کی آخری رسوم ادا کرنے والا نہ تھا ان کی لاش کو لاوارث قرار دے کر میونسپل کارپوریشن نے ٹھکانے لگا دیا۔ اللہ اللہ ایسا عروج اور ایسا زوال خدا کسی کو نہ دکھائے۔ کسی فلم والے کو ان کے مرنے کی خبر تک نہ ہوئی نہ کسی نے ان کی آخری رسوم میں شرکت کی۔ وہ شخص جو بمبئی کی فلمی دنیا کا بادشاہ کہلاتا تھا فقیروں اور لاوارثوں کی طرح اپنی آخری منزل کو پہنچا۔ مس گوہر بھی دنیا کی نظروں سے دور ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ دنیا کی بیوفائی اور قدرت کی کرشمہ سازی کا نمونہ دیکھنا ہو تو یہ داستان پڑھیے اور عبرت حاصل کیجیے۔

عروج کے بعد زوال تو دیکھا لیکن زوال کی یہ حد نہ دیکھی تھی۔

☆☆☆

اپنے عروج کے زمانے میں علی اعجاز نے اعتدال و توازن سے کام لیا اور کفایت شعاری سے آنے والے دنوں کے لیے پس انداز کرتے رہے۔ چنانچہ جب غیر مقبولیت کے سائے نظر آئے تو علی اعجاز نے بہت رکھ رکھاؤ اور سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے وضع داری کے ساتھ فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ فلموں میں زوال کے مسئلے کو انہوں نے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں بنایا نہ ہی اسے اپنی انا کا سوال بنایا۔ ایسے ذہنی توازن، حقیقت پسندی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت بہت کم اداکار دیتے ہیں۔

علی اعجاز نے شہرت تو مزاحیہ کرداروں کے طور پر حاصل کی مگر میری ذاتی رائے میں، وہ ایک بہت اچھے کیریکٹر ایکٹر ہیں اور ہر قسم کے کردار ادا کرنے پر قادر ہیں۔ مزاحیہ اداکاری میں وہ محض اچھے فقروں کے محتاج ہوتے ہیں جبکہ ان کے چہرے اور حرکات و سکنات سے مزاحیہ اداکاری کے لوازمات کے آثار نظر نہیں آتے۔ انہوں نے بعض فلموں میں کیریکٹر رول کیے ہیں اور بہت خوب کیے ہیں۔ دراصل ان کے پاس فقروں کی برجستگی اور وہ حاضر جوابی نہیں ہے جسے اس دور کے دوسرے مزاحیہ اداکاروں نے ایک ضرورت بنا دیا تھا۔ انہیں ایک بہت اچھا اداکار کہا جا سکتا ہے۔ مزاحیہ اداکار کہنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان دنوں ٹیلی وژن ڈراموں میں بھی وہ مزاحیہ اداکاری کر رہے ہیں۔ بہتر ہو اگر وہ دوسرے انداز

کے کرداروں کی طرف بھی متوجہ ہوں۔

علی اعجاز کو میں نے ابتدا سے انتہا تک (یعنی عروج زمانہ میں بھی) ہو بہو یکساں ان کی عادات و اطوار میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ نہ ساون سوکھے نہ بھادوں ہرے ہر حال اور ہر موسم میں ایک جیسے۔ علی اعجاز نے میرے ساتھ بھی کام نہیں کیا۔ نہ میری لکھی ہوئی کسی فلم میں ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن جب بھی ملے بہت اخلاق اور خوش مزاجی کے ساتھ ملے۔ ایک بار میری ایک فلم کے سلسلے میں ایک نئی کار کا ایکسیڈنٹ دکھانا مقصود تھا اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر میں نے پہلے تو ایک نئے ماڈل کی ایکسیڈنٹ میں ٹوٹی پھوٹی کار تلاش کی جس میں شبنم اور شاہد کے ساتھ ایک منظر فلمایا گیا۔ یہ بہت ڈرامائی منظر تھا بلکہ فلم کا کلائمکس ہی تھا۔ اب یہ تلاش ہوئی کہ اس ماڈل کی ایک سالم نئی کار کہاں سے اور کیسے حاصل کی جائے؟ ابھی ہم اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ علی اعجاز کی چمکتی ہوئی سفید کار اندر داخل ہوئی اور وہ سفید قمیص اور سفید پتلون میں ملبوس باہر نکلے۔ اسسٹنٹ نے دیکھتے ہی میرے کان میں کہا کہ اگر علی اعجاز کی کار ایک دن کے لیے مل جائے تو ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔ علی اعجاز علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد جا چکے تھے۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو ان کے پاس بھیجا اور وہ یہ خبر لے کر آیا کہ علی اعجاز کی اس روز آؤٹ ڈور شوٹنگ ہے اور ظاہر ہے کہ انہیں بذات خود کار کی ضرورت پیش آئے گی مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ میری فلم کے لیے ان کی کار درکار ہے تو انہوں نے کار کی چابی میرے اسسٹنٹ کے حوالے کر دی اور خود سارا دن کرائے کی ٹیکسی میں گھومتے رہے۔ ان کے اس برتاؤ کی وجہ سے میں ان کے حسن اخلاق کا قائل ہو گیا اور ساری زندگی یہ واقعہ میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔ ان کی کار مل جانے کی وجہ سے ہماری فلم کے کلائمکس کے مناظر "انتہائی مؤثر اور حقیقت" سے قریب ہو گئے۔ شبنم اور شاہد کے علاوہ ننھا اور حسنا نے بھی اس فلم میں کام کیا تھا۔ ٹیلی وژن کے اداکار انور اقبال کو میں نے پہلی بار اس فلم میں شاہد اور شبنم کے ساتھ ایک مرکزی اور اہم کردار میں کاسٹ کیا تھا۔ گلوکارہ مالا بیگم کی بھانجی عاشی نے بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ معاشرتی اور رومانی فلم تھی۔ افسوس کہ ڈبوں میں بند ہی رہ گئی۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

انور اقبال تو بعد میں فلموں میں نمودار ہو گئے مگر عاشی کی شادی ہو گئی اور وہ فلمی دنیا سے دور ہو گئیں۔

مزاحیہ اداکاروں میں اچھے اور باصلاحیت اداکاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ چند مزاحیہ اداکار پچھلے چند سالوں میں بھارتی فلمی صنعت میں بھی خاصے کامیاب رہے لیکن ان کی اداکاری محض اپنے اسٹائل تک ہی محدود رہی۔ مثلاً جانی واکر کا ایک مخصوص انداز تھا مقری اور محمود کا اداکاری کا اسٹائل مختلف تھا۔ جگدیپ، اسرانی علیحدہ انداز سے اداکاری کرتے تھے۔ آغا اور اوم پرکاش کا انداز جدا تھا۔ لیکن ان اداکاروں میں وہ ذہانت، حاضر جوابی اور برجستگی نہیں تھی جو پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کے حصے میں آئی۔ پاکستان کے مزاحیہ اداکار کسی ایک مخصوص انداز کے پابند نہیں رہے۔ تاثرات کے علاوہ فقروں کی ادائیگی اور فقرہ بازی میں بھی انہیں مہارت حاصل رہی ہے۔ جو ان کے بھارتی ہم عصروں کے حصے میں نہیں آئی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کا معیار بھارتی اداکاروں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی فلمی صنعت میں گزشتہ چالیس سالوں میں خالص مزاحیہ فلمیں بنانے کا رجحان بالکل ختم ہو کر رہ گیا حالانکہ کسی زمانے میں وہاں مزاحیہ اداکاروں کو مرکزی کردار بنا کر خالص مزاحیہ بنانے کا رواج تھا۔ چارلی غوری ڈکشٹ کئی کامیاب مزاحیہ فلموں کے ہیرو رہے ہیں خصوصاً چارلی نے تو اپنے عروج کے زمانے میں کئی ایسی فلموں میں کام کیا جن میں ان کے سوا کوئی دوسرا ہیرو ہی نہیں تھا۔ یہ فلمیں اپنے طنز و مزاح اور چارلی کی اداکاری کی بنا پر بہت کامیاب رہیں لیکن گزشتہ دہائیوں کے دوران میں یہ رواج آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ گیا اور مزاحیہ اداکار اپنے مخصوص لگے بندھے کرداروں تک محدود ہو کر رہ گئے اس کے برعکس پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کے نمایاں کرداروں کے باعث بعض فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور پھر جب منور ظریف، ننھا، رنگیلا، علی اعجاز جیسے اداکار میسر آئے تو خالص مزاحیہ فلمیں بھی بنائی گئیں اور بہت کامیاب رہیں۔ شروع میں یہ تجربہ شباب کیرانوی مرحوم نے کیا۔ منور ظریف اور رنگیلا کے کرداروں پر بنی ان کی فلمیں بہت کامیاب ہوئیں اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے فلم سازوں نے حس مزاح اور سوجھ بوجھ کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی تھی اس

اداکار رنگیلا

اداکار علی اعجاز

لیے دوسرے لوگوں کے تجربے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔

پھر تشدد اور قتل و غارت کی فلموں کا دور شروع ہوا تو رفتہ رفتہ ان فلموں سے مزاحیہ اداکار کا کردار بھی خارج ہو گیا۔ ایک زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھارت اور پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کی شمولیت کے بغیر بھی فلمیں چلائی جا سکتی ہیں کیونکہ ناچ گانے کی طرح کامیڈی بھی ایک کامیاب فلم کا لازمی حصہ قرار دی جاتی تھی مگر قتل و غارت کے زور و شور میں مزاح کی گردن پر چھری پھیر دی گئی اور فلموں میں سے مزاح کا عنصر بالکل غائب ہو گیا لیکن اس اثنا میں ایک ایسا دور بھی آیا جب رنگیلا اور علی اعجاز کی مزاحیہ فلمیں کامیاب ہونے لگیں اور بہت سے فلم ساز اس راستے پر چل نکلے لیکن ایک تو ان سب فلموں میں بہت زیادہ یکسانیت تھی دوسرے ہر چیز کی کثرت سے بھی تماشائی اکتا جاتے ہیں اس لیے یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں رہا لیکن اس میں مزاحیہ اداکاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لکھنے والے اور ہدایت کار اس کے ذمہ دار تھے ظاہر ہے کہ جب تک مزاحیہ فلم میں تھیم، کردار نگاری اور مناسب سچویشن نہیں ہوگی، فلم کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا ہے مزاحیہ فلموں کے لیے ذہانت اور حس مزاح کی موجودگی بہت ضروری ہے جو کہ اکثر فلموں میں ناپید تھی چنانچہ یکے بعد دیگرے کامیڈی فلمیں فلاپ ہونے لگیں اور حسب معمول فلم سازوں نے اس کی ذمہ داری بھی تماشائیوں کے گرتے ہوئے ذوق پر ڈال دی حالانکہ بے چارے فلم بین اس معاملے میں بھی بالکل بے قصور تھے۔

پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کے بارے میں تذکرہ بالکل نامکمل ہوگا اگر رنگیلا کا نام نہ لیا جائے۔ مزاحیہ اداکاروں کی ہماری فلمی صنعت میں کوئی کمی نہیں رہی لیکن رنگیلا جیسی شخصیت قدرے منفرد اور مختلف ہے۔ رنگیلا اپنی شکل و صورت اور عادات و اطوار کی طرح تخلیقی صلاحیتوں میں بھی دوسروں سے مختلف تھے۔ وہ محض کامیڈین ہی نہیں بلکہ گوناگوں صلاحیتوں کے حامل بھی تھے اور انہوں نے ان تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ مثلاً کامیڈی تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بہت حوصلہ مند فلم ساز بھی رہے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہدایت کار بھی تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بعض فلمیں ہدایت کاری کے اعتبار سے نہ صرف بہت کامیاب بلکہ معیاری بھی ثابت ہوئی ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں صرف یہیں تک محدود نہ ہیں بلکہ انہوں نے گلوکاری کے میدان میں بھی قدم رکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بہت مقبول گیت بھی گائے۔ پھر وہ موسیقی ترتیب دینے کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت اچھی دھنیں ترتیب دیں۔ وہ اپنی فلموں کی کہانیاں بھی لکھتے رہے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ہمیشہ رنگیلا کا معترف رہا ہوں حالانکہ ہمارے معاشرے میں اور خصوصاً تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں رنگیلا جیسے کم تعلیم یافتہ اور غریب آدمی کی تعریف کرنا ایک آفت کو دعوت دینے کے مترادف ہے لیکن میں نے ہمیشہ ان کی ہمت اور قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر رنگیلا کسی ترقی یافتہ مغربی ممالک میں ہوتے اور انہیں بہتر ماحول، بہتر ساتھی میسر آتے تو ان کی دولت اور

شہرت میں مزید اضافہ ہوتا اور وہ بھی فلم کی تاریخ میں چارلی چپلن کی طرح کہیں نہ کہیں اپنا نام ضرور لکھوا دیتے۔ چارلی چپلن اور رنگیلا میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ چارلی چپلن کا بچپن عسرت میں گزرا وہ تعلیم حاصل نہیں کر پائے۔ ان کی والدہ اسٹیج کی اداکارہ تھیں اور چارلی چپلن نے ان سے اوائل عمری سے بہت کچھ سیکھا۔ مگر ان کی اصل درس گاہ زندگی کا اسکول تھا۔ پھر انہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور کامیابی حاصل ہوئی تو امریکی معاشرے نے ان کی تعریف وتوصیف اور ہمت افزائی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ سرمایہ کاروں نے انہیں سرمایہ فراہم کرنے کے لیے کسی بخل سے کام نہیں لیا اور انہوں نے بہت فراغت اور آسودگی کے عالم میں فلمیں بنائیں۔ وہ اداکاری اور اپنی ذہانت اور خداداد قابلیت کی بنا پر دنیا بھر میں ان کی قدرومنزلت کی گئی۔ بڑے بڑے دانشور سیاست داں اور حکمراں ان کے مداح تھے اور ان کے ساتھ ملنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ جب ایسے مواقع ایسا ماحول اور سہولتیں میسر ہوں تو نام عروج پر پہنچنا ممکن کیوں نہ ہوتا۔ لیکن رنگیلا کو اس کے برعکس حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ آیئے ذرا رنگیلا کے حالات زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی کامیابیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

رنگیلا کا اصلی نام سعید خان ہے۔ وہ ایک پٹھان تھے بچپن ہی سے انہوں نے اداکاری کے جنون میں گھربار چھوڑ کر دنیائے کارزار کا رخ کیا اور اپنی جنگ کا آغاز کر دیا۔ رنگیلا صحیح معنوں میں ایک سیلف میڈ انسان تھے حقیقت یہ ہے کہ انہیں آگے بڑھانے کے لیے یا ان کی صلاحیتوں کا احساس کر کے انہیں مناسب موقع فراہم کرنے کے لیے کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ وہ محض اپنی ذاتی صلاحیتوں اور جدوجہد کی بنا پر آگے بڑھے ہیں۔ حوصلہ افزائی تو ایک طرف انہیں مذاق اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ مناظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ گھر سے لاہور پہنچ کر رنگیلا نے تندور نما ہوٹلوں میں کام کاج شروع کر دیا۔ گاہکوں کو چائے کھانا پہنچانا برتن دھونا اور رات گئے وہیں کسی تھڑے پر پڑ کر سو جانا یہ ان کی زندگی کا معمول تھا ان کی شکل وصورت ہمیشہ لوگوں کے لیے مذاق کا موضوع بنی رہی لیکن یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ یہی شکل وصورت فلموں میں ان کی ابتدائی کامیابیوں کا سبب رہی ہے۔

☆☆☆

شوکت رحمان خٹک کا پشاور سے ایک خط اس میں آپ کو بہت سی معلومات حاصل ہوں گی۔

1956ء کا زمانہ تھا میں راقم اسلامیہ اسکول پشاور میں جماعت ہشتم کا طالب علم تھا۔ عزیز تبسم، نعمت سرحدی میرے کلاس فیلو تھے ان سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ ان دوستوں نے فلم انڈسٹری میں مقام پیدا کیا۔ عزیز تبسم کراچی میں وحید مراد کے فلمساز ادارے "فلمز آرٹس" میں ملازم تھے۔ خط کے ذریعے مجھے فلم انڈسٹری کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ جب پرویز ملک "فلمز آرٹس" سے منسلک ہوئے تو وحید مراد نے فلم "ہیرا اور پتھر" کا آغاز کیا۔ پرویز ملک اس فلم کے ڈائریکٹر اور عزیز تبسم ان کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ بدر منیر اور نعمت سرحدی بھی اس ادارے سے منسلک تھے۔ وحید مراد کی بطور فلم ساز "انسان بدلتا ہے" "جب سے دیکھا ہے تمہیں" ان دونوں فلموں میں کمال نے مرکزی کردار ادا کیے۔ سنتوش کمار نے "دامن" اور ایس ایف یوسف نے "اولاد" میں وحید مراد کو چھوٹے مگر اہم کرداروں کے لیے منتخب کیا۔ اس سے انہیں حوصلہ ملا اور انہوں نے اپنی ذاتی فلم "ہیرا اور پتھر" میں بطور ہیرو خود کو متعارف کرایا۔ وحید مراد کی پہلی فلم کامیاب رہی اور دوسری فلم "ارمان" نے تو انہیں مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

دوسری جانب عزیز تبسم، نعمت سرحدی اور بدر منیر بھی فلمی دنیا میں آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ عزیز تبسم سے میری خط وکتابت جاری تھی۔ 1967ء میں عزیز تبسم نے مجھے وحید مراد کے فلمی ادارے "فلمز آرٹس" کے لیٹر پیڈ پر ایک خط میں لکھا "میں پاکستان میں پشتو کی پہلی فلم بنانا چاہتا ہوں، میرے پاس سرمائے کی قلت ہے اگر تم اس فلم میں ساٹھ ہزار روپے کا سرمایہ لگاؤ تو بطور فلمساز میں انڈسٹری میں متعارف ہو جاؤں گا۔ فلم کامیاب ہونے کی صورت میں وارے نیارے ہو جائیں گے مگر میں نے عزیز تبسم کی پیشکش کو قبول نہیں کیا کیونکہ میں گرم زمین پر پاؤں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور تقدیر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر فلم فلاپ ہوئی تو میرا سارا سرمایہ ڈوب جانے کا اندیشہ تھا۔ میری جانب سے ناامید ہونے کے بعد عزیز تبسم کے دوستوں نے فلمسازی کے لیے ہامی بھری جن میں عکاس تدبیر حسین، عکاس مدن علی مدن اور لیبارٹری انچارج شفیع قاضی شامل تھے۔ عزیز تبسم اس فلم کے ڈائریکٹر منتخب ہوئے، وہ ایک تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور مہذب انسان تھے۔ موسیقار لال محمد اقبال کی یہ پہلی پشتو فلم تھی۔

ہیروئن کے لیے یاسمین خان کو منتخب کیا گیا جو اس زمانے میں ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں بطور ایکسٹرا کام کر رہی تھی، نعمت سرحدی کو فلم کا ولن منتخب کیا گیا جو اس سے پہلے فلموں میں ڈوپلیکیٹ کیا کرتے تھے۔ نعمت سرحدی نے جہاں ترنم وہاں ہم، کے لیے بھی ڈوپلیکیٹ کیا تھا۔ پشاور سے ریڈیو پاکستان کے مشہور گلوکار ہدایت اللہ کو گانوں کے لیے بلایا گیا جو گلوکار محمد رفیع کے انداز میں گاتے تھے۔ ہیرو کے لیے قرعہ فال بدر منیر کے نام نکلا جو ان دنوں کراچی میں رکشا چلاتا تھا۔ کبھی کبھار سڑکوں پر ہوائی چپل فروخت کرتا۔ وحید مراد کے دفتر میں بطور چپراسی ملازم تھا اور فلموں میں معمولی کردار ادا کرتا تھا جن میں "روڈ تو سوات، جاگ اٹھا انسان، ہیرا اور پتھر، میں بطور ایکسٹرا کام کیا۔ یوسف خان شیر بانو کی کامیابی کے بعد عزیز تبسم کی دوسری فلم "آدم خان درخانئی" کا ہیرو بدر منیر تھا اور فلم کی ہیروئن یاسمین خان تھی۔ کراچی میں فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو گانوں کی وجہ سے گرم جارہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ڈائریکٹر عزیز تبسم، بدر منیر، نعمت سرحدی پشاور آئے اور اس فلم میں مشہور پلے بیک سنگر گلنار بیگم کے تین مشہور ریڈیو گانوں کو فلم میں شامل کرنے کی غرض سے بنوں جانے کا پروگرام بنایا جہاں وہ رہائش پذیر تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ بنوں گیا۔ گلنار بیگم کو پشتو کی لتا کا خطاب ملا تھا۔

عزیز تبسم نے پشتو، اردو اور پنجابی کی کئی مشہور فلمیں بنائیں، ان کی تعداد 35 سے زیادہ ہیں۔ 1971ء سے لے کر بیماری تک بدر منیر اکثر پشاور آتے جس ہوٹل میں ان کا قیام ہوتا، مجھے باقاعدگی سے بلاتے، اکثر و بیشتر ان سے میری ملاقات ہوتی، میں پروفیشنل فوٹوگرافر تھا۔ میں نے اس کے کئی انٹرویوز مقامی اخبارات اور رسائل کے لیے کیے۔ پشاور ریڈیو اسٹیشن کے لیے بدر منیر کا انٹرویو لیا جہاں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو ماہنامہ سرگزشت کے قلمی الف لیلہ کے پرستاروں کے لیے پہلی مرتبہ پیش کر رہا ہوں۔ بدر منیر ان کا اصلی نام ہے۔ 1942ء کے لگ بھگ سوات کے سیاحتی مقام مدین کے نواحی گاؤں شاگرام میں مولوی یاقوت خان کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد انہیں مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہاں تھے۔ اسی سوچ کے تحت انہیں اپنے ایک عالم دوست کے پاس چارسدہ کے ایک گاؤں بھیجا۔ اس شخص نے بدر منیر کی ڈیوٹی گھروں سے وظیفہ یعنی سالن روٹی منگوانے کے لیے لگا دی۔ بدر منیر گھروں کے باہر ایک مخصوص آواز لگاتا۔ "وظیفہ" پشتو زبان میں امدادی کھانے کو کہتے ہیں۔

بدر منیر اس کام کو عار سمجھتا اور ایک دن صبح سویرے چارسدہ سے بھاگ نکلا۔ پشاور جانے والی بس میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے لگا کہ کنڈیکٹر نے بہت برا بھلا کہا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک سفر کر رہا تھا اس نے اپنی جیب سے اس کے ٹکٹ کی ادائیگی کی اس نے انہیں اپنے ہوٹل میں برتن دھونے کی نوکری دی۔ یہ پشاور کے قریب سڑک کے کنارے ایک پُررونق ہوٹل تھا۔ جہاں کھانے پینے کے لیے مسافر آتے۔ بدر منیر برتن دھونے کے ساتھ ترقی کر کے ویٹر بن گیا ہوٹل میں آئے چند لوگوں سے شناسائی ہوئی جو انگلینڈ کا پروگرام بنا رہے تھے بدر منیر نے ان سے کہا۔ "میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ انگلینڈ جانا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس پیسوں کی کمی ہے۔" وہ لوگ بہت رحم دل تھے۔ بدر منیر اپنے استاد سے اجازت لیے بغیر ان کے ساتھ عازم سفر ہوا۔ بدر منیر کی یہ داستان آئندہ کسی نشست میں لکھوں گا۔ بیرونِ ملک نشیب و فراز سے گزر کر کراچی پہنچے تو وہ بالکل بے کار تھے مگر ان کا حوصلہ انہیں آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوا۔

بدر منیر نے عملی زندگی کا آغاز کراچی کی سڑکوں پر ایک رکشا ڈرائیور کی حیثیت سے کیا۔ یہ 1960ء کا عشرہ تھا۔ وحید مراد انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد اپنے والد نثار مراد کے تقسیم کار ادارے میں کام کا تجربہ حاصل کر رہے تھے۔ ان کے دوست پرویز ملک امریکا سے فلموں کا تجربہ لے کر لوٹے تو وحید مراد نے فلم "ہیرا اور پتھر" بنانے کا اعلان کیا۔ وہاں سے ان کی کامیابیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ کراچی میں قیام کے دوران میں بدر منیر کو فلمیں

دیکھنے کی لت پڑ گئی تھی۔ جو بعد میں ظفیریا کے مرض کی صورت اختیار کر گئی۔ وحید مراد کے ہاں جانے کے لیے رکشا پر پابندی تھی۔ چنانچہ بدر منیر نے رکشا چھوڑ کر وحید مراد کے دفتر میں چائے لانے کے لیے چپڑاسی کے ساتھ ساتھ ڈرائیور کی ملازمت کر لی۔ 1966ء میں وحید مراد کی فلم "ارمان" سپرہٹ ہوئی تو جشن کامیابی کے بعد بدر منیر نے وحید مراد کو اپنے فلمی شوق سے آگاہ کیا۔ وحید مراد نے بدر منیر کو "جہاں تم وہاں ہم" میں چھوٹا سا کردار دیا اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب وحید مراد کی ناکامیوں کا دور شروع ہوا تو بدر منیر نے اپنی فلم "پختون پہ ولایت کتبے" (پٹھان ولایت میں) میں ایک اہم کردار دیا جو وحید مراد نے قبول کر لیا۔

1970ء میں دولت و شہرت کی دیوی بدر منیر پر مہربان ہو گئی۔ یاسمین خان کے ساتھ بدر منیر کی پہلی پشتو فلم "یوسف خان شیر بانو" منظر عام پر آئی جو دونوں کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ اس معروف لوک داستان کے بیس برس بعد تک بدر منیر اور یاسمین خان کی فلمی جوڑی پشتو کے ناظرین سے داد وصول کرتی رہی۔ دو دہائیوں پر محیط عرصے میں اس جوڑی نے ستر سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ بدر منیر کی پشتو فلموں کی ہیروئنوں میں ثریا خان، شہناز، مسرت شاہین، خانم، نجمہ، وحیدہ خان، نادرہ، ممتاز اور نمی شامل تھیں۔ اردو فلموں میں نشو، نیلی، بابرہ شریف، دیبا، چکوری اور روحی بانو کے ساتھ بطور ہیرو اداکاری کے جوہر دکھائے۔ بدر منیر نے پشتو کے علاوہ چالیس کے قریب اردو فلموں میں بھی کام کیا۔ پنجابی فلموں میں اپنے لہجے کی وجہ سے کام کرنے سے گریزاں تھے لیکن اس کے باوجود کئی فلمسازوں نے انہیں پنجابی فلموں میں سائن کیا۔ بدر منیر کی یادگار فلموں میں یوسف خان شیر بانو، آدم خان درخانئی، اوربل، گرفتار، میرنے ورور، یو ٹک زما قانون، دوہ پختون نشان، رواج، خاندانی بدمعاش، بیزانگ، اقرار، جشن، باڈی گارڈ اور مسافر کے علاوہ سیکڑوں دیگر فلمیں ہیں۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود بطور کہانی نویس انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔

بدر منیر کو بہترین کارکردگی پر آٹھ نگار، گریجویٹ، نور جہان، بولان اور دیگر ایوارڈ ملے۔ بدر منیر کی پہلی پنجابی فلم "تین بادشاہ" تھی ان کی مشہور اردو فلموں میں "جہاں برف گرتی ہے" دلہن ایک رات کی، دشمنی اور پیچ شامل ہے۔ پشتو فلم دیدن، میں بدر منیر نے اندھے کا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا۔ بدر منیر کو ان کی زندگی میں پشتو فلموں کے دلیپ کمار کا خطاب دیا گیا لیکن وہ اکثر کہتے میں پشتو فلموں کا بدر منیر ہوں۔

بدر منیر نے مشہور کہانی نویس یونس قیاسی کی پانچ فلموں میں کام کیا جن میں دیدن، باغی، ذرتاجہ، باز شہباز، خطرناک قیدی شامل ہیں۔ بدر منیر کا نام پرائیڈ آف پرفارمنس کے لیے سال 2008ء میں منتخب ہوا۔ زندگی میں تو وہ یہ ایوارڈ حاصل نہ کر سکے لیکن 23 مارچ 2009ء کو حسن کارکردگی کا ایوارڈ ان کے لواحقین نے وصول کیا۔

بدر منیر کے نام سے ملک کے اکثر شہروں میں بدر منیر فیڈریشن قائم ہیں۔ بدر منیر نے ہدایتکار رحیم خان کے ساتھ شہنشاہ، شیر شاہ، بدمعاش نہ منم، قلم دکا شگوف، غلام، خاندانی بدمعاش، خان خیلہ، جشن، باڈی گارڈ، میں کام کیا۔ بدر منیر کی فلموں کی تعداد سات سو سے زیادہ ہے۔ ان کا نام گینز بک میں شامل ہے۔ بطور ہیرو 435 ٹائٹل کردار 160 اور 67 فلموں میں مرکزی کردار ادا کیے۔

25 فلموں میں مہمان اداکار آئے۔ باون سینما اسکوپ اور 54 بلیک اینڈ وائٹ فلمیں شامل تھیں۔ 402 پشتو، 31 پنجابی اور ایک انگریزی فلم میں بھی کام کیا۔ بدر منیر نے 33 سال فلم انڈسٹری پر راج کیا۔ صحیح معنوں میں وہ پشتو فلموں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ بدر منیر نے ابتدا میں کراچی کی آٹھ فلموں میں کام کیا۔ ان کی فلم "اوربل" پشاور کے ناز سینما میں ساڑھے تین سال چلتی رہی۔ دیگر فلموں میں کوچوان، دو جوان، لوے دیو، چے نے کامیابی کے ریکارڈ توڑے۔ دیدن نے پشاور میں دو مرتبہ ڈائمنڈ جوبلی کی۔ باز شہباز نے بھی دو مرتبہ ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ ان کی دیگر فلموں میں زندان، انگار، روڈ وہم بازی، جنت، الزام، یوہ ناوے، سروتی کپڑا اور مکان شامل ہیں۔ لیکن ان کی آخری فلم بے حد کامیاب رہی۔ پشتو فلم مسافر میں ان کے بیٹے دلبر منیر نے ہیرو جبکہ بدر منیر نے مہمان اداکار کا کردار ادا کیا۔ وہ اپنی فلموں میں دل دہلانے والے خطرناک مناظر خود فلماتے تھے۔ اداکارہ روحی کے ساتھ یوہ ناوے، میں ہیرو آئے اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی۔ بدر منیر چار سال سے فالج کے مرض میں مبتلا تھے۔ مرنے سے دو روز پہلے چھاتی میں شدید درد اور پھیپھڑوں میں پانی جمع ہونے لگا۔ انہیں اتفاق اسپتال لاہور میں داخل کیا گیا مگر بدقسمتی سے جانبر نہ ہو سکے۔ مرتے وقت ان کی عمر 67 سال تھی۔

جاری ہے

ڈپریشن سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ اسے ذہنی پسماندگی بھی کہتے ہیں۔ اس پسماندگی میں کوئی شخص اسی وقت مبتلا ہوتا ہے جب وہ کسی زبردست صدمے سے دوچار ہو اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہو۔ ایسی ہی ایک نوخیز لڑکی ڈپریشن میں مبتلا ہوگئی تو اس نے سانپ اور چھپکلیاں پالنا شروع کردیں۔ جب اس کے ڈپریشن میں اضافہ ہوا تو اس نے ہر سائز کے چاقو جمع کرنا شروع کردیے۔ ایک چاقو سے اس نے اپنے چہرے کو زخمی بھی کر

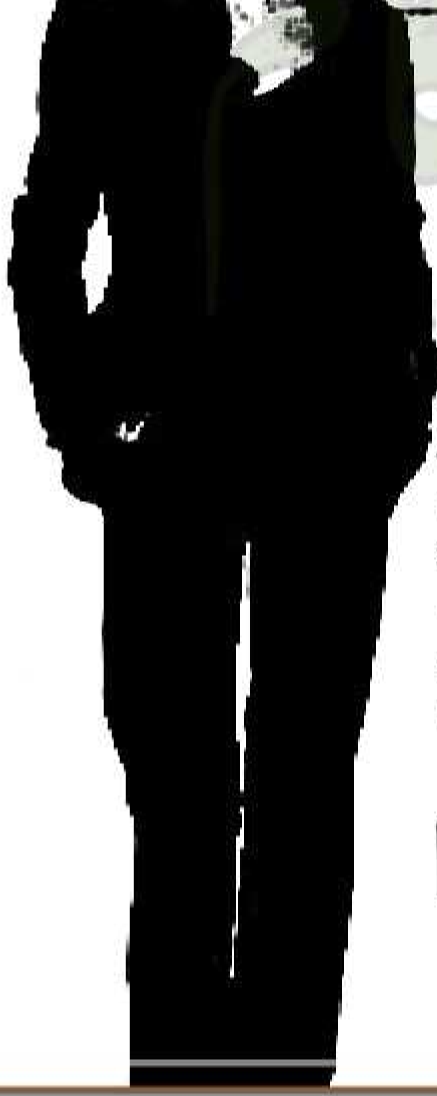

مدر ٹریسا دوم

شکیل ادریس

زندگی اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن چکی تھی۔ مصائب وآلام اس کی زندگی کا حصہ بن کر اسے سوچنے پر مجبور کررہے تھے۔ وہ پیار کے لیے ترستی تھی مگر نہ اسے باپ کا پیار مل رہا تھا اور نہ ماں اسے پیار دے پارہی تھی۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب اس پر قسمت کی کرم فرمائی ہوئی اور وہ پوری دنیا کی چہیتی بن گئی۔ دولت گویا برسنے لگی۔ تب اس نے اپنی اس کمی کو جسے وہ تاعمر محسوس کرتی رہی پورا کرنے کے لیے انسانیت کی خدمت پر آمادہ ہوگئی اور آج وہ یو این او کی جانی مانی سفیر ہے۔

ہالی ووڈ کی ایک مشہور اداکارہ کا تذکرہ

لیا۔ اپنی زندگی سے مایوسی اور دنیائے رنگ و بو سے گریز کی انتہا یہ تھی کہ اس نے ایک اجرتی قاتل کو معاوضہ ادا کیا کہ وہ مناسب موقع دیکھ کر اسے قتل کر دے!

وہ قاتل بودم تھا کہ معاوضہ وصول کرنے کے بعد بھی اسے قتل نہ کر سکا۔ اس کا دل اسے موت کے منہ میں پہنچانے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ وہ اس شہر سے ہی اپنا بوریا لپیٹ کر فرار ہو گیا جہاں کہ وہ رہتی تھی۔

ذہنی پستی میں مبتلا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اداکار باپ نے اس کی اداکارہ ماں کو طلاق دے دی تھی۔ اسے باپ سے نفرت ہو گئی۔ وہ اس کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب شہرت کی دیوی نے اس کے قدم چوم لیے اور اسے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیا۔

مایوسی سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے والی اس دوشیزہ کا نام انجلینا جولی واہٹ ہے۔ وہ 4 جون 1975 کو کیلیفورنیا، لاس اینجلس میں پیدا ہوئی۔ جولی کا مطلب فرانسیسی میں دل کش ہے.... وہ فلم اداکار جان واہٹ اور مارشیلائن برٹرینڈ کی بیٹی ہے۔ اس کا ایک ہی بھائی ہے جس کا نام جیمز ہیون ہے۔ اس کی رگوں میں بھی اپنے ماں باپ کا سچا خون دوڑ رہا ہے اس لیے اسے بھی اداکاری اور ہدایت کاری کا شوق ہے۔ اس کا خاندان کئی پیڑھیوں سے امریکن ہے۔ موروثی طور پر اس کا تعلق بیروان نامی ایک خاتون سے ہے جو 1649ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ جرمن اور ماں فرانسیسی تھی۔ وہ نغمہ نگار چپ ٹیلر کی بھتیجی ہے۔

اس کا باپ جان ہال وورڈ نامور اداکار تھا۔ جس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل چکی تھی۔ اس کی فلموں میں 'مڈنائٹ کاؤبوائے' 'ڈیلیورنس' اور 'ہوم کمنگ' جیسی شہرۂ آفاق فلمیں شامل ہیں۔ آخر الذکر فلم میں اسے آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ویسے وہ زیادہ تر کاؤبوائے فلموں میں کام کرتا تھا جس کا سورث الٹی جان وین تھا۔ جان وین پیدائشی اداکار تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لمبی نال والے پستول کے ساتھ ہیٹ لگائے پیدا ہوا تھا اور پیدائش کے وقت سے ہی گھوڑے پر بیٹھنا سیکھ گیا تھا۔

1967ء میں انجلینا کے باپ نے جب اس کی ماں سے علیحدگی اختیار کر لی تو انجلینا اور اس کا بھائی بے سہارا ہو گئے۔ ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو فوقیت دی۔ اس لیے کہ ماں کو بھی اس سانحے کا گہرا صدمہ تھا۔ بچوں کی خاطر اس کی ماں نے ایک فلم ساز بل ڈے سے دوسری شادی کر لی۔ اس کی ماں خود بھی اداکارہ تھی لیکن اس نے بچوں کی پرورش کی خاطر اس پیشے کو ترک کر دیا۔ گھریلو ماحول چونکہ فلمی تھا اس لیے انجلینا بھی قدرتی طور پر اس سے متاثر ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ فلمیں دیکھا کرتی تھی مگر ان فلموں سے صرف محظوظ ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا باپ اداکار تھا لیکن وہ اس کی قدر و منزلت سے متاثر نہیں تھی، نہ اس سے متاثر کہ وہ آسکر ایوارڈ یافتہ ہے، بلکہ اداکاری سیکھنے کا جذبہ اس کے دل میں از خود پیدا ہوا تھا۔

اس کی تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے بتایا کہ جب اس کی عمر چھ برس تھی تو اس کی ماں اور سوتیلا باپ بل ڈے اپنے خاندان سمیت نیویارک چلے گئے۔ اس کے پانچ سال بعد وہ لاس اینجلس واپس آ گئے۔

اسے اپنا بچپن بخوبی یاد ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے 'اسٹار ٹریک' کی فلمیں پسند تھیں۔ اسے گھریلو پالتو جانوروں سے محبت تھی۔ خاص طور پر وہ سانپ اور چھپکلیاں پالا کرتی تھی۔ اس کا پسندیدہ سانپ ہیری ڈین اسٹنٹن اور پسندیدہ چھپکلی ولادا میر تھی۔ (چنانچہ جب اس نے فلم الیگزینڈر میں کام کیا تو اسے سانپوں کے ساتھ شوٹنگ کرتے ہوئے قطعی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ ایسی مکروہ چیزوں سے مانوس جو ہو چکی تھی) اسے دوسرے بچوں کی طرح والٹ ڈزنی کا کارٹون کردار فلائنگ ڈمبو یعنی اڑنے والا ہاتھی پسند تھا۔ وہ روتی چیختی تھی کہ ہاتھی اڑتا کیوں نہیں ہے؟ اسے چمکدار اور بھڑکیلے کپڑے پسند تھے۔ اس کے علاوہ اسے موت کی سائنس کا، یعنی نعش خانہ بہت پسند تھا۔ وہ گھنٹوں وہاں وقت گزارا کرتی تھی۔ لاشوں سے اس نے کیا کچھ اکتساب کیا، اس راز سے اس نے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا۔ ممکن ہے اس کا سبب ڈپریشن ہو۔

اس کے خاندان کے سربراہ (گاڈ فادر) اسے سالگرہ پر ہمیشہ ایک گڑیا تحفے میں دیا کرتے تھے۔ یہ تحفہ انہوں نے پہلی سالگرہ سے لے کر سولہویں سالگرہ تک دیا۔ بعض اوقات یہ گڑیا ماڈرن ہوتی تھی اور کبھی کبھار پلاسٹک کی۔ کبھی گڑیا بے حد قیمتی ہوتی اور کبھی لکڑی یا پورسلین کی بنی ہوتی۔

چودہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ اس عمر میں ایک

ٹر کے اینٹون سے اس کی دوستی ہو گئی۔ جیسا کہ اس عمر میں افلاطونی عشق ہوتا ہے، وہ اینٹون کے ساتھ زندگی گزارنے اور دنیا کے آخری کونے تک جانے کو تیار تھی۔ باقی دنیا کو اس نے لات مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ گھر چھوڑ دیتی۔ اس کی ماں نے کہا اس کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اسے ایک مکان کرائے پر لے کر دے، لہٰذا وہ چاہے تو اپنے بوائے فرینڈ اینٹون کے ساتھ اسی مکان میں، اسی چھت کے نیچے رہ سکتی ہے۔

انجلینا کو یہ بات پسند آئی۔ وہ دوسرے کمرے میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے لگی۔ اس کا کہنا ہے کہ ماں کی حکمتِ عملی سے دو فائدے ہوئے کہ میں ان کی نظروں کے سامنے ہی رہی اور دوسرے یہ کہ میں نے اپنے اسکول کا کوئی ناغہ نہیں کیا۔ اسی پابندی سے اسکول جاتی رہی اور نصابی تعلیم حاصل کرتی رہی۔

اسکول کی تعلیم ختم ہونے پر انجلینا نے اداکارہ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے ضد کر کے لی اسٹراس برگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں اس نے دو برس تک اداکاری کی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد اسٹیج ڈراموں میں کام کرنے لگی۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر ہر ہدایت کار اسے کوئی چھوٹا موٹا کردار دے دیا کرتا تھا۔ اسکول کا دبلا پن اسٹیج والوں کے لیے قابلِ قبول تھا۔ ایسی لڑکیوں کے لیے ان کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں جن کے جسم پر زیادہ گوشت نہ ہو۔

چودہ برس کی عمر میں جب اس نے اداکاری کی تربیت حاصل کر لی تو ہدایت کاری کی طرف توجہ دی۔ وہ ہدایت کاروں کو 'کٹ' اور 'اوکے' کرتے دیکھتی تھی تو یہ خیال اس کے دل میں چٹکیاں کاٹنے لگتا کہ اسے بھی ایسا کرنا چاہیے۔ ہدایت کار سب پر بھاری ہوتا ہے اور سب اس کے تابع ہوتے ہیں۔ ساری فلم اس کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ساری فلم اس کے دماغ میں ہوتی ہے۔

ہدایت کاری کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا، اس لیے کہ اسے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی۔ اس کی ماں نے اسے بیورلے ہلز ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ اگر اس نے اداکاری کی تعلیم حاصل کر لی تھی تو نصابی تعلیم سے اسے مستثنا قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اسکول میں دوسرے طالب علموں کی طرح درسی کتابوں میں سر کھپانے لگی۔

اس کی ماں کا ہاتھ بہت تنگ تھا اور وہ چاہتی تھی کہ انجلینا اس کا ہاتھ بٹاتی، لیکن محض چاہنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ تعلیم کا بوجھ تو اس پر نہیں پڑ رہا تھا، اس لیے کہ تعلیم تو حکومت کی طرف سے مفت تھی، البتہ خانگی اخراجات اسے ہلائے دے رہے تھے۔ جب تک ہائی اسکول کی تعلیم ختم نہ ہو جاتی وہ اداکاری کی طرف نہیں جا سکتی تھی۔

ہائی اسکول کی تعلیم انجلینا کے لیے دشوار گزار ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ وہ دبلی تھی اور چشمہ پہنتی تھی۔ اس کے ساتھی طالب علم اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ انجلینا ان باتوں کے لیے خود کو موردِ الزام ٹھہراتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ڈپریشن کا شکار تھی اور اپنے مستقبل سے مایوس۔ تو اس نے تنہائی اختیار کر لی۔ وہ اب لوگوں کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ غالباً میرے مصائب کا یہی علاج تھا۔ لوگوں کے معاندانہ رویوں سے دل برداشتہ ہو کر اس نے منشیات میں بھی دل چسپی لینا شروع کر دی تھی۔ جس میں ہیروئن کا نشہ بھی شامل تھا۔

ڈپریشن کا سبب اس کا باپ تھا اس لیے انجلینا نے اس کا گہرا اثر لیا اور ذہنی طور پر اپنے باپ سے دور ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا تھا۔ کافی عرصے بعد دونوں کی یکجائی مشہور فلم "ٹومب رائڈرز" میں ہوئی جو 2001ء میں بنی تھی لیکن ان کے درمیان جو سرد مہری کی ایک اونچی دیوار قائم تھی وہ بدستور حائل رہی۔

جولائی 2002ء میں اس نے عدالت کو باقاعدہ درخواست دی کہ وہ اب اپنا خاندانی نام واہٹ استعمال نہیں کرنا چاہتی۔ عدالت نے اس کی درخواست 12 ستمبر 2002ء کو منظور کر لی۔ یوں اس نے خاندان سے رہا سہا تعلق ختم بھی کر لیا اور اب وہ صرف انجلینا جولی تھی۔ اس کے باپ نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہالی ووڈ کی چکاچوند زندگی نے میری بچی کا دماغ الٹ دیا ہے۔ غالباً وہ اپنے حواس میں نہیں ہے ورنہ کیا کوئی اپنے خاندان سے لاتعلق ہوتا ہے؟

انجلینا نے اس کی وضاحت یوں کی کہ چونکہ اب اس نے ایک بچے میڈوکس کو گود لے لیا ہے، اس لیے نہیں چاہتی کہ اس کا خاندانی نام اس بچے تک منتقل ہو۔ البتہ جب اس کی ماں کی وفات 27 جنوری 2007ء میں ہوئی تو اس نے ذہنی صدمے سے چھٹکارا پانے اور اپنی تنہائی کو ختم کرنے کے لیے ایک بار پھر باپ کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے ساتھ رہنے لگی۔ ان کے درمیان جدائی، مفارقت اور بے

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بھری چھ برس تک حائل رہی تھی۔

بھولی بسری یادیں اس کے بھائی جیمز کا بھی پیچھا کرتی ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ بچپن کے واقعات مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ ممی مجھ پر اور انجلینا پر بہت شفیق تھیں، ہمیں ان کا چیخنا چلانا برا نہیں لگتا تھا۔ مگر باپ نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا اسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ ماں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد وہ اسی قصبے میں رہتا تھا۔ گاہے بگاہے اسکول جاتے ہوئے یا آدھی چھٹی میں اس سے ٹکراؤ ہوجاتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنائیت سے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ جیسے ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں باپ میں علیحدگی کی وجہ کیا تھی؟ اس کا سلوک ماں کے ساتھ اذیت ناک تھا اسی لیے جب وہ بستر مرگ پر تھی تو اس نے انجلینا کو وصیت کی تھی کہ اب تم اپنے باپ سے نہ ملنا۔

ماں کے مرنے کا انجلینا نے بہت اثر لیا۔ اس نے کھانا تقریباً ترک کردیا۔ حالانکہ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ کھانا نہ چھوڑے ورنہ زندگی کی گاڑی کیسے چلے گی؟ وہ کھاتی تو تھی لیکن بہت کم۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ روز بہ روز دبلی ہوتی چلی گئی۔ فلم والے ایسے چھریرے بدن کو پسند کرتے ہیں مگر جب فلم "پلینگ بائی ہارٹ" کی فلم بندی شروع ہونے لگی تو اس کا جسم ہدایت کار کو ضرورت سے زیادہ چھریرا لگا۔ اس نے انجلینا سے کہا کہ وہ کپڑوں کے نیچے سوتی پیڈ باندھ لے تاکہ اس کا جسم کچھ بھاری ہوجائے۔

لوگ، خاص طور پر عورتیں اس کی پتلی کمریا اور چھریرے بدن کے بارے میں جاننے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ دوسری اداکاراؤں کی طرح اس کا پیٹ باہر کیوں نہیں آتا یا وہ اب تک پہلوان کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ وہ سادہ سی غذائیں کھاتی اور ورزش بھی کرتی ہے۔ خصوصی طور پر بھاپ سے گلی ہوئی ٹیونا مچھلی اور بھاپ سے گلی ہوئی سبزیاں استعمال کرتی ہے یا ملک پیتی ہے۔ اس کے علاوہ یوگا ورزش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یوگا سے اسے ڈپریشن سے چھٹکارا پانے میں مدد ملتی ہے۔ وہ باقاعدہ ناشتا نہیں کرتی بلکہ صبح کے وقت صرف کافی ایک پیالی پی سکتی اور وہ سگریٹ پھونکتی ہے۔

اس کے جسمانی ڈھانچے پر لوگ بحث مباحثہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ ہالی وڈ کی دوسری اداکاراؤں کی نسبت قیامت خیز اور شعلہ فشاں ہے۔ وہ اب بھی دلوں پر حکمرانی کررہی ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اگر وہ چند پونڈ اپنا وزن بڑھا لے تو صحت مند دکھائی دے گی۔ وہ اس سلسلے میں دلیل دیتے ہیں کہ انجلینا کا قد 5 فٹ 8 انچ ہے جب کہ وزن 97 پونڈ۔ قامت کے لحاظ سے یہ وزن کم ہے۔

انجلینا جنک فوڈز اور فاسٹ فوڈز سے پرہیز کرتی ہے۔ اس کے سوا وہ پانی کثرت سے پیتی ہے اور اپنے بچوں کو بھی اس کی تلقین کرتی رہتی ہے۔ پھلوں اور سبزیوں پر اس کی خاص نگاہ ہے۔ وہ دن میں تین بار بھاری کھانے کی بجائے چھ بار ہلکا کھانا کھاتی ہے اور کل 600 کیلوریز (حرارے) والی غذائیں کھاتی ہے۔ اس طرح سے سلم رہتی ہے اور ہدایت کاروں کو اس کا سراپا پسند ہے۔

ہماری ماں نے ساری ذمے داریاں نبھائی تھیں۔ کھانے پینے اور پڑھانے میں ان کی توجہ زبردست تھی۔ اگر وہ گاجر کے متعلق بتانا چاہتی تھیں تو پہلے گملے سے گاجر نکال کر لاتی تھیں اور میز پر رکھ کر کہتی تھیں کہ گاجر ایسی ہوتی ہے۔ اب یہی طریقہ انجلینا نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی رکھا ہے۔

سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ سولہ برس کی عمر میں ہمارے پاس کوئی کار نہیں تھی۔ ہمارے سارے دوستوں کے پاس کاریں تھیں اور ہم ان کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ سولہ سال کی عمر میں لاس اینجلس میں کار ڈرائیونگ کا لائسنس مل جاتا تھا مگر میرے پاس کوئی کار ہی نہیں تھی۔ میں لائسنس لے کر کیا کرتا؟

میں نے اپنے باپ کے پاس جاکر کئی بار مفلسی کا رونا رویا لیکن اس نے روکھا سا جواب دیا کہ میں کیا کروں؟ میں اور انجلینا ہر موقع پر ایک دوسرے سے بہت قریب رہے۔ اسی لیے میں اب کسی الجھن میں مبتلا ہوتا ہوں تو اس سے جاکر مشورہ ضرور کرتا ہوں۔ وہ عظیم ہے۔ اس نے اتنے رفاہی کام کیے ہیں کہ اقوام متحدہ کا ادارہ اس کی عزت کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نے اعلان کیا ہے کہ وہ یوگنڈا میں ایڈز کے مریضوں کے لیے بھی کام کرے گی۔ وہ حقیقی معنوں میں مدر ٹریسا دوم بننا چاہتی ہے۔ اس کے دل میں غریبوں اور مفلسوں کا درد بیٹھ گیا ہے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اسے بام عروج تک پہنچانے میں براڈ پٹ کا پورا ہاتھ ہے۔ اس سے شادی کرنے سے پہلے وہ آسودہ نہیں تھی۔ اب دل جمعی سے وہ فلاحی امور نمٹا رہی ہے، بچے پال رہی ہے اور فلموں میں کام

کر رہی ہے۔ اس کا رویہ اب منفی کے بجائے مثبت ہے۔

☆☆☆

چودہ برس کی عمر میں انجلینا ماڈلنگ بھی کرنے لگی۔ لیکن اس میں اسے بہت محنت کرنا پڑی اس لیے کہ جب بھی کوئی اس کی طرف دیکھتا تھا تو ناگواری سے منہ بنا لیتا تھا کیوں کہ وہ دبلی تھی اور ڈپریشن کی وجہ سے اس کا چہرہ مرجھایا رہتا تھا۔ پبلک اسکول کی تعلیم جاری نہیں رہ سکی۔ اس نے ساتھی طلبہ کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیا۔ پھر اپنے حلیے میں تبدیلی کی اور بالوں کو قرمزی رنگ دے دیا۔

ماڈلنگ میں اس کا دائرہ کار صرف لاس اینجلس تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ نیویارک اور لندن کی اشتہاری فلموں میں بھی کام کرنے لگی تھی۔ ماڈلنگ کے دوران ہی اس نے سیاہ لباس بھی پہنا جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔ لیکن اس سلسلے میں اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی۔ کم از کم ایسا نہیں ہوا کہ میگزین، اشتہاری ایجنسیاں اور روزنامے اسے خاص طور پر اپنے لیے بک کرتے۔ انجلینا نے اکتا کر ماڈلنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی، کیوں کہ ماڈلنگ اسے کچھ نہیں دے رہی تھی۔

انجلینا نے ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا جو ایک گیراج کے اوپر تھا۔ یہ اپارٹمنٹ اس کی ماں کے مکان سے بالکل قریب ہی تھا۔ یوں وہ اپنی ماں سے جدا نہیں ہوئی اور اس کی شفقت اور محبت کے زیر سایہ رہی۔ امریکا میں بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا چاہتے اور اس سلسلے میں اپنے والدین سے کوئی مدد نہیں لینا چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں پر بوجھ بن کر بھی نہیں رہنا چاہتے۔ اپنے اخراجات وہ خود پورے کرتے ہیں چاہے انہیں اخبارات ہی کیوں نہ بیچنا پڑیں۔

اس نے تھیٹر کے بارے میں دوبارہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کا دل ابھی تک اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا اور وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی، لیکن اسے کیا کرنا چاہیے یہ اسے خود معلوم نہیں تھا۔ اب تک وہ مختلف کشتیوں میں قدم رکھ رہی تھی اور اس کی جدوجہد کی کوئی سمت نہیں تھی۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ!

تھیٹر میں تربیت لینے کے دوران ہی اس نے مشاہدے پر زور دیا۔ ہر چیز کو غور سے دیکھنا اور اسے اپنے دماغ میں بٹھانا اس کی عادت ہو گئی تھی۔ جب وہ سات برس کی تھی تو اس نے اپنے باپ جان وائٹ کے ساتھ ایک فلم میں اکٹھا کام کیا تھا ویسے باقاعدہ طور پر اس نے سولہ برس کی عمر سے فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ یہ اس کے کیریئر کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ اس کی طرح اس کا بھائی جیمز بھی اداکار اور ہدایت کار بننا چاہتا تھا اس لیے اس نے طالب علموں کے لیے پانچ فلمیں بنا ڈالیں، جس میں انجلینا نے مختلف کردار ادا کیے۔ یہ 1991ء سے لے کر 1993ء کا دور تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ محض مذاق ہے، نہ تو اسے مکالمہ ادا کرنا آتا ہے اور نہ چہرے کے تاثرات دینا آتے ہیں۔ اس کے لیے اسے تربیت لینا پڑے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ اداکاری مشاہدے سے آتی ہے۔ ہم اپنے گرد و پیش میں چلتے پھرتے لوگوں کو غور سے دیکھیں تو ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تمہیں کسی نابینا کا کردار ادا کرنے کے لیے دیا جائے تو تم اسے محض اندازے سے کرو گی لیکن اگر تم نے کسی نابینا شخص کو دیکھ رکھا ہے تو اس جیسی حرکات کرنا تمہارے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ جن لوگوں کو کوڑھ ہوتا ہے ہم ان کے مسائل سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ کچھ عرصہ ان کے پاس نہ گزاریں اور ان کا مشاہدہ نہ کریں۔ جب کسی کو سرطان ہو جاتا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں اور وہ کیسی کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے، ہمیں اس سے کوئی آگاہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں کسی ایسے شخص کا کردار دے دیا جائے جو سرطان میں مبتلا ہے تو ہم کیمرے کے سامنے کیا کریں گے تاوقتیکہ اس کی زندگی کا بھرپور مشاہدہ نہ کر چکے ہوں۔

مختلف اسٹوڈیوز کے چکر کاٹنے کے بعد اسے ایک فلم مل گئی۔ اس کی پہلی فلم نے باکس آفس پر اچھا بزنس نہیں کیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے ایک برس تک کسی فلم کے لیے آڈیشن نہیں دیا۔ اپنے باپ کے سمجھانے پر اس نے دوسری فلم میں کام کرنا منظور کر لیا۔ یہ 1995ء میں بننے والی "ہیکرز" تھی۔ دوسری فلم نے بھی باکس آفس پر قابل ذکر بزنس نہیں کیا۔ مگر انجلینا کا دل نہیں ٹوٹا تھا اس لیے کہ روزنامہ نیویارک ٹائمز کے ایک رپورٹر نے فلم میں اس کے کردار کی تعریف نہایت اچھے الفاظ میں کی تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ فلم انڈسٹری کے بہت سے ہدایت کار وہ تبصرہ پڑھ کر متاثر ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پے در پے کئی فلمیں مل گئیں۔

اس کی فلمی ترقی کا دور اس وقت شروع ہوا جب اسے

ٹیلی وژن کی دو تین فلموں میں اچھے اور جاندار کردار ملے جن میں 2007ء میں بننے والی دو فلمیں 'فرد وومن' اور 'جارج ویلس' شامل ہیں۔ ان میں سے جارج ویلس پر اسے گولڈن گلوب ایوارڈ ملا۔ جو ناقدین نے اس کی اعلیٰ کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے دیے تھے۔

1995ء میں جب وہ ہیکرز نامی فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہی تھی تو اس کے مقابل برطانوی اداکار جونی لی ملر تھا۔ اوائل عمری کے بعد اب یہ انجلینا کا عنفوان شباب تھا۔ وہ لی ملر کے قریب آتی چلی گئی۔ وہ اسے زندگی کا پہلا رومانس قرار دیتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے اور شوٹنگ کے بعد دور بھی ہو جاتے۔ کئی ماہ تک ان کی ملاقات نہ ہو پاتی۔ جب ان کی دوبارہ ملاقاتیں ہوئیں تو انہوں نے 28 مارچ 1996ء کو شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیوں کہ یہی ایک طریقہ ہے کہ جس سے دوری کو نزدیکی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبارات نے لکھا تھا کہ اس نے ملر سے محض اس لیے شادی کی ہے کہ وہ زندگی میں استحکام چاہتی تھی۔ اپنے باپ کے معاندانہ رویے سے وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو چکی تھی اس لیے شادی کر کے اس کیفیت سے باہر آنا چاہتی تھی۔

جونی ملر برطانوی اداکار ہے جو 1972ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہیکرز نامی فلم میں 1995ء میں کام کیا تھا جس کی بنا پر اسے شہرت حاصل ہو گئی۔ وہ دنیائے فلم میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا، اس لیے اس نے فلم اور تھیٹر کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ پھر اسے ٹیلی وژن کی ایک سیریز مل گئی۔ اس کا چہرہ سنجیدگی کا مرقع ہے، اس لیے اسے ایک بار ڈرامے میں شرلاک ہومز کی حیثیت سے بھی منتخب کیا گیا تھا۔ اسے فلموں میں کام کرنے کے علاوہ ہدایت کاری سے بھی دل چسپی ہے۔ وہ منظرنامہ بھی لکھ سکتا ہے۔

انجلینا سے اس کی شادی کامیاب نہیں ہوئی اور صرف اٹھارہ ماہ تک ان کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد اس نے اداکارہ اور ماڈل مائیکل بکس سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں اس کا بیٹا ہے۔

ملر فٹ بال کلب کا ممبر ہے اور اسے میراتھن دوڑ سے بھی دل چسپی ہے۔

شادی ناکام ہونے کی وجہ پریس یہ بتاتا ہے کہ انجلینا کا سلوک اپنے شوہر کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کے باپ نے ایک بار کہا تھا کہ اس کی بیٹی انجلینا دماغی طور پر صحت مند نہیں ہے۔ ملر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ بچپن میں اس نے ایک بار اپنے رخسار پر چاقو سے زخم بھی لگا لیا تھا جو اس کی دماغی علالت کی دلیل ہے۔

اس کے علاوہ آسکر ایوارڈ کی چوراسویں تقریب میں وہ کرنگ کلا گون پہن کر آئی۔ پھر عین اس وقت جب کہ ایوارڈ تقسیم ہو رہے تھے وہ کئی بار اسٹیج پر آئی اور اس نے اپنی ایک ٹانگ گون سے باہر نکال لی۔ معلوم نہیں اس 'حرکت' کا کیا مقصد تھا؟ فوٹو گرافروں نے دھڑا دھڑ اس کی تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔ اگلے دن کے اخبارات اس کی تصویروں سے بھرے پڑے تھے۔ کیا اس نے یہ حرکت محض تصویریں کھنچوانے کے لیے کی تھی؟ یا اس کا دماغ الٹا چلنے لگا تھا؟

☆☆☆

اپنی شادی کی تقریب میں انجلینا نے ربر کی پتلون اور سفید ٹی شرٹ پہنی جس پر اس نے اپنے خون سے دولہا لی ملر کا نام لکھا تھا۔ دونوں کا رومانس کافی دنوں تک چلا۔ جیسا کہ ہالی ووڈ کا اصول ہے۔ تو نہیں اور سہی۔ اور نہیں اور سہی۔ محبت جب زیادہ ہو جاتی ہے تب بھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ستمبر 1997ء میں علیحدگی اختیار کر لی۔ باقاعدہ طلاق 3 فروری 1999ء میں ہوئی۔ محبت روگ بن جائے تو اس کو چھوڑنا بہتر! وہ بہرحال اب بھی اچھے دوست ہیں۔

انجلینا نے بعد میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ علیحدگی کی کیا وجہ تھی، بہرحال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کم عمر اور ناتجربے کار تھے۔ ورنہ لی ملر کے بارے میں جب بھی کوئی پوچھے گا تو میں یہی کہوں گی کہ وہ ایک اچھا شوہر تھا۔ ہر نوجوان لڑکی کو ایسا شوہر نصیب ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوں۔"

ایک اخباری نمائندے نے اس سے انٹرویو کے دوران میں ملر سے جھٹ منگنی پٹ بیاہ اور اس کے بعد طلاق اس بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "مجھے خود بھی اس شادی اور طلاق پر حیرت ہے۔ اس لیے کہ چند ہی راتیں گزارنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں یکدم تبدیل ہو گئے ہوں۔ پھر چند دن اور گزرے تو ایسا لگا کہ ہم میں کوئی بات سرے سے مشترک ہی نہیں ہے۔ بات انوکھی ضرور ہے، لیکن ناقابل یقین نہیں کہ مرد و زن تیزی سے ایک دوسرے سے قریب آ تو جاتے ہیں، لیکن بعد میں عقدہ کھلتا

ہے کہ ہم جو کچھ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت میں کچھ اور تھا۔"

* * *

ٹوم رائڈر کی شوٹنگ یورپ کے اہم مقامات پر ہوئی۔ جب لندن میں اس کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو انجلینا اور لی ملر ساتھ دیکھے گئے، وہ قہقہے لگاتے، پارکوں میں چہل قدمی کرتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے کینڈل لائٹ ریسٹورانوں میں کھانا کھاتے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ ماضی کا پچھتاوا، اعادۂ عشق یا فسانۂ ماضی کو یاد کرتے ہوئے اپنی شاموں کو رنگین بنانا؟

ہالی ووڈ حیرت، دل چسپی اور اسکینڈلوں کی سرزمین ہے۔ 1996ء میں جب وہ "فوکس فائر" کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی تو ماڈل اداکارہ جینی شیمزو کے ساتھ اس کا دوستانہ ہوگیا۔ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: "میں جینی شیمزو سے اتنی محبت کرنے لگی ہوں کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ اگر میرا شوہر نہ ہوتا تو میں غالباً اس سے شادی کر لیتی۔ (یہ سوچے بغیر کہ وہ بھی میری طرح لڑکی ہے)

جینی ایک جاپانی۔ امریکن نژاد عورت ہے۔ اس نے موٹر میکینک کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا اور اس کے بعد ماڈلنگ کرنے لگی۔ اس کی سب باتیں انوکھی اور حیرت انگیز ہیں۔ وہ ماڈلنگ کے مروجہ اصولوں پر پوری نہ اترنے کے باوجود بہت بڑی ماڈل ہے اور اشتہاری ایجنسیاں ہر وقت اسے فون کرتی رہتی ہیں۔ وہ دراز قامت ہے، نہ اس کی آنکھیں شربتی ہیں اور نہ اس کے جسم پر گوشت ہے۔ وہ دبلی پتلی اور سینک سلائی ہے اور اس کے بازو گودے ہوئے ہیں۔ اس وقت اسے سپر ماڈل کہا جاتا ہے۔ مشہور رقاصہ میڈونا سے بھی اس کے "خفیہ تعلقات" رہ چکے ہیں۔

غالباً انہی باتوں کی بنا پر انجلینا، میڈونا سے نفرت کرتی ہے اور رقابت میں مبتلا ہے۔ وہ دونوں ایوارڈ کی ایک تقریب میں مدعو تھیں۔ صحافی برادری کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک اس تقریب میں شریک نہیں ہوگی۔ قوی قیاس تھا کہ انجلینا اس پروگرام کو ملتوی کردے گی۔ حالانکہ اسے خود بھی ایوارڈ ملنے کی اُمید تھی۔

* * *

ایک فلم "فوکس فائر" میں انجلینا کے اتو کے کردار پر لاس اینجلس ٹائمز نے جان دار تبصرہ لکھا تو لوگوں نے اسے اداکارہ تسلیم کرلیا۔ اس طرح اس نے 1996ء تک تقریباً دس فلموں میں کام کیا۔ تاہم اب تک وہ اوپری سطح کی اداکاراؤں تک نہ پہنچ سکی تھی۔ گویا اس نے ابھی تک خود کو فلم دیکھنے والوں سے تسلیم نہیں کروایا تھا اور جولی نے کوئی تہلکہ نہیں مچایا تھا۔

اس کے بعد آنے والی ایک اور فلم "جیا" میں بھی اس کے رول کی تعریف اخبارات نے کی اور اس کو ایمی ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ انجلینا نے اس فلم میں ایسی عورت کا رول ادا کیا تھا جسے ایڈز ہوجاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ فلم کا کردار اس کی شخصیت کو دیکھ کر لکھا گیا تھا، اس لیے فلم میں کام کرنے کا مزہ آیا۔ اخبارات نے تبصرہ کیا کہ اس نے ایڈز کے کسی مریض کا بغور مشاہدہ کیا ہے، ورنہ اس کے بغیر یہ ناممکن تھا۔ یہ فلم ایچ بی او کی محدود سرمایہ کاری سے ٹیلی وژن کے لیے تیار کی گئی تھی اور ایک سپر ماڈل جیا کرینگی کی زندگی پر بنائی گئی تھی جسے 26 سال کی عمر میں ایڈز ہوگیا تھا۔

انجلینا نے بتایا کہ اس نے شوٹنگ کے دوران ہی لوگوں سے ملاقات کرنی چھوڑ دی تھی اور کردار کو خود پر طاری کرلیا تھا۔ فلم کی ریلیز کے بعد اپنے شوہر ملر سے طلاق لینے کے بعد اس نے اعلان کردیا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی، اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ اس سے بہتر اداکاری نہیں کرسکتی۔

وہ نیویارک چلی گئی اور اس نے یونی ورسٹی میں ہدایت کاری سیکھنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ وہ منظر نامہ لکھنے میں بھی دل چسپی رکھتی تھی۔ یونی ورسٹی سے ایک چھوٹا سا کورس کرنے کے بعد وہ پھر فلم انڈسٹری میں لوٹ آئی، کیونکہ اداکاری اس کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔ اب وہ کیمرے کے سامنے آئے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ فلم میں واپسی کا سال 1998ء تھا۔

اس نے اس سال دو فلموں میں کام کیا۔ دوسری فلم قاتل ڈکری تھی جس میں شون کونری نے اس کے ساتھ کام کیا تھا۔ سان فرانسسکو کرونیکل نے اس کی اداکاری کو پسند کیا اور اس پر مثبت تبصرہ لکھا۔ نیشنل بورڈ آف ریو آف موشن پکچرز نے اسے عمدہ کارکردگی پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بھی دیا۔

1999ء میں بننے والی فلم "دی بون کلکٹر" جو جیفری ڈیور کے کرائم ناول پر بنی تھی، انجلینا نے لیڈی پولیس آفیسر کا رول ادا کیا تھا۔ فلم ایک جنسی منظر سے شروع ہوتی تھی، اس لیے انجلینا نے اس میں کام کرنے سے انکار کردیا تھا مگر ہدایت کار کے سمجھانے پر اس نے فلم نہیں چھوڑی۔ اس فلم

نے دنیا بھر میں 151 ملین ڈالر کا بزنس کیا اور دھوم مچا دی۔ انجلینا نے اپنے رول کے ساتھ انصاف کیا تھا، اس لیے اخبارات نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

فلم ''گرل انٹرپٹڈ'' میں کام کر کے انجلینا نے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد اس نے تیسری بار گولڈن گلوب ایوارڈ جیتا، اس کے علاوہ بہترین معاون اداکارہ کے طور پر اسے اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ فلمی دنیا نے اس کی اداکاری کا لوہا مان لیا تھا اور اب میڈیا نے اسے سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ اس پر مضامین، اس کی تصاویر اور انٹرویوز شائع ہو رہے تھے۔ وہ ہر میگزین کے سر ورق کی زینت بنائی جا رہی تھی۔

2000ء میں اس نے ''گون ان سکسٹی سیکنڈز'' میں نکولس کیج جیسے بڑے اداکار کے ساتھ کام کیا۔ اس کا فلمی کردار اس میں ہلکا تھا مگر اسے شائقین نے پسند کیا۔ اس فلم کا دنیا بھر میں بزنس 237 ملین ڈالر تھا۔ یہ یاد رہ جانے والی جرم و سزا پر مبنی ایک دل چسپ فلم تھی۔ جس میں لڑائی دنگا اور فساد کی بھرمار تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایکشن فلموں کی ہیروئن بنتی جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بھیڑ چال ہے جس سے اس کی اداکاری مجروح ہو سکتی ہے۔ شون کونری کی طرح سے وہ بھی ٹائپ ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے کہا کہ جہاں تک ایکشن کا تعلق ہے تو ہیریسن فورڈ یہی کچھ کر رہا ہے اور بہتر طریقے پر کر رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بھی ایسے کردار ادا کرنے لگوں؟

2001ء سے لے کر 2005ء تک اس نے جن فلموں میں کام کیا انہوں نے اسے بین الاقوامی طور پر دنیا بھر میں روشناس کرا دیا۔ ان میں 'ٹومب رائڈرز' وہ فلم تھی جس نے اسے عالمی شہرت یافتہ ہیروئن کے طور پر اداکاری کے بلند مینارے پر بٹھا دیا۔ اسے سپر اسٹار کہا جانے لگا۔ فلم میں انجلینا نے لارا کروفٹ کا کردار ادا کیا۔ فلم بندی سے پہلے اس نے مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کی۔ انجلینا اس فلم میں کام کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی تھی لیکن دوستوں کے سمجھانے پر اس نے آفر قبول کر لی۔ لارا کروفٹ کا کردار جیمز بانڈ اور انڈیانا جونز کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ ریلیز ہونے پر فلم، تنقید نگاروں کو بالکل پسند نہیں آئی۔ بہرحال پبلک نے اسے سر پہ اٹھا لیا۔ اس فلم نے دنیا بھر میں 257 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ انجلینا کو 'لیڈی ایکشن اسٹارز' کا خطاب دیا گیا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بن چکی تھی۔ ایسے میں تنقید نگاروں کو سنے کی کھانی پڑی۔

فلم ٹومب رائڈرز کی شوٹنگ زیادہ تر کمبوڈیا میں ہوئی تھی۔ انجلینا نے وہاں کی زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا۔ ہر طرف مفلسی، بے چارگی اور فاقہ کشی تھی۔ وہ ان روح فرسا مناظر سے لرزہ براندام ہو گئی۔ یہ اس کی زندگی کا حیرت انگیز موڑ تھا۔ اس نے اقوام متحدہ کے آفس میں جا کر خود کو رجسٹر کرایا اور پھر ان کے نمائندے کی حیثیت سے تقریباً بیس ملکوں کا دورہ کیا۔ وہ عملی طور پر مفلوک الحال لوگوں کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی، کر رہی تھی۔ فلموں سے ہونے والی آمدنی سے وہ ایک تہائی بچا رہی تھی، ایک تہائی عطیے کے طور پر دے رہی تھی اور ایک تہائی سے وہ اپنے اخراجات پورے کر رہی تھی۔

اس نے بتایا کہ جب میں کمبوڈیا میں پہلے ریلیف کیمپ میں گئی تو میں نے اندازاً چار لاکھ افراد کو دیکھا۔ وہ مصائب اور مجبوریوں کا ایک بے کنار سمندر تھا۔ اسی طرح سے میں نے سیرالیون میں لاکھوں افراد کو ہاتھ پاؤں کٹی حالت میں دیکھا۔ (دہشت گردوں نے ان کو اس حالت میں پہنچایا تھا) ان کے قریب یتیم بچے بلک رہے تھے اور ان کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں ان کی حالت زار دیکھ کر رونے لگی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ محض رونے سے کیا حاصل؟ مجھے ان کے دکھ درد کا مداوا کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے عطیات جمع کیے اور کمبوڈیا اور تھائی لینڈ کی حکومت کو ایک سال بعد پچاس لاکھ ڈالر دیے۔

☆☆☆

کسی ساتھی کے بغیر زندگی خشک اور بے مزہ تھی۔ بے کیف اور پھیکی۔ چنانچہ اسے بلی بوب تھورنٹون اچھا لگنے لگا۔ انجلینا نے اسے آنکھوں کے راستے دل میں اتار لیا۔ پھر وہ اس کی زندگی میں مکمل طور پر داخل ہو گیا۔ دو ماہ تک وہ پیار و محبت اور اقرار و پیمان کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے 5 مئی 2000 میں لاس ویگاس میں شادی کر لی۔ ان کی ملاقات 1999ء میں 'پشنگ ٹن' کے سیٹ پہ ہوئی تھی۔ دل چسپ بات یہ کہ بلی بوب اس سے بیس برس بڑا تھا اور انجلینا اس کی پانچویں بیوی تھی۔

ممکن ہے بلی بوب واقعی محبت کرنے والا شخص ہو مگر اس نے جب انجلینا سے اپنے تعلقات کو طشت از بام کیا تو کسی کو اس کی باتیں پسند نہیں آئیں۔

بلی بوب امریکی نژاد ہے۔ وہ ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں بجلی تھی اور نہ واش بیسن۔ 1973ء میں اس نے ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کرلی۔ تعلیم کے علاوہ اس کے مشاغل میں بیس بال کھیلنا شامل تھا۔ اس نے بعد میں یونی ورسٹی میں نفسیات کے شعبے میں داخلہ لیا مگر ایک سال بعد اس نے پڑھائی ترک کر دی۔ 1980ء میں لاس اینجلس چلا گیا۔ وہاں اس نے فلمی اداکار بننے کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ فلموں میں آسانی سے کام نہیں ملتا اس لیے اسے ہوٹل ویٹر بھی بننا پڑا۔ اس کے بعد اس نے ہدایت کاری بھی کی اور منظرنامہ لکھنے میں دل چسپی لی۔ اس کی زندگی مصائب میں بھی گزری۔ جس میں کم کھانا بھی شامل ہے۔ جس کی بنا پر وہ کئی بار بیمار بھی ہوا۔

پہلے اسے فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ملے لیکن پھر بعد میں وہ بڑے کرداروں میں آنے لگا۔ ایک فلم میں اسے آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔ اس نے گائیکی میں بھی حصہ لیا اور اس کا ایک البم فروخت کے لیے مارکیٹ میں آیا۔

ہالی ووڈ کے واک آف فیم میں اس کے نام کا تارہ بھی نصب کیا گیا ہے۔ اس نے پانچ شادیاں کیں اور ان کا انجام طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تین بیویوں سے اس کے چار بچے ہیں۔

انجلینا سے شادی کے ناکام ہونے کے بعد اس نے میک اپ کرنے والی خاتون سے شادی کرلی جس سے اس کی ایک لڑکی ہوئی۔ بلی بوب کا کہنا ہے کہ اب اگر اس کی شادی ناکام ہوئی تو وہ آئندہ شادی نہیں کرے گا۔

انجلینا اور بلی بوب، دونوں کا شادی کرنا اور بیویاں، شوہر تبدیل کرنا میڈیا کو بہت پسند آیا۔ ان کی تصاویر شائع کرنا اور ان کے بارے میں کرارے اور رنگین واقعات شائع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وہ ازدواجی بندھنوں میں بندھ گئے۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کردیا تھا کہ وہ مارچ 2002ء میں کمبوڈیا جا کر ایک بچے کو گود لیں گے۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ تین ماہ بعد انہوں نے علیحدگی کا اعلان کردیا۔ قانونی طور پر ان کی علیحدگی کا اعلان عدالت نے 27 مئی 2003ء کو کیا۔ اس شادی سے انجلینا کو ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اس نے منشیات سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور وہ ایک معزز شخص کی بیوی تھی۔

2001ء میں اس نے اقوام متحدہ کے ادارے میں رفاہی کاموں کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ اس نے اس موقع پر کہا تھا۔ "جب دنیا کے کسی خطے پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے یا وہ مفلسی اور درماندگی کے پاٹوں کے بیچ پسنے لگتا ہے تو ہم بے حس ہوکر اس کی طرف سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ لاکھوں افراد کو ایک وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہے اور وہ مفلسی کی آخری سطح سے نیچے کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ہم ان کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں؟ میں ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں سارے ذی حیثیت لوگوں سے مختلف ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس نکتے پر تو آپ مجھ سے کوئی اختلاف نہیں کریں گے کہ قانون اور انصاف سب کے لیے برابر ہے اور اس کے اثرات نچلی سطح تک پہنچنا چاہئیں۔ زندگی کا بہرحال کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے۔ آخر ہم ایک دوسرے کے کام کیوں نہیں آتے؟ جب ہم کرب و اذیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو دوسروں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کریں۔ اسی طرح سے دوسرے بھی ہم سے یہی توقع رکھتے ہیں۔"

2001ء میں جب وہ کمبوڈیا میں ٹومب رائڈرز کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے پناہ گزین سے رابطہ قائم کیا کہ اسے اس بارے میں معلومات دی جائیں کہ دنیا میں لوگ کہاں کہاں پسماندگی اور لاچاری کا شکار ہیں۔ اقوام متحدہ نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔

فروری 2001ء میں انجلینا نے ان ممالک کا دورہ شروع کیا جو غربت میں ڈوبے ہوئے تھے اور دو وقت کی روٹی کے لیے ہاتھ پھیلانے پر مجبور تھے۔ اس نے اٹھارہ دن سیرالیون اور تنزانیا میں گزارے۔ بعد میں اس نے اپنی روداد المناک سے خوش حال دنیا کے لوگوں کو آگاہ کیا۔ وہ اس وقت رنجیدہ و ملول تھی۔

دو ہفتوں بعد وہ کمبوڈیا گئی اور اسی دوران میں پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے کیمپ میں بھی اس نے وقت گزارا۔ اس نے سفر کے اخراجات خود برداشت کیے، اسٹاف کے لوگوں کے ساتھ عام لوگوں کی طرح اٹھنا بیٹھنا رکھا۔ ان خدمات کی بنا پر اقوام متحدہ نے اسے اپنے جینوا ہیڈ کوارٹر میں 27 اگست 2001ء کو خصوصی نمائندے کا درجہ دیا۔ اب وہ کسی بھی ملک میں اقوام متحدہ کے نمائندے کی حیثیت سے جا سکتی تھی اور رفاہی کام کر سکتی تھی۔ یہ بہرحال ایک بڑا اعزاز تھا۔

اس روز کے بعد سے انجلینا خاص طور پر دنیا بھر میں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں جاتی ہے ان کے دکھ درد بانٹتی اور حتی الوسع ان کی مدد کرتی ہے۔ وہ اب تک تقریباً تیس ملکوں کا دورہ کر چکی ہے۔ ایک اخباری نمائندے نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ اس نے جواب دیا: "میں چاہتی ہوں کہ دنیا کو ایسے لوگوں کا علم ہو جائے۔ یہ ہماری دنیا کے انسان ہیں اور ہمیں ہی ان کے لیے کچھ کرنا ہے۔ ان کی دادرسی کے لیے کوئی مریخ سے تو نہیں آئے گا نا؟ سیرالیون کے دورے کے وقت میں نے ایک ایسا کیمپ بھی دیکھا جہاں نومولود بچے فرش پر پڑے رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس کے بچے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ ان ماؤں کے بچے ہیں جن کی آبرو ریزی حملہ آور فوجیوں نے کی تھی۔ میں پوچھتی ہوں کہ ان بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ ان کی پرورش کون کرے گا۔ میں نے اس سلسلے میں ایک تفصیلی رپورٹ لکھ کر اقوام متحدہ کو دی ہے۔

انسان، انسان کو اسلحے اور بم بارود سے تہس نہس کیے ڈال رہا ہے اور اس کا خیال ہے کہ صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق ہے اور باقی سب کو مر جانا چاہیے لہٰذا وہ حالت جنگ میں رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے ملنے اور ان کا موقف معلوم کرنے کے لیے انجلینا نے کئی دور دراز علاقوں کا دورہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ مارنے والے کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کیوں مار رہا ہے اور مرنے والے کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کس لیے مر رہا ہے۔ ہر طرف مفادات کی جنگ جاری ہے جس میں کوئی ٹھوس موقف نہیں ہے۔

2002ء میں اس کی ریلیز ہونے والی فلم "لائف آر سم تھنگ لائک اٹ" بزنس کے اعتبار سے کمزور رہی لیکن اس کے کردار کو پریس نے سراہا اور یہ کہا کہ اس نے دل لگا کر اپنا رول نبھایا ہے۔ سی این این نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے لیے وہ کردار خاص طور پر لکھا گیا تھا۔

10 مارچ 2002ء میں انجلینا نے پہلا بچہ گود لیا جس کی عمر سات برس تھی اور نام میڈوکس شیوان تھا۔ وہ بچہ یتیم تھا اور اس کے والدین کمپوچیا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک مضافاتی گاؤں میں 5 اگست 2001ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کا پیدائشی نام روتھ وائبل تھا۔ انجلینا نے اسے گود لینے کی درخواست 2001ء میں کی تھی جب وہ ٹوب رائڈر کی شوٹنگ کے دوران میں دوسری بار کمپوچیا گئی تھی۔ اس کی درخواست فوراً قبول نہیں کی گئی اس لیے کہ امریکی حکومت نے کمپوچیا کے بچے گود لینے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ بچوں کو گود لینے کی آڑ میں کوئی خاص قسم کا لین دین ہو رہا ہے۔

جب اس پر سے پابندی ہٹالی گئی تو انجلینا نے بچے کو نمیبیا میں گود لے لیا، جہاں وہ 2003ء میں فلم 'بیانڈ بارڈرز' کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ بلی باب اور انجلینا نے بچے کو مشترکہ گود لینے کے لیے اعلان کیا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ انجلینا نے تنہا اس کی ماں بننے کے لیے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔

2003ء اور 2006ء کے دوران میں امریکا کے صدر مقام پر اس نے کانگریس کے ممبران سے بیس کے قریب ملاقاتیں کیں اور ان کی توجہ اس عالمی مسئلے کی طرف مبذول کرائی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ تیسری دنیا کے بچوں کی خاص طور پر مدد کی جائے، جو اپنے والدین کے انتقال کے بعد یتیم اور بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ وہ جن ممالک میں گئی اور اس نے لوگوں کی فلاح کے لیے جو قدم اٹھائے وہ اس نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیے۔ 2003ء میں جب اس کی فلم 'بیانڈ بارڈرز' ریلیز ہو رہی تھی اور اس کی ڈائری 'میرے سفر' کے نام سے شائع ہوئی۔ 2005ء میں اس نے اپنی ڈائری پر فلم بھی بنائی، جس کا بڑا حصہ مغربی کینیا میں فلمبند کیا گیا تھا۔

2003ء میں اس کی فلم "کریڈل آف لائف" ایک معرکتہ آلارا فلم تھی جس نے اسے دنیا کی مہنگی ترین اداکاراؤں کی صف پر لا کھڑا کیا۔ ساری دنیا میں اس فلم نے 156 ملین ڈالر کا کاروبار کیا۔

2004ء میں اس کی فلم "ٹیکنگ لائف" نے بڑا بزنس نہیں کیا لیکن فلم میں اس کے کردار کو پسندیدگی کی سند ملی۔ اسی سال اس نے "الیگزینڈر دی گریٹ" نامی فلم میں کام کیا اور اولمپیاس کا کردار ادا کیا۔ امریکا میں فلم کا بزنس کامیاب نہیں تھا لیکن باقی دنیا میں اس فلم نے 139 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ اس کے تاریخی کردار کو بھی فلم کے شائقین نے سراہا۔ فلم میں یکساں ایکشن کردار ادا کرتے کرتے یہ ایک نیا موڑ تھا جس سے اس کی اداکاری میں تنوع پیدا ہو گیا۔

فلموں میں کام کرنا ہی اس کی زندگی کا مقصد نہیں تھا، وہ اس کے متوازی رفاہی کاموں میں بھی حصہ لے رہی تھی۔ 2005ء اور 2006ء میں اسے ڈیوس کے مقام پر 'ورلڈ اکنامکس فورم' میں خصوصی مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا

گیا۔ بین الاقوامی تنظیموں کے لیے کام کرنے کے سوا اس نے اپنے طور پر بھی 2003ء میں ایک خیراتی فاؤنڈیشن بنائی جس کا نام میڈوکس جولی فاؤنڈیشن ہے۔ یہ فاؤنڈیشن 2007ء تک فعال رہی۔ یہ فاؤنڈیشن اس لیے قائم کی گئی تھی کہ کپوچیا اور اس کے شمال مشرقی علاقوں میں فلاحی کام کیے جا سکیں۔

دکھی لوگوں کی خدمت کے سلسلے میں اس نے 2004ء میں سوڈان کے نواحی علاقوں کا دورہ کیا۔ 2005ء میں اپنے بوائے فرینڈ براڈ پٹ کے ساتھ کشمیر میں آنے والے زلزلے کے موقع پر گڑھی حبیب اللہ کا دورہ کیا اور خواتین اور بچوں سے ملاقات کی۔ اس زلزلے پر اس نے اپنے شدید دکھ کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو ہر شخص کو گھر بنا کر دوں۔ اس نے ایک بچے کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر آسمان کی سیر بھی کرائی۔ اس کی ممی نیچے کھڑی اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اخبارات نے انجلینا کے اس عمل کو سراہا۔

اس نے انگریزی روزنامہ ڈان کے نمائندے سے کہا کہ زلزلے سے متاثر ہونے والے افراد کے لیے سردی کے موسم سے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے ورنہ ان لوگوں کو شدید مصائب گھیر لیں گے۔ اس علاقے کے دورے کے بعد وہ براڈ پٹ کے ساتھ اسلام آباد گئی اور اس نے صدر پاکستان پرویز مشرف اور وزیراعظم سے بھی ملاقات کی۔

پاکستان سے واپسی پر انجلینا نے اقوام متحدہ کو جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ ایک کروڑ شہری بھوک سے تڑپ رہے ہوں، اس کے لیے وزیراعظم ہاؤس میں شاہی دسترخوان بچھایا گیا۔ وزیراعظم کا خاندان اپنے مخصوص طیارے میں سفر کرکے اس سے ملنے اور تحفے دینے کے لیے آیا۔ یہ رپورٹ ایک ایسا طمانچہ ہے کہ انسان کا خون سفید نہ ہو تو اس کے گالوں کی سرخی پوری قوم کو نظر آئے۔

☆☆☆

6 جولائی 2005ء کو انجلینا نے چھ ماہ کی بچی زاہرہ مارلے کو ادیس ابابا ایتھوپیا میں گود لے لیا۔ زاہرہ اواسا میں 8 جنوری 2005ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اسے گود لیتے وقت اس کے بارے میں خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ بچپن ہی سے ایڈز کی مریضہ ہے مگر بعد میں جب اسے ٹیسٹ کیا گیا تو نتیجہ اس افواہ کے برعکس نکلا۔ انجلینا جب اسے لے کر امریکا آئی تو اسے اسپتال میں داخل کرانا پڑا اس لیے کہ بچی پانی اور غذا کی کمی کا شکار تھی۔ نومبر 2007ء میں اخبارات میں یہ افواہ پھیلنے لگی کہ زاہرہ کی حقیقی ماں اپنی بچی کو واپس لینا چاہتی ہے لیکن جب اس نے اس بات سے انکار کیا تو اخبارات نے چپ سادھ لی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا "میں مطمئن ہوں کہ زاہرہ خوش قسمت ہے کہ اسے انجلینا نے گود لے لیا ہے۔"

انجلینا کی ملاقات اور پھر رومانس برطانوی نژاد اداکار براڈ پٹ سے کیسے ہوا، یہ جاننے کے لیے ہم کچھ پیچھے چلتے

انجلینا کی وہ فلمیں جن میں اس نے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

1.CYBORG2
2.GLASS SHADOW
3.HAKERS
4.FOXFIRE
5.LOVE IS ALL THERE IS
6.GEORGE WALLECE
7.PLAYING GOOD
8.CIA
9.PUSHING TIN
10.PLAYING BY HEART
11.GIRL INTERREPTED
12.BONE KILLER
13.GONE IN SIXTY SECONDS
14.TOMB RIDER
15.THE CRADLE OF LIFE
16.BEYOND BORDERS
17.TAKING LIVES
18.TOMORROW
19.ALEXANDER
20.MR & MRS SMITH
21.THE GOOD SHEPHERD
22.A MIGHTY HEART
23.THE CHANGELING
24.WANTED
25.ATLAS SHRUGGED
26.SALT
27.THE TOURIST

ہیں۔ 2005ء میں ایکشن فلم "مسٹر اینڈ مسز اسمتھ" میں بریڈ پٹ کے ساتھ کام کیا۔ لوگوں کو فلم بہت دل چسپ لگی، اس لیے کہ ہیرو، ہیروئن حقیقی زندگی میں بوائے فرینڈ تھے لیکن فلم میں ایک دوسرے کے مخالف اس لیے ایک دوسرے پر گولیاں برساتے رہے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سیکرٹ ایجنٹ ہیں اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے پر مامور ہیں۔ ساری دنیا میں اس فلم کا بزنس 478 ملین ڈالر تھا۔ 2005ء میں ریلیز ہونے والی فلموں میں یہ فلم بزنس کے اعتبار سے ساتویں نمبر پر رہی۔ یوں اب انجلینا کا طوطی بولنے لگا اور وہ اداکارہ کی حیثیت سے بالائی سطح پر پہنچ گئی۔

فلم انڈسٹری کا تعلق کہیں سے بھی ہو بالی وڈ، ہالی وڈ یا کسی اور ملک سے، اسکینڈل ضرور بنتے ہیں۔ ہالی وڈ ان سب میں بہت آگے ہے۔ گلیمر، دولت کی چکاچوند اور تصویر میں رہنے کا جنون اداکاروں سے سب کچھ کراتا ہے۔ 2005ء کے اوائل میں انجلینا پر ایک بار پھر الزام تراشیاں عائد ہونا شروع ہو گئیں۔ سب اس پر انگلیاں اٹھا رہے اور سیٹیاں بجا رہے تھے۔ پریس سب سے آگے تھا۔ انہوں نے مسالے دار خبریں لگانا شروع کر دیں کہ براڈ پٹ جو برطانوی اداکار ہے اس نے اپنی بیوی جنیفر اینسٹون کو اس لیے طلاق دے دی ہے کہ وہ انجلینا کی اداؤں کا شکار ہو چکا ہے۔ ان کے درمیان کھچڑی پک رہی تھی اور "کچھ کچھ" ہو رہا تھا۔ اخباری نمائندے جب چٹکیاں لینے لگے تو انجلینا صاف مکر گئی مگر جب بات بڑھ گئی اور دونوں ہنستے مسکراتے دیکھے گئے پھر انہیں کسی نے گلے میں بانہیں ڈالے بھی دیکھ لیا تو انجلینا کو اعتراف کرتے بنی "ہاں، ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی ہے۔"

یہ اعتراف اس نے شوٹنگ کے دوران ایک سیٹ پر کیا تھا۔

ولیم براڈلے پٹ 1963ء میں پیدا ہوا تھا... پیدائشی امریکن ہے۔ اداکار کے علاوہ فلمساز بھی ہے۔ اسے چار بار اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا جا چکا ہے۔ اس نے ایک بار گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ لیکن پانچ بار نامزد ہوا۔ میڈیا نے اسے "دنیا کا سب سے پرکشش انسان" کا خطاب دے رکھا ہے۔ وہ اوکلاہاما میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک ٹرک کمپنی کا مالک بھی تھا۔ براڈ پٹ نے ککاپو ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ اسے گولف، پیراکی، ٹینس اور ریسلنگ سے دل چسپی تھی۔ وہ کھیل کے علاوہ اسکول کے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ اسے ابتدا ہی سے موسیقی سے بھی دل چسپی تھی۔ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے یونی ورسٹی آف میسوری میں صحافت میں داخلہ لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ صحافی بنے گا اور اس کے بعد دورانِ تعلیم اپنی ایک اشتہاری کمپنی کھول لے گا۔

تو اس نے بہت سے ڈراموں میں حصہ لیا۔ پھر اچانک بیٹھے بٹھائے نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے فلم اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈگری کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن ڈگری ملنے میں دو دن تھے کہ وہ میسوری سے لاس اینجلس چلا گیا اور اداکاری کی تربیت حاصل کرنے لگا۔ اس کے بعد جب وہ اکیڈمی سے باہر آیا تو اسے فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ملنے لگے۔ اس کے بعد ایک ٹیلی وژن کمپنی نے اسے اپنے ڈرامے میں کاسٹ کر لیا۔ رفتہ رفتہ ہدایت کاروں نے اس میں اداکاری کے جوہر دیکھ کر ہیرو کی حیثیت سے بھی فلموں میں کاسٹ کرنا شروع کر دیا۔ مگر عرصہ تک کام کرنے اور کیمرے کے سامنے آنے کے باوجود اس کی فلمیں نہ تو اچھا بزنس کر رہی تھیں اور نہ ناقدین اس کی تعریف میں قلابے ملا رہے تھے۔ البتہ چند فلمی صحافیوں نے یہ اعتراف ضرور کیا تھا کہ اس میں سیکس اپیل ہے اور وہ خواتین کے لیے کشش کا باعث ہے۔ قسمت کی دیوی کو اس پر رحم آ گیا۔ 1995ء میں بننے والی فلم "سیون" میں اس کی اداکاری کو سراہا گیا اور اس فلم نے ساری دنیا میں 327 ڈالرز کا بزنس کیا۔ بعد میں کئی فلموں میں اس کی اداکاری تبصرہ نگاروں کو پسند نہیں آئی لیکن جب اس کی فلم "ہانگنگ تا کواطرہ" وینس کے عالمی فلمی میلے میں پیش کی گئی تو سب نے اس کی تعریف کی اور اسے "بڑا اداکار" تسلیم کر لیا۔ پھر اسے جولیا رابرٹ جیسی بڑی اداکاراؤں کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ اس کی فلم "اوشنز الیون" نے باکس آفس پر کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس فلم نے ساری دنیا میں 450 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ براڈ پٹ نے لوگوں سے اپنا لوہا منوا لیا۔ اس کے بعد فلم "ٹرائے" بننا شروع ہوئی جس کے لیے اس نے چھ ماہ تک شمشیر زنی کی تربیت حاصل کی۔ یہ فلم ریلیز ہونے پر براڈلے پٹ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دی گئی۔ اس کا بین الاقوامی بزنس 497 ملین ڈالر تھا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مسٹر اینڈ مسز اسمتھ'' میں اس کے مقابل انجلینا جولی ہیروئن تھی۔ اس کی کہانی کسی کو پسند نہیں آئی لیکن اس فلم نے ساری دنیا میں بھاری بزنس کیا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ 2005ء میں انجلینا نے ایک پریس کانفرنس میں کہا ''اگر میں ایک شادی شدہ مرد کی طرف ملتفت ہوں تو یہ کوئی شرم ناک بات نہیں ہے اس لیے کہ میرے باپ نے میری ماں کے ساتھ یہی حرکت کی اور دھوکے بازی کی تھی۔ میں یہ بات کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں اس میدان میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھ پر پتھر وہی پھینکے جو خود صاف ستھرا اور پاکباز ہو۔''

انجلینا جب اس بچی زاہرہ کو گود لینے ایتھوپیا جا رہی تھی تو براڈ لے پٹ اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے بعد میں انکشاف کیا کہ صرف اسی نے نہیں بلکہ براڈ لے پٹ نے مشترکہ طور پر اس بچی کو گود لینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ براڈ لے پٹ کی پبلسٹی سیکریٹری نے ایک بیان جاری کیا کہ براڈ لے پٹ، میڈوکس اور زاہرہ دونوں کو گود لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ انجلینا نے حکومت کو درخواست دی کہ قانونی طور پر گود لینے والی کا نام صرف انجلینا کے بجائے انجلینا براڈ لے پٹ لکھا جائے۔ یہ درخواست 19 جنوری 2006ء کو منظور کر لی گئی۔ اس طرح سے دونوں ہی ان بچوں کے قانونی والدین بن گئے۔

وہ دونوں ساتھ رہائش اختیار کیے ہوئے تھے لیکن انہوں نے اپنے رشتے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بچی کی پیدائش کے سلسلے میں نمیبیا گئے۔ 27 مئی 2006ء کو انجلینا نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام اس نے شیلوہ نووویل تجویز کیا۔ یہ نام اس نے انجیل مقدس سے لیا تھا۔ براڈ لے پٹ نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کی بچی کے پاس نمیبیا کا پاسپورٹ ہوگا۔ انہوں نے بچی کی تصاویر کسی فوٹو گرافر کو اتارنے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ جب میگزین پیپل سے معاہدہ ہو گیا تو انہوں نے چالیس لاکھ ڈالر کے بدلے یہ سودا کیا کہ اس بچی کی تصویر صرف شمالی امریکا کے رسائل اور اخبارات میں شائع کی جائے گی۔ جب کہ میگزین ہیلو' نے اس کی حقوق اشاعت برطانیہ کے لیے ساڑھے تین لاکھ ڈالر میں خریدے۔ یہ ساری رقم افریقا کے خیراتی اداروں میں عطیے کے طور پر جمع کرا دی۔

2006ء میں اس نے ایک اور تنظیم سے اشتراک کیا جس کا نام شیوان چلڈرن سینٹر تھا، جو خاص طور پر بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کی گئی تھی۔ انجلینا تاہم اس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھی، اس لیے اس نے 2007ء میں ڈاکٹر جینی اسپرلنگ کے تعاون سے بچوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی جو جنگ کی ہولناکیوں کے سبب تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہوں۔

اب تک اس نے جتنی فلموں میں کام کیا تھا اس کے تناظر میں تنقید نگاروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ درجۂ اوّل کی ہیروئن ہے۔ اسے اداکاری کرنا آتی ہے۔ چنانچہ اس تبصرے کی روشنی میں اسے ہالی وڈ کے بڑے اداکاروں کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ 2006ء میں اسے ''گڈ شیفرڈ'' میں رابرٹ ڈی نیرو کے مقابل کاسٹ کیا گیا۔ یہ فلم سی آئی اے کی ابتدائی تاریخ سے متعلق تھی۔ اس فلم کی کہانی سی آئی اے کی ایک افسر ایڈورڈ ولسن نے لکھی تھی۔ تنقید نگاروں نے انجلینا کا رول پسند کیا۔ شا گوڑ بین نے لکھا کہ وہ انجلینا دیکھنے والوں کی ہمدردی سمیٹ لے گی۔ فلم میں اس کا کردار حقیقت سے بالکل قریب ہے۔

اب تک اداکاری کرتے ہوئے اس نے کافی وقت گزار لیا تھا، چنانچہ انجلینا نے ہدایت کاری کی طرف توجہ دی اور 2007ء میں ایک دستاویزی فلم ''اے پلیس ان ٹائم'' بنائی، جو اس نے ایک فلمی میلے میں پیش کی۔ فلم پسند کی گئی اور فلم کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ساری دنیا میں اس کی نمائش کی جائے۔ صرف سنیما ہالوں میں نہیں اس کی نمائش اسکولوں میں بھی کی جائے۔

2007ء میں اس نے ''مائٹی ہارٹ'' میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ فلم پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی سے متعلق تھی۔ وال اسٹریٹ جرنل کے رپورٹر ڈینئل پرل نے لکھا کہ انجلینا نے اپنا کردار بہتر طریقے سے نبھایا ہے اور فلم پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ انجلینا کو اس فلم میں گولڈن گلوب ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔

2008ء میں وہ ایک ایکشن پکچر 'وانٹیڈ' کی ہیروئن تھی جو مارک ملر کے ناول پر مبنی تھی۔ فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اس نے ساری دنیا میں 342 ملین ڈالر کا کاروبار کیا۔ اخبارات اس کی تعریف و توصیف سے بھر گئے۔ وہ جدھر سے گزرتی تھی کیمروں کے بلب جھپکنے لگتے تھے۔

2008ء میں بننے والی ایک اینی میٹڈ فلم ''کنگ فو پانڈا'' میں ماسٹر ٹائیگریس کے کردار کے لیے انجلینا نے اپنی آواز ریکارڈ کرائی۔ اس فلم نے ٹیکس ادا کرنے کے بعد

632 ملین ڈالر کا کاروبار کیا تھا۔ اس طرح سے یہ فلم دنیا میں بزنس کے اعتبار سے اس سال ریلیز ہونے والی فلموں میں تیسرے نمبر پر رہی۔ 2008ء میں ہی اس نے کلنٹ ایسٹ ووڈ کے ڈرامے 'چینجلنگ' میں کام کیا۔ اس کی اداکاری بے حد پسند کی گئی اور ناقدین نے اسے سراہا۔ ایک تنقید نگار نے تو یہاں تک لکھا کہ یہ ڈراما ناظرین کے لیے اس طرح ضروری ہے جیسے شام کی چائے!

2009ء میں سناٹا طاری رہا اور وہ تھکن اتارتی رہی۔ 2010ء میں اسے 'سالٹ' نامی فلم میں کاسٹ کیا گیا۔ وہ اس فلم میں سی آئی اے کی سیکرٹ ایجنٹ تھی۔ لیکن اس وقت بھاگ دوڑ اور پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے جب اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ KGB کی ایجنٹ ہے اور ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر کامیاب رہی اور اس نے بین الاقوامی طور 294 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ مجموعی طور پر اس کا کردار ناقدین نے پسند کیا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے توصیفی کالم تحریر کیے۔ 2010ء میں بننے والی فلم 'ٹورسٹ' اس کی دوسری فلم تھی جس میں نہ تو اس کے رول کی تعریف کی گئی اور نہ اس نے باکس آفس پر تسلی بخش کامیابی حاصل کی۔ مجموعی طور پر 'ٹورسٹ' کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ فلم کب ریلیز ہوئی اور کب سینما ہالوں سے اتر گئی، یہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔

2011ء میں اس نے ایک بار پھر ماسٹر ٹائیگریس کی آواز میں اس کردار میں جان ڈال دی۔ فلم کا نام 'کنگ فو پانڈا' حصہ دوم تھا۔ یہ 2011ء کی بزنس کے اعتبار سے چوتھی بڑی فلم تھی۔ بین الاقوامی طور پر اس فلم نے پروڈیوسر کو 666 ملین ڈالر کما کر دیے۔ کنگ فو پانڈا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بچوں کے لیے بنائی جانے والی فلم تھی۔

فروری 2013ء میں اعلان کیا کہ وہ دوسری جنگ عظیم کی کہانی پر فلم بنائے گی۔ کہانی لارا ہیلن برانڈ کی تاریخی کتاب سے اخذ کی گئی ہے۔ فلم کا ہیرو لوئی زیمفرینی ہوگا۔

2007ء میں جب لیبیا کے علاقے چاڈ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی تو اس نے وہاں کا دورہ بھی کیا۔ 2007ء سے 2009ء کے دوران میں جب دوسری بار گلف میں جنگ ہو رہی تھی تو اس نے عراق کا دورہ کیا۔ وہ افغانستان بھی گئی جہاں امریکی استعماریت 2008ء سے 2011ء کے دوران میں اس ملک پر غیظ و غضب ڈھا رہی تھی۔ 2011ء میں جب لیبیا میں انقلاب آیا ہوا تھا تو انجلینا وہاں بھی گئی۔

اسے اقوام متحدہ کے خیر خواہ نمائندے کی حیثیت سے مفلوک الحال خطوں کا دورہ کرتے ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ اقوام متحدہ نے 17 اپریل 2012ء میں اس کا عہدہ بڑھا دیا اور اب وہ خصوصی قاصد کہلاتی ہے۔ وہ ممالک جو حالت کرب میں مبتلا ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے طویل منصوبہ بندی کرنا لازم ہے، جن میں افغانستان اور سومالیہ شامل ہیں، وہ خصوصیت سے دل چسپی لیتی ہے۔ اسے کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اس لیے کہ عام لوگ اس سے واقف ہیں اور اسے اپنا مونس و غم خوار سمجھتے ہیں۔ اب وہ ہر سال واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ رفیوجی ڈے بھی مناتی ہے۔ کسمپرسی میں مبتلا لوگوں کی فلاح کے لیے وہ گاہے گاہے اعلانات کرتی اور پروگرام بھی بناتی ہے۔ اس نے ایک برانچ قائم کی جو ان بچوں کا قانونی طور پر دفاع کرتی تھی جو غیر قانونی طور پر امریکا کی سرحد پار کر کے وہاں سکونت اختیار کر چکے ہوں۔

اپنی ان رفاہی سرگرمیوں کی بنا پر انجلینا ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے اور اسے انسانیت کا پیغامبر سمجھا جانے لگا۔ اس کی خدمات کے صلے میں اسے 2002ء میں چرچ ورلڈ سروس کی تنظیم نے ایوارڈ سے نوازا۔ اسی طرح 2003ء میں اقوام متحدہ کراسپانسرڈ ایسوسی ایشن نے اسے سٹیزن آف دی ورلڈ ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ پہلی بار کسی شہری کو دیا گیا تھا۔

اس کے ان تعمیری کاموں اور پروگراموں کے صلے میں اسے اقوام متحدہ ہی نہیں بلکہ امریکا نے بھی ایوارڈز اور انعامات سے نوازا۔ 2005ء میں اسے گلوبل ہیومینیٹیرین ایوارڈ دیا گیا جو اقوام متحدہ اور امریکا کے اشتراک سے دیا گیا تھا۔ 31 جولائی 2005ء میں شاہ نورودم شہامونی نے کمپوچیا کے لوگوں کے خدمات کے سلسلے میں اسے کمپوچیا کی شہریت پیش کی۔

2011ء میں اقوام متحدہ نے اسے طویل عرصے تک لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے پر ایک سنہری پن سے نوازا۔ اب تک اس اعزاز کا کسی اور کو مستحق نہیں سمجھا گیا ہے۔

براڈ پٹ اور انجلینا نے اب تک اپنے تعلقات کی نوعیت کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ البتہ جنوری 2006ء میں "پیپل" نامی میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے شکم میں ایک بچہ ہے۔ سات برس تک ساتھ رہنے کے بعد انہوں نے اپریل 2012ء میں صرف اپنی

منگنی کا اعلان کیا۔ اسکینڈل پھیلانے والے اخبارات اور میگزینوں نے انہیں 'برنگلینا' (انجلینا اور براڈ پٹ کا مرکب) کا خطاب دے دیا۔ یہ ساری دنیا کے پریس کے لیے ایک انوکھا خطاب تھا۔ ان کی شادی کے بارے میں آئے دن افواہیں اڑتی رہتی ہیں اور پریس یہ جاننے کے لیے بے قرار رہتا ہے کہ وہ شادی کب کریں گے؟ اس بارے میں وہ اپنے قیاسات کی بنا پر مختلف تاریخوں کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔

15 مارچ 2007ء میں انجلینا نے تین سالہ لڑکے میکس تھائین کو گود لے لیا۔ یہ لڑکا یتیموں کی پرورش کرنے والے ایک ادارے سے لیا گیا تھا جس کا آفس ہو چی من سویت نام میں تھا۔ پیدائش کے وقت اس لڑکے کا نام فام قوانگ تھا جو 29 نومبر 2003ء کو پیدا ہوا تھا اور اپنی پیدائش کے بعد ہی یتیم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کے والدین بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

مئی 2008ء میں کانز کے فلمی میلے کے موقع پر انجلینا نے اس کی تصدیق کی کہ وہ جڑواں بچوں کو جنم دینے والی ہے۔ دو ہفتوں بعد اس نے نیس، فرانس کے ایک ساحلی اسپتال میں داخلہ لیا اور 12 جولائی 2008 کو ایک بیٹے اور بیٹی کو جنم دیا۔ ان کی تصاویر کھینچنے کے لیے 'پیپل' اور 'ہیلو' میگزین کو اشاعت کے حقوق ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر میں دیے گئے۔ بعد میں یہ ساری رقم جولی پٹ فاؤنڈیشن میں جمع کرادی گئی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً یسوع مسیح کے بعد دنیا کا قیمتی ترین اور مقدس بچہ ہے!

2010ء میں برطانیہ کے اخبار نے یہ خبر لگا دی کہ براڈ پٹ اور انجلینا اب علیحدگی اختیار کرنے والے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں سنسنی دوڑ گئی اور ان کے چاہنے والوں نے فون کر کے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ انجلینا نے یہ خبر پڑھی تو غصے میں آ گئی اور اس نے کہا کہ خبر میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ لہٰذا اخبار کو چاہیے کہ وہ معافی مانگے اور جرمانہ ادا کرے۔

اخبار نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جرمانہ ادا کرنا تو دور کی بات ہے، اس نے معافی بھی نہیں مانگی۔ چنانچہ انجلینا نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔ تب اخبار کے مالکان نے نہ صرف معافی مانگی بلکہ جرمانہ بھی ادا کیا۔

16 فروری 2013ء کو جب کہ انجلینا کی عمر 37 برس تھی اسے سینے کے سرطان پر قابو پانے کے لیے دونوں پستانوں کو سرجری کے ذریعے نکلوانا پڑا۔ ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اسے سرطان ہونے کے 87 فی صد امکانات تھے جو اب گھٹ کر پانچ فی صد رہ گئے ہیں۔ جب ڈاکٹروں نے اس کی فیملی رپورٹ طلب کی تو معلوم ہوا کہ اس کی اداکارہ ماں مارشلائن 56 برس کی عمر میں رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھی۔ (اس کا انتقال 27 جنوری 2007ء میں ہوا تھا) جب کہ اس کی نانی بھی 45 برس کی عمر میں رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھی۔ اس کی ایک خالہ 61 برس کی عمر میں 2004ء میں موت کی نیند سو چکی تھیں، سبب رحم کا سرطان ہی تھا۔ انجلینا نے سرجری کرا لی تو سرطان ہونے کے امکانات کم ہو گئے۔ البتہ اس کی ماں اور خالہ رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھیں اس لیے جینیاتی طور پر اسے بھی رحم کا سرطان ہونے کے 50 فی صد امکانات تھے!

اس نے اپنے بیان میں کہا "میں نے اس بات کو راز میں نہیں رکھا کہ میں سرطان کا شکار ہو چکی ہوں۔ اس لیے کہ اس ملک میں سیکڑوں ایسی خواتین موجود ہیں جنہیں یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرطان کا شکار ہو سکتی ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں ہوشیار رہنا چاہیے اور گاہے گاہے اپنا جینیاتی ٹیسٹ کرانا چاہیے۔ جب انہیں اس کا علم ہو جائے تو اس کا حتی المقدور علاج کرانا چاہیے۔ یہی کفر ہے۔ ہمیں اس موذی مرض کے خلاف ضرور جنگ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انہیں نیٹ سے بھی مدد لینا چاہیے۔"

موروثی طور پر اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ کہیں اسے بھی رحم کا سرطان نہ ہو جائے، اس لیے کہ اس کی ماں اور نانی بھی اس موذی مرض میں مبتلا رہ چکی تھیں، لہٰذا انجلینا نے اپنا رحم بھی نکلوا دیا۔ اب اس کے ہاں اولاد ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

ٹائم نے اپنے ٹائٹل پر اس کی تصویر اور اندر کے صفحات پر ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں بتایا گیا کہ اس نے جتنے بھی ٹیسٹ کیے وہ اسپاٹ لائٹ میں کرائے تاکہ عام لوگ بھی اس مرض کو پوشیدہ نہ رکھیں اور اس سے آگاہی حاصل کریں۔ لوگوں نے اس کے اس اقدام کو بہت پسند کیا۔

انجلینا کا کہنا ہے کہ جب اس نے اب تک پبلک سے کوئی بات نہیں چھپائی تو اب کیا ہوا ہے؟ اس کو سرطان ہوئے دس برس گزر چکے ہیں۔ اس نے سلسلے میں کسی نمائندے کی خدمات حاصل نہیں کی ہیں۔ اگر کچھ کہنا مقصود

ہوا تو اس نے پریس سے براہ راست کہہ دیا۔ مثال کے طور پر اس نے جتنے بھی عشق لڑائے وہ وحشت انجام کر دیے۔ اپنی دوہری جنسی حرکات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس نے اب تک جو نشہ بازی کی اس بارے میں بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

میڈیا اس کے خدوخال اور جسمانی تناسب کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے اور اسکوائر، شیلی، ہیلو، ہارپر بازار، ایمپائر اور وینٹی فیئر نے اسے دنیا کی حسین ترین خاتون اور سب سے زیادہ جنسی کشش رکھنے والی خاتون قرار دیا۔

پریس زیادہ تر اس کے جسم پر گدے ہوئے نشانات (TATTOOS) کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور اس بارے میں سوالات کرتا رہتا ہے۔ ایک بار انجلینا نے گن کر بتایا کہ اس کے جسم پر چودہ نشانات ہیں۔ ان میں سے ایک تو لاطینی کہاوت ہے، دوسرا ٹینسی ولیم کا قول ہے، اس کے علاوہ ایک شیر کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بیٹے کی پیدائش کا نام اور اپنے منگیتر براڈ لے پٹ کی تصویر ہے۔ بہت سے نشانات کو اس نے لیزر سے ختم کروا دیا ہے، جس میں اس کے دوسرے شوہر بلی باب کا نام شامل ہے۔

اس کے پاس پرائیویٹ پائلٹ کا لائسنس ہے اور ایک انجن کا چھوٹا طیارہ۔ لائسنس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طیارہ اڑا سکتی ہے۔

اس وقت وہ دنیا کی پسندیدہ ترین ہستی ہے۔ جب اس نے 2006ء میں آسکر ایوارڈ حاصل کیا تھا تو اس وقت دنیا کے 1 8 فی صد افراد اس سے واقف ہو چکے تھے۔ 2006ء میں ٹائم میگزین نے 100 سب سے زیادہ بااثر شخصیتوں کی فہرست بنائی تو اس فہرست میں انجلینا جولی کا نام بھی شامل تھا۔ میگزین فوربس کے اعداد و شمار کی رو سے وہ ہالی ووڈ کی 2009ء سے 2011ء کی سب سے زیادہ معاوضہ پانے والی اداکارہ ہے، جب کہ اس کی اوسط آمدنی تین کروڑ ڈالر سالانہ تھی۔

انجلینا کے پسندیدہ گلوکاروں میں میڈونا، ایلوس پریسلے، فرینک سناترا اور رولنگ اسٹون شامل ہیں۔ اس نے نو فلموں کی ہدایت کاری کی ہے۔ جن میں دستاویزی فلموں کی اکثریت ہے۔

وہ ایک بڑی اداکارہ ہے اور اس کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ موبائل فون نہیں رکھتی۔ وہ کلائی پر گھڑی نہیں باندھتی۔ اس کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں ہے۔ اس کا ایک منیجر ضرور ہے لیکن اس نے اپنی پبلسٹی کے لیے کوئی ایجنٹ نہیں رکھا۔ شہرت خود اس کے تعاقب میں رہتی ہے لہٰذا وہ اپنی شہرت کے ڈھول نہیں پیٹنا چاہتی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں پبلک پراپرٹی نہیں ہوں اس لیے ہر وقت مجمع میں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے تنہائی بھی درکار ہے۔

ایک بڑے تنقید نگار کا کہنا ہے کہ آج کل کے زمانے میں ہر شخص انجلینا کی باتیں کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے 1951ء میں لوگ الزبتھ ٹیلر کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ اس کے فن کا عروج ہے کہ لوگوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔ وہ کیا کھاتی ہے، کیا پہنتی ہے اور آج اس نے کیا پہن رکھا ہے؟

اس نے اپنی ماں کے مذہب کے بارے میں بتایا کہ وہ کیتھولک تھی مگر اس نے فادر کے پاس جا کر اعتراف کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ مذہب کیا ہے لیکن اس بارے میں تبلیغی انداز اختیار نہیں کیا۔ اگر کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی تو وہ ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کرتی تھی۔ غالباً اسی لیے اس نے مجھ پر بھی دباؤ نہیں ڈالا کہ میں چرچ جاؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہب ذاتی معاملہ ہے۔ جس کا دل جیسا چاہے کرے، بعد میں خدا تعالیٰ روز قیامت خود اس سے سوال و جواب کرے گا۔

میرا شوہر براڈ لے پٹ پچھلی کرسمس پر کتابوں کا ایک شیلف لے آیا تھا۔ اس میں ہم نے دنیا کے سارے مذہب کی کتابیں سجا دی ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بچوں کو سارے مذاہب کی تعلیم دیں گے۔ وہ چاہیں گے تو ان میں سے ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں یا پھر سارے مذاہب پر چل سکتے ہیں۔ گھر میں ہم سارے مذاہب کی تقریبات مناتے ہیں۔ ہم انہیں چرچ لے جاتے اور دنیا بھر میں ساری مذہبی خانقاہوں میں بھی لے جاتے ہیں۔

میرے بچوں کا خیال ہے کہ جنت کی ہر چیز سفید ہے اور وہ بہت خوب صورت ہے۔ جہنم کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ فلم 'کیسپر' کی طرح ہوگی جہاں ہر طرف بھوت پریت ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا۔

بچوں کے خیالات معلوم نہیں کیا ہوں گے اور وہ کیا بننا چاہتے ہیں لیکن ہم ان کے لیے آرٹ پسند کرتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کوئی نہ کوئی بیٹا پینٹنگز ضرور بنائے۔ بچوں کو ہم اچھے لباس پہناتے ہیں اور سحر انگیز لگتے

سناتے ہیں تاکہ ان کی جمالیاتی حس تازہ رہے۔

2007ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں ریڈرز ڈائجسٹ کے نمائندے نے اس سے پوچھا کہ پچھلی بار جب میں نے تمہارا انٹرویو لیا تھا تو تمہارے ساتھ صرف ایک بیٹا میڈوکس تھا۔ اب تمہارے چار بچے ہیں۔ یہ فیصلہ تم نے کب کیا کہ خاندان خوب بڑا ہونا چاہیے؟

انجلینا نے اس کا جواب یہ دیا کہ براڈلے پٹ حقیقی معنوں میں ایک سلجھا اور معقول آدمی ہے۔ اس کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں کسی اور سیارے میں پہنچ گئی ہوں۔ براڈلے پٹ اور مجھ میں ہم آہنگی ہے۔ ہم عام گھریلو جوڑے کی طرح چاہتے ہیں کہ ہمارے بہت سے بچے ہوں اور ہم انہیں اسکول لے جائیں اور بعد میں ان کے کپڑے واشنگ مشین میں ڈال کر دھوئیں۔ جب ہم ان بچوں کو باتھ روم میں لے جاکر غسل دیتے ہیں تو بہت مزہ آتا ہے۔ پہلے تو نہیں مگر اب یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ ہم سارے بچوں کی بیک وقت خدمت نہیں کرسکتے اس لیے ہم نے 25 آیاؤں کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ یہ بڑی تعداد ہے لیکن بچے ان سے قابو نہیں آتے اس لیے کہ انہیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ بچوں کو ڈانٹیں یا ماریں۔ بچے ہم سے خوش ہیں اس لیے کہ ہم بچوں سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ براڈلے پٹ کی طرف سے سب کو پینٹنگ کرنے کی اجازت ہے مگر کینوس کی بجائے بچے گھر کی دیواروں پر اپنے آرٹ کے نمونے بکھیرتے ہیں۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے ہیں، گھر چڑیا گھر میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک ہفتے بچوں نے اتنا اودھم مچایا کہ دو آیائیں تو گھر چھوڑ کر ہی چلی گئیں۔

چھ بچوں کو پالنا آسان نہیں ہے۔ ہم ان کے اخراجات پر مجموعی طور پر ایک کروڑ ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ جس میں ان کے کپڑے لتے، تعلیم، کھانا پینا، تفریحات اور پرائیویٹ ٹیوشن بھی شامل ہے۔ جب وہ صبح اٹھتے ہیں اور ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو سب کا مطالبہ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ انڈا فرائی چاہیے، جب کہ دوسرے کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اسے آملیٹ بنا کر دیا جائے۔ تیسرا ایک پیسٹری کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ اسے ناشتے میں میٹھا پسند ہے۔

انجلینا اور براڈ پٹ کا بنیادی مکان لاس اینجلس میں ہے۔ جب کہ دوسرا مکان قصبہ برگنول، فرانس میں ہے جو ایک تاریخی تعمیر ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی تعمیر 121 قبل مسیح کی گئی تھی۔ حال ہی میں انہوں نے اٹلی کے علاقے وینٹو میں ایک اور مکان خریدا ہے جس کا رقبہ چار ایکڑ ہے۔

☆☆☆

اس نے ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی جس کا نام ''ان بروکن'' ہے۔ یہ ''ان دی لینڈ آف بلڈ اینڈ ہنی'' کے بعد دوسری فلم ہے جو اس نے اپنے سرمائے سے بنائی ہے اور خود ہی اس کی ہدایت بھی دے رہی ہے۔ 'ان بروکن' کے لیے پہلے شوٹنگ جزیرہ ہوائی میں کرنے کا خیال تھا، لیکن اس کو لوکیشن پسند نہیں آئی اور اب اس نے آسٹریلیا کے کچھ علاقوں کو شوٹنگ کے لیے چنا تھا۔

پہلی فلم میں انجلینا کی ہدایت کاری مبصروں کو بہت پسند آئی تھی۔ انہوں نے تبصرہ کیا تھا کہ جب اداکارہ کی حیثیت سے اس کا کیریئر ختم ہوجائے گا تو وہ ایک اچھی ہدایت کار ثابت ہوگی۔ محبت اور جنگ کے پس منظر میں بنائی جانے والی اس فلم نے اچھا بزنس کیا تھا۔

وہ 'میلفیسنٹ' کی شوٹنگ میں بھی حصہ لے رہی ہے۔ مرکزی کردار انجلینا ہی ادا کر رہی ہے۔ یہ بھی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ ایک فلم ساز 'سالٹ۔2' تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے جس میں وہ ہیروئن کا رول ادا کرے گی۔ براڈلے پٹ نے اس کی ماں پر ایک فلم بنانے کا اعلان کیا ہے جس میں انجلینا جولی اپنی ماں کا کردار ادا کرے گی، جو رحم کے سرطان سے 2007ء میں 56 برس کی عمر میں موت کا شکار ہوئی تھی۔

وہ ہشت پہلو شخصیت کی مالک ہے۔ ڈپریشن کا شکار، خود کو سلم اور فٹ رکھنے کا خبط، دوسروں کا دکھ درد بانٹنے والی اور اس سلسلے میں ہزاروں میل کا سفر کرنے والی، یو این کی نمائندہ، فلاحی کاموں میں پیش پیش، درد مندوں کی مسیحا، نونہالوں کی خدمت گزار، فلموں میں کام کرنا یا ہدایت کاری کرنا اس کا پیشہ ہے جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا سکتی، اس لیے کہ پیشے 'محرک' بن جاتے ہیں۔ انسان بھلے ہی دو وقت کی روٹی نہ کھائے لیکن اپنے مشاغل کو ترک نہیں کرسکتا۔ اسی طرح سے اس کا معاملہ ہے۔ گویا فلم اس کی ضرورت بھی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنا امیج خدمت گزار کی حیثیت سے بنانا چاہتی ہے۔ اس کے پیش نظر ہے کہ لوگ اس کی ساری باتوں کو بھول جائیں اور صرف یہ یاد رکھیں کہ وہ ہمدرد مسیحا دوم ہے۔ غمگساری اور چارہ سازی اس کا وصف ہے۔

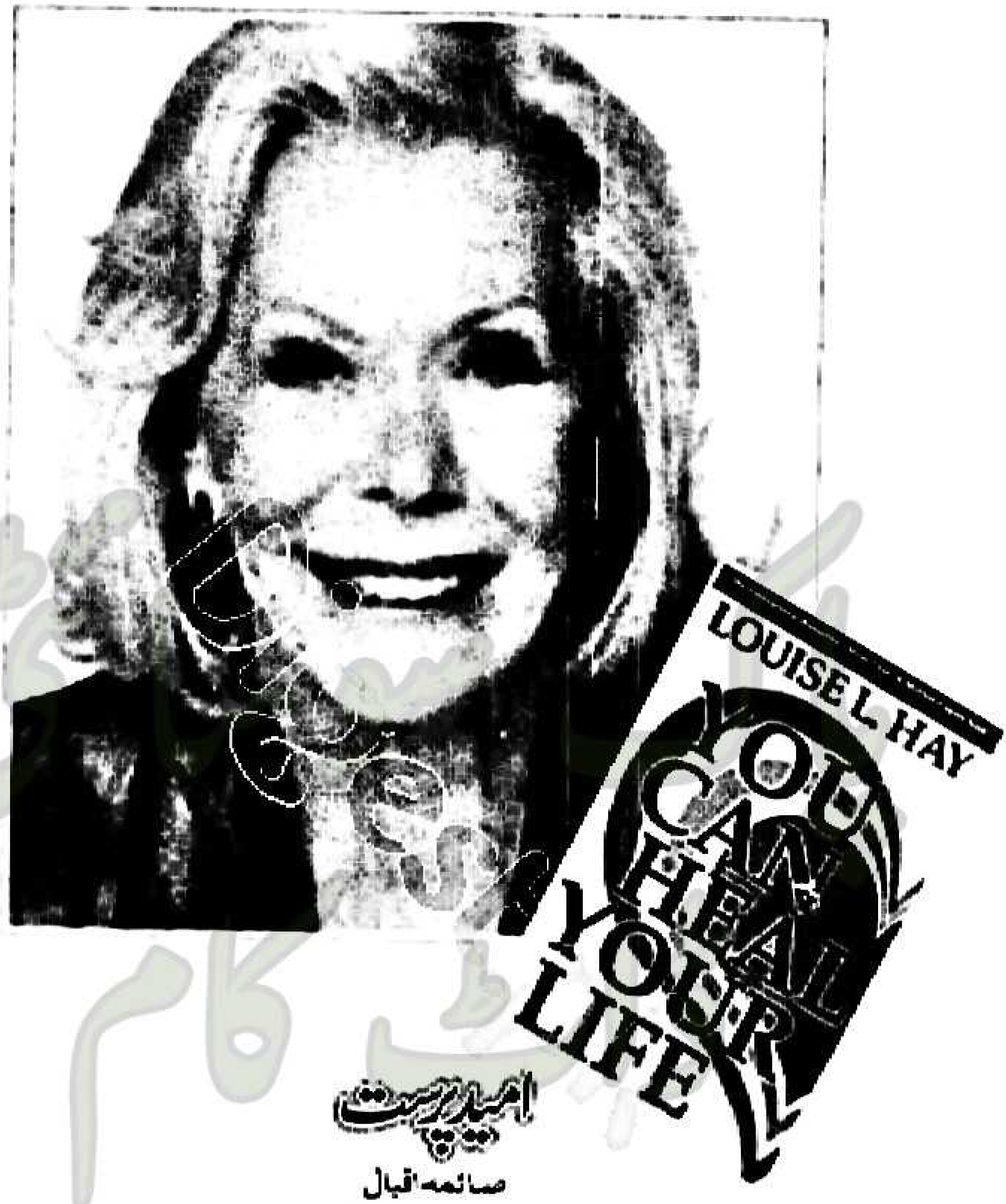
LOUISE L. HAY
YOU CAN HEAL YOUR LIFE

امید پرست

صائمہ اقبال

اس نے عسرت بھری ترستی ہوئی زندگی گزاری تھی۔ مصائب اس کے ہمرکاب تھے۔ غم و آلام نے اس کی شاہراہِ زندگی پہ کانٹے بچھا رکھے تھے مگر وہ حوصلہ مند تھی۔ دکھ درد کے عفریت کو وہ پچھاڑنا جانتی تھی۔ اس نے یہ ثابت کر دکھایا۔ ہر قسم کے مصائب کو چت کرتے ہوئے وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کی مصنفہ کا احوال

جھیل کنارے چیری کے پیڑوں کی قطار تھی۔ درختوں پر گلابی رنگ چھایا ہوا تھا۔ ٹہنیاں جھول رہی تھیں۔ بڑھی سر جھکائے بنچ پر بیٹھی تھی۔ ذہن مصائب میں الجھا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت اُسے ملازمت سے برخاست کیا جا سکتا تھا۔ عرصے سے ہاتھ بھی تنگ تھا۔ صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ سر درد، سینے میں تکلیف، دھڑکن میں تیزی کے عارضے نے گھیر لیا تھا۔ اس کے ازدواجی تعلقات شدید کشیدگی کی زد میں تھے اور ذمے دار وہ خود تھی۔ یہی احساس

ندامت اُسے کھا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ زندگی سے مایوس تھی۔

"آہ۔ کتنا حسین دن ہے۔" اچانک کانوں سے ایک شیریں آواز ٹکرائی۔

وہ چونکی۔ پہلو میں سفید لباس میں ملبوس ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ بال سفید، چہرے پر جھریاں مگر ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ۔

"ذرا دیکھو تو۔" وہ چہکی۔ "جھیل پر بھی پھولوں کا رنگ اتر آیا ہے۔"

"ہاں۔" برٹنی رسمی انداز میں مسکرائی اور دل میں کہا۔ محترمہ خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھیں، پھر پوچھوں گی کہ دن کتنا حسین ہے۔

"پنچھی گیت گا رہے ہیں۔" عورت نے آسمان کی سمت اشارہ کیا۔ "وہ تفکرات سے آزاد ہیں... فقط آج میں زندہ ہیں۔"

"کیوں کہ وہ انسان نہیں۔" جولیا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "مستقبل کی منصوبہ سازی ہی انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔"

"میری پیاری بچی۔" عورت کے لہجے میں شفقت تھی۔ "روشن مستقبل کے لیے لمحہ حال کی زمین میں خوش بختی کا بیج بویا جاتا ہے۔"

جولیا سٹپٹائی۔ یہ الفاظ وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ شاید اپنی دادی سے سنے تھے یا شاید کسی مذہبی کتاب میں پڑھے تھے۔

"مگر میرے لیے تو لمحہ حال پریشانیوں سے پُر ہے۔" اس نے آہ بھری۔

"نہیں میری پیاری۔" اس نے برٹنی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ تو موجودہ لمحے سے مسلسل فرار کا عمل ہے، جو تمہیں دُکھ دے رہا ہے۔ تمہارا جسم تو یہاں ہے مگر ذہن کہیں اور الجھا ہے۔ اگر تم گہرا سانس لو۔ اس پل پر توجہ مرکوز کرو تو یہ گلابی جنت تمہارے سامنے آشکار ہو جائے گی۔"

عورت کا لمس جادوئی تھا۔ برٹنی نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرا سانس لیا۔ فرحت کے احساس نے یہ عمل دہرانے کی تحریک دی۔ دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

ہوا کا لطیف جھونکا چہرے سے ٹکرایا۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ جھیل سے منعکس ہونے والی کرنیں خنک تھیں۔ ایک بگلے نے پر جھٹکے۔ پانی کے قطرے موتیوں کی طرح اس کے پروں سے جھڑے۔ ایک گلابی پھول اس کی گود میں آن گرا۔ اس نے پھول اٹھایا۔ وہ قدرت کا شاہکار تھا۔

"یہ لمحہ... خوبصورت ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ "آپ کا شکریہ۔ آپ نے..."

وہ عورت کی سمت مڑی، مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اب وہ وہاں نہیں ہے۔ وہ جا چکی تھی۔

اچانک برٹنی کے ذہن میں جھماکا ہوا... وہ اس عورت کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ شاید کسی اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ دوڑی دوڑی گھر پہنچی۔ آج کا اخبار سامنے بچھا لیا۔ ایک کونے پر اشتہار تھا:

"زندگی آپ کی منتظر ہے!" عورت کی تصویر کے ساتھ اس کا نام درج تھا۔ "لوئیز ہائے۔" آج ابراہام لنکن ہاؤس میں اس کا سیمینار تھا۔

"لوئیز ہائے۔" اس نے نام دہرایا۔ اب وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ انٹرنیٹ پر عورت کا نام ٹائپ کرتے ہی کئی معلومات کھل گئیں۔

وہ ایک مسیح تھی۔ ایک روحانی راہنما۔ ایک ترغیبی ماہر۔ اس کے ذکر کے ساتھ ایک کتاب You Can Heal Your Life کا بھی تذکرہ تھا۔ برٹنی نے اس کے بارے میں پڑھا تو بھونچکا رہ گئی۔

تبصرہ نگاروں نے کتاب کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا یہ کتاب ان گنت انسانوں کی زندگی بدل چکی ہے مگر ان باتوں نے جولیا کو حیران نہیں کیا۔ حیرت خیز امر یہ تھا کہ اس کتاب کی اب تک چار کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ اور یہ ایک ریکارڈ تھا۔ آج سے قبل کوئی سیلف ہیلپ کتاب اس تعداد میں فروخت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بوڑھی عورت دنیا کی مقبول ترین لکھاری تھی۔

جولیا نے اخبار کی سمت دیکھا۔ لوئیزا کی مسکراتی ہوئی تصویر۔ پہلو میں اُس کا پیغام "زندگی آپ کی منتظر ہے!"

☆☆☆

جونہی وہ اسٹیج پر نمودار ہوئی، ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس شام ابراہام لنکن ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ برٹنی اگلی صف میں تھی۔ پہلو میں ایک ضعیف العمر سیاہ فام عورت بیٹھی تھی۔ زینے پر اُن دونوں کی

ملاقات ہوئی۔ برنی بوڑھی عورت کو سہارا دیے ساتھ لے آئی۔

"خوش آمدید۔" لویزا کی شیریں آواز ہال میں گونجی۔ "میں آپ کی آمد کی شکر گزار ہوں۔"

برنی بہت خوش تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آج کچھ انوکھا ہونے کو ہے۔

لویزا نے لیکچر کا آغاز انتہائی پُراثر الفاظ سے کیا۔

"زندگی بہت سادہ ہے، ہم جو بوتے ہیں، وہی کاٹتے ہیں۔"

اگلے مرحلے میں اس نے زندگی بدل دینے والی سادہ مگر اثر انگیز تکنیکوں کا تذکرہ کیا۔ غصے کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی۔ خود سے محبت کرنے، دشمنوں کو معاف کرنے کا پیغام دیا۔ آئینہ بینی کی مشق کا طریقہ بیان کیا۔ دلائل کے ساتھ مثبت خیالات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ تلخ یادوں کے برے اثرات بیان کیے۔ جوں جوں لیکچر آگے بڑھ رہا تھا، لوگوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سامعین کے چہرے دمک رہے تھے۔ وہ مسرور تھے۔

"میں اب 87 برس کی ہوگئی ہوں۔" لویزا نے کہا۔ "اور میں آج خود کو پہلے سے زیادہ تروتازہ اور خوش محسوس کر رہی ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟" اس نے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ "کیوں کہ میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ ہر نیا دن، میری زندگی کا بہترین دن ہوگا۔ آپ بھی خود سے یہ عہد کرسکتے ہیں۔ یاد رکھیں، ہر ایک خیال ہمارا مستقبل تعمیر کرتا ہے، اس لیے لازم ہے کہ ہم مثبت خیالات کا چناؤ کریں۔ آئیں عہد کریں کہ آج سے آپ خوش رہیں گے۔"

اس نے ہاتھ بلند کرلیے۔ "کیا آپ عہد کرتے ہیں؟"

"ہم عہد کرتے ہیں۔" لوگوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

"اوہ میں شاید بوڑھی ہوگئی ہوں، سن نہیں سکی۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "آپ ذرا ابھار سے کہیں گے۔"

"ہم عہد کرتے ہیں۔" ہال گونج اٹھا۔

"قوت کا مرکز لمحہ موجود ہے۔ ہم اس لمحے میں رہتے ہوئے خود سے محبت کریں گے۔" لویزا نے کہا۔ ہزاروں لوگوں نے ان الفاظ کو دہرایا۔ وہ اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے تھے۔ مسرت ان کی روح میں دوڑ رہی تھی۔

برنی پر لویزا کے جادوئی الفاظ نے گہرا اثر چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں ایک سسکی سنائی دی۔ وہ چونکی۔ بوڑھی سیاہ فام عورت اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ برنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عورت مسکرائی۔

کچھ دیر بعد برنی بک اسٹال پر کھڑی تھی۔ سامنے لویزا کی مشہورِ زمانہ تخلیق You Can Heal Your Life رکھی تھی۔ اس پر 40 ویں ایڈیشن کا ٹیگ مسکرا رہا تھا۔ اس نے انتہائی تجسس کے ساتھ وہ کتاب اٹھائی۔

"اچھی کتاب ہے۔" ایک مانوس آواز کانوں سے ٹکرائی۔ سیاہ فام عورت پہلو میں کھڑی تھی۔ "خرید لو، گھاٹے میں نہیں رہوگی۔"

"تو آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟" برنی نے سوال کیا۔

"ہاں۔ شائع ہونے سے قبل اس کا مسودہ پڑھا تھا۔"

"کیا!" وہ بری طرح چونکی۔ "مگر..."

"لویزا نے میرے ہی اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر یہ کتاب لکھی تھی۔" وہ ہنسی۔ "سمجھ لو کہ ہم دونوں بہنیں ہیں۔ فرق بس رنگت کا ہے۔"

"اوہ تو آپ انہیں تب سے جانتی ہیں؟"

"اس سے بھی پہلے سے پیاری۔" عورت نے گردن ہلائی۔ "اس وقت سے، جب غموں نے میری پیاری لویزا کو گھیر رکھا تھا۔"

"دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ انہیں کبھی غم نے چھوا بھی ہوگا۔" برنی کے لہجے میں تعجب تھا۔

"اوہ... تو تم اس کی کہانی سے واقف نہیں۔" عورت چونکی۔ "تب تو تمہیں یہ سننی چاہیے۔ یہ دلچسپ ہے۔ کیوں ناں ہم باہر لان میں چل کر بیٹھیں۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے برنی نے ایک خاص نوع کا تجسس محسوس کیا۔

☆☆☆

اسے بدقسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

جس رات وہ پیدا ہوئی، چاند کو گرہن لگا۔ اگلے روز لاس اینجلس میں گرد کا طوفان آیا۔ چار روز بعد اس کے باپ کو ملازمت سے برخاست کردیا گیا۔ گھر میں فاقے

رینگنے لگے۔

لوبزا کی پیدائش کے ٹھیک اٹھارہ ماہ بعد اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہوگئی۔ اس کی ماں میسی ایک چھوٹے سے تاریک اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئی۔ اس کا اپنا کوئی نہیں تھا اور ایسے میں اس کے سر پر ایک بچی کی ذمے داری تھی۔

میسی کو ملازمت کی تلاش میں باہر نکلنا پڑا مگر یہ آسان نہیں تھا۔ امریکا دھیرے دھیرے دوسری جنگ عظیم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مالیاتی بحران کی ابتدائی علامات ظاہر ہوگئی تھیں۔

اسے بہ مشکل ایک ریسٹورنٹ میں ویٹرس کی ملازمت ملی۔ تنخواہ معمولی تھی، مگر گزارے کا امکان پیدا ہوگیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ننھی لوبزا کو کس کے پاس چھوڑے۔ اس نے پڑوسیوں سے مدد مانگی۔ تمام لوگوں نے معذرت کرلی۔ وہ پہلے ہی اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ ایسے میں ایک سیاہ فام عورت جینیٹ اس کی مدد کے لیے آگے آئی۔ "تم بے فکر رہو، میں اسے سنبھال لوں گی۔"

ملازمت کا پہلا دن دباؤ سے بھرپور تھا۔ جوں ہی چھٹی ہوئی، وہ بھاگی بھاگی اس عورت کے گھر گئی۔ دروازے ہی پر لوبزا کے رونے کی آواز سن لی۔ عورت نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

"تمہاری بچی تو بہت ہی شریر ہے۔" اس نے کہا۔

"خیر، شریر تو نہیں۔" جینیٹ کی بہو نے منہ بنایا۔ "بس روتی بہت ہے۔"

جب وہ اپنی بچی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہورہی تھی، بوڑھی عورت نے آواز لگائی۔ "میں کل صبح تمہارا انتظار کروں گی۔"

اگلے دن جب وہ ریسٹورنٹ پہنچی، تو پتا چلا کہ آج شام خصوصی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، تمام ملازمین کو اضافی کام کرنا ہوگا۔

پریشان حال ماں رات نو بجے ہی مہربان جینیٹ کے گھر پہنچ سکی۔ لوبزا اس وقت بھی بری طرح رو رہی تھی۔ بچی کو سنبھالنا سیاہ فام گھرانے کے لیے مشکل ثابت ہورہا تھا۔

چند روز تو یہ سلسلہ جاری رہا، مگر تین ہفتے بعد جینیٹ کی بہو نے معذرت کرلی۔ "معاف کرنا، مگر تمہاری بچی روتی بہت ہے۔ میری ساس نے اخلاقاً ذمے داری تو لے لی مگر اس کی وجہ سے میرا۔۔۔ پورا گھرانا مضطرب ہورہا ہے۔"

جینیٹ ایک کونے میں خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔

میسی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اوہ میری بچی۔ مجھے دکھ ہے۔" بوڑھی عورت نے آہ بھری۔

"آپ کو دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔" میسی نے دھیرے سے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔"

☆☆☆

"یہ فیس تو بہت زیادہ ہے۔ کچھ تو رعایت کیجیے۔"

"اس کا تو امکان نہیں۔ آپ کسی اور ڈے کیئر سینٹر کا رخ کریں۔ شکریہ۔" استقبالیہ پر بیٹھی عورت نے منہ بنایا۔

وہ سر جھکائے سینٹر سے باہر آگئی۔ لوبزا گود میں تھی اور اپنی ماں کی پریشانی سے لاتعلق انگوٹھا چوس رہی تھی۔

اس نے کچھ اور سینٹرز سے بھی رابطہ کیا مگر ان کی فیسیں سن کر امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ پھر خوش قسمتی سے بس میں سفر کرتے ہوئے اس کی ایک ایسی عورت سے ملاقات ہوگئی جو اپنے گھر میں ڈے کیئر سینٹر چلاتی تھی۔ اس نے جو فیس بتائی، وہ نہایت مناسب تھی۔

میسی اس کے ساتھ ہولی، مگر جب وہ اس کے گھر پہنچی تو اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ ایک غریب بستی کی تنگ گلی میں واقع چھوٹا سا مکان تھا۔ بچوں کے لیے کوئی علیحدہ کمرا نہیں تھا۔ بس ایک کونے میں چند جھولے، کرسیاں اور کھلونے رکھے تھے۔

عورت نے اس کی آنکھیں پڑھ لیں۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ کوئی اچھا انتظام نہیں، مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہاری بچی کا بھرپور خیال رکھا جائے گا۔"

میسی کا دل تو نہیں مان رہا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس روز وہ دن بھر خاصی بے چین رہی۔ چھٹی کے بعد ریسٹورنٹ سے گولی کی طرح نکلی اور اس بستی میں پہنچ گئی۔

وہاں ایک حیرت اس کی منتظر تھی۔ لوبزا اس عورت کی گود میں کھیل رہی تھی۔

"یہ روئی تو نہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"تھوڑی بہت روئی تھی لیکن پھر کھیل میں لگ گئی۔" عورت مسکرائی۔ "میں نے کافی بنائی ہے، پی کر جانا۔"

* * *

لویزا اب بڑی ہو رہی تھی۔

گو وہ خاصی خوبصورت تھی، مگر ماں کی توجہ سے محرومی کے اثرات اس پر عیاں تھے۔ رنگت زرد۔ جسم نحیف۔ گال پچکے ہوئے۔

میسی کو بھی اس بات کا ادراک تھا، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اگر ملازمت چھوڑ دیتی، تو چند روز میں ماں بیٹی فاقوں سے مر جاتے۔ 1930 کا خطرناک مالیاتی بحران امریکا پر نازل ہو چکا تھا جس نے کاروبار تباہ کر دیا۔ ملازمتوں کا ویسے بھی کال تھا۔

ایسے میں میسی کی ملاقات مشرقی جرمنی کے ایک نوجوان پوڈسکی سے ہوئی۔ وہ کسرتی بدن والا ایک لاابالی نوجوان تھا۔ لڑکیوں کو لبھانا اسے خوب آتا تھا۔ اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے میسی کو محبت کے دام میں پھانس لیا۔ مصائب میں گھری لڑکی اس کی شادی کی پیشکش رد نہیں کر سکی۔ ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ اس طرح اس کی بیٹی کو ایک باپ مل جائے گا۔ پھر مضافات میں لڑکے کا ذاتی اپارٹمنٹ بھی ہے۔ چھت بھی مل جائے گی۔

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک غلط فیصلہ تھا۔ وہ ایک سخت گیر شخص تھا، جس کے مزاج پر خانگی زندگی کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کر سکی۔ لویزا کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جب وہ غصے میں بے قابو ہو جاتا تو چیختا، چلاتا۔ چیزیں توڑ دیتا۔ اپنی بیوی پر تشدد کرتا۔

میسی حاملہ تھی۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ اب وہ کلی طور پر اپنے شوہر کی محتاج تھی۔ نو ماہ بعد وہ ایک اور لڑکی کی ماں بن گئی۔

یہ واقعہ بھی پوڈسکی کو بدل نہیں سکا۔ اس میں احساس ذمے داری پیدا نہیں ہوا۔ خاندان کی کفالت میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

مالیاتی بحران شدت اختیار کر گیا۔ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ مجبوراً میسی کو پھر ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اب اسے اپنی اور اپنی دونوں بیٹیوں کی کفالت کرنی تھی۔ پوڈسکی جو کچھ کماتا، وہ تو شراب اور جوئے میں اڑا دیتا۔

لویزا کے لیے یہ سب بہت ہیبت ناک تھا۔ زندگی بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی مگر اصل سانحہ تو ابھی رونما ہونا تھا۔

* * *

جونہی وہ اس تاریک کمرے میں داخل ہوئی، دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ مڑی۔ ایک عفریت سامنے کھڑا تھا۔ چہرے پر حیوانیت رقصاں تھی۔

سرما کی اس منحوس شام سات سالہ لویزا گھر کے قریب ایک پارک میں کھیل رہی تھی۔ اچانک جیک سامنے آن کھڑا ہوا۔

”کیسی ہو لڑکی۔ میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تمہارے ڈیڈی بلا رہے ہیں؟“ ہونٹوں پر شاطر مسکراہٹ تھی۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر چیچک کے داغ اور بازو پر ٹیٹو تھے۔ وہ ایک موٹر مکینک تھا۔

”ڈیڈی؟“ بچی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں۔ تمہارے گھر والے آج میرے گھر مدعو ہیں۔ کیا انہوں نے تمہیں نہیں بتایا؟“ چہرے پر مصنوعی حیرت تھی۔ ”چائے لگ چکی ہے۔ سب تمہارے ہی منتظر ہیں۔ چلو۔“

معصوم لویزا جیک کے ساتھ ہو لی۔ آگے جو کچھ ہوا، وہ ایک ڈراؤنے خواب کی صورت برس ہا برس اس کا تعاقب کرتا رہا۔

اس درندے نے ۔۔۔ بچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ اس کی روح کو چھید ڈالا۔ ایسا زخم دیا، جو برسوں رستا رہا۔

لویزا گرتی پڑتی گھر پہنچی۔ دروازے پر دستک دینے کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ میسی اسے دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اسے گود میں بھر لیا۔ دوڑی دوڑی ڈاکٹر کے پاس گئی۔

اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ معائنے کے بعد اس نے میسی کو یہ بتا کر حیرت میں مبتلا کر دیا کہ کسی نے اس کی معصوم بچی کی آبرو ریزی کی ہے۔

عورت کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”مگر یہ کس طرح ممکن...“ الفاظ ساتھ نہیں دے سکے۔

”ہمیں پولیس میں رپورٹ کرنے ہوگی۔“ ڈاکٹر نے بات کاٹ دی۔

جب بچی کو ہوش آیا، وہ اسپتال کے بستر پر تھی۔ ماں سرہانے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بستر کے دائیں جانب دو پولیس اہل کار کھڑے تھے۔

پولیس کے سوالات اسے ماضی میں لے گئے۔ اسے وہ اذیت ناک لمحے یاد آ گئے۔ بچی رونے لگی۔ اس نے پورا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔

"جیک... ناممکن۔" پوڈگی بپھر گیا۔ "وہ میرا دوست ہے۔"

"ایسے معاملات میں قریبی رشتے دار ہی ملوث ہوتے ہیں۔" تجربے کار افسر نے کہا۔ "محترمہ کیا آپ کیس درج کروانا چاہیں گی؟"

"ہاں۔ میں اس آدمی کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔" عورت نے سر ہلایا۔

اسی رات جیک کو گرفتار کر لیا گیا۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ یہ جانچنے کے لیے کہ کیا واقعی بچی کی آبرو ریزی ہوئی ہے، اس کا میڈیکل ٹیسٹ ہوا۔ یہ ٹیسٹ لویزا کے لیے ایک انتہائی اذیت ناک عمل تھا۔ اس دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

اس پورے معاملے میں پوڈگی کا کردار خاصا منفی رہا۔ میڈیکل جانچ والے روز گھر لوٹنے کے بعد جب میسی اپنی بچی کو دلاسے دے رہی تھی، وہ وحشی دہاڑا۔ "یہ سب اس کا قصور ہے۔ یہ اس کے ساتھ گئی کیوں؟"

"کیا؟" میسی بوکھلا گئی۔ "ارے... یہ بچی ہے اور وہ درندہ..."

"کوئی بچی نہیں۔ یہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔" الفاظ عورت کے دل پر گھونسے کی طرح لگے۔ لویزا بھی سکتے میں تھی۔

"پوڈگی تمہیں شرم..." عورت نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ آدمی نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

"چپ ہو جاؤ۔ میرے سامنے زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔" وہ چلایا۔ "یہ اس کا قصور ہے۔ اسے ساتھ جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بے شرم۔"

اس رات لاس اینجلس میں طوفانی بارش ہوئی۔ لویزا بستر پر پڑی روتی رہی۔ اس کی روح زخمی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک ڈری ہوئی، اعتماد سے محروم، نالائق لڑکی تھی، جسے کوئی استانی پسند نہیں کرتی تھی۔

پوڈگی تو اسے پڑھانے کے سخت خلاف تھا مگر میسی نے اس کی ایک نہیں سنی۔ متوسط طبقے کے نسبتاً بہتر اسکول میں داخل کروایا مگر اسکول کا ماحول اس کے کچھ کام نہیں آیا۔ وہ اندر سے سہمی ہوئی تھی۔ غربت اور بے چارگی اس کے لباس، چال ڈھال اور اطوار سے عیاں تھی۔ لباس خستہ ہوتا۔ بالوں کا انداز بھونڈا۔ جوتے پھٹے ہوئے۔ دیگر بچے اس سے دور ہی رہتے۔

اسکول سے لوٹنے کے بعد وہ پڑوس میں ایک بوڑھی عورت کا ہاتھ بٹایا کرتی۔ اس کے عوض اُسے ہر ہفتے دس سینٹ ملتے۔ بوڑھی عورت سالگرہ اور کرسمس والے روز اُسے ایک ڈالر دیا کرتی۔ ہفتہ وار ملنے والے دس سینٹ تو گھر کے بجٹ کی نذر ہو جاتے۔ سالگرہ اور کرسمس پر ملنے والے پیسوں سے اس کے کپڑے خرید لیے جاتے۔ اب دو ڈالر میں اچھی پوشاک کہاں آتی ہے۔

جب لویزا چوتھی جماعت میں تھی، اس کے اسکول میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ بہت سے بچے گھروں سے کیک لائے۔ لویزا نے کبھی کیک نہیں چکھا تھا۔ وہ اس کے ذائقے سے ناآشنا تھی۔ ہمیشہ بیکری کے اندر سجے کیک اور پیسٹریوں کو حسرت سے دیکھا کرتی تھی۔

گو دعوت میں خاصا کیک تھا مگر اس کا اندرون پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ آج بھی اس خوش شکل شے کو چکھنے سے محروم رہے گی۔

جب استانی کیک کے ٹکڑے لے آئی، تو بچے طشتری پر جھپٹ پڑے۔ کسی نے دو ٹکڑے اٹھائے، کسی نے تین۔ لویزا قطار میں آخری تھی۔ جب استانی اس تک پہنچی، کیک ختم ہو چکا تھا۔

"اوہ، تم رہ گئیں۔ میں دیکھتی ہوں، شاید اور کیک ہو۔" یہ کہہ کر استانی اندر دوڑی۔ کچھ دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹ آئی۔ "سوری لویزا۔ کیک ختم ہو گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" آنسوؤں سے اس کی آواز رندھ گئی۔

☆☆☆

زندگی کیا تھی، تلخیوں کی زنجیر تھی۔

غربت گھر میں پھنکارنے لگی۔ میسی جو کچھ کماتی، اس سے بہ مشکل گزارہ ہو پاتا۔ لویزا نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ ہر معاملے میں چھوٹی بہن کو ترجیح دی جاتی۔ اس کا بچا ہوا کھانا لڑکی کے سامنے رکھا جاتا۔ اسے اسکول سے بھی اٹھا لیا گیا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کا سوتیلا باپ ایک حیوان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ رات گئے شراب کے نشے میں دھت گھر لوٹتا۔ اس پر تشدد کرتا۔

اس درندے نے لویزا کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو وہ میسی کو طلاق دے ڈالے گا۔ بے چاری نے

لویزا کو اس بری طرح گھیر لیا تھا کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکی۔ چپ چاپ عذاب سہتی رہی، یہاں تک کہ اس کی عمر پندرہ برس ہو گئی۔ اور تب اس کی ہمت جواب دے گئی۔

اس نے روتے ہوئے اپنی دوست جولیا کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ جولیا ایک قابل اعتماد لڑکی تھی۔ لویزا کی آنے والی زندگی میں وہ اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔

جولیا اسے اپنی دادی کے پاس لے گئی۔ یہ وہی عورت تھی، جس نے کئی برس قبل۔۔ کچھ روز کی لویزا کی دیکھ ریکھ کی تھی۔

گو جینٹ خاصی بوڑھی ہو چکی تھی، مگر اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ "تم تو جیسی کی لڑکی ہو۔" اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدایا۔ کتنی بڑی ہو گئیں۔ اس وقت تو تم بہت رویا کرتی تھیں۔ اب تو نہیں روتیں ناں؟"

عورت کی شفقت کسی مرہم کے مانند تھی۔ لویزا نے اسے اپنے کرب سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

جب وہ کہہ چکی تو عورت گویا ہوئی۔ "تمہاری زندگی تلخ ہے میری بچی۔ مگر رونے سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہے۔ یا تو اس زندگی کو قبول کر لو یا اسے تبدیل کرنے کے لیے کچھ کرو۔"

"میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیوں نہیں کر سکتیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "تم جوان ہو۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا اختیار رکھتی ہو۔ بس تھوڑا ہمت کرنی ہوگی۔ باقی سب اوپر والا سنبھال لے گا۔" یہ کہتے ہوئے بڑھیا نے آنکھ ماری۔

لویزا بات سمجھ گئی۔ ایک صبح اس نے بیگ میں کچھ کپڑے ڈالے اور گھر چھوڑ دیا۔ سیدھی جولیا کے گھر چلی آئی۔ کچھ روز وہ جینٹ کے زیر سایہ رہی۔ پھر ایک ہاسٹل میں منتقل ہو گئی۔

اس کی نئی زندگی شروع ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

حالات یکسر تبدیل تو نہیں ہوئے مگر ان میں بہتری ضرور آ گئی۔

لویزا کو ایک ہوٹل میں ویٹریس کی ملازمت مل گئی تھی۔ دن بھر وہاں کام کرتی۔ رات میں ہائی اسکول کے امتحانات کی تیاری کرتی۔ اعتماد کی بحالی میں ابھی خاصا وقت تھا۔ وہ اب بھی ایک ڈری ہوئی، سہمی ہوئی لڑکی تھی۔ کوئی آہٹ ہوتی تو اچھل پڑتی۔ کوئی ڈانٹتا، تو تھر تھر کانپنے لگتی۔ کوئی محبت کے دو بول کہہ دیتا تو اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتی۔

بہت سے بدمعاشوں نے اسے محبت کے دام میں پھنسایا۔ رات بسر کی اور پھر چھوڑ دیا۔ یہ صورت حال تکلیف دہ ضرور تھی مگر ماضی کے برعکس آزادی اور خودمختاری کا ایک احساس تھا۔ مگر یہ احساس اس وقت چکنا چور ہو گیا، جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ ہے۔

لویزا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

یہ جولیا ہی تھی، جو اس موقع پر کام آئی۔ اس نے ایک بے اولاد جوڑا ڈھونڈ نکالا، جو بچہ گود لینے کے لیے تیار تھا۔ وہ بچے کی پیدائش تک لویزا کو اپنے گھر رکھنے پر بھی راضی ہو گئے مگر شرط یہ تھی کہ لویزا بچے کو جنم دینے کے بعد پھر اس سے کبھی نہیں ملے گی۔

یہ ایک کڑی شرط تھی۔ اپنے لخت جگر سے یوں جدا ہونا کوئی ماں کیسے گوارا کر سکتی ہے مگر بچے کے بہتر مستقبل کے لیے لویزا کو اس کرب سے گزرنا تھا۔

اپنی سولہویں سالگرہ سے تین روز قبل اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے پیر اپنی ماں کی طرح بڑے اور چوڑے تھے۔

وہ بہت روئی۔ "آہ، تمہاری بدقسمت ماں تمہیں محبت اور وقت دینے کے قابل نہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔"

بچے کے رخسار پر الوداعی بوسہ دے کر اسے جولیا کے حوالے کر دیا۔

سیاہ فام لڑکی کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ "اس کے اچھے مستقبل کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔"

وہ چار روز اسپتال میں رہی اور اس دوران میں اس نے چند اہم فیصلے کیے۔ اسپتال سے وہ سیدھی اپنی ماں کے پاس پہنچی۔ جیسی نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں میری بچی؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تمہاری جدائی میں مجھ پر کتنے ہی عذاب گزرے۔"

"اب عذابوں کو بھول جاؤ میری پیاری ماں۔" اس نے عورت کے آنسو پونچھے۔ "چلو میرے ساتھ۔ اس جہنم میں رہنے کی اب ضرورت نہیں۔"

"گھر... میرا گھر۔ میرا شوہر۔" عورت متذبذب تھی۔

"کون سا گھر؟ کون سا شوہر؟" اس نے تیزی سے کہا۔ "یہ ایک جہنم ہے۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔"

اس نے اپنی چھوٹی بہن کو مخاطب کیا۔ "تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں۔ میں ڈیڈ کے ساتھ رہوں گی۔" بچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی سمت بڑھی۔ اس اثناء میں نشے میں دھت بوڑھا گھر میں داخل ہوا۔ کچھ دیر تو کچھ سمجھ ہی نہ سکا مگر جیسے ہی صورت حال کا اندازہ ہوا، وہ کف اڑاتا ہوا اس کی سمت بڑھا۔

لویزا منتظر تھی۔ اس نے فرائی پین اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بوڑھا چکرا کر گرا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ اور اپنی ماں کا ہاتھ تھامے باہر نکل گئی۔

اس نے ایک دوست کے ہوٹل میں اپنی ماں کے لیے ملازمت کا انتظام کروا دیا۔ ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے دیا۔ کچھ آزادی اور سکون ملا تو ممی کی بشاشت لوٹ آئی۔ وہ ہنسنے مسکرانے لگی۔ بوڑھی جیسف سے بھی ملنے لگی۔

"بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی لڑکی۔" جیسف چہکی۔ "آج تو جشن ہونا چاہیے۔"

ماں کی ذمے داری سے سبک دوش ہو کر وہ اپنے اگلے سپنے کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس نے سامان سمیٹا، ماں کے رخسار پر بوسہ لیا اور شکاگو روانہ ہو گئی۔

"میں جلد لوٹ آؤں گی۔" جاتے ہوئے اس نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ تین ہفتے۔"

وہ غلط تھی۔ لویزا اس کے 30 برس بعد ہی لاس اینجلس لوٹی۔

☆☆☆

جب اس نے شکاگو میں قدم رکھا، دوسری جنگ عظیم اپنے اختتام کی سمت بڑھ رہی تھی۔

نیا شہر، نئے ولولے، نئی زندگی۔ مگر ماضی اتنی آسانی سے کہاں پیچھا چھوڑتا ہے۔ لویزا نے ایک تلخ زندگی گزاری تھی، جس نے اس میں احساسِ بے چارگی کا بیج بو دیا۔ اعتماد کی کمی تو بچپن سے تھی۔ کم میں گزارہ کرنے کی عادت راسخ۔ گو ڈراؤنے خواب مدھم پڑ گئے تھے، مگر ختم نہیں ہوئے تھے۔ ماضی میں ہونے والے جسمانی و روحانی تشدد کا عفریت کبھی کبھار سرد راتوں میں پھنکارتا، تو وہ ڈر جاتی۔ اکثر بیٹھ کر اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر کڑھا کرتی۔

شکاگو میں وہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتی رہی۔ کچھ اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ ایسے نوجوان بھی ملے، جو اس سے محبت کے دعوے دار تھے۔ چند کے ساتھ معاملہ آگے بھی بڑھا، مگر جلد ہی لویزا کو احساس ہو گیا کہ انھیں فقط اس کے حسن سے سروکار ہے۔ وہ بھی اس کی طرح نفسیاتی طور پر ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ڈراؤنا بچپن گزارا ہے اور ان کے موجودہ رویے ان کے تلخ ماضی کے عکاس ہیں۔

کتابوں سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، مگر پھر چند صفحات پر پھیلا ایک طویل مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ ہٹلر کی موت سے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ اس روز بارش ہو رہی تھی۔ بارش رکنے تک لویزا کو دفتر ہی میں ٹھہرنا پڑا۔ وقت گزاری کے لیے ایک رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس میں ایک معروف مذہبی مبلغ نورمن ونسنٹ پیل کا مضمون چھپا تھا۔

تحریر دلچسپ تھی۔ نورمن نے عام پادریوں کی مانند مذہبی مباحث نہیں چھیڑے، بلکہ زندگی میں بہتری کے لیے مثبت سوچ اپنانے اور خود پر یقین رکھنے کا پیغام دیا تھا۔ مصائب اور بری عادتوں سے نجات کے لیے اس نے دعا کی تکنیک پیش کی۔

اس مضمون نے اس پر گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے مصائب شاید اس کے کرب ناک خیالات کا پرتو ہیں۔ اگر اس نے اپنے خیالات نہیں بدلے، احساسِ ندامت اور خود اذیتی سے جان نہیں چھڑائی تو اس کا اختتام کسی پاگل خانے میں ہوگا۔

لویزا کی زندگی میں دھیرے دھیرے سدھار آنے لگا۔ منفی خیالات کے حامل افراد سے اس نے فاصلہ پیدا کیا۔ روحانیت پسندوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی۔ اور ان ہی میں سے ایک شخص نے اسے شاندار مشورہ دیا۔

وہ نیلی آنکھوں والا ایک پختہ عمر آدمی تھا جو بات بات پر چہکا کرتا۔ لویزا کو دیکھ کر اس نے کہا۔ "لڑکی تم بلا کی حسین

RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہو۔"

"شکریہ۔ میں پہلے بھی یہ سن چکی ہوں۔" اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔ یہ سرد مہری بلا سبب نہیں تھی۔ لوگ اس کی تعریف کرکے اس کا قرب ہی تو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آدمی ذہین تھا۔ اس نے برا نہیں منایا۔ "ممکن ہے کہ تم پہلے بھی یہ سن چکی ہو مگر کسی نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ تمہیں اپنے حسن کو ماڈلنگ کی دنیا میں استعمال کرنا چاہیے۔"

"ماڈلنگ کی دنیا؟" وہ چونکی۔

"ہاں پیاری لڑکی۔" وہ مسکرایا۔ "یہ بے کار کی ملازمتیں چھوڑ دو۔ شکاگو سے رخت سفر باندھو۔ نیویارک تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

کیا لوبزا نے شکاگو کو چھوڑ دیا۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

☆☆☆

وہاں روشنی تھی، رنگ تھے، خوشیاں تھیں۔

لوبزا کیمروں کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس نے پرکشش لباس زیب تن کررکھا تھا۔ چہرے پر روشن مسکراہٹ تھی۔ وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

نیویارک آتے ہی زندگی یکسر بدل گئی۔ پہلے ہی آڈیشن میں اسے منتخب کرلیا گیا۔ اوائل میں نسبتاً چھوٹے برانڈز کے لیے ماڈلنگ کی، مگر جوہریوں نے جلد اس ہیرے کو پہچان لیا۔

کچھ روز بعد وہ کیمرے کے سامنے کھڑی لوگوں کو ایک مشہور شیمپو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ تیسری بار وہ ایک کاسمیٹک کمپنی کے اشتہار میں نظر آئی۔ پھر تو ایک سلسلہ سا چل نکلا۔ اس نے کئی بڑے برانڈز کے لیے ماڈلنگ کی۔ اخبارات میں اس کی تصاویر نظر آنے لگیں۔ بل بورڈز پر اس کی مسکراہٹ جلوے بکھیرنے لگے۔

ماڈلنگ کے عوض اسے ٹھیک ٹھاک پیسے ملے۔ اس نے اپنی ماں اور جولیا کے نام کئی تحائف روانہ کیے۔ زندگی اچھی ڈگر پر آگئی تھی مگر اب بھی کسی چیز کی کمی تھی۔ کبھی کبھار وہ اداس ہوجاتی۔ تلخ یادیں لوٹ آتیں۔ یادیں زنجیر کے مانند ہوتی ہیں۔ ایک منحوس یاد... دوسرے کریہہ منظر کو جنم دیتی ہیں۔ دوسرے منظر سے تیسری چیخ جنم لیتی اور اس پر ڈپریشن طاری ہوجاتا۔

اپنی قوت ارادی کے ذریعے وہ خود کو سنبھال لیتی مگر کئی روز تک خاموش رہنے کے بعد ایک روز پھر... یاسیت لوٹ آتی۔

ان ہی دنوں اس کی ملاقات ایک انگریز بزنس مین اینڈریو ہائے سے ہوئی۔ وہ ایک بااخلاق اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اس سے مل کر لوبزا نے خود سے کہا اصل تہذیب تو انگریزوں میں ہے، ہم تو بالکل ہی اجڈ اور گنوار ہیں۔

ملاقاتوں میں جلد ہی تسلسل آگیا۔ 1954 میں اینڈریو نے اُسے شادی کی پیشکش کردی۔ اس نے اتنے اچھے ڈھب پر ہیرے کی انگوٹھی پیش کی کہ لڑکی ششدر رہ گئی۔

شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں شادی کی تقریب کا انتظام کیا گیا۔ ملک کی نامور سیاسی، سماجی اور فلمی ہستیوں نے اس میں شرکت کی۔ جولیا اور اس کی ماں بھی لاس اینجلس سے تقریب میں شرکت کرنے آگئیں۔ جوڑے کو بے شمار تحائف سے نوازا گیا۔

وہ ایک یادگار ایونٹ تھا۔ اگلے کئی روز تک میڈیا میں اس کا چرچا رہا۔ شادی کے بعد دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ نیویارک کی تمام جانی مانی ہستیوں نے اس نئے نویلے جوڑے کو مدعو کیا۔ اعزاز میں کئی تقریبات ہوئیں۔

ان تقریبات میں شرکت ایک حیران کن تجربہ رہا۔ میزبان اتنی محبت سے پیش آتے کہ وہ نہال ہوجاتی۔ مگر کبھی کبھی دل میں احساس کمتری کا ناگ سر اٹھاتا۔ وہ اس طبقے کے آداب نہیں جانتی تھی۔ ان کی طرح دنیا بھر کے موضوعات پر بے لاگ تبصرہ نہیں کرسکتی تھی۔ سیاست کا علم نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو ایک عام سی لڑکی تھی، جس نے تلخ بچپن گزارا، جو مصائب کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کرسکی، جسے شدید روحانی اور جسمانی تشدد برداشت کرنا پڑا تھا۔

احساس کمتری اسے اداسی میں دھکیل دیتی۔ بھیڑ میں بھی وہ تنہا ہوجاتی۔ ذہین اینڈریو کو اس بات کا ادراک تھا، وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا مگر برسوں کے زخم چند ماہ میں تو مندمل نہیں ہوتے۔

ایک دن... ایک انوکھا بلاوا موصول ہوا۔ انہیں وائٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا تھا۔ ڈنر والے روز ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ صدر امریکا سے ملاقات یادگار رہی۔ خاتون اوّل اتنی سادہ مزاج اور شفیق تھیں کہ لوبزا کو کسی نوع کی دقت پیش نہیں آئی۔ اس دعوت کے بعد اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

"صدر صاحب تو شان دار آدمی ہیں۔" واپسی میں

اس نے شوہر سے کہا۔

"بالکل، جب ہی تم لوگوں نے انھیں ووٹ دیا۔" اینڈریو نے کہا۔ "ہم انگریز تو بس ملک کے وفادار ہیں۔"

گاڑی میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

☆☆☆

وقت کو جیسے پر لگ گئے۔ موسم بدلے۔ ماہ و سال بیتتے رہے۔

زندگی اپنی ڈگر پر آگئی تھی۔ کچھ برس بعد لوئیزا نے ماڈلنگ کی دنیا چھوڑ دی۔ اب وہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ غم مٹ گئے، مصائب اُسے بھول گئے ہیں، خوشی دائمی ہے۔ مگر وہ غلط تھی۔ ایک بھیانک موڑ آنے والا تھا۔

شادی کے چودہ برس بعد، جب وہ یقین کر بیٹھی تھی کہ ہر شے درست سمت پر جارہی ہے، اس کے شوہر نے ایک کرب ناک انکشاف کیا۔ "میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ بھونچکا رہ گئی — ان گنگ ہوگئی۔

"مجھے تمھیں چھوڑنا پڑے گا۔ آئی ایم سوری۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور لوئیزا کو لگا کہ خوشی چلی گئی۔ مسرت کھو گئی۔

وقت تھم گیا۔

اس رات طوفان آیا۔ غموں کا طوفان۔ ماضی کے زخم پھر رسنے لگے۔ بھیانک خواب لوٹ آئے۔ آسیب چنگھاڑنے لگے۔

اینڈریو دو ماہ کے لیے یورپ کے دورے پر گیا تھا۔ بس اس کے لوٹنے کی دیر تھی، لوئیزا ہر سہولت سے محروم ہوجاتی۔ پُرآسائش زندگی چھن جاتی۔ سپنا ٹوٹ جاتا۔

کیا وہ پھر سے شوبز کی دنیا میں لوٹ سکتی تھی؟ نہیں۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اُس کا حسن ماند پڑ رہا تھا۔

"مجھ سے کہاں غلطی ہوئی؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ "کیا میں اینڈریو کی محبت کا جواب نہیں دے سکی؟ کیا میں نے اس کا خیال نہیں رکھا؟ میری زندگی کب تک مصائب جھیلتی رہے گی؟"

وہ رو پڑی۔ صدمے سے دل کی دھڑکن رک گئی۔

پت جھڑ شروع ہوچکا تھا۔ درختوں کی شاخیں ویران ہوگئیں۔ ہر سو اداسی تھی۔ ایسے میں لوئیزا کی زندگی میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔

طاہر جاوید مغل
کے رومان انگیز سحر آفریں قلم کا نیا شاہکار
ستاروں پر کمند
چاہتوں کو در و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں...... روزنوں کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے انہیں دہانہ بنا دیتے ہیں
حسن و عشق اور رقابت و رفاقت کی چاشنی لیے ایک دل ربا داستان
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
کے صفحات پر شمارہ جولائی 2014 سے ملاحظہ فرمائیں

نیویارک سٹی کی 48 اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے اس کی نظر قدیم طرز کی ایک عمارت پر پڑی۔ دروازے پر Church of Religious Science لکھا تھا۔ لویزا مذہبی عورت نہیں تھی، مگر اس وقت وہ اس قدر مغموم تھی کہ کسی سہارے کی تلاش اُسے عمارت کے اندر لے گئی۔ وہاں حیرت اس کی منتظر تھی۔

وہ کوئی گرجا نہیں تھا۔ مذہبی پیغامات کی بجائے وہاں سائنسی اصول زیر بحث تھے۔ فکری پیرائے میں بات ہو رہی تھی۔ پادری کی جگہ دوستانہ مزاج کے حامل اساتذہ تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر شادابی تھی۔ ہر کوئی مسرور تھا۔

لویزا کے اندرون نے کہا۔ ”ذرا توجہ دو۔ یہاں کچھ انوکھا رونما ہونے کو ہے۔“

اور پھر ایسا ہوا۔ ایک پیغام اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ ”فقط اپنے خیالات تبدیل کرکے انسان اپنی زندگی بدل سکتا ہے۔“

”کیا یہ ممکن ہے؟“ وہ چونکی۔ ایک گہرا سانس لیا۔ توجہ مبلغ پر مرکوز کی جو کسی کالج کا پروفیسر معلوم ہوتا تھا۔

”ہمارے نظریات اشیاء کے مانند ٹھوس ہوتے ہیں، وہ نہ صرف ہمارے جسم بلکہ ہمارے ماحول، ہمارے اردگرد بسنے والوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔“

یہ الفاظ سن کر وہ ٹھٹکی۔ پہلی بار ان خیالات سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ ذہن میں لورین ونسٹ شیل کا مضمون گھوم رہا تھا۔

لیکچر کے اختتام پر وہ خود کو نسبتاً بہتر محسوس کر رہی تھی۔ وہاں موجود لوگوں سے بات کرکے اُسے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ New Thought تحریک کے پیروکار تھے۔ 19 ویں صدی میں شروع ہونے والی اس تحریک میں مذہب کے روحانی عناصر کو نفسیاتی، سائنسی اور فلسفیانہ اصولوں میں گوندھ کر پیش کیا گیا تھا۔ معروف فلسفی فینکس کمبی نے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ولیم جیمز اور ایمرسن کی تحقیقات نے اسے آگے بڑھایا تھا۔

تحریک کا بنیادی فلسفہ کچھ یوں تھا: ”لامتناہی آفاقی قوت کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ روح حقیقی اشیاء کے مانند ہے۔ خیالات روح سے جنم لیتے ہیں، جو ہماری دنیا میں واقعات کی صورت ٹھوس شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مثبت اور نیک خیالات نہ صرف جسمانی اور نفسیاتی امراض کا علاج کرسکتے ہیں، بلکہ پوری دنیا کو محبت سے بھر سکتے ہیں۔“

یہ تحریک پھیلتی گئی۔ لاکھوں لوگ اس سے وابستہ ہوگئے۔ مختلف ممالک میں اس کے چرچ کھلنے لگے۔ اور بہت ہجر کی اس شام لویزا ایسے ہی ایک چرچ میں موجود تھی جس کے پیروکار فلورنس سکوول اور ارنیسٹ ہومز کے افکار سے استفادہ کر رہے تھے۔ فلورنس کا نظریہ تھا کہ پختہ خیالات انسانوں کی زندگی میں حقیقی واقعات کو جنم دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف Religious Science نامی مکتبۂ فکر کی داغ بیل ڈالنے والے ارنیسٹ کو یقین تھا کہ پاکیزہ خیالات امراض کا علاج کرسکتے ہیں، زخم بھر سکتے ہیں۔

لویزا کے لیے یہ نظریات جتنے انوکھے تھے، اتنے ہی دلچسپ۔ وہ باقاعدگی سے ان اجتماعات میں شرکت کرنے لگی۔ وہ اچھی شاگرد ثابت ہوئی۔ ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تین ہفتے بعد اس کی حالت خاصی سنبھل چکی تھی۔

جلد ہی وہ یہ سمجھ گئی کہ اس کے مصائب کا ذمے دار کوئی اور نہیں، وہ خود ہے۔ وہ اپنے تلخ تجربات سے دامن چھڑانے کی بجائے انھیں سینت سینت کر رکھتی رہی۔ ان کی پرورش کرتی رہی۔ ساز گار ماحول میں ان منحوس یادوں نے انڈے دیے، جس سے مزید مصائب نے جنم لیا۔

وہ عمارت اس کا نیا گھر بن گیا۔ زیادہ وقت وہیں گزرتا۔ جب اینڈریو نے یورپ سے لوٹ کر اسے طلاق دی، وہ ذرا نہیں روئی، بلکہ کھڑی مسکراتی رہی۔ جب اپنے سابق شوہر کو مغموم پایا، تو آگے بڑھ کر اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

”میں تمہاری شکرگزار ہوں اینڈریو۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ آج ہم جدا ہو رہے ہیں تو میں تمھیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

اینڈریو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ لویزا بالکل نئی تھی۔ آج سے قبل تو وہ اعتماد سے محروم ایک گھبرائی ہوئی عورت ہوا کرتی تھی۔

لویزا نے بات جاری رکھی۔ ”تم ایک نئی زندگی شروع کرنے والے ہو، اس میں ماضی کی پرچھائیں نہیں ہونی چاہیے۔ اسے محبت سے بھرنا۔ غموں سے دور رہنا۔ آج سے ہم اچھے دوست ہیں اینڈریو۔ اچھا الوداع۔“

یہ کہہ کر وہ اس پُرآسائش محل سے نکل گئی۔ تحیر زدہ اینڈریو اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

لویزا ہے کی نئی زندگی کا آغاز ہونے کو تھا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ عام سا بستر۔ سادہ سی میز۔ الماری میں چند ہی کپڑے مگر لویزا خوش تھی۔ شاہانہ زندگی چھوڑنے کا ذرہ برابر دکھ نہیں تھا۔

وہ تحریک کی سرگرم کارکن بن چکی تھی۔ اس نے دیگر طالب علموں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ فقط تین سال بعد اس نے اُن کے افکار کی مبلغ بننے کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس کا باقاعدہ ٹیسٹ ہوا۔ انٹرویوز ہوئے، جن میں وہ سرخرو ٹھہری۔ اب وہ چرچ کی کونسلر تھی۔

یہ ایک نیا سفر تھا۔ ایک نیا آغاز۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی، سو ریاست آئیووا کی ایک یونیورسٹی کا حصہ بن گئی۔ وسائل محدود تھے، جن کے پیشِ نظر اس نے اپنی ضروریات کو سکیڑ لیا۔ جو کچھ میسر تھا، اس پر قناعت کرنا سیکھ لیا۔ جابجا گھومنا ترک کر دیا۔

یونیورسٹی کا تجربہ یادگار رہا۔ وہاں ہر سو پُرسکون خاموشی تھی۔ مراقبے اور غور و فکر کے لیے بہت وقت میسر تھا۔ شراب نوشی، دعوتوں اور رقص کی محافل جیسی خرافات سے جان چھوٹ گئی۔

وہ روحانی افکار سے پُر تھی۔ کیمیا، طبیعیات اور حیاتیات جیسے مضامین الوہی انکشافات کر رہے تھے۔ روحانی تجربات کے وسیلے قانون کشش اس پر نئے معنی آشکار کر رہا تھا۔

آئیووا میں حاصل ہونے والا روحانی تجربہ نیویارک لوٹنے کے بعد بھی قائم رہا۔ ٹریفک کا بے پناہ شور، بھانت بھانت کی بولیاں اور ساحلی گہماگہمی اس سکون کو توڑ نہیں سکیں۔

وہ ماضی والی لویزا نہیں تھی، جو لوگوں کے سامنے بات کرتے ہوئے گھبرا جاتی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے کونسلنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیگر افراد کے برعکس وہ بولنے سے زیادہ سننے پر یقین رکھتی تھی۔ مریض اس کے سامنے خود کو آرام دہ محسوس کرتے۔ اس کے مشورے ان پر مثبت اثرات مرتب کرتے۔

اب اس نے عوامی اجتماعات میں لیکچر دینے شروع کیے۔ اس کا شیریں انداز، سلجھا ہوا بیان لوگوں کو بہت بھلا لگتا۔

کچھ عرصے بعد اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔
وہ کرسمس کی شام تھی۔ لویزا کھڑکی میں کھڑی تھی۔ باہر برف گر رہی تھی۔ اچانک ایک جھماکا ہوا۔ ایک خیال ذہن میں کوندا۔ وہ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ ڈائری کے سفید ورق پر سیاہ الفاظ ابھرنے لگے۔ اس نے لکھا:

”کئی افراد کامیاب طبی علاج کے باوجود یاسیت کا شکار رہتے ہیں۔ صحت یاب ہونے کے باوجود بیماروں جیسے حالات بنائے رکھتے ہیں۔ نتیجتاً طبی علاج بے اثر ثابت ہوتا۔ کبھی کبھار تو مرض لوٹ آتا ہے اور ان کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔“

لویزا کو پہلی بار اس کا بات کا احساس ایک ایسی عورت سے مل کر ہوا تھا جو چہرے کی پلاسٹک سرجری سے گزری تھی۔

بچپن میں ہونے والے خوفناک حادثے میں میری اپنے حسین چہرے سے محروم ہو گئی تھی۔ برسوں وہ احساسِ کمتری کا شکار رہی۔ وہ تنہا اور اداس رہتی تھی۔ پھر وہ پلاسٹک سرجری سے گزری۔ اس کا چہرہ اسے واپس مل گیا مگر حیرت انگیز طور پر یاسیت کے آسیب سے جان نہیں چھوٹی۔ احساسِ کمتری کا مرض اب بھی ساتھ تھا۔

اس عورت سے ہونے والی طویل گفتگو کے بعد ہی لویزا کو ادراک ہوا کہ اگر بیماری کا نفسیاتی اور روحانی علاج نہ کیا جائے تو طبی علاج دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔ پھر اس کا سامنا ایک نوجوان سے ہوا، جو کینسر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا آپریشن ہوا، ناسور نکال دیا گیا مگر وہ ہنوز خود کو بیمار محسوس کرتا۔ ایسی اور بھی مثالیں تھیں۔

بہت غور و فکر کے بعد لویزا نے اس نفسیاتی کیفیت کو (انگریزی میں برتے جانے والے لفظ Disease کے وزن پر) "Dis-ease" کا نام دیا۔ یعنی ایسی کیفیت جس میں انسان خود کو بے آرام محسوس کرتا ہے۔

دھیرے دھیرے اس کے مفروضے کی تصدیق ہونے لگی۔ مریضوں کے ذہنی علاج پر توجہ مرکوز کی۔ انھیں احساسِ کمتری اور احساسِ ندامت سے نجات حاصل کرنے اور خود سے محبت کرنے کا پیغام دیا۔ ان ہی مریضوں کے علاج کے دوران میں اس پر آئینہ بینی کی اہمیت آشکار ہوئی۔ مثبت الفاظ مسلسل دہرانے کے عمل کے جادوئی اثرات کا اندازہ ہوا۔

لگ بھگ دو برس وہ مریضوں پر اپنی تکنیک استعمال کرتی رہی۔ نتائج حیران کن رہے۔ اس کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ شفا کی تلاش میں اس کے پاس آنے لگے۔

ان ہی دنوں بے چارگی کے مرض سے نجات حاصل کرنے والے ٹیری نے اسے ایک مشورہ دیا۔

"لوئیزا! تمہارے الفاظ میں شفا ہے۔ خدا نے تمہیں ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے مگر یہ محدود ہے۔ ہر کوئی تم تک نہیں پہنچ پاتا، اسے عام کرنا چاہیے۔ کیوں ناں تم ایک کتاب لکھو۔"

"کتاب۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اور ایک منصوبہ نمو پانے لگا۔

اگلے تین ہفتے اس نے اپنے مریضوں کی کیس ہسٹری کے تفصیلی جائزے میں صرف کیے۔ اندازہ لگایا کہ کچھ خاص نوع کی پریشانیاں، کچھ خاص قسم کے امراض کو جنم دیتی ہیں۔ احساس رائیگاں سے سر درد جنم لیتا ہے، انتقامی جذبات سے امراض قلب۔ غصے سے بینائی متاثر ہوتی ہے اور نفرت سے یادداشت۔

"جب ایک مخصوص منفی خیال ایک خاص قسم کے مرض کو جنم دینے کی قوت رکھتا ہے تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک مخصوص مثبت خیال ایک خاص مرض کا علاج کر سکے۔"

اس نے امراض کی فہرست مرتب کی اور اُن الفاظ کا تعین کیا، جنہیں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دہرانا سود مند ہوتا ہے۔ یوں اس کی پہلی کتاب "Heal your Body" مکمل ہوئی۔ یہ کتاب 1976 میں شائع ہوئی۔

اس کاوش کو بہت پسند کیا گیا۔ قارئین کے ساتھ ساتھ ماہرین نے بھی بہت تعریف کی۔ البتہ چند نے شکایت کی کہ یہ بہت مختصر ہے۔ مثبت الفاظ کا استعمال سود مند ہے مگر کچھ اور تکنیکوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ کیوں ناں اگلے ایڈیشن میں کچھ اضافے کیے جائیں۔

خیال اس کے دل کو لگا۔ اس نے تیاری بھی شروع کر دی مگر پھر... ایک سانحہ ہوا۔ ایک امتحان اس کے سامنے آن کھڑا ہوا... ایک عفریت نے اس پر حملہ کر دیا۔

اُس عفریت کا نام تھا کینسر!

☆☆☆

اداسی کا موسم تھا۔ شام زرد پڑ گئی۔ پیڑوں کے پتے جھڑ چکے تھے۔

وہ ایک طلاق یافتہ عورت تھی، جس کی کم عمری میں آبرو ریزی کی گئی، جس کی روح پر زخم لگے اور جسمانی استحصال برداشت کیا، کسمپرسی میں زندگی گزاری۔ اور آج وہ ایک نئی مشکل کے روبرو تھی جو ماضی کی ہر مشکل سے بڑی تھی۔

کینسر کا موذی مرض سامنے تھا۔ تشخیص سے پتا چلا کہ مرض خاصا بگڑ گیا ہے۔

علاج بہت مہنگا تھا اور کامیابی کا امکان خاصا کم۔

اسے زندگی کا چراغ بجھتا ہوا محسوس ہوا۔

رپورٹس میز پر بکھری پڑی تھیں۔ وہ اپنے دفتر میں سر تھامے بیٹھی تھی۔

اچانک فون بجا۔ اس نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کی ایک کلائنٹ تھی۔

"اوہ پیاری لوئیزا۔ میں جیسکا بول رہی ہوں۔"

لوئیزا کو یاد آیا کہ جیسکا اس کے پاس جوڑوں کے درد کی شکایت لے کر آئی تھی۔

"میں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہاری کتاب نے میری زندگی بدل دی۔ اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ میری بیماری کا سبب میرے ماضی کے تلخ تجربات اور منفی خیالات تھے۔ وہ تو شکر ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اندازہ ہوا کہ میری بیماری، بیماری سے زیادہ بے آرامی ہے۔ وہ تم کیا کہتی ہو اُسے... ہاں یاد آیا، "Dis-ease"۔ کیا خوب نام دیا۔ خیر، تو میں اب بالکل صحت یاب ہوں۔ نہ صرف چل، بلکہ دوڑ سکتی ہوں۔ شکریہ لوئیزا۔"

"تمہارا شکریہ جیسکا۔" ریسیور رکھ کر اس نے ایک نظر میز پر پڑی میڈیکل رپورٹس کو دیکھا۔ کھڑکی سے آنے والی کرنیں چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

دھیرے سے مسکرائی۔ خود کو مخاطب کیا۔ "جن نظریات پر تم یقین رکھتی ہو، جن کا پرچار کرتی ہو، انہیں ثابت کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ تمہیں اس مرض میں مبتلا تو ہونا ہی تھا۔ تم برسوں ماضی کا بوجھ ڈھوتی رہیں۔ ٹھیک ہے، تلخ یادیں ناسور بن گئیں۔ تو اب ان کا مقابلہ کرو۔ چلو، کام پر لگ جاؤ۔"

علاج کے پیسے تو اس کے پاس تھے نہیں۔ پھر آپریشن کی کامیابی کا امکان بھی کم تھا، تاہم اس کے پاس مثبت سوچ تھی، جو مایوسی سے نکال کر نئے امکانات کی سمت لے آئی۔

اس نے ریسرچ شروع کی، تو اندازہ ہوا کہ کینسر کے علاج کے کئی غیر رسمی یا غیر سائنسی طریقے بھی رائج ہیں۔ کچھ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ماہرین مخصوص قسم کی غذا کا استعمال مفید خیال کرتے ہیں۔ کچھ دعاؤں سے علاج کی حمایت کرتے ہیں۔ کچھ چینی طریقہ علاج کو معاون خیال کرتے ہیں۔

لویزا نے ہر طریقے سے مدد لی۔ غم زدہ رہنے، اپنی قسمت پر رونے دھونے کی بجائے خود سے ٹوٹ کر محبت کی۔ ہر نعمت کے لیے قدرت کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ادویہ بھی لیتی رہی۔

ذہنی طور پر وہ خاصا افاقہ محسوس کر رہی تھی مگر جب اگلے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ آئی، تو اندازہ ہوا کہ اس کی حالت میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔ ناسور اسے کھا رہا تھا۔

یہ خبر ایک دھچکا ثابت ہوئی۔ ذہن منتشر ہو گیا۔

"کیا جن نظریات پر میں یقین رکھتی ہوں، وہ بے معنی ہیں، جھوٹ ہیں؟" دل میں ایک اندیشے نے جنم لیا۔ "کوئی بات میں بھول رہی ہوں۔ کوئی بنیادی کلیہ، کوئی اہم اصول مجھ سے نظر انداز ہو گیا۔"

کیا لویزا واقعی کچھ بھول گئی تھی۔

☆☆☆

وہ تاریک اور سرد رات تھی۔ سناٹا رینگ رہا تھا۔ قبرستان پر کہرا چھایا تھا۔

اچانک کہرے کے درمیان ایک چیچک زدہ عفریت ظاہر ہوا۔ وہ جیک تھا... وہی شخص جس نے بچپن میں لویزا کو نشانہ بنایا تھا۔

وہ اس کی سمت بڑھا۔ خوف زدہ لویزا مخالف سمت میں دوڑ پڑی۔ اس کا پاؤں ایک قبر سے ٹکرا گیا۔ وہ زمین پر آ رہی۔ جب اٹھنے لگی، تو ایک جھٹکا لگا۔ کسی نے اس کا پیر پکڑ لیا تھا۔ وہ مڑی۔

قبر سے نکلا ہوا ایک مکروہ ہاتھ سامنے تھا۔ اچانک قبر شق ہو گئی۔ ایک ہیبت ناک شخص اس سے باہر آیا۔

یہ پوڈگی تھا۔ اس کا سوتیلا باپ۔

اس کے عین پیچھے جیک کھڑا تھا۔ دونوں کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ وہ تیزی سے پلٹی۔ کچھ دیر دوڑتی رہی۔ پھر ہانپنے لگی۔ ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اچانک مکروہ ہنسی سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ جیک شاخوں پر جھول رہا تھا۔ اس نے جست لگائی...

لویزا زور سے چلائی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس نے ایک خوف ناک سپنا دیکھا تھا۔

اس نے بتیاں جلائیں۔ ٹھنڈا پانی پیا مگر حالت میں سدھار نہیں آیا۔ دھڑکن تیز تھی۔ جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ رہا تھا۔

اچانک چرچ کی گھنٹی بجی۔ آنکھوں کے سامنا ایک جھماکا ہوا۔ کتاب مقدس کے الفاظ کانوں میں گونجے۔
"جب تم اپنے دشمن کو معاف کر دو گے، تو خدا بھی تمھیں معاف کر دے گا۔"

اُس نے گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کون سے اصول بھول بیٹھی تھی۔

"اگر تم اپنے دشمن کو معاف نہیں کرو گے۔" اس نے کتاب مقدس کے الفاظ دہرائے۔ "تو خدا بھی تمھیں معاف نہیں کرے گا۔"

اس نے سر جھٹکا۔ "مجھے انھیں معاف کرنا ہو گا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس مرض سے نجات چاہتی ہوں، بلکہ اس لیے کہ اب میں جانتی ہوں کہ دونوں بیمار تھے۔ اوروں کی طرح تلخ یادوں نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ انھیں وحشی بنا دیا تھا۔ حیوان کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ ان کے دلوں کو پتھر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ بھی انسان تھے۔"

وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ آسمان پر ستارے دمک رہے تھے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

کینسر کی تشخیص کے چھ ماہ بعد اس کا دوبارہ ٹیسٹ ہوا۔ ڈاکٹر نتائج دیکھ کر حیران رہ گئے، مگر لویزا کو قطعی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ مسکراتی رہی۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈاکٹر ہکلایا۔

"یہ ممکن ہے۔" اس نے کاندھے اچکائے۔ "ذہنی انتشار سے پیدا ہوئے امراض کا مثبت خیالات سے علاج کیا جا سکتا ہے۔"

ڈاکٹر کھڑا پلکیں جھپکتا رہا۔ لویزا نے بات جاری رکھی۔ "حادثات میں سبق پوشیدہ ہوتا ہے ڈاکٹر۔ اس سانحے نے بھی مجھے ایک سبق دیا ہے۔ ہمیں زندگی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔"

وہ کلینک سے نکل کر سیدھی اپنے اپارٹمنٹ پہنچی۔ بیگ تیار کیا۔ اپنے کلائنٹس کے نام ایک مشترکہ پیغام تیار کیا:

"دوستو، میں کیلیفورنیا جا رہی ہوں۔ بے فکر رہیں۔ میں آپ سے رابطہ میں رہوں گی۔ آپ کسی بھی وقت مجھے

فون کر سکتے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ میرا یوں اچانک جانا آپ کو ناگوار گزرے گا مگر میں معذرت چاہتی ہوں۔ مجھے جانا ہوگا۔ آبائی وطن مجھے بلا رہا ہے۔"

ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے اسے قطعی علم نہیں تھا کہ یہ سفر اسے دنیا کی مقبول ترین مصنفہ بنانے والا ہے۔

☆☆☆

لاس اینجلس سرد تھا۔ برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے گر گیا۔

یہ اس کا آبائی وطن تھا مگر وہ یہاں فقط تین افراد کو جانتی تھی۔ ایک اس کی ماں، دوسری بہن اور تیسری جولیا۔

اس کی ماں اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ مضافات میں مقیم تھی۔ اس چھوٹے سے مکان میں اجنبیت چھائی تھی۔ بہن سرد مہری سے ملی اور ماں... وہ تو اسے دیکھ ہی چہک گئی۔ بوڑھی ممی تیزی سے اپنی بینائی کھو رہی تھی۔ وہ انتہائی خستہ حال تھی۔

وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتی رہیں۔ ماضی کی حسین یادیں کنگھالیں۔ بری یادوں سے اجتناب برتا۔ لویزا نے اسے یقین دلایا کہ اب وہ آگئی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پھر وہ جولیا سے ملنے گئی، جو وسطی علاقے کے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پھولی نہ سمائی۔ دونوں سہیلیاں کئی پہر باتیں کرتی رہیں۔ جب جانے کے لیے اٹھی، سیاہ فام عورت نے کہا۔

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک کمرا خالی پڑا ہے۔ تمہارا بستر وہاں لگ جائے گا۔"

"تم کیوں زحمت کرو گی۔ میں کرایے پر اپارٹمنٹ لے لوں گی۔" اس نے تھوڑی مزاحمت کی۔

"جو کرایہ مالک مکان کو دو گی، وہ مجھے دے دینا۔" عورت کے لہجے میں شوخی تھی۔ "اور ہر شام دالان میں جھاڑو مار دینا۔"

وہ اپنی دوست کے گلے لگ گئی۔ واقعی اچھے دوست بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔

لویزا کے پاس اپنی کتاب کی چند کاپیاں تھیں اور ایک واضح منصوبہ تھا۔ اس نے ہم خیال لوگوں کی کھوج شروع کی۔ وہ ان کے سیمینارز اور ورکشاپس میں شرکت کرنے لگی۔ وہ لوگوں سے تبادلۂ خیال کرتی۔ اپنے نظریات اور پھر ان کن تجربات سے انھیں آگاہ کرتی۔ اپنی کتاب پیش کرتی۔

اس عرصے میں وہ خوب گھومی پھری۔ روز ہی ساحل کی سمت جاتی۔ لہروں کو کنارے سے ٹکراتے، پرندوں کو پرواز کرتے دیکھتی۔ اس نے مرکزی علاقے میں ایک چھوٹا سا دفتر لے لیا تھا۔ دھیرے دھیرے لوگ مشوروں کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ نیویارک میں جہاں سے پریکٹس کا سلسلہ منقطع ہوا تھا وہیں سے دوبارہ شروع ہو گیا۔

وہ حقیقی تجربات سے لیس تھی۔ روحانی احساس الفاظ میں موجزن تھے۔ اس کے افکار کی رسائی بڑھنے لگی۔ اسے سیمینارز میں بطور اسپیکر مدعو کیا جانے لگا۔

اسی طرح دو برس گزر گئے اور پھر اسے ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف اس کی بہن تھی اور اس کے پاس ایک اذیت ناک خبر تھی۔

"مما سیڑھیوں سے گر گئی ہیں۔ ان کی کمر کی ہڈی ٹوٹ..." وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ "وہ شدید تکلیف میں ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔"

"تم خود کو سنبھالو میری بہن۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں آرہی ہوں۔"

اپنی ماں سے ملنے سے قبل لویزا نے اپنی چھوٹی بہن کو گلے لگایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ خود بھی خاصی بیمار تھی مگر اپنی پریشانیوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کرتی تھی۔

لویزا نے اسے حوصلہ دیا۔ پھر وہ اپنی ماں سے ملی۔ اس نے بوڑھی عورت کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" عورت کے لہجے میں بےیقینی تھی۔

"ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

اس کی کوششیں کارگر رہیں۔ امید سے لبریز الفاظ، سادہ سی تھپکیوں نے بوڑھی عورت پر جادوئی اثر کیا۔ وہ تیزی سے صحت یاب ہونے لگی۔ ایک ماہ بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آئی۔

کسی بیمار کی تیمارداری ایک بھاری ذمے داری ہے۔ لویزا کے پاس اعتماد اور یقین کی قوت تو تھی، مگر معاشی طور پر ابھی وہ مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ پھر اسے اپنے کام کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ ایسے میں ماں کی دیکھ ریکھ کون کرتا۔

www.paksociety.com www.paksociety.com

ہار ماننے کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس نے سر جھکا کر دعا کی۔

قدرت نے ساتھ دیا۔ دو دن بعد اسے سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بڑی ورک شاپ میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ ایک بڑا موقع تھا، جسے وہ ضائع نہیں کر سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں ماں کا کون خیال رکھے گا؟

نیک دل جولیا نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ "تم بے فکر ہو کر جاؤ، میں یہاں موجود ہوں۔"

یہ من و عن وہی الفاظ تھے جو اس کی دادی جینٹ نے برسوں پہلے لوئیزا کی ماں سے کہے تھے۔

سان فرانسسکو میں اس کی بہت پزیرائی ہوئی۔ ایک نئی کتاب کا خاکہ ذہن میں بننے لگا۔

لوٹتے ہی وہ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے سفید کاغذ پر پہلی سطر لکھی۔

"زندگی بہت سادہ ہے جو ہم کائنات کو دیتے ہیں، کائنات ہمیں وہی لوٹا دیتی ہے۔"

یہ اس کتاب کی پہلی سطر تھی... جو لوئیزا ہائے کو امر کرنے والی تھی۔

☆☆☆

کتاب کی تکمیل میں ایک برس لگا۔

وہ کرائے کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ جولیا کے گھر منتقل ہو گئی۔ دفتر میں بیٹھنے کا دورانیہ مختصر کر دیا۔ اپنی کل توجہ اور صلاحیت قلم کو سونپ دی۔ اس دوران کئی رکاوٹیں آئیں۔ ایک بار اس کی ماں شدید علیل پڑ گئی، اسے اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ معاشی مسائل بھی تھے۔ پھر لوئیزا خود بھی ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہوئی۔ الغرض کتاب لکھتے ہوئے وہ طرح طرح کے مسائل سے گزری مگر اس نے کسی بھی مرحلے پر لکھنا ترک نہیں کیا۔

کوئی کانوں میں سرگوشیاں کرتا رہا۔ "یہ کتاب ہر صورت مکمل ہونی چاہیے۔ دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔"

1984 میں لوئیزا ہائے کی دوسری کتاب You Can Heal Your Life کا مسودہ مکمل ہو گیا۔ جو سادہ مگر پُراثر تکنیکوں پر مشتمل ایک عملی پروگرام تھا۔

کتاب تو لکھ لی، مگر اسے شائع کروانا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ آج کے برعکس اس وقت سیلف ہیلپ کتابیں اتنی مقبول نہیں تھیں۔ پھر اس شعبے پر مرد چھائے ہوئے تھے۔ خواتین کا اس سمت آنے کا تصور رہتا تھا۔

تمام ناشروں نے معذرت کر لی۔ ایک نے مشورہ دیا کہ وہ کتاب سے سادگی نکال دے، سنسنی خیزی کا تڑکا لگائے۔ طلسماتی کہانیاں بیان کرے۔

کیا لوئیزا مایوس ہو گئی؟ قطعی نہیں۔ کینسر کو شکست دینے کے بعد اب وہ ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قدرت کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گی۔

لوئیزا ہائے کی تعلیمات

"خود سے محبت کریں۔" یہی دنیا کی مقبول ترین مصنفہ کا بنیادی پیغام ہے۔ یہ پیغام گوتم بدھ کی تعلیمات کے بے حد قریب ہے، جن میں خود ان کے لیے اپنی ذات سے محبت کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

وہ آئینہ بینی کی مشق کا مشورہ دیتی ہے، تاکہ ہم خود کا سامنا کریں۔ اپنی ذات سے فرار حاصل کرنے کی بجائے خود کو قبول کر سکیں۔

وہ ندامت اور احساسِ گناہ سے نجات حاصل کرنے پر زور دیتی ہے۔ خوف، غصے اور انتقامی جذبات کو مکمل طور پر رد کرتی ہے، کیوں کہ اسے یقین ہے کہ ان عوامل سے نہ صرف روحانی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں، بلکہ ان سے جسمانی امراض بھی جنم لیتے ہیں۔

وہ مثبت خیالات پر یقین رکھتی ہے۔ انھیں وقتاً فوقتاً دہرانے کی نصیحت کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کامل انسان بننے کے لیے نہ صرف ہمیں اپنے دشمن کو معاف کرنا پڑے گا، بلکہ اپنی خود خطائیں بھی معاف کرنی ہوں گی۔ یعنی انھیں بھولنا ہوگا۔

اس کے نزدیک بیماری یعنی Disease درحقیقت بے آرامی کی ہی شکل ہے۔ ہم بے آرامی کے اسباب ڈھونڈ کر ان کا تدارک کر سکتے ہیں۔

اسے یقین ہے کہ جن باتوں پر ہم اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں، ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لیے ہمیں مثبت عوامل پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ وہ برتر قوت پر یقین رکھتی ہے مگر مصائب کے نجات کے لیے عملی کوششوں کو اہمیت دیتی ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ سرما کی ایک رات اُسے ایک اشارہ ملا۔ وہ ایک خواب تھا جس میں وہ ایک پبلشنگ ہاؤس کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ عمارت کے ماتھے پر لکھا تھا "ہائے ہاؤس!"

اگلے صبح وہ نشرو اشاعت کے محکمے پہنچ گئی اور یہ نام رجسٹرڈ کروا لیا۔ بینک میں کچھ پیسے تھے، تھوڑا قرضہ لیا اور پرنٹر کی سمت روانہ ہوگئی۔

ماہِ دسمبر میں یہ کتاب مارکیٹ میں آئی۔ آگے جو کچھ ہوا... وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

کتاب کو حیران کن پذیرائی ملی۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ "نیویارک ٹائمز" کی بیسٹ سیلر لسٹ میں یہ لگاتار 14 ہفتے پہلے نمبر پر رہی۔

چند ہی ماہ میں پہلا ایڈیشن مارکیٹ سے غائب ہوگیا۔ "ہائے ہاؤس" کو بھاری تعداد میں آرڈرز ملے۔ خریداروں کی دلچسپی دیکھتے ہوئے تمام بڑے بک اسٹورز نے لوئیزا کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کیا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندے انٹرویوز کے لیے دوڑے چلے آئے۔

جلد ہی اس کتاب کی شہرت ریاست کیلیفورنیا کی سرحدیں عبور کرگئی۔ دیگر ریاستوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

لوئیزا شہر کی مقبول ترین لکھاری بن گئی تھی۔ شہرت اور دولت کی دیوی اس پر مہربان ہوگئی، مگر وہ اپنا اصل فریضہ نہیں بھولی۔ اُس کا مقصدِ حیات انسانیت کے کام آنا تھا۔ اس لیے جب جیمس ملٹن اُس کی مدد مانگنے آیا، تو اس نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ فوراً ہاں کہہ دی۔

یہ ایک پُرخطر فیصلہ تھا۔

☆☆☆

80 کی دہائی دنیا کے لیے ایک دہشت لے کر آئی۔ ایک نئی وبا کا انکشاف ہوا۔ ایک مرض، جس کا کوئی علاج نہیں تھا... ماسوائے موت کے۔

آج تو حالات خاصے بدل گئے ہیں مگر اس زمانے میں امریکا میں جب کوئی ایڈز کا نام سنتا تھا تو تھرتھر کانپنے لگتا۔ مریض سے دور بھاگنے کی کوشش کی جاتی۔ ساتھ بیٹھنا تو درکنار، ایڈز میں مبتلا شخص سے بات کرنا بھی کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے گناہ گار خیال کیا جاتا۔ اور جیمس ملٹن... اسی موذی مرض میں مبتلا تھا۔

اس وقت یہ بیماری نئی نئی تھی۔ اس کے حوالے سے کئی غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ مریض کا سماجی بائیکاٹ کر دیا جاتا اور یوں وہ اپنی طبعی موت سے قبل نفسیاتی طور پر مر جاتا۔

جیمس کا خیال تھا کہ لوئیزا اپنے پُراثر پیغام کے ذریعے نہ صرف ایڈز کے مریضوں میں جینے کی امنگ پیدا کرسکتی ہے بلکہ معاشرے میں اس حوالے سے سماجی شعور بھی بیدار کرسکتی ہے۔

خیرخواہوں کا مشورہ تھا کہ لوئیزا کو اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ایڈز کے مریضوں سے وابستگی اس کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتی ہے مگر اس نے ناصح کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔

اگست کی ایک خاموش شام وہ اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ایڈز کے مریضوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اُن کی تعداد چھ تھی۔ چہروں پر اداسی چھائی تھی۔

"ہم نئے سفر پر روانہ ہونے کو ہیں دوستو۔" اُس نے ہاتھ رگڑے۔ "اور ایسے میں اداسی کچھ مناسب نہیں لگتی۔"

وہ اُن سے باتیں کرتی رہی۔ انہیں یاسیت کی کھائی سے نکالا۔ جینے کی آس پیدا کی۔ رخصت ہوتے وقت وہ سب خاصا بہتر محسوس کررہے تھے۔

اگلے ہفتے چھ کی بجائے گیارہ افراد اُس کے اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ تیسرے ہفتے ان کی تعداد اکیس ہوگئی۔ جگہ کم پڑنے لگی۔ وہ ایک سماجی تنظیم کے ہال میں اکٹھے ہونے لگے۔ پھر ایسا وقت بھی آیا، جب اس مرض میں مبتلا 800 افراد کو لوئیزا ہائے نے اُمید سے لبریز لیکچر دیا۔

یہ کیلیفورنیا کی تاریخ کا ایک حیران کن واقعہ تھا۔

اس گروہ کو "ہائیرائیڈ سپورٹ گروپ" کا نام دیا گیا۔ لوئیزا کی فلاحی کوششوں نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ ہر جگہ اُس کا چرچا ہونے لگا۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ اور پھر ایک روز... اسے ایک غیرمتوقع فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف اوپرا ونفری تھی، امریکا کی سب سے چوٹی کی ٹی وی میزبان۔

وہ لوئیزا کو اپنے شو میں مدعو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بہ خوشی ہامی بھرلی۔

اس نے اپنے گروپ کے چند سینئر ارکان کے ساتھ شو میں شرکت کی۔ ایک گھنٹے کے اس پروگرام میں جہاں

ایڈز کے مریضوں کے مسائل پر روشنی ڈالی، وہیں اُن افکار اور تکنیکوں کا بھی ذکر کیا، جو مریضوں کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی کتاب کا بھی تذکرہ آیا۔

شو کے اگلے روز اسے اطلاع ملی کہ بک اسٹورز سے اس کی کتاب غائب ہو گئی ہے۔ لوگ ٹوٹ پڑے تھے۔ اسٹاک ختم ہو گیا۔ "ہائے ہاؤس" کو نئے آرڈرز موصول ہوئے۔ نہ صرف یورپ بلکہ لاطینی امریکا اور ایشیا کے بھی چند بڑے پبلشرز نے اس سے رابطہ کیا۔

شہرت نے لوئیزا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اگلے ہفتے اُسے ڈاکٹر برنی سیگل نے اپنے پروگرام Donahue میں مدعو کیا۔ وہاں بھی بہت پذیرائی ہوئی۔ مزید ٹی وی شوز سے بھی بلاوے آئے۔

لاس اینجلس کے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولنے والی لوئیزا کچھ ہی روز میں ایک ملک گیر شخصیت بن گئی۔ اُسے اُمید کا استعارہ تصور کیا جانے لگا۔

کتاب کی شہرت تیزی سے پھیلی۔ فرانس، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک سے اسے حیران کن کالز موصول ہونے لگیں۔ کچھ لوگ ان کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔

"خوشی سے کیجیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس کا پبلشنگ ہاؤس، جسے قائم کرنے کے لیے اس نے قرض لیا تھا، تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ فقط ایک کتاب کی اشاعت نے اُسے سال میں سب سے زیادہ منافع کمانے والے پبلشنگ ہاؤسز کی فہرست میں لا کھڑا کیا۔

پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہوا... سیلف ہیلپ کے موضوع پر قلم اٹھانے والے نئے لکھاری اپنی کتابوں کی اشاعت کے لیے اس سے رابطہ کرنے لگے۔ ابتدا میں تو وہ تھوڑی متذبذب تھی۔ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اس فیصلے کا کیا نتیجہ نکلے گا مگر پھر خیال آیا، اگر وہ بھی ان نئے رائٹرز کا ہاتھ نہیں تھامے گی، تو کون تھامے گا؟ قدرت نے اس کی مدد کی، اب اسے اوروں کی مدد کرنی ہوگی۔

بس یہی سوچ کر اس نے اپنے پبلشنگ ہاؤس سے ایک نوجوان مصنف کی کتاب چھاپنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ پیش لفظ خود لکھا۔ نتائج مثبت رہے۔ لوگوں نے اس نوجوان کی فکر کو سراہا۔

مثبت ردعمل دیکھتے ہوئے اس نے دو اور کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ وہ پچھلی کتاب سے بھی زیادہ کامیاب ٹھہری۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ الغرض "ہائے ہاؤس" کا تجربہ رجحان ساز ثابت ہوا۔

☆☆☆

کچھ ہی برس میں لوئیزا ہائے نے سیلف ہیلپ انڈسٹری کی صورت بدل دی۔

You Can Heal Your Life کی اشاعت سے قبل بک اسٹورز میں فکشن، تاریخ اور شاعری کے تو سیکشن ہوتے تھے، مگر سیلف ہیلپ کتابوں کا کوئی سیکشن نہیں تھا۔ اس کتاب کو ملنے والی ناقابل یقین پذیرائی کے بعد ہی بک اسٹور مالکان نے یہ سیکشن قائم کیا۔ کئی بڑی دکانوں میں ان سیکشنز کا افتتاح لوئیزا ہائے ہی نے کیا۔ سیلف ہیلپ رائٹنگ کے میدان میں نئے نئے لوگ آنے لگے تھے۔

اس عرصے میں لوئیزا کی دیگر کتب بھی شائع ہوئیں، مگر You Can Heal Your Life کی شہرت ماند نہیں پڑی۔ کسی پُراسرار قوت کے سہارے اس کی رسائی بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک ایڈیشن شائع ہو رہا تھا۔ اس کی شہرت یورپ سے ہوتی ہوئی، ایشیا اور لاطینی امریکا میں پھیل چکی تھی۔ کئی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا۔ اس نے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بدل دیں۔ دنیا بھر سے لوئیزا کو احساسِ تشکر سے لبریز خطوط آنے لگے۔

لوگ اسے اپنی کہانیاں لکھ کر بھیجتے۔ بتایا کرتے کہ کیسے ان کی زندگیاں کرب اور مصائب میں الجھی تھیں اور اس کی کتاب نے انھیں یکسر بدل دیا۔

سات برس تک وہ ایڈز کے مریضوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی تھی۔ ان کوششوں کے طفیل ان دھتکارے ہوئے انسانوں کو سماج نے قبول کیا۔ ان کے سلب شدہ حقوق انھیں واپس ملے۔ لوئیزا کو سماجی تنظیموں کی جانب سے کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

اس نے جانوروں کی حفاظت اور فلاح و بہبود کے لیے بھی ایک منصوبہ شروع کیا۔ یہ اس کے کرشماتی پیغام ہی کا اثر تھا کہ امریکا کی کئی قدآور شخصیات اس مہم میں شامل ہو گئیں۔ جانوروں کے تحفظ سے متعلق قوانین پاس ہوئے۔ ادارے قائم کیے گئے۔ سماجی شعور بلند ہوا۔

سیلف ہیلپ کتب کی تاریخ میں، فروخت کے لحاظ

سے لوبزا پہلے نمبر پر آ گئی تھی۔ اس نے نپولین ہل اور نورمن ونسنٹ پیل جیسے نابغۂ روزگار لکھاریوں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ 2006 میں اُسے ایک انوکھا اعزاز ملا۔ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی خاتون لکھاری کا تاج اس کے سر رکھ دیا گیا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ نے تسلیم کر لیا کہ آج سے قبل کسی ادیبہ کی کتابیں اس تعداد میں فروخت نہیں ہوئیں۔

اگلے ہی برس ایک دلچسپ معاملہ ہوا۔ دو نوجوان اس سے ملنے آئے۔ ایک ہدایت کار تھا، دوسرا مصنف۔ وہ اس کی زندگی کو فلم کے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے۔

ان کی پیشکش سن کر لوبزا ہنس پڑی۔ "میرے بچو، یہاں 35 برس کی خواتین کو فلم میں کام نہیں ملتا۔ اور تم مجھ 81 سالہ بڑھیا کو کاسٹ کرنا چاہتے ہو۔"

دونوں نوجوان مسکرائے۔ "جی ہاں، کیوں کہ اس بڑھیا نے لاکھوں زندگیاں بدل دی ہیں۔"

2008 میں فلم You Can Heal Your Life ریلیز ہوئی، جو فقط لوبزا کی کتاب پر مبنی نہیں تھی، اس کی کہانی اور مصائب کا بھی احاطہ کیا گیا تھا۔

فلم نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ اثر پذیری کے معاملے میں اس نے کتاب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لاکھوں انسانوں کی زندگی بدل دی۔ نیپال کے پہاڑی علاقوں سے، جاپان کے بیمار کیمپوں سے، افریقی ملکوں سے لوبزا کو شکریے کے پیغامات موصول ہونے لگے۔

فلم کی حیران کن مقبولیت دیکھتے ہوئے اوپرا ونفری نے اسے دو عشروں بعد پھر اپنے پروگرام میں مدعو کیا۔ اوپرا بھی اب لوبزا ہائے کی طرح بین الاقوامی شخصیت بن چکی تھی۔

وہ دونوں پرانی دوستوں کی طرح ملیں۔ پروگرام کے شرکا نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا، لوبزا کی کتاب میں نئی روح آ گئی۔ دو عشروں قبل وہ نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلر لسٹ میں 14 ہفتے نمبر ون رہی تھی۔۔۔ اس بار وہ اس اہم فہرست میں 22 ہفتے اوّل نمبر پر دمکتی رہی۔ میگزین میں شائع ہونے والے آرٹیکل میں کتاب کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ جب کوئی کتاب 22 سال کے طویل عرصے بعد ہماری فہرست میں پھر پہلے نمبر پر آ گئی۔ لوبزا کے پیغام میں جادو ہے۔"

2013 کے اعداد و شمار کے مطابق یہ کتاب 132 ممالک میں فروخت کے ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ 42 بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اس کی 4 کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔

سب سے مقبول مصنفہ کا ریکارڈ کئی برسوں بعد ہیری پوٹر کی مصنفہ جے کے رولنگ نے توڑا مگر اس نے اعتراف کیا کہ وہ خود لوبزا کی مداح ہے۔ اُس نے کہا "بے شک میری کتابیں فروخت کے معاملے میں اُن کی کتب سے آگے نکل گئی ہیں، مگر ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ میرے قلم نے کسی کی زندگی نہیں بدلی، دوسری جانب لوبزا کے قلم نے کروڑوں انسانوں کو یکسر بدل دیا جن میں شاید جے کے رولنگ بھی شامل ہے۔"

☆☆☆

بیلوں کی ٹہنیاں ہوا کے دوش پر جھول رہی تھیں۔ ان پر گلابی پھول کھلے تھے۔ آسمان میں پورا چاند تھا۔

کہانی ختم ہو چکی تھی۔ بچی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ بوڑھی جولیا بینچ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پُرسکون خاموشی تھی۔ چاندنی میں قدرت کے کرشمے دمک رہے تھے۔

"آپ کی دوست کی کہانی تو... انوکھی ہے۔" بچی نے خاموشی توڑی۔

"تمہیں پسند آئی؟" بوڑھی نے گردن موڑی۔

لڑکی نے سر ہلایا۔ عورت مسکرائی۔ "پھر ایک وعدہ کرو کہ تم کم از کم دو آدمیوں کو ضرور یہ کہانی سناؤ گی۔ یہ اُمید کی کہانی ہے۔ اور اُسے عام کرنا ہم پر فرض ہے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" اس نے عورت کا ہاتھ تھام لیا۔ "اور یہ عہد بھی کرتی ہوں کہ میں نہ صرف لوبزا کی کتاب پڑھوں گی بلکہ اپنے جیسے اور دکھیاروں کو بھی اسے پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔"

بوڑھی عورت کی فطری شوخی لوٹ آئی۔ "واہ، یعنی اس برس بھی ہائے پبلشنگ ہاؤس منافع میں رہنے والا ہے۔"

دونوں نے قہقہہ لگایا۔ چاند انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ ٹہنیاں رقص کرنے لگیں۔ پھر اس نے کہا "مجھے پہچانا؟ میں ہی اس کی اکلوتی دوست ہوں، جس کی والدہ نے اسے بچپن میں اپنے ہاں رکھا تھا۔"

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص

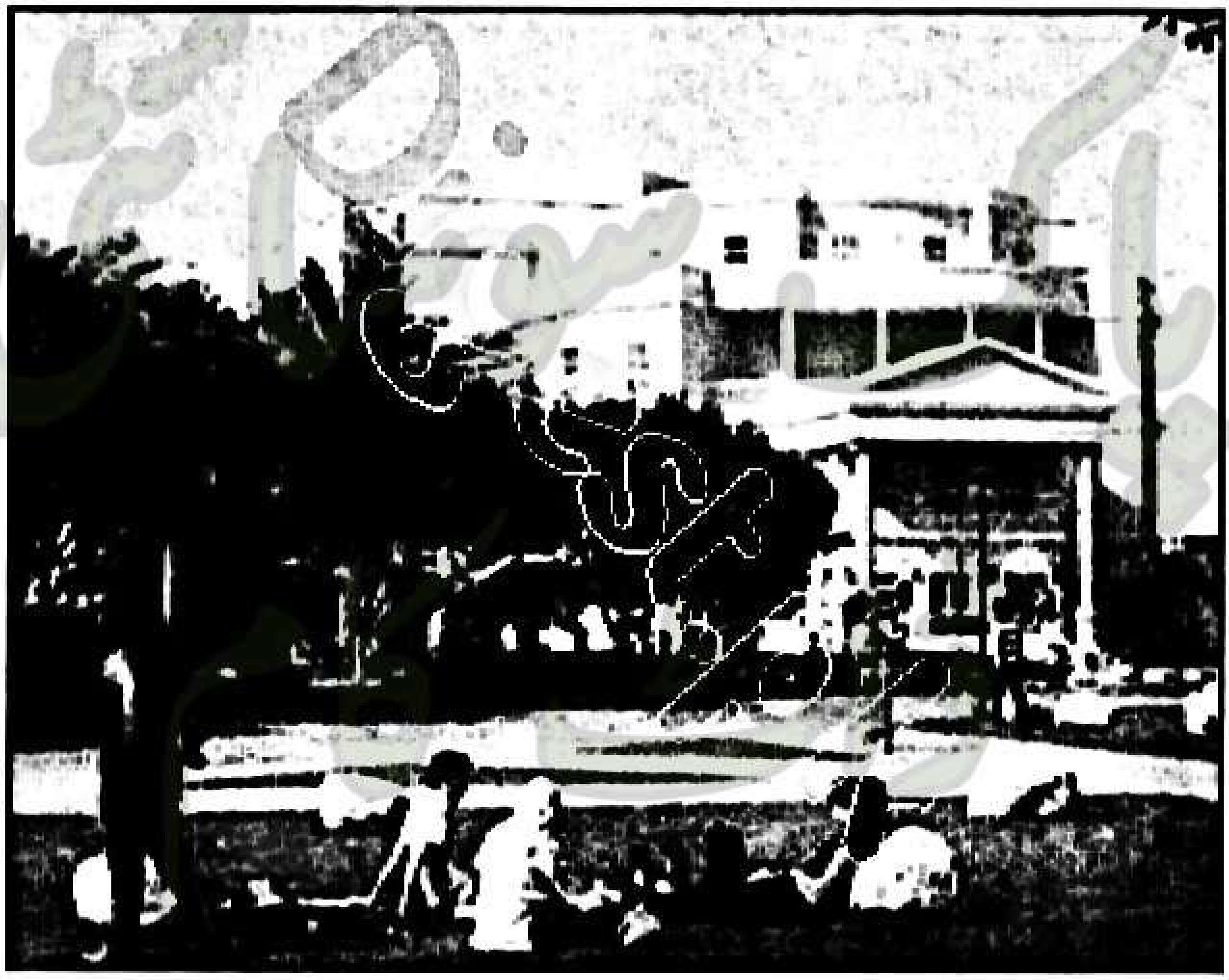

"جانا لاپس آنا" ہمارے خاندان کی ایک ذاتی اصطلاح ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پاکستان میں ہی نوکری کر رہا تھا۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر امین الدین ٹورونٹو سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عمرہ کرتے ہوئے براستہ جدہ پاکستان واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ میری بہن اور ان کا بیٹا کمال بھی تھے۔ کمال جب ٹورونٹو گئے تو شیر خوار تھے مگر اب ماشاءاللہ" چار سال کے گبھرو جوان" ہو چکے تھے اور ٹورونٹو کے غیر مانوس ماحول میں رہنے کی وجہ

سے گورا شاہی اردو بولتے تھے۔ وہ اپنی نانی یعنی میری والدہ کو اپنے عمرہ کی تفصیل بتانا چاہتے تھے۔ پہلے خانہ کعبہ کی بابت بتایا۔ "امی! ہم لوگ "اللہ ہاؤس" گئے تھے۔" پھر صفا و مروا کے درمیان سعی کی تفصیل بتائی۔ "امی وہاں کچھ نہیں بس جانا واپس آنا پھر جانا پھر واپس آنا۔" اس دن کے بعد سے جب بھی کسی ایسی جگہ کا ذکر ہو جہاں بار بار یا کئی بار جانا ہو تو ہمارے گھر میں اس جگہ کے لیے جانا واپس آنا، کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔

برمنگھم کو الوداع کہنے کے بعد مجھے انگلستان پاکستان اور کینیڈا کے درمیان کئی دفعہ جانا واپس آنا پڑا۔

برمنگھم سے ٹورونٹو کا سفر، ٹورونٹو سے برمنگھم کا الٹا پھیرا تھا یعنی برمنگھم، لندن، ڈوور، اوسٹنڈ، برسلز، مونٹریال، ٹورونٹو اس سفر کے ابتدائی ٹکڑے برمنگھم سے لندن کا فاصلہ محمت کے ساتھ اس کی گاڑی میں طے کرنا تھا۔ میں اپنا تمام مال و متاع اپنے واحد سوٹ کیس میں بند کرنے کے بعد محمت کا انتظار کر رہا تھا۔ گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو پیوان خسرو شاہی کو سامنے کھڑا پایا۔ ہم دونوں باورچی خانے میں میز کی طرف آ کر بیٹھ گئے کہ فلیٹ کا یہ باورچی خانہ بلکہ کھانے کا کمرا بیٹھک کا کام بھی دیتا تھا۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ محمت آچکا تھا۔ اب باورچی خانہ بلکہ بیٹھک میں RCD کا کورم پورا ہو چکا تھا۔ یعنی ترکی، پاکستان اور ایران کا ایک ایک نمائندہ باورچی خانے میں موجود تھا۔ میں نے اس باورچی خانے میں آخری دفعہ چائے بنائی۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ روزلین آنکھیں ملتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔

"تم ابھی سے جا رہے ہو؟ تمہاری فلائیٹ تو رات میں ہے۔"

"ہاں رات میں ہے۔ مگر برسلز سے ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے مجھے اسی وقت نکلنا پڑے گا۔"

"اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا وہ عمران سے مخاطب ہوئی۔ "اب تمہارے کمرے پر میرا قبضہ ہے تم وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں تم سے کرائے کا تقاضہ نہیں کروں گا تم میری مہمان ہو۔"

روزلین نے جماہی لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بائی بائی" اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ پھر اس کو کچھ یاد آ گیا۔ "رات ٹونی تم کو بائی بائی کرنے آیا تھا مگر تم سو چکے تھے۔" ٹونی روزلین کا منگیتر تھا۔

"بائی بائی۔ اب تم جا کر دوبارہ سو جاؤ مگر ٹونی کے خواب مت دیکھنا۔"

چائے ختم کرنے کے بعد میں نے اپنی آسٹن منی کی چابی پیوان کے حوالے کی کہ وہ یہ گاڑی مجھ سے مبلغ 196 پاؤنڈ سکہ رائج الوقت حکومت برطانیہ میں خرید چکا تھا۔ اور محمت کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔ برسلز تک کا سفر لمبا تھا۔ میں عین وقت پر برسلز ائرپورٹ پہنچا۔ کچھ دیر اور ہوتی تو فلائٹ چھوٹ جاتی۔ آج میرے لیے اس ٹکٹ کو استعمال کرنے کا آخری دن تھا۔ ائر کینیڈا کے جہاز میں داخل ہوا تو ایک انجانی سی اپنائیت کا احساس ہوا جیسے اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت ہوتا ہے۔ سارے دن کے سفر نے تھکا دیا تھا۔ جیسے ہی کھانا ختم ہوا اور جہاز کے کیبن کی لائٹیں دھیمی کی گئیں میں نے کمبل اوڑھا اور لمبی تان کر سو گیا۔ خوابوں میں خدا جانے کہاں کہاں کی سیر کرتا رہا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ پیوان نے مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "جلدی اٹھو آج تمہارے امتحان کا پرچہ ہے۔ کیا پرچہ دینے نہیں جاؤ گے؟"

آنکھ کھلی تو ائر ہوسٹس مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجوڑ رہی تھی۔ "اپنی سیٹ کی پشت سیدھی کر لیں۔ ہم جلد ہی مونٹریال کے ائرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔"

میں نے کرسی کی پشت سیدھی کر لی۔ تھوڑی دیر بعد جہاز مونٹریال کے ہوائی اڈے پر اتر چکا تھا۔ سات آٹھ گھنٹے کا سفر گزر چکا تھا مگر مونٹریال میں ابھی اندھیرے کا راج تھا۔ رات کا ایک یا ڈیڑھ بجا تھا۔

جہاز سے اتر کر امیگریشن ہال کا قصد کیا۔ امیگریشن کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک نئی مصیبت پاؤں پھیلائے مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

کینیڈا کا یہ قانون تھا کہ اگر کسی شخص کے پاس کینیڈا کا امیگریشن ویزا ہے اور وہ کینیڈا سے باہر جاتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک سال کا وقفہ گزرنے سے پہلے کینیڈا میں واپس داخل ہو جائے ورنہ اس کا امیگریشن ویزا کینسل ہو جاتا ہے۔ وہ دوبارہ کینیڈا میں داخل نہیں ہو سکتا۔

میں مونٹریال سے 23 ستمبر کو برسلز کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میرے لیے لازم تھا کہ میں 22 یا اس سے پہلے کینیڈا کے کسی شہر میں داخل ہو جاؤں ورنہ میرا ویزا کینسل ہو جائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

گا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کی بھی یہی پابندی تھی۔ اسی لیے میں 22 ستمبر کو برسلز سے کینیڈا واپسی کے لیے روانہ ہو چکا تھا مگر جس وقت ہمارا ہوائی جہاز مونٹریال کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ قانونی طور پر 23 ستمبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ امیگریشن آفیسر نے میری توجہ اس طرف دلائی "قانونی طور پر وہ وقت گزر چکا ہے جس وقت کے اندر اندر تم کو کینیڈا واپس آ جانا چاہیے تھا۔ وقت پر نہ آ سکنے کی سزا۔ اب تم کینیڈا میں داخل نہیں ہو سکتے!"

"پھر اب کیا ہوگا؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں انتظار کرو۔ میں اپنے سپروائزر کو بلا کر لاتا ہوں۔" وہ اپنے سپروائزر کو بلانے چلا گیا۔

ہر قوم کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اگر آپ کسی سرکاری یا نیم سرکاری دفتر میں کسی کام کی غرض سے جائیں تو وہاں کام کرنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آپ کا کام آج نہ ہو سکے۔ کوئی نہ کوئی خامی نکال کر یا بہانہ تلاش کر کے آپ کو کل آنے کا حکم دے دیں گے۔ کینیڈا امریکا اور برطانیہ میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ان ملکوں میں کام کرنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی طرح سے آپ کا کام آج ہو سکتا ہے تو ہو جائے، آپ کو دوبارہ آنے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

امیگریشن افسر واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کا سپروائزر بھی تھا۔ سپروائزر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گویا ہوا "پڑھائی ایک نیک کام ہے۔ تم ایک نیک مقصد کے لیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ صرف ایک یا دو گھنٹے کی بات ہے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ سہولت موجود ہے کہ تم کینیڈا میں داخل ہو سکتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے میرے پاسپورٹ پر ٹھپا لگا دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

یہ صورت حال اگر مجھے اس وقت پیش آئی ہوتی کہ جب میں پہلی دفعہ کینیڈا میں داخل ہوا تھا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے لیکن اب معاملہ کچھ اور تھا۔ مجھے میرا کینیڈا آنے کا اصل مقصد یعنی اپنی تعلیم مکمل کرنا، حاصل ہو چکا تھا۔ میرا مستقل طور پر پاکستان چھوڑنے کا اور کسی دوسرے ملک میں مستقل طور پر بس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت اگر امیگریشن آفسر مجھے کینیڈا میں داخل ہونے سے روک دیتا تو میرے اوپر اس کا کوئی منفی اثر نہ پڑتا، مجھے چنداں افسوس نہ ہوتا۔ میں اپنا چھوٹا سوٹ کیس اٹھا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پاکستان واپس آ جاتا۔ وقت وقت کی بات ہے افسوس کا کیا مقام!

افسوس تو صرف اس بات کا تھا کہ اس دفعہ بھی مجھے ائرپورٹ پر ائر کینیڈا کا جلوس نہیں دکھائی دیا جو مجھے پھولوں کے ہار پہنا کر کاندھوں پر اٹھا کر دفتر لے جا کر مجھ سے استدعا کرتا کہ میں اپنی خدمات سے ائر کینیڈا کو مستفید کروں حالانکہ اب کی دفعہ تو میرے پاس مغربی ملک کی ڈگری کا امکان بھی موجود تھا بشرطیکہ ڈاکٹر کوئس اپنی ٹانگ بیچ میں نہ اڑائے۔ خیال ہوا کہ رات کے تین بجنے والے ہیں شاید ائر کینیڈا والے سو گئے ہوں گے ورنہ وہ اس طرح سے اس نادر موقع کو ضائع نہ ہونے دیتے یقیناً انہوں نے میرے استقبال کا بندوبست ٹورنٹو کے ائرپورٹ پر کر رکھا ہوگا لیکن وہاں بھی مایوسی ہوئی۔

حسب سابق میں نے ایک دفعہ پھر ائر کینیڈا کو ان کی کوتاہی پر معاف کر دیا اور سوچا کہ میں خود نفس نفیس ان کے دفتر جا کر ان نادانوں کو ان کی غلطی اور کوتاہی کا احساس دلاؤں گا کہ وہ ایک دفعہ پھر میری صلاحیتوں سے مستفیض ہونے کا بیش بہا موقع گنوا رہے ہیں۔ میں ان کی خطاؤں کو درگزر کرتا ہوا کمال مہربانی سے ان کے دفتر پہنچ گیا۔

اس دفعہ گو کہ کاؤنٹر پر صاحبزادی بھی دوسری تھیں اور سپروائزر بھی نیا تھا لیکن ان کا جواب وہی پرانا اور گھسا پٹا تھا۔

"آج کل کینیڈا کی معیشت بہت خراب دور سے گزر رہی ہے۔"

جب وہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے ایک دفعہ پھر اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتے تھے تو میں ان کو کیسے روک سکتا تھا۔ اپنے کیے پر ایک دن خود ہی پچھتائیں گے، میرا کیا۔

میں نے طے کر لیا کہ اب میں دوسرے اداروں کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی دوڑ میں مزید رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ آخر ان کا بھی میرے اوپر کوئی حق بنتا تھا۔ وہ بھی دو خوار ہوتے تھے۔ ابھی میں کینیڈا کی دوسری کمپنیوں کو اپنی کینیڈا واپسی کی خوش خبری سے مطلع کرنے کا ارادہ مصمم کر ہی رہا تھا کہ مجھے میری ماں کا خط ملا۔ تقاضا تھا۔ "تین سال ہو گئے ہیں آ کر شکل دکھا جاؤ۔"

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
www.paksociety.com www.paksociety.com

ایک اور عجیب بات ہوئی۔ جس شہر برمنگھم کو اور اس کی یونیورسٹی کو چھوڑنے کے لیے میں بے چین اور بے تاب ہورہا تھا۔ اسی شہر اور اسی یونیورسٹی کی یادیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں حالانکہ برمنگھم سے جدا ہوئے مجھے ایک ہفتہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹریول ایجنسی جا کر ٹکٹ خرید لیا۔ کراچی براستہ لندن۔

برٹش ایرویز کا جہاز لندن ائرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر میں نے بس اسٹاپ کا رخ کیا اور اے وان ائربس پکڑ کر لندن شہر میں وکٹوریہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگیا۔ کرایہ صرف پچاس پنس۔ 1995ء میں یہ کرایہ بڑھ کر پانچ پاؤنڈ ہوچکا تھا۔ آج کل یہ کرایہ کتنا ہے معلوم نہیں۔

مغرب کا وقت ہوچلا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ کر میں اسی بیڈ اینڈ بریک فاسٹ ہوٹل پہنچ گیا جہاں ایک سال پہلے مجھے ایک پاؤنڈ کا حیدرآبادی ڈسکاؤنٹ ملا تھا۔ یہ ڈسکاؤنٹ آج بھی میرا منتظر تھا۔ ہوٹل کے مالک نے شکوہ کیا۔

”اویار شاہ، آپ تو ایسا غایب ہوئے جیسے گدے (گدھے) کے سر سے سینگاں (سینگ)، کیا پلٹ کو پوچھا نکو؟“ (کیا آپ کو پلٹ کر پوچھنا نہیں چاہیے تھا)

میں نے جواب دیا۔ ”سینگ تو میں آج بھی بھول آیا ہوں۔ گدھا حاضر ہے۔“

وہ ہنسنے لگے۔ میرا حیدرآبادی ڈسکاؤنٹ پکا ہوچکا تھا۔ ناشتا ہمیشہ کی طرح نکھرا تھا۔ ناشتا ختم کرنے کے بعد میں برمنگھم جانے کے لیے ایوسٹن اسٹیشن روانہ ہوگیا۔

برمنگھم کے نیو اسٹریٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا جیسے برسوں بعد بچھڑے ہوؤں سے ملاقات ہوئی ہے حالانکہ اسٹیشن پر میرا ایک بھی جاننے والا نہیں تھا۔ محمد میرے کینیڈا روانہ ہونے کے تین، چار دن بعد استنبول کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور عمران کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کا گھر میرا دیکھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ عمران کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

”تم تو چلے گئے تھے پھر کہاں سے آگئے؟“

”تمہاری محبت مجھے کھینچ لائی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

جب میں اور عمران ایک ساتھ گرفن کلوز کے فلیٹ میں رہتے تھے تو پڑھائی کے وقت کے علاوہ ہمارا زیادہ تر وقت ساتھ گزرا کرتا تھا۔ میں اور عمران اس وقت کو یاد کرتے رہے پھر میں نے عمران سے اس کی گاڑی کی چابی لی اور گرفن کلوز روانہ ہوگیا۔ یہ گاڑی میں نے پچھلے ہفتے گرفن کلوز میں ہی عمران کے حوالے کی تھی۔ میری دو سو پاؤنڈ کی خریدی ہوئی گاڑی کے عمران نے 196 پاؤنڈ دیے تھے۔ تین مہینے میں صرف چار پاؤنڈ کا گھاٹا۔

اپنے پرانے فلیٹ پر پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی۔ میں جیری سے ملنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی تک فلیٹ میں ہوگا لیکن دروازہ جیری کی بجائے روزلین نے کھولا۔ وہ شاید ابھی تک دوسرے فلیٹ میں منتقل نہیں ہوئی تھی۔ میں مبہوت ہوکر روزلین کو دیکھتا رہ گیا۔

روزلین کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ میں اس کو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا مل چکا تھا۔ پچھلے ہفتے اس نے مجھے ٹورنٹو کے لیے رخصت بھی کیا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ اور ہی چیز لگ رہی تھی۔ بکھرے بال، لانبا قد، اس نے سر سے پیر تک ایک گاؤن پہن رکھا تھا۔ دروازے کے ایک طرف اندھیرا تھا، روشنی بائیں طرف کی کھڑکی سے چھن چھن کر آرہی تھی اور اس کے اوپر دھوپ چھاؤں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے دل میں اس وقت ایک ہی خیال آرہا تھا۔ شاید جنت میں جن حوروں کا ذکر ہے وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

روزلین مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر شرما گئی کہنے لگی۔ ”اگر تم حسن سے ملنے آئے ہو تو وہ کینیڈا جا چکا ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میں ہی حسن ہوں کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“

وہ بپھر گئی، کہنے لگی۔ ”پہچانا کیوں نہیں مگر تم کو اپنے آپ کو اس طرح گھورتے دیکھ کر میں سمجھی کہ کوئی اور ہے۔ کیا تم نے مجھے اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں جو مجھے اس بدتمیزی سے گھور رہے تھے؟“

”میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا پھر اپنی صفائی پیش کی۔ ”میں یقیناً تم کو پہلے دیکھ چکا ہوں۔ اسی فلیٹ کے باورچی خانے میں ہم ایک آدھ بار کھانا بھی کھا چکے ہیں۔ تھوڑی بہت گپیں بھی ہانک چکے ہیں۔ چند دن پہلے تم نے مجھے ٹورنٹو کے لیے بائی بائی بھی کہا تھا لیکن آج کی بات ہی کچھ اور ہے۔“ پھر میں نے اس کی تعریف

کی۔ ''آج تمہارا حسن ملکوتی ہے۔ تم حوروں کی طرح حسین لگ رہی تھیں۔'' پھر میں نے دوبارہ اس طرح گھورنے کی معذرت کی۔ ''میں تم سے ایک دفعہ پھر اپنی بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔''

اس کے چہرے پر شفق پھیل گئی۔ یہ تو سچی تعریف تھی۔ عورت اپنی جھوٹی تعریف پر بھی سارے خطا قصور معاف کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ایک لڑکے نے اپنی محبوبہ کی تعریف کر دی۔ وہ خوش ہو گئی اور بولی۔ ''اگر تم ایک دفعہ اور یہی الفاظ دہرا دو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں۔''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''خبردار کرنے کا شکریہ۔'' یہ بھی ایک کئی سال پیشتر سنی سنائی کہانی ہے۔

جیری باہر گیا ہوا تھا۔ میں تھوڑی دیر روز لین سے باتیں کرتا رہا پھر ہیو ان کے پاس لوٹ آیا۔ آج کی رات میں عمران کا مہمان تھا، کھانے کے لیے بھی اور سونے کے لیے بھی۔

صبح ناشتا کرنے کے بعد میں یونیورسٹی کی طرف نکل گیا۔ میں ڈاکٹر کوکس سے ملنا چاہتا تھا کہ اپنی پروجیکٹ رپورٹ کا انجام معلوم کر سکوں لیکن ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار دل کڑا کر کے ان کے دفتر میں قدم رکھا۔ میں نے ان کی سیکریٹری سے پوچھا۔

''ڈاکٹر کوکس کیسے موڈ میں ہیں؟''

جواب ملا۔ ''نارمل۔''

معلوم نہیں نارمل سے اس کا کیا مطلب تھا مگر میں نے ایک دفعہ پھر اپنے دل کو مضبوط کیا اور دروازے پر دستک دے کر ڈاکٹر کوکس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنا محبوب اخبار فنانشل ٹائمز پڑھنے میں غرق تھے۔ مجھے دیکھ کر چونکے۔

''تم تو کینیڈا واپس جا رہے تھے پھر کیا ہوا؟''

''کینیڈا تو میں چلا گیا تھا لیکن اب وہاں سے پاکستان جا رہا ہوں سوچا ادھر بھی چکر لگا لوں۔''

جھنجلا کر بولے۔ ''یہ بھی خوب رہی چکر لگا لوں اگر واپس ہی آنا تھا تو اپنی بلا میرے سر کیوں چھوڑ گئے تھے؟''

مجھے معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر کوکس کا اشارہ کس بلا کی طرف تھا۔ میں نے وضاحت چاہی۔

''کون سی بلا؟''

کھا جانے والے انداز میں بولے۔ ''اپنی پروجیکٹ رپورٹ۔ تم مجھ سے ملے بغیر یہ رپورٹ میری سیکریٹری کو تھما کر رفوچکر ہو گئے۔''

میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا کہ اب یہ مجھ سے تیسری دفعہ اس رپورٹ کو لکھنے کا تقاضہ کریں گے۔ میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر پوچھا۔

''کیا میری پروجیکٹ رپورٹ آپ کو پسند نہیں آئی؟''

جھلا کر بولے۔ ''میں پسند آنے یا ناپسند آنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔''

''پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ تیسری دفعہ رپورٹ لکھنے کی جان لیوا تلوار مجھے اپنے سر پر لٹکتی دکھائی دے رہی تھی مگر ان کا جواب سن کر جان میں جان آئی۔

''تمہاری غیر موجودگی میں یہ رپورٹ تمہاری بجائے مجھے کمپنی کو پیش کرنا پڑی۔'' پھر لہجہ کچھ خوشگوار ہو گیا۔ ''ان لوگوں کو پسند آئی۔''

کمپنی کا میری رپورٹ کو پسند کرنا یا ناپسند کرنا میرا مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ میرے کام سے مطمئن تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اس طرح سے بھی کیا تھا کہ میرے بتائے ہوئے کئی مشوروں پر انہوں نے عمل درآمد بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی پسندیدگی کا اندازہ مجھے یوں بھی تھا کہ جب میں نے ان کے پاس اپنا پروجیکٹ مکمل کر لیا تھا تو انہوں نے مجھے نوکری کی پیشکش بھی کی تھی جو میں نے شکریے کے ساتھ مسترد کر دی تھی۔ میں صرف جہازراں کمپنیوں میں کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ انگلستان مجھے مستقل رہنے کے لیے بالکل پسند نہیں آیا تھا پھر مجھے اس کمپنی کے مستقبل کے بارے میں بھی شکوک تھے (ان معلومات کی بنا پر جو مجھے پروجیکٹ کے دوران میں معلوم ہوئی تھیں)

اس کمپنی کی بنیاد دو دوستوں نے والٹر ولکن اور تام مچل نے 1904ء میں ڈالی تھی۔ ان کا کارخانہ ڈارلنگٹن شہر کی ٹیل اسٹریٹ پر واقع تھا۔ 1907ء میں انہوں نے اپنا پہلا ہائیڈرالک پریس بنایا۔ اس کے بعد ان کا کاروبار اتنا بڑھا کہ ٹیل اسٹریٹ کا کارخانہ ان کو اپنے کاروبار کے لیے چھوٹا پڑنے لگا۔ 1910ء میں وہ موجودہ فیکٹری میں منتقل ہو گئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ان کا کام بہت بڑھ گیا لیکن 1970ء کی دہائی میں ان کا کام بتدریج تنزل پذیر ہوتا گیا۔ 1980ء میں یہ کمپنی ریسیور شپ میں چلی گئی

جس کے بعد اس کا دیوالیہ ہونے لگا تو اس کو 1982ء میں ایک امریکن کمپنی نے خرید لیا۔

میں نے ڈاکٹر کوتس کو مخاطب کیا۔ ”ڈاکٹر کوتس، مجھے کمپنی کی پسند یا ناپسند سے کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتادیجیے کہ کیا آپ نے میری رپورٹ کو پاس کردیا ہے؟“

وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گئے پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر آپس میں ملائیں اور کمال بے نیازی سے گویا ہوئے۔ ”پاس کیوں نہ کرتا، اچھی خاصی رپورٹ تھی۔“

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ غصہ اپنے عروج پر تھا مگر اپنے مزاج کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ استاد کے سامنے کوئی بے ادبی نہ ہوجائے میں نے دھیرے سے ڈاکٹر کوتس کو مخاطب کیا۔

”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ پچھلے تین ہفتوں سے آپ نے میرا خون خشک کر رکھا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محض اس رپورٹ کی وجہ سے شاید میں وہ پہلا اُمیدوار بنوں اس ڈیپارٹمنٹ کا کہ جس کو پروجیکٹ رپورٹ کی خاطر فیل ہونے والے پہلے امیدوار کا اعزاز حاصل ہوا۔“

کہنے لگے۔ ”ہاں تو پھر کیا ہوا اس طرح تم رپورٹ لکھنا تو سیکھ جاؤ گے۔“

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

سچ ہے ہمی کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

میں نے ڈاکٹر کوتس سے ہاتھ ملایا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور دروازے سے باہر نکل کر [illegible] کی طرف چل دیا۔

سہ پہر کو میں نے لندن جانے والی ٹرین پکڑی۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ کر ائرپورٹ جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ ان دنوں لندن کی انڈر گراؤنڈ ٹرین ٹیوب ائرپورٹ تک نہیں جاتی تھی گوکہ بعد میں جانے لگی تھی۔ ائربس ہیتھرو کی ٹرمنل تین پر پہنچی تو میں وہاں اتر گیا۔ کراچی کے لیے پی آئی اے کا جہاز یہیں سے روانہ ہوتا تھا۔

ان دنوں پی آئی اے کی ٹورنٹو کے لیے براہ راست پرواز کا آغاز ابھی نہیں ہوا تھا۔ یا تو نیویارک سے پرواز پکڑنی پڑتی تھی یا یورپ کے کسی شہر سے۔ میں نے برمنگھم جانے کی خاطر لندن کو ترجیح دی تھی۔ لندن سے کراچی جانے والی پرواز کا اعلان ہوچکا تھا۔ میں پی آئی اے کے طیارے میں داخل ہوا تو اپنائیت کا احساس ہوا۔ اردو زبان سننے کو ملی۔ طیارہ فضا میں بلند ہوچکا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹوائلٹ جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔

ٹوائلٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا تو خیال ہوا کہ یہ وہی بوئنگ B707 جہاز ہے جس میں میں کئی دفعہ کام کرچکا تھا اور شاید یہ وہی ٹوائلٹ ہو جس کی ٹوائلٹ موٹر میں تبدیلی کرچکا تھا اور یہ موٹر تبدیل کرتے وقت میں ایسے پوز میں رہا ہوں گا کہ

دینا کسی کا ساغر مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر اِدھر کو اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ

واپس آکر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کراچی صرف چند گھنٹے دور تھا۔

کراچی ائرپورٹ پر اتر کر جہاز نے جیسے ہی رن وے کو چھوا۔ لوگوں نے اپنے سیٹ بیلٹ کھول کر اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر جلدی جلدی... اپنا سامان اوپر کے خانوں سے نکالنا شروع کردیا۔ ائرہوسٹس بے چاری اعلان کرتی ہی رہی کہ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں اور جہاز کے رکنے کا انتظار کریں۔ مگر کسی ایک بھی شخص نے اس کی آواز پہ کان نہیں دھرا۔ اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ میں اپنے ملک پہنچ چکا ہوں کیونکہ یہ صرف میری ہی قوم ہے جو اس قدر نظم و ضبط اور صبر جمیل کا مظاہرہ کرسکتی ہے۔

جہاز سے اتر کر امیگریشن کی لائن میں کھڑا ہونا تھا۔ مگر یہاں بھی لوگ بھاگ دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے لائن میں لگنے کی سعی میں مصروف تھے بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اگر وہ جلد سے جلد امیگریشن سے فارغ ہو بھی گئے تو ان کو اپنے سامان کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔

میں امیگریشن کی لائن میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کررہا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو حسن انکل کھڑے تھے۔ حسن انکل کسٹم میں ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ لے کر امیگریشن کو تھمادیا۔ امیگریشن کا مرحلہ فوراً طے ہوگیا۔ وی آئی پی کلچر۔ ہمارے یہاں جان پہچان یا اثر و رسوخ زندگی کا ہر مرحلہ آسان بنا دیتی ہے۔ میرے ماں باپ کو حسن انکل کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ ان کا بیٹا تین سال امریکا، کینیڈا اور لندن میں گزار کر آرہا تھا۔ کم از کم آدھا جہاز تو ضرور اس کے سامان سے بھرا ہوا ہونا چاہیے مگر حقیقت ان کی توقعات کے برخلاف تھی۔ میرے ساتھ صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ بھی بڑا والا نہیں بلکہ درمیانے سائز کا۔

حسن انکل بہت مایوس ہوئے۔ باہر جا کر انہوں نے میرے ماں باپ کو بتا دیا کہ ان کا بیٹا کینیڈا، امریکا اور لندن سے نہیں بلکہ جہنم آباد سے آیا ہے۔

کسٹم سے فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھ کر جیسے ہی اسٹار گیٹ سے نکل کر شاہراہ فیصل پر داخل ہوئے تو ٹریفک کے ایک طوفان بے تمیزی نے خوش آمدید کہا۔ ٹریفک کے اس بے ضبط اور بے اصول سیلاب کو دیکھ کر ایک دفعہ اور یقین ہو گیا کہ "لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔"

میں نے پچھلے تین ... سال کینیڈا اور برطانیہ میں گزارے تھے۔ ٹورونٹو اور لندن کی ٹریفک کا شمار دنیا کی بہترین اور قاعدہ والی ٹریفک میں ہوتا ہے۔ اس قسم کی ٹریفک کا عادی ہو جانے کے بعد کراچی کی بے ہنگم ٹریفک کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میں ایک قسم کا تناؤ محسوس کرنے لگا تھا۔ اس تناؤ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چند دن بعد جب کسی نے مجھ سے کینیڈا کے بارے میں جاننا چاہا تو بجائے اس کے کہ میں ان کو کینیڈا کی زندگی اور تہذیب کے بارے میں کچھ کہتا میں نے جواب دیا۔ "ٹورونٹو کی ٹریفک بہت سسٹمیٹک ہے۔" میرے اس بے محل اور بے تکے جواب کا اور میرے انگریزی کے لہجے کا مذاق کافی دنوں تک اڑتا رہا۔ مگر میں پاکستان "واپس" آ چکا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد میری خواہش تھی کہ میں دوبارہ پی آئی اے میں ملازمت کر لوں۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ جب میں تین سال قبل پڑھائی کی غرض سے امریکا گیا تھا تو میری کلاسیں شروع ہو چکی تھیں۔ مجھے فوراً سے پیشتر یونیورسٹی پہنچنا تھا اس لیے میں اپنا استعفیٰ منظور ہونے سے پیشتر ہی امریکا کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ چیز پی آئی اے کے ضابطے کے خلاف تھی۔ لیکن میری مجبوری تھی۔ پی آئی اے میں میری واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے ذہن پر ہوائی جہاز سوار تھا۔

ان ہی دنوں مجھے کراچی میں واقع نیشنل موٹرز جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ لوگ ان دنوں ایک نیا شعبہ "ورک اسٹڈی" کے نام سے کھولنا چاہ رہے تھے۔ میری ہر قسم کی تعلیم اس سے مطابقت رکھتی تھی۔ انہوں نے مجھے اس شعبہ کو چلانے کی پیشکش کی جسے میں نے منظور کر لیا۔ اس شعبہ کی ابتدا کے لیے مجھے ایک دفتر اور ایک سیکریٹری مہیا کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میرے ساتھ ایک دم چھلا بھی لگا دیا گیا جس کا "ورک اسٹڈی" سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک انسٹرکٹر صاحب تھے جو مکینک کو عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک ہفتہ بعد میرے سیکریٹری نے میرے سامنے ان کا استعفیٰ رکھا جس کو میں نے منظور کر لیا۔ اس پر میرے سیکریٹری نے پوچھا۔ "آپ نے اس کا استعفیٰ بغیر اس سے بات کیے ہی منظور کر لیا؟"

میں نے لاتعلقی سے جواب دیا "اگر وہ یہاں نوکری نہیں کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ میں کیوں اس کا استعفیٰ نامنظور کروں!"

"میرا مشورہ ہے آپ اسے بلا کر بات کر لیں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں۔"

"اچھا اس کو بلا لو۔ فی الحال یہ استعفیٰ ایک طرف رکھ دو۔"

میں نے جب ان سے بات کی تو معلوم ہوا کہ ان کے کچھ دیرینہ حقیقی مسائل تھے جس کی بنا پر انہوں نے استعفیٰ دیا تھا۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان کا کسی شعبہ سے مستقل تعلق نہیں تھا۔ ادارہ جب چاہتا ان کا شعبہ تبدیل کر دیتا۔ وہ بنیادی طور پر اپنے آپ کو نیشنل موٹرز کی سوتیلی اولاد سمجھتے تھے۔ میں نے متعلقہ ڈائریکٹرز وغیرہ سے باہمی مشورہ کے بعد ان کے مسائل حل کروا دیے جس کے بعد انہوں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

اس واقعہ نے میری سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔ مینجمنٹ میں MSC کی ڈگری میرے پاس تھی۔ لیکن جب مینجمنٹ کا عملی مسئلہ درپیش ہوا تو میں نے اس کو بہت سرسری طور پر اور سطحی طور پر دیکھا جبکہ میرے سیکریٹری نے جس کی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تھی۔ اس مسئلہ کی گہرائی میں جا کر اس کی اہمیت کو جانا۔ کتابوں میں چند اصول پڑھ لینا الگ بات ہے اور ان کا عملی اطلاق بالکل ہی جدا چیز ہے۔ کتابیں ایک مشعل کی مانند ہیں کہ یہ اپنے اطراف نور پھیلاتی ہیں مگر جب تک اس نور سے مستفید ہونے کے لیے عملی جدوجہد نہ ہو یہ نور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے سیکریٹری نے مجھے وہ سبق پڑھایا تھا جو یونیورسٹی نہ پڑھا سکی تھی۔

چند ماہ بعد میں نے یہ نوکری چھوڑ دی۔ یہ میرا گوہر مقصود نہ تھا۔ مجھے دیر یا سویر پاکستان میں یا کہیں اور ہوائی جہاز کی نوکری چاہیے تھی۔ میں کینیڈا "واپس" آ گیا۔

لیکن ایئر کینیڈا کی بدنصیبی کی کوئی حد نہیں وہ اس دفعہ بھی میری خدمات سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی۔ اس نے لگاتار تیسری دفعہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ میں ان کی قسمت پر صرف افسوس کر سکتا تھا۔ جو میں نے کیا۔

کینیڈا وامریکا اور ہمارے ملک میں نوکریاں حاصل کرنے کے معیار مختلف ہیں۔ پاکستان میں سب سے پہلے سفارش پر زور ہوتا ہے۔ اگر وہاں کامیابی قدم نہ چومے تو پھر دوسرے حربے آزمائے جاتے ہیں۔ کینیڈا ابھی اس دوڑ میں ہم سے بہت پیچھے ہے۔

اس سے صرف نظر ابھی تک ان کے یہاں ہمارے ارکان پارلیمان کی طرح جعلی ڈگریاں اکٹھی کرنے کا رواج بھی نہیں ہے۔ جعلی ڈگریوں کے فقدان کا یہ ناقابلِ یقین خمیازہ ہے کہ آج تک میں نے کینیڈا میں جتنے بھی انٹرویو دیے ان میں سے کسی ایک میں بھی ایک دفعہ بھی کسی نے میری ڈگریوں پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ ان کی سوچ بہت سادہ ہے۔

نوکری جس وقت ملتی ہے اس وقت وہ پکی نہیں ہوتی ہے۔ دو سے چار ہفتے تک کا آزمائشی دورانیہ ہوتا ہے۔ اس دوران میں کھل کر اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ آپ کے دعووں میں کس قدر سچائی ہے۔ آپ کتنے پانی میں ہیں۔ آپ میں اپنا کام کرنے کا علم اور صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگر آپ کے دعوے سچے ہیں تو نوکری پکی ورنہ باہر جانے کا دروازہ سامنے کھلا ہوتا ہے۔

کینیڈا میں نوکری حاصل کرنے کے لیے جو ایک بہت زیادہ اہم چیز ہے وہ ہے ان سابقہ اداروں کا حوالہ جہاں پر آپ پہلے کام کر چکے ہیں۔ یہ معاملہ میرے لیے ٹیڑھا ہو سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اپنے سابقہ باس فریڈ کو آگاہ کر دوں کہ میں نوکری کی تلاش میں ہوں اور اس ضمن میں اس کا حوالہ استعمال کروں گا۔ وہ کسی قسم کی جھوٹی معلومات میرے پچھلے کارناموں کے بارے میں نہ دے مگر غیر ضروری معلومات سے ضرور گریز کر سکتا تھا۔ ان کافروں میں یہی ایک خرابی ہے۔

ان میں سے اسی پچاسی لوگ سچے اور ایماندار ہوتے ہیں۔ ہم ان کی بہتری کے لیے ان کو مسلمان بنا کر اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ باقی اللہ کے ہاتھ ہے۔ یہ تو عام آدمیوں کا معاملہ ہے حکومت اور اس کے اداروں میں کام کرنے والے اس سچائی اور ایمانداری سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ حکومتی لوگ ہمارے حکمرانوں کے ہم قبیلہ ہیں۔ لیکن اُمید کی کرن یہاں بھی موجود ہے۔ وہ لوگ ابھی عوام کا پیسا اور دولت لوٹنے کے اس درجہ کمال کو نہیں پہنچے ہیں کہ جس درجۂ کمال پر ہمارے حکمران اور ان کی اولادیں فائز ہیں۔ ان کو ابھی تک اس سے استثنیٰ حاصل ہے۔ لیکن اس کے لیے قانون سازی کی جا سکتی ہے۔

میں فریڈ سے [illegible] سے "واپس" آنے اور پاکستان "واپس" جانے سے پہلے مل چکا تھا اور اس سے اس ملاقات کی غرض و غایت سے بھی آگاہ کر چکا تھا مگر یہ اب سے تقریباً ایک سال پہلے کی بات تھی۔ میں چاہتا تھا کہ فریڈ سے دوبارہ مل کر اس کی یاد دہانی کروا دوں۔ اس مقصد کی خاطر میں ورکو انڈسٹریز کے دفاتر میں پہنچ کر فریڈ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ہربرٹ بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے فریڈ سے اپنا مدعا بیان کیا۔ ہربرٹ نے سن کر کہا "مجھے پہلے ہی اتحادیوں کے معیار تعلیم سے شکایت تھی۔ اب اس کی تصدیق ہو گئی۔ اگر تم صحیح معنوں میں پڑھائی کرنا چاہتے ہو تو کسی جرمن یونیورسٹی میں جا کر پڑھائی کرو۔"

جرمن یونیورسٹی جانا تو اب ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں نے ہربرٹ کو بتایا کہ NED کالج جانے سے پہلے میرا جرمنی جانے کا خیال تھا۔ میں نے دو مہینے جرمن زبان بھی سیکھی تھی۔ اب بھی جرمن زبان میں گنتی گن سکتا ہوں۔

الٹے ہاتھ کی ہتھیلی پر سیدھے ہاتھ سے زور سے مُکہ مارتے ہوئے ہربرٹ نے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ "یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ تم نے جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کا سنہری موقع ضائع کر دیا۔"

ہربرٹ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اگر جرمنی اتنا ہی اعلیٰ اور ارفع ملک تھا تو وہ جرمنی کو چھوڑ کر کینیڈا میں کیا کر رہا ہے۔ میں نے تو جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔ لیکن ہربرٹ کے لیے تو اب بھی سنہری موقع موجود تھا۔ وہ کینیڈا کو خیرباد کہہ کر اب بھی جرمنی واپس جا سکتا تھا۔ لیکن جرمنی واپس جانے کی بجائے ہربرٹ نے کینیڈا میں ایک گھونسلا اور گاڑ لیا تھا۔ کہنے لگا "تم نے جرمنی میں پڑھنے کا موقع تو ضائع کر دیا مگر میں تم کو جرمن ماحول سے لطف اندوز ہونے کا ایک نادر موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ ہفتے کی رات تم میرے گھر گرمانے کی پارٹی میں شرکت کر سکتے ہو۔" یہ تھا ہربرٹ کا کینیڈا میں نیا گھونسلا۔ اس نے ٹورونٹو کے مضافات میں نیا گھر خرید لیا تھا۔

ہربرٹ کا پارٹی میں شمولیت کا دعوت نامہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ "ہاں شراب کی بوتل لانا مت بھولنا۔ تم فریڈ کی پارٹی میں فقیروں کی طرح خالی ہاتھ چلے آئے تھے۔"

میں اگر پارٹی میں گیا تب بھی میرا شراب کی بوتل

معاوضہ

ایک دوپہر کو ایک بہت ہی پرانی کھٹیچر سی کار ایک ریستوران کے سامنے آ کر رکی۔ کار چلانے والا اتر کر قریب کھڑے ہوئے ایک شخص سے بولا۔

"بھائی! ذرا کار کا خیال رکھنا۔ میں ابھی ٹیلی فون کر کے واپس آتا ہوں۔"

کار کا مالک ٹیلی فون کر کے واپس آیا تو اس نے کار کا خیال رکھنے والے شخص کے ہاتھ پر دو روپے انعام کے طور پر رکھ دیے۔

اس آدمی نے گھور کر کہا۔

"دس روپے دیجیے جناب!"

کار کے مالک نے حیران ہو کر کہا۔

"دس روپے۔۔۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ میں نے تو ریستوران میں پانچ منٹ بھی نہیں لگائے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جناب! میں وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس شرمندگی کا معاوضہ طلب کر رہا ہوں جو مجھے اس کار کے پاس کھڑے ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ادھر سے گزرنے والے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ کار میری ہے۔"

لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اسکینڈی نیوین پارٹی کا لطف تو میں فریڈ کے گھر گرمانے کی پارٹی میں دو سال پہلے اٹھا چکا تھا مگر مجھے جرمن پارٹی میں اس سے پہلے کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب موقع تھا۔ ہفتے کی رات کو میں تیار ہو کر ہربرٹ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہربرٹ مجھے بیرونی دروازے پر ہی مل گیا۔ مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھوں کو دیکھا پھر کہنے لگا۔ "آگئے نا! تم پھر خالی ہاتھ۔ اسی لیے میں نے تم کو فریڈ کے کمرے میں یاد دلایا تھا کہ شراب کی بوتل لانا مت بھولنا۔" ہم دونوں ہنستے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

گھر کے اندر وہی شور غوغا اور وہی شراب کی بو اور سگریٹ کا دھواں تھا جو فریڈ کی پارٹی میں تھا لیکن یہاں پر ایک جدت تھی۔ عام لائٹوں کی بجائے اودے رنگ کی ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں جن کی روشنی کے اثر سے لوگوں کے چہرے اور کپڑے عجیب سے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

یہاں پر فریڈ کے علاوہ میرے جاننے والوں میں پال، پیٹرک اور پیٹرک کی بیوی اینا شامل تھی۔ فریڈ کی پارٹی میں جو لباس اینجلی نے پہنا ہوا تھا بالکل وہی لباس اس وقت اینا نے پہنا ہوا تھا۔ یا تو اینجلی سے لیا ہوگا یا شاید یہ پارٹی ڈریس تھا جو کرایہ پر ملتا ہوگا۔ کیتھ اور اینجلی مجھے کہیں نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

ورکو انڈسٹری میں ملازمت کے دوران میں، میں اینا سے دو بار مل چکا تھا۔ میوزک شروع ہوا تو اینا نے میرے ساتھ ناچنے کی فرمائش کی۔ میرے شانے سے لگ کر اس نے مجھے اس زور سے بھینچا کہ اگر کچھ اور طاقت لگاتی تو میری پسلیوں کی خیر نہیں تھی۔ میوزک ختم ہوا تو میں نے اینا کا شکریہ ادا کیا اور باہر آ گیا۔ سامنے پال کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "پیٹرک کہاں ہے؟"

پال نے جواب دیا۔ "ابھی یہیں تھا، کہہ رہا تھا کہ میری بیوی حسن کے۔۔۔۔" پھر پال کو ایک دم خیال آیا کہ وہ تو حسن سے ہی مخاطب ہے۔ اس نے فوراً بات پلٹ دی۔

"میرا مطلب ہے ہربرٹ کے ساتھ ناچ رہی ہے۔ اس کو رجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔" مجھے یہ سن کر سخت ندامت محسوس ہوئی۔ اگر یہ واقعہ پاکستان کے کسی اندرونی گاؤں میں ہوا ہوتا تو وہاں خون خرابہ ہو چکا ہوتا۔ ایک دو قتل ہو چکے ہوتے کہ کسی کی بیوی کسی غیر آدمی کو رجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن پیٹرک اس بات کو پال کے سامنے فخریہ انداز میں بتا رہا تھا۔ مجھے ڈھاکے کا وہ رکشا چلانے والا یاد آ گیا جس کی بیوی خوبصورت تھی، جوان تھی اور وہ اپنی عزت کو پانچ روپے کے عوض فروخت کرنے کو تیار تھا۔ غربت اس کی مجبوری تھی۔

لیکن پیٹرک کا اپنی بیوی کا اس طرح سے ذکر کرنا اس کی بے حسی اور بیوی کے مقدس رشتے کی توہین تھی۔ یہ مغرب کے سماج اور ماحول کا بدترین رخ تھا۔ ان کی سچائی، ایمانداری، محنت اور احساسِ ذمہ داری قابلِ ستائش خوبیاں ہیں کہ ہم ان خوبیوں سے محروم ہیں لیکن زندگی کے ساتھی کے ساتھ یہ بے حسی ناقابلِ معافی ہے۔ یہ اور ایسی ہی چند اور خرابیاں مغرب کے ماحول میں ہیں جن کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلد ہو سکا میں اس ماحول سے نکل جاؤں گا۔

پارٹی ختم ہو چکی تھی۔ میں گھر آ کر سو گیا۔

☆☆☆

نوکری کی تلاش جاری تھی۔ میں نے کئی جگہ درخواستیں بھیج رکھی تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا۔ "میں مستو کینیڈا سے بات کر رہا ہوں۔ میرا نام مرے ہوف مین ہے۔ آپ نے ہماری کمپنی میں نوکری کے لیے درخواست بھیجی تھی۔"

میں نے اقبالِ جرم کیا کہ جی ہاں، یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ کہنے لگے "کل رات آٹھ بجے آپ مجھ سے فلاں فلاں ہوٹل میں ملاقات کریں۔" پتا ڈاؤنز ویو کے ایک ہوٹل کا تھا۔ ڈاؤنز ویو ٹورنٹو کا ایک محلہ ہے۔

بات ختم کرنے سے پہلے مسٹر ہوف مین نے اپنی شناخت بتائی۔ "میں برساتی پہنے ہوئے ہوں گا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ ہوگا اور ہاں میرے منہ میں تمباکو کا پائپ ہوگا۔"

جواباً میں نے ان کو اپنے حلیے سے آگاہ کر دیا۔

مجھے وقت کی پابندی کا ہمیشہ سے احساس رہا ہے کینیڈا جا کر اس کو اور زیادہ تقویت مل چکی تھی۔ میں ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی ساتھ ایک اور صاحب بھی اسی دروازے سے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ برساتی پہنے ہوئے تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھی اور منہ میں تمباکو کا پائپ۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اور ایک ساتھ ہوٹل میں داخل ہو کر ایک خالی میز پر قبضہ جما لیا۔ مرے نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پینے کے دوران میں وہ مجھ سے سوال جواب کرتے رہے۔ چائے ختم ہوئی تو مجھ سے گویا ہوئے۔ "مجھے امید ہے آپ ہمارے ساتھ کام کر کے خوش ہوں گے۔"

انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

مستو کا ہیڈ آفس برلنگٹن شہر میں تھا۔ میں نے ٹورونٹو شہر کو خیرباد کہا اور ہیملٹن شہر منتقل ہو گیا۔ یہ نسبتاً بڑا شہر تھا اور برلنگٹن سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ صبح اٹھنے کے بعد میں سب سے پہلا کام یہ کرتا تھا کہ اپنے بیڈروم کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھ لوں کہ کہیں رات میں برف نے دھاوا تو نہیں بول دیا۔ کسی کسی رات...... رات بھر میں ایک فٹ سے بھی زیادہ برف گر چکی ہوتی تھی۔ ہائی وے تو جلد صاف کر دی جاتی تھی مگر چھوٹی سڑکوں پر گاڑی چلانا اعصاب کی آزمائش ہوا کرتی تھی۔

مستو کا نیا اسٹور کھل رہا تھا۔ پیر کے دن اس کا افتتاح تھا۔ آج اتوار تھا۔ نئے اسٹور کا زیادہ تر سامان جا چکا تھا لیکن کچھ سامان ابھی باقی رہ گیا تھا۔ باب کو فارغ کرنے کے بعد ویئر ہاؤس کی ساری ذمے داری میرے سر آ پڑی تھی۔ اگر سامان وقت پر اسٹور نہ پہنچا تو اس کی جوابدہی میرے اوپر تھی۔

مستو کینیڈا کا کاروبار مرے کے بھائی ڈیوڈ ہوف مین نے بہت ہی ادنیٰ پیمانہ پر اپنے گھر سے شروع کیا تھا۔ پھر جب کاروبار نے ترقی کی تو ڈیوڈ نے باب کو بحیثیت ویئر ہاؤس منیجر ملازم رکھ لیا۔ ڈیوڈ اور مرے کی دن رات کی محنت نے کاروبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ کینیڈا کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں اس کے اسٹور کھل گئے۔ اتنے بڑے کاروبار کو سنبھالنا باب کی صلاحیتوں سے ماسوا تھا۔ اس کی کمزوریوں کی بنا پر کمپنی کے منافع میں کمی واقع ہوتی جا رہی تھی۔ ڈیوڈ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ منافع کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے باب کی جگہ دوسرا منیجر ملازم رکھا جائے۔ ڈیوڈ اور مرے نے باب کو فارغ کرنے کا فیصلہ میرے مستو میں شمولیت اختیار کرنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میری ملازمت شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد مرے نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ "تمہیں باب کو ملازمت سے فارغ کرنا ہے۔ اس کو نوٹس کی بجائے دو ہفتہ کی تنخواہ دے دینا۔ یہ کام آج ہی کر لینا اور کل سے تم کو باب کے فرائض بھی انجام دینے ہوں گے۔"

"لیکن میں باب کو کس بنا پر فارغ کر دوں۔ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تم کو جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ڈیوڈ کا فیصلہ ہے۔ وہ تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کو یہ کاروبار کیسے چلانا ہے۔ باب اتنے بڑے کاروبار کو چلانے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ اس کو جانا ہوگا۔"

باب چلا گیا۔ لیکن آنے والے ڈیڑھ سال کے اندر اندر ڈیوڈ ہاف مین کو بھی منافع کی کمی اور نقصان کا اندیشہ وہی راستہ دکھائے گا جو ڈیوڈ ہاف مین نے باب کو دکھایا تھا قطع نظر اس حقیقت کے کہ ڈیوڈ ہاف مین نے ہی مستو کو جنم دیا تھا اور اس باغیچے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی۔ لیکن سرمایہ داری نظام کسی کے خون کی پروا نہیں کرتا وہ صرف منافع پر چلتا ہے۔ جب مستو کو لگاتار نقصان کا

سامنا کرنا پڑا تو کمپنی نے ڈیڈ ہالف مین کو فارغ کر دیا کہ اب وہ کمپنی کو سود مند طریقے سے نہیں چلا رہا تھا۔

باب کی چھٹی ہو چکی تھی۔ نیا اسٹور کل کھلنا تھا۔ اسٹور کا باقی ماندہ سامان پہنچانا میری ذمہ داری تھی۔ میں نے سامان وین میں لدوایا اور نئے اسٹور جانے کے لیے ہائی وے 401 کا رخ کیا۔ صبح سویرے برف پڑ چکی تھی لیکن ہائی وے صاف کر دی گئی تھی۔ میں آرام سے اسٹور پہنچ گیا۔ اسٹور پر سامان اتروانے کے بعد میں واپس ہائی وے پر آ گیا۔ اب میں برلنگٹن واپس جا رہا تھا۔ سامان اتروانے کے بعد وین بالکل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں کوئی وزن نہیں تھا۔ انجن سامنے ہونے کی وجہ سے وین کا سارا وزن آگے کی طرف تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے نظام ثقل کا مرکز (سینٹر آف گریوٹی) بالکل آگے کی طرف آ چکا تھا۔

ہائی وے 401 کینیڈا کی معروف ترین ہائی وے ہے۔ تین لین آنے والی ٹریفک کے لیے اس کے بعد بیچ کی کھائی جس کے بعد جانے والی ٹریفک کے لیے تین لین۔ 401 تیز رفتار ہائی وے ہے لیکن برفباری کے سبب میں وین کو بیس پچیس میل سے زیادہ کی رفتار سے نہیں چلا سکتا تھا۔ میں آرام آرام سے وین چلا رہا تھا کہ یکایک سڑک پر سامنے جمی ہوئی برف کا ایک ٹکڑا آ گیا۔ جیسے ہی وین کا اگلا پہیا برف پر سے گزرا۔ وین گھوم گئی۔ اس نے جانے والی تینوں لین کراس کیں۔ اس کے بعد درمیانی کھائی کو پار کر کے آنے والی تینوں لین کراس کیں پھر مخالف سمت میں گھوم کر آنے والی تینوں لین دوبارہ کراس کیں پھر آخر کار درمیانی کھائی میں آ کر اور وین کا انجن بند ہو گیا۔ یہ سب کچھ صرف چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

ہائی وے 401 اتنی معروف شاہراہ ہے کہ اس پر اگر خدانخواستہ کوئی گاڑی ایک لین بھی کراس کر جائے تو دو ڈھائی سو گاڑیوں کا ٹکراؤ ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہاں تو چھ کی چھ لین کراس ہو چکی تھیں۔ زندہ بچنے کا کوئی امکان نہ تھا اگر 401 کی معمول کی ٹریفک ہوتی۔ اس وقت اگر ہزار گاڑیوں کا بھی آپس میں ٹکراؤ ہو جاتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ اتوار اور برف باری کے باعث میرے آس پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ کسی گاڑی کا ہائی وے 401 پر نہ ہونا بھی ایک غیر معمولی بات تھی کہ اس پر ہر وقت گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

پندرہ بیس منٹ تک میں وین میں ساکت وصامت گم صم بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد حواس ٹھکانے آئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گاڑی کو کھائی سے باہر نکالا اور برلنگٹن کا رخ کیا۔ اللہ نے آج بڑا کرم کیا تھا۔

کینیڈا میں سردی، برف باری میں سڑکوں کے حادثات بہت واقعات ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اسنو اتنی خطرناک نہیں ہوتی ہے جتنی منجمد بارش ہوتی ہے۔ یا وہ اسنو جو پگھلنے کے بعد دوبارہ جم جاتی ہے۔ دوبارہ جمی ہوئی اسنو برف کی ہلکی سی تہ بن جاتی ہے جس کی پھسلاہٹ انتہائی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے اس صورتِ حال سے بھی گزرنے کا اتفاق ہوا۔

ٹورنٹو کے مضافات سے ٹورنٹو شہر جانے کے لیے ایک ہائی وے ہے جس کا نام ہے گارڈنر ایکسپریس وے۔ ٹورنٹو شہر سے چند میل پہلے اس پر ایک گھماؤ آتا ہے جو تقریباً دو کلومیٹر لمبا ہے۔ ایک شام میں اس گھماؤ سے گزر رہا تھا۔ اسنو پگھل کر دوبارہ جم چکی تھی۔ گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے کوئی چار، پانچ کلومیٹر فی گھنٹہ رہ گئی تھی۔ اس وقت اس سڑک پر ہر ڈرائیور بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑیوں کو گھماؤ کے مطابق موڑنا بھی تھا لیکن اگر اسٹیئرنگ پر ذرا بھی زیادہ دباؤ ڈالا تو گاڑی پھسل کر آس پاس کی گاڑیوں سے جا ٹکرائے۔ بریک لگانا موت کو دعوت دینا تھا کہ گاڑی اس زور سے پھسلتی کہ ڈرائیور اور گاڑی دونوں کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ ہر ڈرائیور آس پاس کے ڈرائیور کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ صرف اُمید تھی۔ خدا خدا کر کے یہ موڑ کٹا۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ قیامت کے ڈیڑھ گھنٹے تھے۔

نئے اسٹور کا سامان چھوڑ کر میں گھر واپس آ چکا تھا۔ لیکن آج کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ میں سو رہا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "آپ کے ویئر ہاؤس میں چور گھس آیا ہے۔ فوراً پہنچیں۔" یہ ٹیلی فون سکیورٹی کی طرف سے آیا تھا۔

میں نے منہ پر گرم پانی کے چھینٹے مارے۔ کوٹ پہنا۔ اس کے اوپر اوور کوٹ پہنا۔ سر پر ایسی ٹوپی پہنی جو کانوں کو بھی چھپاتی تھی اور ہاتھ میں دستانے۔

ویئر ہاؤس پہنچا تو وہاں پر دو گاڑیاں پولیس والوں کی اور ایک گاڑی سکیورٹی کمپنی کی کھڑی تھیں۔ میرا انتظار ہو رہا

تھا۔ ویئر ہاؤس کی چابیاں میرے پاس تھیں۔

ویئر ہاؤس میں جو سیکیورٹی سسٹم لگایا گیا تھا اس میں آواز جیسے چاپ، باتیں وغیرہ، محسوس کرنے کے آلے (سنسر) بھی موجود تھے۔ کوئی کھڑ بڑ ہوتا یا چاپ کی آواز ہوتی تو وہ بھی پکڑ میں آجاتی تھی۔ انہیں صوتی سنسر کے سگنل سے معلوم ہوا تھا کہ ویئر ہاؤس کے اندر کوئی موجود ہے۔

پولیس والے اسلحے کے ساتھ ویئر ہاؤس کے اندر داخل ہوئے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ ٹھہرتا رہا۔ چند منٹ کے بعد ایک پولیس والا باہر نکلا تھا اس نے نکل کر مجھے آواز دی۔ ''آجائیں چور پکڑا گیا۔''

میں اندر گیا تو دیکھا کہ چور پولیس والے کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے اقبالِ جرم کیا۔ ''میاؤں'' یہ ایک بلی تھی جو کسی طرح ویئر ہاؤس کے اندر رہ گئی تھی اور باہر نکلنے کی جدوجہد میں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ اس کی اس بھاگ دوڑ سے صوتی سنسر کے سگنل نے سیکیورٹی کمپنی کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس چور کو ہتھکڑی لگانا بے سود ہوتا۔ میری نیند خراب ہو چکی تھی۔

چند دن بعد میں کسی کام سے ریجکر شاپ گیا۔ ریجکر شاپ کے باہر تین چار اسکڈ رکھے ہوئے تھے جو ہارڈ ویئر سے لدے ہوئے تھے۔ اس میں کار ریڈیو، ٹیپ پلیئر، کیسٹ پلیئر وغیرہ شامل تھے۔ میں نے معلوم کرنا چاہا کہ آخر اتنی بڑی تعداد میں یہ ہارڈ ویئر کے یونٹ کیوں رکھے ہوئے ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ یہ تمام کے تمام یونٹ کباڑی کو دینے کے لیے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آخر یہ تمام کا تمام مال کباڑ میں کیوں بیچا جا رہا ہے کیونکہ ان میں سے تقریباً تین چوتھائی ثمک ایسے تھے جو دیکھنے میں بالکل نئے لگ رہے تھے۔ مجھے کباڑ میں بیچنے کی وجہ بتائی گئی۔

''یہ تمام کے تمام ثمک یونٹ وارنٹی کے تحت مرمت کے لیے آئے تھے۔''

''تو پھر ان کی مرمت کیوں نہیں کی جا رہی ہے۔''

''اس لیے کہ جتنا خرچ مرمت کرنے میں آئے گا۔ اس سے کم پیسوں میں ہم ان کو نیا یونٹ دے سکتے ہیں اور کباڑی سے جو پیسے ملیں گے وہ اس کے علاوہ ہیں۔''

ستمر کی زیادہ تر ہارڈ ویئر جاپان سے بن کر آتی تھی اور بہت سستی پڑتی تھی۔ اس کے برعکس کینیڈا میں مزدوری اتنی مہنگی تھی کہ نیا یونٹ وارنٹی میں دے دینا سستا پڑتا تھا بہ نسبت اس کی مرمت کرنے کے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر یہ یونٹ پاکستان میں ہوتے تو یہ سارے کے سارے یونٹ مرمت کر لیے جاتے۔ شاید ان میں سے کوئی ایک ثمک بھی ضائع نہ جاتا۔ ہمارے ملک میں بہترین دماغ موجود ہے۔ صرف اعلیٰ سطح اور تعلیم میں ہی نہیں بلکہ کم ترین سطح پر بھی۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہماری ذہانت غلط راہوں پر نکل پڑی ہے۔ دولت کی ہوس نے ہمارے ہر جذبے کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ہم طالب ''دولت'' ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
(اصل مصرعہ: ہم طالب شہرت ہیں.....)

پچھلے دو سال سے ستمر کو منافع نہیں ہوا تھا۔ کمپنی مسلسل گھاٹے میں جا رہی تھی۔ یہ بات کمپنی کے اسٹیک ہولڈرز کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ انہوں نے ڈیوڈ ہاف مین کو اسی راستے پر بھیج دیا جس راستے پر ڈیوڈ نے باب کو بھیجا تھا۔ اس بات کو کوئی اہمیت دیے ہوئے کہ ڈیوڈ نے ہی اس کمپنی کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کو جنم دیا تھا۔ اس کو اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ اگر ڈیوڈ اس کمپنی سے منافع نہیں کما سکتا ہے تو اس کی جگہ کسی اور کو لگایا جا سکتا تھا۔

کمپنی کا نیا پریذیڈنٹ جان کرین۔ جان سے پہلی ملاقات کے دوران میں ہی ہم دونوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہم دونوں کی سوچ کا انداز مختلف تھا۔ چند دن بعد میں نے اپنا استعفیٰ جان کے ہاتھ میں پکڑایا اور عارضی طور پر پاکستان ''لاٹھی'' آگیا۔ چند مہینے کے لیے۔ پاکستان میں کچھ وقت گزارنے کے بعد جب میں پاکستان سے کینیڈا ''لاٹھی'' آیا تو اس کے چند مہینے بعد میری کینیڈا میں قیام کی وہ مدت پوری ہو چکی تھی جب میں وہاں کی شہریت کے لیے درخواست دے سکتا تھا۔ میں نے درخواست دے دی۔ اب صرف شہریت کے لیے انٹرویو اور شہریت کی حلف برداری کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔

جب دو مہینے انتظار کے بعد بھی انٹرویو کی کوئی سن گن نہیں ملی تو میں نے اپنا سامان پانی کے جہاز سے پاکستان روانہ کیا اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر جدہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاز فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے ٹورنٹو شہر کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میں نے ان روشنیوں پر آخری نظر ڈالی۔ کینیڈا..... الوداع۔

(جاری ہے)

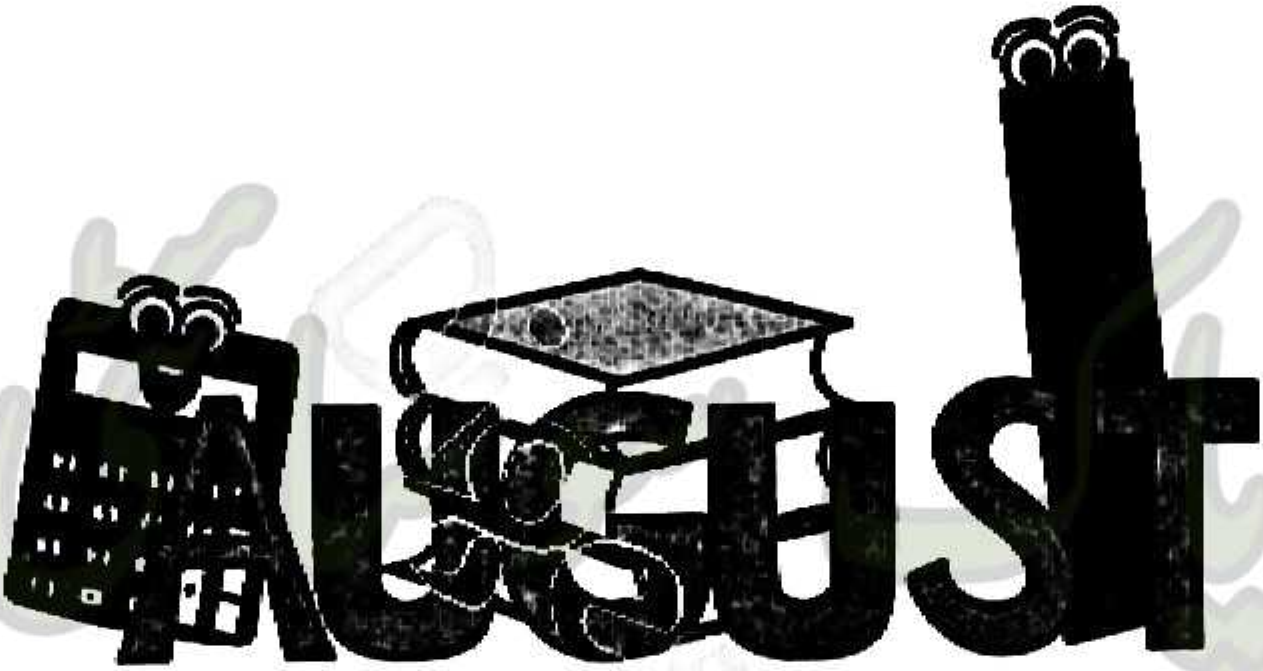

اگست

منظر امام

عیسوی سن کا یہ مہینا کئی معنوں میں اہم ہے۔ ہمارے لیے تو بطور خاص اہم ہے کہ اس مہینے کی چودہ کو ہم نے دو سو سالہ غلامی کی زنجیر کو کاٹ کر اپنا ملک آزاد کرایا تھا، اس مہینے میں اور کتنے اہم واقعات رونما ہوئے اس کا مختصر سا جائزہ۔

معلومات حاصل کرنا جنہیں پسند ہے ان کے لیے تحفہ

یہ عیسوی سال کا آٹھواں مہینا ہے۔ لاطینی میں اس مہینے کو Sextilis کہتے ہیں کیونکہ کسی زمانے میں رومی کیلنڈر کے مطابق یہ سال کا چھٹا مہینا ہوتا تھا۔ 753Bc تک یہ سال کا چھٹا ہی مہینا رہا۔ جبکہ اس زمانے میں مارچ سال کا پہلا مہینا ہوتا تھا۔ پھر 700BC میں یہ سال کا آٹھواں مہینا ہوگیا۔ اس کے دنوں کی تعداد میں بھی الٹ پھیر ہوتی رہی ہے۔ یہ پہلے انتیس دنوں کا ہوا کرتا تھا۔ پھر جولیس سیزر نے اس میں اس وقت توسیع کردی۔ جب

وہ جولین کیلنڈر ترتیب دے رہا تھا۔

جب سے یہ دنیا بنی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مہینا خالی گیا ہو جب انسانی تہذیب نے انقلابات نہ دیکھے ہوں۔ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔

اسی مہینے 14 اگست کو دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کا اضافہ ہوا۔ وہ ہے میرا اور آپ کا پاکستان۔ جسے لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا۔ چودہ اگست پاکستان کا یوم آزادی ہے، جبکہ پندرہ اگست ہندوستان کا۔ اسی مہینے ایڈن برگ اسکاٹ لینڈ میں مشہور آرٹ فیسٹیول بھی ہوا کرتا ہے۔ اس فیسٹیول میں دنیا بھر سے آرٹ کے دلدادہ اور پرفارمر شامل ہوا کرتے ہیں۔ موسیقی، پینٹنگ، مجسمہ سازی، اسٹیج اور اسٹیریٹ تھیٹرز، شاعری، کیا نہیں ہوتا۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا فیسٹیول ہوتا ہو جہاں ادب اور آرٹ کے پیاسے اپنی پیاس بجھا سکیں۔ یہ مہینا مختلف بیماریوں کے خلاف ٹیکے لگانے کی مہم سے آگاہی کا مہینا ہے۔ فلپائن میں یہ مہینا ان کی اپنی زبان فلپینو سے آگاہی کا ہوا کرتا ہے۔ (چونکہ اس میں تاریخ کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے میں نے تاریخ نہیں لکھی)

اوہیو میں اس مہینے ایک بہت دلچسپ جشن ہوا کرتا ہے اور وہ ہے جڑواں بچوں کا جشن۔ ملک بھر سے جڑواں خاص طور پر اس جشن میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ جشن میں بھی ایک فیسٹیول ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت قدیم یہودی روایت ہے۔ اس میں پورا خاندان ایک ساتھ ہو کر خوشیاں مناتا ہے۔ ایک دوسرے کو اپنے حالات سے باخبر کرتا ہے۔

اگست کے اس مختصر سے تعارف کے بعد آئیں اگست کی تاریخوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی اگست

Francis Scott Key کی پیدائش۔ 1779ء

یہ امریکی وکیل جارج ٹاؤن میں پیدا ہوا۔ ایک اچھا مصنف اور شاعر بھی تھا۔ اس نے امریکا کے لیے ایک ترانہ لکھا تھا Thestar-spangeed Banner۔ امریکی تاریخ میں اس لحاظ سے اس کی بہت اہمیت ہے۔

پہلی اگست 1949ء کو کینیڈا کے سائنس داں جارج ڈاوسن کی پیدائش ہوئی۔

1884ء میں جان مایون کی پیدائش ہوئی۔ اس نے امراض میں پنسلین کا استعمال شروع کیا۔

1936ء میں فرانس کے مشہور فیشن ڈیزائنر ایو سینٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا فیشن ڈیزائنر کہا جاتا ہے۔

پہلی اگست 1981ء کو دنیا کا سب سے مشہور اور مقبول ٹی وی میوزک چینل MTV شروع ہوا۔ اس کی ابتدا نیویارک سٹی سے ہوئی۔ ایک ادارہ تھا Viacum Media Network جس نے یہ چینل شروع کیا۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اس کی نشریات دیکھی اور پسند کی جاتی ہیں۔ میوزک کے شائقین کے لیے اس سے بہتر اور مستند کوئی میوزک چینل نہیں ہے۔ ایک مکمل میوزک چینل کا تصور بہت پرانا ہے۔ 1960ء کی میں کچھ اداروں نے اس پر سوچنا اور کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ مشہور گروپ Beatles کے تعاون سے مختصر پیمانے پر ایک چینل کی ابتدا ہوئی۔ بیٹلز نے اپنے مشہور گانے اس چینل سے پیش کیے جیسے A hard Days Night اور Cant buy me love وغیرہ۔

ایک میوزک چینل MTV سے پہلے بھی آ چکا تھا۔ مشہور فلم ساز ادارے وارنر برادرس نے میوزک ٹی وی شروع کیا تھا۔ MTV سے دکھایا جانے والا پہلا وڈیو The Buggles کا Video killed the radiostar تھا۔

پہلی اگست کو Respect for Paronsts Day یعنی اپنے والدین کی عزت کرنے کا دن منایا جاتا ہے (ہم خدا کے فضل سے کسی دن کے تکلف کے بغیر والدین کی عزت کرتے ہیں)

پہلی اگست 1291ء میں سوئٹزرلینڈ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

سوئٹزرلینڈ کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہ ملک اپنی بے پناہ فطری خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ 1291ء میں تین ریاستیں اس میں شامل ہوئی تھیں۔

یہ ایک بہت پُرسکون اور غیر جانب دار ملک ہے۔ یہ اب تک کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا۔ چھوٹا ہونے کے باوجود اس کی اکانومی بہت مضبوط اور بااثر ہے۔

اس کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے۔ مشکل سے ایک کروڑ کے قریب ہوگی۔ اس کے باوجود صرف اپنی مضبوط

اٹالوی کی وجہ سے اسے اقوامِ عالم میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

یہاں جرمنی، فرنچ، اٹالین اور سوئس زبانیں بولی جاتی ہیں۔

پہلی اگست کو The wonbar Ful Wizard of oz فرینک بام نے رجسٹرڈ کروایا تھا۔

1941ء میں ولیز ٹرک کمپنی نے پہلی جیپ سامنے لائی تھی۔

پاکستان میں 1960ء میں حکومتِ پاکستان کا مرکز اسلام آباد قرار پایا۔

دو اگست 1834ء کو مشہور فرانسیسی مجسمہ ساز اگسٹی برتھو ہولڈی کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے امریکا کا مشہور مجسمہ آزادی statue of Libarty ڈیزائن کیا تھا۔ 1835ء میں الیشا گرے کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ابتدائی فون کا تجربہ کیا تھا۔ 1926ء میں ایک کامیاب بزنس مین Betsy Bloonring کی پیدائش ہوئی۔ اس نے امریکا کا مشہور ڈیپارٹمنٹل اسٹور قائم کیا۔ 1904ء میں مائیکل اوون نے شیشہ سازی کی صنعت کی ترقی کے لیے شیشے کو ڈھالنے کا فریم بنایا۔ اس کے بعد شیشہ سازی کی صنعت کو ترقی ہوئی۔ اسی تاریخ کو ہیری ہوون کی پیدائش ہوئی تھی۔

1492ء۔3 اگست یہ وہ تاریخ ہے جب مشہور جہاز راں کولمبس اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

3 اگست 1897ء کو ولیم پیٹر اور والٹر نائٹ نے اسٹریٹ کار کنٹرولر متعارف کروایا تھا۔

1961ء میں 4 اگست کو امریکی موجودہ صدر بارک اوباما کی پیدائش ہوئی۔ اسی تاریخ کو 1755ء میں نکولس جیک کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پنسل ایجاد کی تھی۔

1857ء میں ناروے کے ادیب نٹ ہان سن کی پیدائش ہوئی۔ اپنے بے مثال کاموں پر ہان سن نے 1920ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

پانچ اگست 1930ء میں اوہیو میں نیل آرم اسٹرونگ کی پیدائش ہوئی وہی چاند پر جانے والا مشہور خلا باز۔

1902ء میں رابرٹ برائٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ رابرٹ برائٹ امریکی مصنف اور تصویر نگار۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے اس کو جانا جاتا ہے۔ اس نے 40 سال میں 20 کتابیں لکھیں اور وہ سب کی سب مقبول ہیں۔

1944ء میں اس نے "جارج" لکھا تھا۔ اس کتاب کا شمار بچوں کے کلاسیک میں کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بچے اور ایک شرمیلے بھوت کی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کی دوسری کتابوں میں Travel of Ching اور The Olivars وغیرہ ہیں۔

5 اگست 1540ء میں جوزف جسٹس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے جولین کیلنڈر کو تاریخیں دیں۔

1802ء میں نیل آبل کی پیدائش ہوئی۔ یہ ناروے کا مشہور ریاضی دان تھا۔

5 اگست 1904ء کو مشہور ماہر حیاتیات Kauneth thi man کی پیدائش ہوئی۔ جڑی بوٹیوں پر اس نے بے مثال کام کیا تھا۔

1906ء میں ماہر معاشیات وسلی کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1973ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

5 اگست 1997ء کو تھوری ہاسکن نے اپنی ایجاد Talking Patty رجسٹر کروایا تھا۔

6 اگست 1917ء میں باربرا کونی کی پیدائش ہوئی تھی۔

باربرا کونی۔ بچوں کے ادب پر کام کرنے والی امریکی مصنفہ باربرا نیویارک میں پیدا ہوئی تھی۔ انتقال 10 مارچ 2000ء کو ہوا۔ اس کی کتابوں نے اسے دو بار بہترین مصنفہ کا اعزاز دلوایا۔

اس کی مشہور کتابوں میں Dx-Cort man, Miss Ranm Pttlus وغیرہ ہیں۔ اس تاریخ کو اوڈی کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔ بچوں کا پسندیدہ کارٹون کردار گارفیلڈ کی دوست ٹی وی دیکھنے والا ہر بچہ گارفیلڈ کو جانتا ہے۔

1809ء کو الفریڈ لارڈ ٹینی سن کی پیدائش ہوئی۔ بہت اچھا شاعر، مناظر فطرت پر اس کی شاعری کلاسک کا درجہ رکھتی ہے۔

6 اگست 1859ء میں جے آرتھر کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ ایک مشہور میٹلرجسٹ تھا۔ اس نے ایمیزن پار کرنے کے لیے گرم ہوا کا غبارہ بنایا تھا۔

6 اگست 1976ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے پورٹ قاسم کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

1928ء میں Betsy Byars کی پیدائش

ہوئی تھی۔

یہ ایک مشہور امریکی مصنفہ ہے۔ اس نے بچوں کے ادب پر بہت کام کیا ہے (ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب میں بچوں کے ادب پر باقاعدگی سے کام ہو رہا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے)

Betsy کا ناول Summer of The Swan 1971ء کی بہترین کتاب قرار پائی تھی۔

7 اگست 1779ء میں Carl Ritter کی پیدائش ہوئی۔ اس نے علم جغرافیہ کو جدید نظریات دیے۔

1783ء میں جان ہیتھ کوٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے لیس بنانے کی مشین بنائی تھی۔

سات اگست 1880ء میں گستاؤ ریپ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے انسانی جسم میں ایک خاص قسم کے جنسی ہارمون کا پتا چلایا تھا۔

1886ء میں لیوس ہیزل ٹائن کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ایک سرکٹ بنایا جو نیوٹروڈائن سرکٹ تھا۔ اس کی وجہ سے آگے جا کر ریڈیو کی ایجاد ممکن ہو گئی تھی۔

1903ء میں ایک مشہور انتھروپولوجسٹ لیوس کیلے کی پیدائش ہوئی۔

7 اگست 1935ء میں ولیم کوبج نے Cat Hose Ray Tube متعارف کروایا۔ یہ آلہ ٹی وی اور دیگر برقی مصنوعات میں استعمال ہوتا ہے۔

7 اگست 1944ء میں پہلا پروگرام کنٹرولڈ کیلکولیٹر سامنے آیا۔ اسے ہوورڈ ایکن نے مشہور ادارے IBM کے تعاون سے بنایا تھا۔

17 اگست 1955ء میں اس وقت کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے استعفیٰ دیا تھا۔

7 اگست کو (یعنی 2014) کے حساب سے اسلامی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ جنگ حنین پیش آیا تھا۔ (بہ مطابق دس شوال)

8 اگست 1861ء میں ایک برطانوی بایولوجسٹ ولیم بیٹ سن کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہلی بار دنیا کو جینٹک کی اصطلاح دی۔

1901ء میں ایک مشہور سائنس داں ارنسٹ لارنس پیدا ہوا۔ اس نے 1939ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

1902ء میں مشہور برطانوی فزیسٹ (ماہر فزکس) ارنسٹ لارنس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کوانٹم میکانک بنایا اور 1933ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔

8 اگست 1922ء میں مشہور فیشن ڈیزائنر روڈی گرنیچ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے پہلا تیراکی کا لباس اور منی اسکرٹ بنایا۔

8 اگست 1911ء میں فرانسس ہرلن نے گاڑیوں کے لیے ایک نیا ٹائر متعارف کروایا۔

1819ء میں ولیم تھامس گرین کی پیدائش۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دندان سازی میں سب سے پہلے ایتھر کا استعمال کیا۔

9 اگست 1898ء میں روڈالف ڈیزل نے ڈیزل انجن بنایا تھا۔

1910ء میں آسٹریلوی فزسٹ ولیم فاؤلر کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1983ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

1927ء میں مارون منسکی کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کمپیوٹر کے لیے Artificial Intellegence بنایا تھا۔

دس اگست 1909ء میں مشہور زمانہ فورڈ موٹر کارپوریشن نے ٹریڈ مارک فورڈ رجسٹرڈ کرایا۔

اس بار دس اگست کو مادھو لال حسین کا عرس لاہور میں ہوگا۔ مادھو لال حسین اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تھے۔ ان کا مزار اچھرا لاہور میں ہے۔ آپ اپنے حال میں مست رہنے والے صوفی بزرگ تھے۔ ان کی شاعری رندانہ تصوف کی شاعری ہے۔

آپ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "ربا میرے حال دا محرم تو۔

اندر توں ہیں باہر توں ہیں روم روم وچ توں۔ توں ہی تانا توں ہی بانا سب کچھ میرا توں۔

دس اگست 1921ء میں مشہور مصنف ایلکس ہیلے پیدا ہوا تھا۔

ایلکس ہیلے کی کئی کتابیں بیسٹ سیلر کی فہرست میں رہی ہیں۔

گیارہ اگست 1958ء میں کرسٹن ایجک مین کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک مشہور ہائجینولوجسٹ تھا۔ اس نے 1929ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

1926ء میں برطانوی لارا ایشلے کی پیدائش۔ فیشن ڈیزائنر

مشہور برانڈ "لارڈ شلے" کا خالق۔

گیارہ اگست 1953ء میں مشہور ریسلر ہلک ہوگن کی پیدائش ہوئی۔

یہ ریسلر جارجیا میں پیدا ہوئے۔ اس کا پورا نام ٹیری جین جولیا ہے۔ لیکن شہرت ہلک ہوگن سے پائی۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کبھی فاؤل پلے نہیں کیا۔ یعنی ریسلنگ میں غلط طریقے نہیں اپنائے۔ ہلک ہوگن ریسلر ہونے کے علاوہ سنگر اور کمپوزر بھی رہا ہے۔ اس کے ٹریز کا نام Itioro تھا۔ ہلک ہوگن نے دو بار 1990ء اور 1991ء میں رائل ریسل جیت کر ریکارڈ بنایا تھا۔

گیارہ اگست 1999ء میں مکمل سورج گرہن ہوا تھا جبکہ پچھلا سورج گرہن 3 نومبر 2013ء کو دیکھا گیا تھا۔ یہ گرہن یورپ کے کچھ حصوں، شمالی امریکا ایشیا اور افریقا کے کچھ علاقوں میں دیکھا گیا تھا۔

گیارہ اگست 1973ء کو چوہدری فضل الٰہی پاکستان کے صدر قرار پائے تھے۔

گیارہ اگست 1950ء میں پیدا ہونے والے Steve wozniak نے ایپل کمپیوٹر متعارف کروایا تھا۔

بارہ اگست 1930ء کو کلیرنس برڈ نے خوراک کو منجمد کرکے ان کی پیکنگ کا طریقہ دریافت کیا۔ اس طرح ہم ڈبوں میں بند خوراک کو کئی دنوں بعد بھی استعمال کرسکتے ہیں۔

بارہ اگست 1981ء میں IBM کے PC کا اعلان ہوا۔

یہ ملٹی نیشنل ٹیکنالوجی اور کنسلٹنگ کا بہت بڑا ادارہ ہے۔ اور تقریباً پوری دنیا کو اپنی سروس فراہم کرتا ہے۔ اس کا پورا نام International Business Macttinas ہے۔ IBM کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے۔ اس کا قیام 1911ء میں ہوا تھا۔

پہلے اس کا نام Computer Tabulating Recording Compny تھا۔ پھر یہ IBM ہوگیا۔

13 اگست 1860ء میں Annie oaklery کی پیدائش ہوئی تھی۔ اینی اوکلے اوہیو میں پیدا ہوئی۔

اس کی شہرت نام بنانے جیسی تھی۔ اچھل کود، گھڑ سواری، نشانہ بازی اس کے مشاغل تھے۔ بلا کی مہم جو تھی۔ اس نے اپنی حرکتوں سے ایک دنیا کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس نے اسکول کے زمانے ہی سے شوٹنگ کے مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا اور کامیاب ہوتی چلی گئی۔ مشہور شو Wils West شو کی میزبان بھی رہی۔

13 اگست 1655ء میں جوہان کرسٹوف کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ایک مشہور ساز کلارینٹ بنایا تھا۔

اسی تاریخ کو 1819ء میں جارج گیبریل کی پیدائش۔ اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والا یہ شخص فزسسٹ اور ریاضی دان تھا جبکہ 1888ء میں اسکاٹ لینڈ میں جان لاگ بیرڈ کی پیدائش۔ اس نے ٹی وی کا ایک سسٹم بنایا۔ اسی تاریخ کو 1902ء میں جرمنی کے فلکس وانکل کی پیدائش۔ اس شخص نے وانکل روٹری انجن سسٹم بنایا۔

1918ء میں برطانوی بائیو کیمسٹ فریڈرک سانگر

فرخ سیر

1683-1719ء

شہنشاہ عظیم الشان کا بیٹا، شاہ عالم کا پوتا۔ الٰہ آباد کے صوبیدار عبداللہ خان بارہہ اور اس کے بھائی سید حسین علی خان کی مدد سے فوج تیار کرکے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے جہاندار شاہ ابن شاہ عالم بہادر شاہ اول سے کھجوا میں لڑا۔ فتح پائی، پھر آگرہ میں دوسری مرتبہ اسے شکست دے کر قتل کیا۔ 1723ء میں بادشاہ بن گیا لیکن تمام اختیارات سید برادران کے ہاتھ میں تھے جنہیں لوگ "بادشاہ گر" کہنے لگے تھے۔ لوگوں کے بھڑکاوے میں آکر بادشاہ نے ان سید بھائیوں سے دشمنی پیدا کرلی جبکہ وہ انہی کی مدد سے بادشاہ بنا تھا۔ حسین علی خان دکن سے مرہٹوں کو چڑھا لایا اور انہیں دکن میں چوتھ وصول کرنے کا حق دے دیا۔ مرہٹوں کی مدد سے سید بھائیوں نے فرخ سیر کو قید کرکے قتل کرا دیا۔ رفیع الدرجات اور رفیع اللہ کو یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھایا وہ تین تین مہینے میں فوت ہوگئے۔ پھر سیدوں نے شاہ عالم بہادر شاہ کے ایک پوتے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے بادشاہ بنا دیا۔

مرسلہ: نعمان اختر، راولپنڈی

کی پیدائش ہوئی اس نے دوبار نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ ایک بار 1958ء میں اور دوسری بار 1980ء میں۔

1512ء Aztoe کا خاتمہ ہوا تھا۔ یہ وہ تہذیب ہے جو ختم ہوگئی۔ یہ تہذیب وسط میکسیکو کی تھی۔ چودھویں سے سولہویں سنچری تک قائم رہی۔

اس لفظ کا مطلب ہے وہ لوگ جو Aztlan سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان نوہاٹی کہلاتی تھی جو اب معدوم ہو چکی ہے۔ یہ سرخ ہندی Red Indian کہلاتے تھے۔ شمالی امریکا کی سابقہ تہذیبوں میں سے ایک یہ قوم بہت ذہین تھی۔ اس نے اپنی ذہانت کے کئی ثبوت دیے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی درست تقویم کا استعمال کرتے تھے جو 365 دنوں پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ ایک مذہبی تقویم بھی تھا جو 260 دنوں کا ہوتا تھا۔ آزٹیک کا صدر مقام "تینوں جیلان" تھا۔

یہ شہر ایک بڑے جزیرے پر بنایا گیا تھا۔ اس وقت یہ شہر دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک ہوا کرتا تھا۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے اہرام آج بھی میکسیکو میں موجود ہیں اور دیکھنے والوں کو حیران کرتے رہتے ہیں۔ اس تاریخ کو نیشنل کریم ڈے بھی منایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1917ء میں Alica Provensen کی پیدائش ہوئی۔ آلائس شکاگو میں پیدا ہوئی۔ اس کے شوہر کا نام مارٹن پروون سین تھا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان بے انتہا موافقت تھی۔ دونوں برسوں تک مل کر کام کرتے رہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے چالیس کے قریب کتابیں لکھیں اور تصویریں بھی بنائیں۔ دونوں اپنے آپ کو ایک جان اور دو قالب نہ صرف کہا کرتے بلکہ اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔

چودہ اگست 1945ء دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔

اتحادی افواج جاپان کی کامیابیوں سے بہت پریشان ہوگئی تھیں لہٰذا انہوں نے جاپان کے خلاف ایک ایسا بے رحمانہ قدم اٹھایا کہ انسانی تاریخ میں خون ریزی کی اس سے بڑی مثال نہیں ملتی۔ جاپان نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب 6 اگست 1945ء کو امریکا نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا۔ جس میں اتنی تباہی ہوئی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کیا۔ 16 اگست 1945ء کو دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرایا۔ اس کے بعد جاپان کے پاس سرینڈر کر جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ کہا یہ جارہا تھا کہ اس طرح ہر شہر پر بم گرایا جائے گا۔ اس خوف سے بالآخر 14 اگست 1945ء کو اس نے کُل طور پر سرینڈر کر دیا۔

چودہ اگست 1777ء Hans Crisians Oersted کی پیدائش۔ ڈنمارک کا فزسٹ اور کیمسٹ۔ اس نے ویو آف کیمیکل لکھا اور الیکٹرو میگنٹزم پر کئی تجربات کیے۔

1883ء ارنسٹ جسٹ کی پیدائش۔ یہ ایک مشہور بائیولوجسٹ تھا۔

1903ء میں سرکس ڈائریکٹر جان رنگلنگ کی پیدائش۔ یہ شخص رنگلنگ برادرز میں سے ایک تھا۔ ایجادات کے شعبہ میں IBM نے MS.DOS ورژن متعارف کروایا۔

چودہ اگست 1947ء۔ پاکستان کا یوم آزادی۔ اسی تاریخ کو 1991ء میں نواز شریف نے والٹن پر باب پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور 2000ء میں پرویز مشرف نے لوکل گورنمنٹ آرڈی ننس نافذ کیا۔

15 اگست 1912ء میں جولیا چائلڈ کی پیدائش۔ یہ خاتون اپنے زمانے میں پورے امریکا کی خواتین کی پسندیدہ تھیں۔ یہ کیلی فورنیا میں پیدا ہوئی۔ یہ بہترین مصنفہ تھیں۔

جولیا نے فرانسیسی لذیذ کھانوں کو امریکا میں نہ صرف متعارف کروایا بلکہ ان کو بنانے کے طریقے بھی ٹی وی پر بتاتی رہی۔

15 اگست 1744ء میں مشہور سوئس ماہر نباتات ایلین فریڈ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے Mycolgicum سسٹم ایجاد کیا۔

16 اگست 1892ء میں فرانسیسی فزسٹ لوئس وکٹر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے 1929ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

1896ء میں Leon Therewin کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ایک ساز ایجاد کیا تھا اس ساز کا نام اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔

16 اگست 1845ء میں گیبرائل لپ مین کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک فرانسیسی فزسٹ تھا۔ (فزکس کے علم کا ماہر) اس نے فوٹوگرافی کے لیے پہلی فوٹوگرافک پلیٹ بنائی۔ فزکس کے شعبے میں اپنی خدمات پر 1908ء میں نوبل

انعام بھی حاصل کیا۔

1848ء میں فرانسیسی ڈاروین کی پیدائش ہوئی۔ پوری دنیا کا متنازعہ ترین دانشور۔ اس کی تھیوری آف ریولیوشن نے ایک ہنگامہ برپا کر کے رکھ دیا تھا اور آج تک اس پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے کام کو اس کے بیٹے چارلس ڈارون نے آگے بڑھایا۔

16 اگست 1862ء کو ایک ایسے شخص کی پیدائش ہوئی جس کو کھیلوں کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس کا نام ایمس الونزو اسٹاگ تھا۔ یہ فٹ بال کے بانیوں میں سے تھا۔

16 اگست 1904ء کو Wandepp stanlay کی پیدائش ہوئی۔ مشہور بائیو کیمسٹ۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے وائرس کو کرسٹلائز کیا۔ 1946ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔ 16 اگست 1961ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتقال ہوا۔

اسی تاریخ کو 1991ء میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ ریٹائر ہوئے۔ ان کے بعد یہ عہدہ جنرل آصف نواز نے سنبھالا۔

16 اگست 1997ء میں گلوکار، موسیقار استاد نصرت علی خان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 48 سال تھی۔

17 اگست 1870ء کو فریڈرک رسل کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے ٹائیفائیڈ کا موثر ٹیکہ بنایا تھا۔

17 اگست 1906ء میں ہیزل بشپ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک مشہور کیمسٹ اور کاسمیٹکس بنانے والا تھا۔

17 اگست 1993ء میں تھامس ولش نے اسکیٹ بورڈ پیٹنٹ تھا۔

1939ء میں مشہور فلم Wizaed of Oz کا پریمیئر ہوا۔

17 اگست 1988ء کو ضیاء الحق کے طیارے کو بدترین حادثہ پیش آیا تھا جس میں وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

18 اگست 1934ء میں مارشل فیلڈ کی پیدائش ہوئی اس نے مارشل فیلڈ ڈیپارٹمنٹل اسٹور قائم کیا تھا۔

1904ء میکس فیکٹر جونیئر کی پیدائش۔ جو میکس فیکٹر کاسمیٹکس کا Ceo اور میکس فیکٹر سینئر کا بیٹا تھا۔ پوری دنیا کی خواتین اس ادارے کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔

18 اگست 1947 میں پاکستان UN کا ممبر بنا۔

18 اگست مشرف نے صدارت چھوڑی تھی اور میاں سومرو صدر بنے تھے۔

19 اگست 1871ء میں اوروِل رائٹ کی پیدائش ہوئی تھی (رائٹ برادران میں سے ایک) اسی تاریخ کو 1946ء میں امریکا کے صدر بل کلنٹن کی پیدائش ہوئی تھی اور 1785ء میں سیٹھ تھامس کی پیدائش۔ جس نے آگے چل کر گھڑی ساز ادارہ قائم کیا اور بڑی تعداد میں گھڑیاں بنانی شروع کیں۔ اسی تاریخ کو 1919ء میں مالکم فوربس کی پیدائش۔ یہ ایک مشہور، پبلشر تھا جس نے مشہور فوربس میگزین شروع کیا۔ 1888ء میں بیلجیم میں ایک ایسی رسم کی ابتدا ہوئی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہر سال اس رسم کا انعقاد زور و شور سے کیا جاتا ہے اور وہ ہے مقابلہ حسن۔ اس کی ابتدا بہت تھوڑے پیمانے پر ہوئی تھی۔ اس پہلے مقابلے میں ویسٹ انڈیز کی 18 سالہ حسینہ نے کامیابی حاصل کی تھی اور اب تو یہ مقابلہ ایک بہت بڑا کمرشل ایونٹ بن چکا ہے۔

20 اگست 1741ء کو Tus Baring.... نے الاسکا دریافت کیا تھا۔ اسی تاریخ کو 1930ء میں فائلو فرنس ورتھ نے ایک ٹی وی پیٹنٹ کروایا تھا۔

21 اگست 1888ء کو ولیم باروے نے دنیا کا پہلا کیلکولیٹر بنایا تھا۔ اسی تاریخ کو 1952ء میں پاکستان اور ہندوستان ایسٹ بنگال اور ویسٹ بنگال کی سرحدوں پر متفق ہوئے تھے۔

بائیس اگست 1762ء میں این فرینکلن کی پیدائش ہوئی۔ یہ دنیا میں کسی بھی اخبار کی پہلی خاتون ایڈیٹر تھی۔ اسی تاریخ کو 1860ء میں پال نپ کی پیدائش ہوئی جو ٹی وی کا موجد کہلاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1920ء میں ڈینٹن کولے ہارٹ سرجن کی پیدائش۔ اس نے پہلی بار مصنوعی دل کی ٹرانسپلانٹیشن کی۔

22 اگست 1932ء میں BBC نے تجرباتی نشریات کا آغاز کیا۔ 22 اگست 1952ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان فون کا رابطہ شروع ہوا تھا۔ اسی تاریخ کو 1966ء میں لونر نے چاند سے زمین کی پہلی تصویر اتاری۔ (اور اس دن پتا چلا کہ ہماری زمین چاند سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے)

23 اگست 1926ء میں مشہور انتھراپولوجسٹ کلفورڈ گیرز کی پیدائش ہوئی۔ 1933 میں مین فریڈ

ڈوناٹک کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے دواؤں کی جانچ کا سسٹم ایجاد کیا تھا۔

23 اگست 1904ء میں آٹو موبائل ٹائر چین پیٹنٹ ہوا تھا۔

24 اگست کو روم کا مشہور شہر پامپئی آتش فشاں کے غضب کا شکار ہو کر تباہ ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ 79 اے ڈی میں پیش آیا تھا۔ آگ کے بڑے بڑے گولے پہاڑ کے دہانوں سے نکل کر بیس میں تیس کلومیٹر تک برس گئے تھے کہا جاتا ہے کہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم سے سو گنا زیادہ طاقت ور اور تباہ کن مواد اس پہاڑ سے نکل کر شہر والوں پر نازل ہوا تھا۔ اس کی آبادی میں بائیس ہزار کی رہی ہوگی۔ جس میں سے سولہ سترہ ہزار افراد اسی وقت مر گئے تھے جبکہ پورا شہر کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔ آج بھی اس پہاڑ کے گرد تین لاکھ کی آبادی کا ایک بڑا شہر آباد ہے۔ یہ آتش فشاں فی الحال تو سویا ہوا ہے لیکن کبھی بھی جاگ اٹھے گا مگر کب یہ کوئی نہیں جانتا۔

چوبیس اگست 1880ء میں جوشوا کی پیدائش ہوئی۔ اس نے فلش لائٹ بنانے میں تعاون کے علاوہ اپنے طور پر پہلی کھلونا الیکٹرک ٹرین بنائی تھی۔

چوبیس اگست 1898ء میں بیلجیم کے سائنس داں البرٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے خلیات کی ساخت اور کارکردگی کا جائزہ لیا۔ اور 1974ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔

1918ء میں کیمیکل انجینئر رے کی پیدائش ہوئی۔ اس نے Styro foam ایجاد کیا۔

24 اگست 1993ء کو منہ سے ببلہ نکالنے والی گڑیا رجسٹر ہوئی۔

24 اگست 1967ء میں پاکستان کے پہلے اسٹیل مل کا چٹاگانگ میں افتتاح ہوا تھا (اب یہ شہر بنگلہ دیش میں شامل ہے۔)

24 اگست 2002ء میں جنرل پرویز مشرف نے لیگ فریم ورک آرڈر جاری کیا۔

25 اگست 1841ء میں تھیوڈور کوشر کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک سوئس سرجن تھا۔ اس نے 1909ء میں نوبل حاصل کیا تھا۔

1916ء میں امریکی ماہر حشریات فریڈک رابن کی پیدائش۔ اس نے 1954ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔

26 اگست 1740ء میں جوزف سوشولیر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے گرم غبارے کو فضا میں ٹھہرانے کا تجربہ کیا تھا۔

1743ء میں مشہور فرانسیسی سائنس داں انتوانی لوویزو کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہلی بار آکسیجن کے لیے آکسیجن کی اصطلاح استعمال کی۔ ویسے سائنس داں یہ تو معلوم کر چکے تھے کہ فضا میں آکسیجن موجود ہے جو زندگی کے لیے بہت ضروری ہے لیکن اسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔

26 اگست 1850ء میں چارلس رچٹ کی پیدائش ہوئی۔ یہ فرانسیسی فزیالوجسٹ تھا۔ اس نے 1913ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

1906ء میں البرٹ سابن کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک امریکی مائکرو بیالوجسٹ تھا اس شخص نے پوری دنیا کے بچوں کے لیے ایک بہت بڑا کام انجام دیا۔ وہ ہے پولیو کے قطرے۔ اس نے پولیو کے قطرے بنائے تھے۔

1951ء میں ایڈورڈ واٹکن کی پیدائش۔ یہ ایک امریکی ریاضی داں تھا۔

28 اگست کو آرتھر ٹیکرای نے فوٹو گرافی کے لیے ایک ایسا ٹب بنایا جس میں دن کی روشنی میں عکسی فلم کے رول دھل سکتے تھے۔

(اب تو خیر کیمروں سے رول وغیرہ ختم ہو چکے ہیں کیونکہ دوسرا سسٹم آگیا ہے۔ لیکن پہلے کیمروں میں تصویریں کھینچنے کے لیے رول ڈالے جاتے تھے اور ایک اندھیرے کمرے میں اس رول کو خاص کیمیکل سے دھویا جاتا تھا جس سے تصویریں واضح ہو جاتی تھیں پھر ان تصویروں کو اسی اندھیرے کمرے میں سکھایا جاتا تھا)

26 اگست 2006ء میں اکبر بگٹی کی ہلاکت ہوئی۔

27 اگست 1910ء میں مدر ٹریسا کی پیدائش ہوئی۔ خود کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دینے والی عیسائی راہبہ نے اپنی زندگی غریبوں اور بے کسوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ ہندوستان کے شہر کلکتہ میں ساٹھ برسوں تک غریبوں ناداروں بیماروں کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ مدر ٹریسا مقدونیہ بلقان کے شہر اسکوپجی میں پیدا ہوئی تھیں۔ تاہم ان پر البانوی اور مقدونیائی باشندوں کا یکساں دعویٰ ہے۔ کیونکہ اس وقت مقدونیہ کے نام سے کسی ملک کا وجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ شہر سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے ادارے کی بنیاد انیس سو پچاس میں محض بارہ راہباؤں کے ہمراہ رکھی تھی۔ جن کی تعداد بعد میں بڑھ

کر ساڑھے چار سو تک اور دائرہ کار ایک سو تینتیس ممالک تک جا پہنچا۔ مدر ٹریسا کو ان کی خدمات کے صلے میں 1979ء میں نوبل انعام دیا گیا۔ ہندوستان نے انہیں بھارت رتن دیا۔ پاپائے روم نے بابرکت شخصیت قرار دیا ہے۔ یہ سعادت سینٹ قرار دیے جانے یا عیسائیت کے تحت ولایت کا مرتبہ حاصل کرلینے کے برابر ہے۔ مدر ٹریسا کا انتقال 1997ء میں کلکتہ میں ہی ہوا تھا۔

27 اگست 1874ء کو جرمن کیمسٹ کارل جوش کی پیدائش۔ اس نے دواؤں کی مشہور کمپنی BASF بنائی۔ 1931ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

1877ء کو چارلس اسٹیوارٹ ورلس کی پیدائش۔ برطانوی کار ساز، اس نے مشہور گاڑی رولز رائس بنائی۔ جو دنیا کی مہنگی ترین گاڑیوں میں سے ہے۔

1890ء امریکی آرٹسٹ اور فوٹوگرافر مین رے کی پیدائش۔ اس نے ڈیڈا مومنٹ ایجاد کیا۔

28 اگست 865 میں عالم اسلام کے ایک بہت بڑے انسان رازی کی پیدائش ہوئی تھی۔ آپ کا پورا نام ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی تھا۔ آپ ایک نامور مسلمان عالم، طبیب، فلسفی، ماہر علم نجوم اور کیمیا دان تھے۔ آپ جالینوس العرب کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی ولادت ایران کے شہر رے میں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بقراط نے طب ایجاد کی، جالینوس نے طب کا سالیا کیا، رازی نے مختلف سلسلہ ہائے طب کو جمع کیا اور ابن سینا نے تکمیل تک پہنچایا۔

29 اگست 1561ء میں جرمن ریاضی دان PitisCus کی پیدائش ہوئی۔ اس نے علم الحساب میں ٹریگنومیٹری کا اضافہ کیا۔

1904ء میں جرمنی یورولوجسٹ ورنر کی پیدائش ہوئی۔ 1956ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

29 اگست 1958ء میں امریکا کے علاقے انڈیانا میں مشہور شوبز کی شخصیت مائیکل جیکسن کی پیدائش ہوئی۔ اس کا پورا نام مائیکل جوزف جیکسن تھا۔ انڈیانا میں 29 اگست 1953ء میں پیدا ہوا اور 25 جون 2009ء میں لاس اینجلس میں انتقال ہوا۔ یہ مشہور سنگر، پاپ، راک، ڈسکو ہر قسم کے گانے گالیتا تھا۔ یہ بہترین میوزیشن سنگر، گیت نگار اور ڈانسر ہونے کے علاوہ بہترین ایجنٹ آرگنائزر بھی تھا۔ اس نے اپنے کیریئر کی ابتدا اپنے بھائیوں کے گروپ کے ساتھ کی۔ اس گروپ کا نام جیکسن فائیو تھا۔ مائیکل ابتدا میں کانگو بجایا کرتا تھا پھر جب اس کی صلاحیتیں سامنے آنے لگیں تو گروپ کا سربراہ ہوگیا۔ اس کے البم Life thriller- On Thewall وغیرہ پوری دنیا میں سنے جاتے ہیں۔ 750 ملین کاپیوں کی فروخت کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس کی موت پر پوری دنیا کے ٹی وی اس کے بارے میں بتاتے رہے تھے۔

1971ء میں راشد منہاس شہید کو نشانِ حیدر دیا گیا۔

30 اگست 1852ء میں ڈچ تھیوریٹکل کیمسٹ جیکب ہیریکس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1901ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

اسی تاریخ کو 1884ء میں سویڈن کے کیمسٹ تھیوڈور کی پیدائش۔ جسے 1936ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

30 اگست 1927ء میں مشہور فیشن ڈیزائنر جیفرے بین کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 8 بار کوٹی ایوارڈ حاصل کیا۔ فیشن کی دنیا کا یہ ایک مستند ایوارڈ ہے۔

30 اگست 1994ء میں IBM نے اعلان کیا کہ اسے اس پر اعتراض نہیں ہے کہ مائیکروسوفٹ ونڈوز کی اصطلاح استعمال کررہا ہے۔ یہ دو بڑی کمپنیوں کے درمیان مطابقت کا معاہدہ تھا۔

1870ء میں ماریا مونٹی سوری کی پیدائش ہوئی۔ ماریا کی پیدائش اٹلی میں ہوئی۔ اور انتقال ہالینڈ میں ہوا تھا۔ ماریا نے یونیورسٹی آف روم میں تعلیم حاصل کی۔ آپ فزیشن بھی تھیں۔ ایک عرصے تک ذہنی طور پر کمزور بچوں کے لیے کام کرتی رہیں۔ آپ نے ایک چھوٹا سا اسکول "کاساڈی بام بینی" کے نام سے شروع کیا تھا۔

پہلا کاسا 6 جنوری 1907ء میں کھولا گیا۔ جس میں پچاس ساٹھ بچے تھے۔ ان کی تعلیم دینے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ یہ بچے کے اعصاب اور حواس کو فعال کرتی تھیں۔ پھر اس میں ذہانت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ آپ کے خلوص اور لگن کی وجہ سے یہ طریقہ تعلیم مقبول ہوتا چلا گیا اور اس وقت دنیا کے ہر حصے میں کاساڈی بام بینی اور مونٹی سوری اسکول موجود ہیں۔

◆

سراب

راوی : شہبار ملک

تحریر: کاشف زبیر

ق: 68

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزر رہی تھی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سونیا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی دشمنی میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ابوذر شاہ جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں اللہ داد وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئے۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سونیا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ابوذر شاہ کے ہیرے حاصل کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، بہرت شاہ کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر راحیل کو بھی بلوا لیا۔ بہرت شاہ نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے بہرت شاہ کو گولی مار دی۔ مرتے وقت بہرت شاہ بڑبڑایا "نارتھ۔۔۔ بگسٹ" "دو ٹکڑے" بہرت شاہ کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں جیل میں آ گیا۔ وہاں راحیل بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور راحیل کو خود کش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا۔ مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زیدی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ گیا۔ ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا ہوا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی۔ پھر خبر ملی کہ شہلا کسی صابرہ نامی عورت سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ مجھے کسی ذریعے سے کام چلانا پڑا کہ وہ صابرہ کو پکڑ لیں۔ صابرہ پکڑی گئی مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس کے گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں ہم ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زیدی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زیدی نکلا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہمیں گھیر لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اسی وقت میری مدد کو مل بخش والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو وہیں بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے پک اپ کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسین نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسین ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ راحیل بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں شفٹ کرنے جا رہے تھے راستے میں پولیس والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیلہ بہانہ کر گیا اور کچھ ایسا کیا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے باپو کو اپنے بیڈ روم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزاری تو باپو مارا جائے گا۔ میں نے راحیل پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ کشمی ولی آ گیا اور اس نے راحیل کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر کم ہوا تو ٹیک اور راحیل اندر آ گئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔" لیکن غیرت راج کنور کے ہاتھ پر ضرب لگا کر پستول نکال کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام ... کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شفقت پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوا دیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آ گئی اور راحیل کی آواز ابھری۔ "ہلنا مت شہباز۔" میں نے اسے گھونسا مار کر بے ہوش کیا اور گلی سے نکل آیا۔ ہوٹل پہنچ کر لیپ ٹاپ کے ذریعے تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کر کے ہیلی کاپٹر کے ذریعے بارڈر کراس کر لوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر

امرت سنگھ سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کر لیا۔ اس نے بتایا کہ راس راج کنور کو نکال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ بٹلی کا بھیس بدل کر راج کنور کا پیچھا کروں گا اور اسے اغوا کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر آیا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپس کے لیے بٹلی کا بھیس اپنانے کو کہا۔ ستاری جب بٹلی کا چہرہ واپس لا رہا تھا کہ میرا دل پھٹ گیا اور ماحول تاریک ہو گیا۔ دھماکے سے بٹلی کا ہاتھ پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے چھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکہ بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں بینو نے سڑک پر دو کیلیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچی اور دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بینو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک بٹلی کا چہرہ اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بینو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن بینا کے گھر بھیج دیا۔ بینا کا شوہر اروان اسے ہراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ایاز شاہ کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ایاز شاہ کے پاس پہنچا۔ ایاز نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی لڑکی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے شکتی دل ہی کی آواز سنائی دی" شکتی شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ایاز شاہ کا جواب نہیں سن پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ ہمیں ایک دوسری لڑکی دے دی گئی۔ ہم حملے کی ریہرسل بھی کر رہے تھے کہ خبر آئی "فوراً کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔" ہم فتح خان کے ساتھ ایک دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلنے کے لیے نکلا اور ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کرنے لگا تبھی کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ ہوش آیا تو میں کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ راس میرے سامنے تھا۔ وہ تفتیش کر رہا تھا۔ کہ کنور پیلس پر حملہ ہوا اور دھماکے سے میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو میں نے خود کو کرسی سے بندھا ہوا پایا پھر موقع پا کر آزاد ہو گیا اور راتھک کو الیکٹرک شاک لگا کر ٹھکانے لگایا اور کمرے سے سرنگ میں آ گیا۔ بینو بھی مل گیا ہمیں راس اور شکتی دل نے گھیر لیا۔ پتا چلا کہ سادی اور بڑا کنور اب تک محفوظ ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ پوری سرنگ میں ڈائنامائٹ لگا ہے اور یہاں کی باتیں بڑا کنور سن رہا ہوگا۔ تبھی فائرنگ کی آواز سنائی دی اور میں نے چیخ کر کہا" کنور مت شیطان سادی کو لے کر بھیر..." مگر میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ زبردست فائرنگ شروع ہو گئی پھر سادی کی چیخ سنائی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

اس سے پہلے بارہا میں نے موت کو پاس سے دیکھا۔ بے شمار لوگ میرے ہاتھوں اور میرے سامنے مرے۔ گزشتہ بارہ گھنٹے میں اتنی قتل و غارت دیکھ لی تھی۔ میں اس معاملے میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ زخم کی کنڈیشن اور زخمی کی صورت دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ بچے گا یا نہیں اور بینو کا زخم دیکھ کر میرے اندر سے کسی نے کہا وہ نہیں بچے گا۔ مگر میں اپنے اندر کے آدمی کو جھٹلا رہا تھا۔ میں بینو کو سنبھال رہا تھا۔ سادی نے اپنی شال اتار کر اس کی گدی بنا کر بینو کے زخم پر رکھا۔ جب کھڑکی کی ٹوٹنے کا چھناکا سنائی دیا تب بھی میں نے بینو سے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے معلوم تھا فتح خان فرار ہو گیا ہے۔ اگر وہ فرار ہونے کی بجائے مجھے شوٹ کر دیتا تب بھی مجھے پروا نہیں ہوتی۔ اس وقت مجھے بینو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ گولی بلٹ پروف سے صرف نصف انچ اوپر لگی تھی اگر ذرا سا نیچے لگتی تو کچھ نہ ہوتا۔ آدھے انچ کا فرق زندگی اور موت کا فرق بن جاتا ہے۔ میں نے نم لہجے میں کہا۔ "بینو یہ کیا کیا؟"

بینو کو زخم کا پتا نہیں تھا لیکن اس نے میرے تاثرات سے جان لیا اور سرگوشی میں بولا۔ "شوبی ہم بچے گا نہیں....."

"نہیں.....نہیں۔" میں نے پھر کہا۔ "بینو کچھ نہیں ہوگا.....ابھی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "شوبی ڈاکٹر بہت دور ہے۔ ہم نہیں جا سکتا۔ پر آپ ادھر ہے بے بی ادھر ہے۔ ہمارے لیے یہ کافی ہے۔"

سادی خود پر قابو رکھ رہی تھی۔ مگر اس کے آنسو اس کے قابو میں نہیں تھے۔ شاید میرے بھی نہیں تھے۔ کیونکہ بینو مجھے دھندلا نظر آ رہا تھا۔ سادی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "بینو ایسی بات نہ کرو۔"

میں نے بینو کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے روک دیا۔ "نہیں شوبی..... وقت کم ہے.....آپ ہم سے بات کرو....."

اب تک میں خود کو جھٹلا رہا تھا کہ بینو بچ جائے گا۔

اسے کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی وہ کئی بار زخمی ہوا تھا۔ ہم میں سب سے زیادہ زخم خوردہ وہی تھا۔ اس کا پورا خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے مارا گیا تھا۔ اس کے قبیلے کے بیشتر افراد مارے گئے تھے اور باقی پتا نہیں کہاں تھے۔ دنیا میں اس کا اب کوئی نہیں تھا سوائے ہمارے۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ وہ میرے خاندان کا ایک حصہ ہوگا۔ ہم اس کی شادی کریں گے پھر اس کا بھی ایک خاندان ہوگا۔ مگر جو سوچا تھا وہ سوچ میں رہ گیا اور حقیقت جیتو کی رگوں سے قطرہ قطرہ کرکے رس رہی تھی۔ جب جیتو نے مجھ سے بات کرنے کو کہا تو مجھے لگا کہ ہاں اب وقت نہیں ہے۔ جیتو جانے والا ہے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا زخم دبایا۔ خون جتنی دیر تک نکلتا جیتو اتنی ہی دیر زندہ رہتا۔

"جیتو میں بات کر رہا ہوں میرے بیٹے....."

اس کا چہرہ ایک لمحے کو چمکا تھا۔ "ہم آپ کا بیٹا ہے؟"

"تم میرے بیٹے ہو، بھائی ہو، دوست ہو۔"

"ہم جانتا ہے شوبی....." اس نے کسی قدر وقت سے کہا۔ "آپ سمجھتا ہم کامی سے محبت کیا..... نہیں شوبی ہم بس آپ لوگ سے محبت کیا..... کامی اچھا لگتا تھا اور بس....."

"میں جانتا ہوں اگر تمہیں کامی سے محبت ہوتی تو تم اس کے ساتھ جاتے..... آدمی اس کے ساتھ جاتا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔ اگر تم اس سے محبت کرتے تو میں اسے کہیں سے بھی تمہارے لیے لے آتا۔"

"ہم کو معلوم ہے، پر ہم نے کبھی نہیں چاہا۔"

سادی بڑے کنور کے بیڈ کے ساتھ موجود دواؤں کی میز سے بینڈیج کا سامان لے آئی تھی۔ اس نے ایک بڑی پٹی نکالی۔ میں نے شال ہٹا کر یہ پٹی اور اس کے ساتھ روئی کا بنڈل رکھا۔ خون اسی روانی سے بہہ رہا تھا اور اسے یوں بہتے دیکھ کر میری رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ جیتو کا چہرہ ہر گزرتے لمحے زرد ہو رہا تھا اور اس پر تکلیف نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ "شوبی..... ہم کو سمیر..... بھائی یاد آ رہا ہے..... ہم اس سے بہت لڑا..... بدتمیزی بھی کیا....."

"جیتو میری جان یہ محبت تھی۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"ہم جانتا ہے..... وہ ہم سے بولا کہ جب سب ٹھیک ہو جائے گا تو وہ ہم کو اپنے پاس رکھے گا کیونکہ وہ جیسے مرتا ڈیڈی کے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح ہمارے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔" جیتو کا لہجہ پھر صاف ہو گیا۔ اس کی لکنت ختم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے اندر قوت آ گئی ہو۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے۔ اس نے سادی کی طرف دیکھا۔ "ڈیڈی ہم کو معاف کر دینا۔ ہم آپ کو ڈیڈی بولا اور آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"تم نے میرے لیے سب کیا جو ایک بھائی اپنی بہن کے لیے کر سکتا ہے اس سے زیادہ کیا..... یہ میرے بھائی ہیں۔" سادی نے راج اور بڑے کنور کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اللہ کی قسم مجھے ان کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے لیکن جیتو تمہارا زخم مجھے اپنے دل پر لگ رہا ہے۔"

"ڈیڈی آپ ہم سے محبت کرتا ہے۔"

"ہاں میرے بھائی....." سادی رونے لگی تھی۔

"شوبی آپ بھی کرتا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اس کا ماتھا چوم لیا جس پر پسینا آ گیا تھا اور یہ موت کا پسینا تھا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ لیکن چہرہ پُرسکون تھا۔ "شوبی میرا آخری خواہش پوری کرے گا۔"

اس وقت مجھے خود پر قابو پانے میں بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ "جیتو میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔"

"شوبی ہمارا ارتھی کو آپ آگ دکھانا..... پر ایسا ضروری نہیں ہے۔ اگر خطرہ ہو تو آپ ہم کو ادھر ہی چھوڑ جانا....."

"میں تمہاری یہ خواہش پوری کروں گا۔" میں نے کہا تو مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔ سادی دوپٹے سے منہ دبا رہی تھی کہ اس کی آواز نہ نکلے۔

"تمیں آپ یہاں سے جاؤ..... یہاں خطرہ ہے۔" جیتو نے کہا۔ "ہم پاگل ہے جو آپ کو ایسا بولا..... آپ ڈیڈی کو دیکھو..... یہاں سے....."

"تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ اس وقت وہ میری جان بھی مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔ اس کی آنکھیں بجھ رہی تھیں۔ اس نے رک رک کر کہا۔

"شوبی..... ہمارا ماں ایک بار..... ہم سے بولا..... آدمی مرتا ہے تو..... اس وقت..... وہ بھگوان سے..... جو مانگتا..... بھگوان اسے..... ضرور دیتا ہے..... شوبی ہم مانگتا..... بھگوان آپ کو کامیاب کرے..... آپ کا دشمن ناکام

ہو۔"

"بچہ میری خواہش ہے تم میرے ساتھ رہو۔"

"شوبی اب ایسا نہیں ہو سکتا۔" بچہ نے کہا اور بولتے ہوئے اچانک اسے جھٹکا لگا اور اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کی چمک بجھنے لگی تھی۔ میں بچہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آواز دے رہا تھا مگر وہ میری آواز کی حد سے دور جا چکا تھا۔ آوازیں دیتے ہوئے میں نے اسے جھنجوڑا تو بچہ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ ساوری دھاڑیں مار کر رونے لگی وہ سمجھ گئی تھی۔ مگر میں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"بے وقوف رو کیوں رہی ہو، بچہ بے ہوش ہوا ہے ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔"

ساوری نے میرے شانے پر سر مارا۔ "شوبی بچہ مر گیا ہے۔"

تب میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض چیک کی۔ وہ ساکت تھی۔ بچہ کی سانس اور دل دونوں ٹھہر گئے تھے۔ وہ مر گیا تھا۔ شاید میں بھی رونے لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا دایاں بازو میرے جسم سے کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میں نے بے ساختہ اپنا بازو ٹٹولا مگر وہ اپنی جگہ تھا۔ ہاں شل ہو گیا تھا۔ میں سن سی کیفیت میں تھا۔ بچہ کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ مگر اس موقع پر ساوری نے حواس بحال رکھے۔ حالانکہ اس کے دو بھائی اس کے سامنے مارے گئے اور بچہ تو بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ اس نے میرا بازو ہلایا۔ "شوبی... ہمیں یہاں سے جانا ہے۔"

میں چونکا۔ "بچہ کو چھوڑ کر؟"

"اگر نہ لے جا سکے تو چھوڑ کر جانا ہوگا۔" ساوری کھڑی ہو گئی۔ "شوبی وقت کم ہے کوئی بھی آ سکتا ہے۔ ابھی یہاں کچھ لوگ اور ہوں گے۔"

"کون لوگ۔" میں نے رامن، منشی، راج اور بڑے کنور کی لاشوں کی طرف دیکھا۔ "اب بچا ہی کون ہے۔"

"ان کے آدمی ہوں گے۔ ممکن ہے منشی کے کچھ آدمی باہر بھی ہوں۔ یا جگنو کے آدمی بچے ہوں۔"

ساوری ٹھیک کہہ رہی تھی۔ لیکن میں بچہ کو یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں ہر صورت اس کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بچہ کا سر احتیاط سے نیچے رکھا جیسے وہ سو رہا ہے اور اس کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ میں نے رامن کا پستول اٹھایا کیونکہ اپنا پستول تو میں نے راج کنور پر خالی کر دیا تھا۔ بچہ اس کی گولی کا نشانہ بنا تھا لیکن اس کا اصل قصور ساوری پر ہتھیار اٹھانا تھا۔ میں نے اس کا پستول بھی اٹھایا جو اس کے پاس پڑا تھا۔ پھر میں باہر آیا جہاں تاج خان کے آدمیوں کی لاشیں، جگنو اور اس کے آدمیوں کی لاشوں کے ساتھ پڑی تھیں۔ کنور پیلس میں اندر باہر لاشیں ہی لاشیں بکھری تھیں۔ ان میں وہ بھی تھے جو دوسروں کو مارنے آئے تھے اور وہ بھی تھے جن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی انہیں مارنے آ رہا ہے۔ وہ بھی مارے گئے تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کنور پیلس میں کام کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے تو یہاں غلام کی حیثیت سے تھے۔ انہیں صرف زندہ رہنے کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کے تابعدار تھے مگر ان کی تابعداری بھی ان کو موت سے نہیں بچا سکی تھی۔

ان میں میرے بہت سے دشمن تھے اور بہت سے ایسے تھے جن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور بچہ جو میرا ساتھی تھا میرے وجود کا ایک حصہ اب وہ یہاں لاشوں کا ایک حصہ تھا۔ رامن اور راج کنور نے ہال میں موجود تاج خان کے آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئے اور راج کنور یہاں تک کیسے پہنچا۔ جیسا کہ تاج خان کا دعویٰ تھا کہ یہاں جتنے راستے سامنے تھے اس سے کہیں زیادہ خفیہ راستے تھے۔ وہ دونوں بھی کسی ایسے ہی راستے سے آئے ہوں گے۔ راج کنور کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اب ڈیوڈ شا کے قبضے میں نہیں ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اچانک یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ تو واضح تھا کہ رامن اب تک اس کے ساتھ تھا اور وہ اسی کے ہمراہ آیا تھا۔ منشی سمجھ رہا تھا کہ اس نے رامن کو بے وقوف بنایا ہے لیکن حالات بتا رہے تھے کہ رامن نے راج کنور کے ہمراہ مل کر اسے بے وقوف بنایا تھا۔ ان سب نے میرے اور ڈیوڈ شا کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی مگر آخر میں خود نشانہ بن گئے۔

میں گیلری کی طرف آیا تھا کہ مجھے کسی کی جھلک دکھائی دی اور میں تیزی سے واپس آ گیا۔ آنے والے نے میری جھلک بھی دیکھ لی تھی اور مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ "شہباز یہ میں ہوں۔"

میں چونکا تھا۔ وہ کرنل جبر تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے سر نکال کر جھانکا۔ وہ سر سے پاؤں تک گرد اور مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ مگر وہ کرنل جیمز ہی تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ کرنل کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کے بائیں بازو اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ”کرنل تم زندہ ہو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال تھا تم بھی مر چکے ہو؟“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”اتفاق سے میزائل اے پی سی کے سامنے لگا تھا اور میں پچھلے حصے میں تھا۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے اور میں اڑ کر باہر جا گرا تھا کم سے کم دس گز دور اس کے باوجود بچ گیا شاید اس لیے کہ نرم گھاس پر گرا تھا۔“

”تمہارا احمقانہ منصوبہ پوری طرح ناکام رہا۔“

”نہیں پوری طرح ناکام نہیں ہوا میں زندہ ہوں تم زندہ ہو۔“

میں نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگایا اور اس کی گردن پر کہنی رکھ کر چلایا۔ ”ہاں لیکن میرا ساتھی زندہ نہیں ہے۔ وہ مارا گیا ہے تمہارے اس منصوبے کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکا۔ ”وولزکا...؟“

”ہاں وہی۔“ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ کرنل نے مزاحمت نہیں کی تھی اس لیے میری گرفت خود نرم ہو گئی۔ ”تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ میرے لیے کیا تھا؟“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ کرنل نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن اس کی موت اسی طرح اور اسی جگہ لکھی تھی۔ یہ میرا اور تمہارا ایمان ہے۔“

اس کے الفاظ نے مجھ پر اثر کیا تھا میرا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹ گیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو.... لیکن میں کیا کروں۔“

”وولزکی کہاں ہے؟ جسے ہم لینے آئے ہیں۔“

”اندر ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں تھے۔ اے پی سیز کو اڑے بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔“ میں نے اچٹتی نظر گھڑی پر ڈالی جس میں تین بج رہے تھے۔

”میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے کاش کہ میں پہلے ہی تمہاری بات مان جاتا۔ یہ سارا کیا دھرا غشی کا تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے تھے صرف ہیلی کاپٹر سے اترنے والی ٹیم محفوظ تھی۔ لیکن باہر اسنائپرز کی موجودگی میں وہ بھی محفوظ نہیں تھے اس لیے میں نے ان کے خاتمے کا فیصلہ کیا۔ میں رات کی تاریکی میں باہر نہیں نکل سکتا تھا اس لیے دن طلوع ہونے تک ایک جگہ چھپا رہا کتنے ہی پیلس گارڈز میرے سامنے مارے گئے۔ جیسے ہی دن طلوع ہوا میں پیلس سے نکل گیا۔ مجھے عقبی حصے سے اترنا پڑا تھا اس کے بعد میں ایک ایک جگہ جا کر غشی کے آدمیوں کا خاتمہ کرتا رہا۔ یہ کام نمٹا کر میں اندر آیا۔ یہاں کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔ میں اس امید میں یہاں آیا تھا کہ شاید یہ لڑکی زندہ ہو اور میں اسے ساتھ لے کر نکل سکوں۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”اُمید تو مجھے بھی نہیں تھی۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟“

”ہاں ہیلی کاپٹر ہے۔“ کرنل نے کہا۔ ”میری پائلٹ سے ریڈیو پر بات ہوئی ہے وہ دس منٹ میں یہاں آسکتا ہے۔“

ہم کمرے میں آئے تو سادی جو بچی کے پاس بیٹھی تھی کرنل کو دیکھ کر چونکی اور سہم گئی۔ ”شوبی یہ کون ہے؟“

”کرنل جیمز۔“ میں نے کہا۔ ”یہ مہم اسی نے ترتیب دی تھی۔“

”مہم یا قتل عام۔“ سادی نے تلخی سے کہا۔ ”اسے معلوم ہے یہاں کتنے لوگ مارے گئے ہیں۔“

”بے بی ایسے کاموں میں یہ سب ہوتا ہے۔“ کرنل نے نرمی سے کہا۔ ”فی الحال ہمیں کسی بحث میں پڑے بغیر یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”میں ہیلی کاپٹر کے لیے کال کر رہا ہوں۔“

اب تک میں سوچ رہا تھا کہ بچی کو کیسے لے کر جاؤں۔ مجھے گاڑی کا خیال آیا تھا مگر ہیلی کاپٹر کہیں بہتر تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے کال کرو۔“

اس کے پاس کسی قدر بڑے سائز کا ریڈیو تھا۔ یہ اس کی پشت پر بندھے بیگ میں موجود تھا۔ اس نے ریڈیو نکالا اور ہیلی کاپٹر پائلٹ کو کال کرنے لگا۔ ”ریڈ برڈ.... ریڈ برڈ ڈو یو ریڈ می؟“

اس نے کئی بار پکارا لیکن ریڈیو سے کوئی جواب برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”شاید مجھے چھت پر جانا پڑے.... یہاں ریڈیو کام نہیں کر رہا ہے۔“

چھت پر جانے کا سیدھا راستہ تباہ ہو گیا ہے۔ لیکن ایک راستہ اور ہے۔“

”کہاں ہے اس پر بتاؤ۔“ کرنل نے وبیکشل کہا اس

نکالا۔ میں نے اسے ایمرجنسی سیڑھیوں والا خفیہ راستہ سمجھایا۔ وہ نقشے میں نہیں تھا مگر کرنل سمجھ گیا۔

"لیکن یہ اوپر سے بند ہوگا اور اسے کھولنا پڑے گا۔"

"فکر مت کرو میں اسے کھول لوں گا۔" کرنل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی سادی بولی۔

"شوبی کیا ہم اس کے ساتھ جائیں گے۔"

"مجبوری ہے۔ یہاں میں خود سے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ڈیوڈ شا کی مدد سے ہم با آسانی واپس جاسکتے ہیں۔"

"آپ اس شخص پر بھروسا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ جیتو مارا گیا۔" سادی جذباتی لہجے میں بولی۔ "کیا ضمانت ہے کہ یہ آپ کے کام آئے گا۔ میں جانتی ہوں وہ آپ کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ اگر میں اور آپ اس کے پاس چلے گئے تو کیا وہ میری مدد سے آپ کو مجبور نہیں کرے گا۔"

جیتو کی اچانک موت نے مجھ سے جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی اور میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ میں جو سب بیان کر رہا ہوں اگر وہ کیفیت ہوتی تو میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ پاتا۔ سادی نے توجہ دلائی تو مجھے خیال آیا۔ یہ سامنے کی بات تھی۔ اگر میں سادی سمیت ڈیوڈ شا کے پاس پہنچ جاتا تو اس جیسے عیار کے لیے ذرا بھی دشوار نہیں تھا کہ وہ سادی کی مدد سے مجھے بلیک میل کرے۔ یہ کتابوں سے نکل کر کہانی میں کرنے والی بات ہوتی۔ مجھے لگا جیسے جیتو کی موت کے بعد مجھے پہلی بار ہوش آیا ہے۔ میں نے جیتو کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سرد ماتھے پر پیار کیا۔ میرے آنسو اس کے چہرے پر گرے تھے۔ جیتو چلا گیا تھا لیکن سادی تھی اور وہ میری ذمے داری تھی۔ مجھے اپنی پوری توجہ اس ذمے داری پر دینی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سادی تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے اپنا سامان اور اگر رقم ہے تو وہ بھی لے لو۔ اگر ہم نے اپنا راستہ الگ کیا تو اس کی ضرورت پڑے گی۔"

سادی نے سر ہلایا اور بولی۔ "میرے ساتھ چلیں مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

میرا جیتو کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں مان رہا تھا اس لیے خود پر جبر کر کے گیا۔ سادی کا کمرا صاف ستھرا اور چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی پیلس کا ایک حصہ ہے جس کا حشر ہو چکا ہے۔ اس نے الماری کھولی اور اس سے اپنے کچھ کپڑے نکال کر ایک چھوٹے ہینڈ کیری میں ڈالے۔ پھر اس نے اندر سے رقم کی گڈیاں نکالیں۔ یہ بھارتی روپے تھے۔ ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی چار گڈیاں تھیں۔ یہ تین لاکھ کی رقم تھی جو عام حالات میں ہمارے لیے کافی ہوتی۔ سادی نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی میں نے پوچھا۔ "ٹراؤزر شرٹ ہے تو وہ پہن لو اور پیروں میں جوگرز ہوں۔ ہوسکتا ہے بھاگ دوڑ کرنی پڑے۔ اپنی دوائیاں بھی ساتھ رکھنا۔"

"میں نے سب رکھ لی ہیں۔" اس نے کہا اور بیگ کی زپ بند کی۔ میں نے وہ اٹھا لیا۔ سادی نے الماری سے ایک پتلون اور شرٹ نکالی تو میں باہر نکل آیا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے ایک رائفل اٹھالی تھی۔ مگر کسی نے راستہ نہیں روکا۔ سادی چند منٹ میں باہر آگئی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ "شوبی! آپ نے کیا سوچا؟"

"دیکھتی رہو۔" میں نے کہا اور ہم واپس بڑے کمرے والے حصے میں پہنچے۔ کرنل وہاں آچکا تھا اس نے بے چینی سے کہا۔

"کہاں چلے گئے تھے ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

"کچھ سامان لینا تھا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسا سامان؟"

"اس کی دوائیاں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم نے ہیلی کاپٹر کے لیے کال کر لی؟"

"ہاں اور یہ با آسانی بات ہو گئی۔" اس نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ "ہیلی کاپٹر پانچ منٹ میں آنے والا ہو گا۔"

"تب چلو اوپر۔" میں نے کہا اور بیگ سادی کو تھما کر جیتو کو اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ میرا دل ایک بار پھر لرزا۔ آدھے گھنٹے پہلے جیتو جیتا جاگتا انسان تھا اور اب میں اس کی لاش لے جا رہا تھا۔ کرنل چونکا۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"یہ میرا ساتھی ہے میں اس کی لاش یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ کرنل کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

"او کے ہری اپ وقت کم ہے۔ ممکن ہے مقامی پولیس یہاں آنے والی ہو۔"

ہم سیڑھیوں سے اوپر آئے۔ سب سے آگے کرنل

www.paksociety.com www.paksociety.com

تھا۔ اس کے پیچھے ساوری اور سب سے پیچھے میں بچہ کو لیے ہوئے تھا۔ ممکن ہے زندگی میں بچہ وزنی ہو لیکن اس وقت مجھے کسی بچے کی طرح ہلکا پھلکا سا لگ رہا تھا۔ ہم چھت پر آ گئے۔ میں نے بچہ کو ایک طرف لٹا دیا۔ کرنل خیمرو آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمیں اوپر آنے میں چند منٹ لگے تھے اور اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ کسی نقطے کی طرح نمودار ہوا جو بتدریج بڑا ہوتا گیا۔ کرنل نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ہیلی کاپٹر چھت پر بنے ہیلی پیڈ پر اتر گیا۔ اس کے پنکھے گردش کر رہے تھے۔ انجن کی آواز دھیمی ہوئی تھی لیکن وہ بند نہیں ہوا تھا۔ کرنل نے ہمیں اشارہ کیا اور چلا کر بولا۔ "جلدی کرو۔"

میں نے ساوری کو سہارا دیا اور ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے اندر بٹھایا۔ پھر میں نے مڑ کر کرنل کو اشارہ کیا کہ وہ بچہ کو اٹھا کر لائے۔ اسے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام اسے کہوں گا۔ اس لیے وہ جھجکا اور پھر با دل نا خواستہ بچہ کی طرف بڑھا اس نے بچہ کو اٹھا کر شانے پر ڈالا اور ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ جیسے ہی اس نے بچہ کو اندر لٹایا میں نے عقب سے اس کی گدی پر پستول کا دستہ مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور دوسری ضرب پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس دوران میں ساوری اپنا پستول دونوں پائلٹ پر تان چکی تھی۔ جو میری کارروائی سے چونک گئے تھے۔ میں نے کرنل کے بیگ سے رسی نکال کر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے۔ ہاتھ کس کر باندھے تھے اور پاؤں اس طرح باندھے کہ وہ چھوٹے قدموں سے چل سکتا تھا۔ یہ کام نمٹا کر میں نے اسے ہیلی کاپٹر میں ڈالا۔ پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ دروازہ بند کیا تو شور کسی قدر کم ہوا تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ "اسی ٹیلے پر چلو جہاں سے آئے ہو۔"

"ہمیں واپس شملہ جانا ہے۔" پائلٹ بولا۔ وہ مقامی لیکن خوش شکل جوان آدمی تھا اس کا کو پائلٹ سیاہ رو اور بد صورت تھا۔

"لگتا ہے تمہیں جہنم جانا ہے۔" میں نے اس کے سر سے پستول لگایا تو وہ جلدی سے بولا۔

"او کے او کے..... جہاں تم کہو۔"

"ریڈیو بند ہوں اور ہیلی کاپٹر کا کوئی ریڈیائی سسٹم کام نہ کرے۔"

"ریڈیو کام کر رہا ہے باقی سسٹم بند ہیں۔"

"ریڈیو بھی بند کر دو۔"

"اس صورت میں ہم کسی ممکنہ وارننگ سے بے خبر رہیں گے یہ علاقہ حساس ہے چائنا کی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ریڈیو بند کر دو۔" میں نے پھر حکم دیا تو اس نے تعمیل کی تھی۔ اس نے تھروٹل کھینچا تو انجن کی آواز بدلی اور ہیلی کاپٹر ایک جھٹکے سے دوبارہ بلند ہوا تھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے اور سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ مگر ابھی غروب ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ ہیلی کاپٹر دس منٹ سے بھی پہلے اس ٹیلے تک پہنچ گیا تھا۔ وہاں ہیلی پیڈ کے لیے بنائے گئے نشانات اور دوسرا سامان۔ جس سے یہ جگہ صاف کی گئی تھی۔ اپنی جگہ موجود تھے۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر نیچے اتارا اور پھر انجن بند کر دیا۔ میں راستے میں کرنل کو چیک کر چکا تھا اس کی نبض سست لیکن باقاعدہ تھی۔ وہ بے ہوش تھا لیکن اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انجن بند ہونے پر سکون ہو گیا۔ اس کے گردش کرتے پنکھوں کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں پائلٹس سے کہا۔ "نیچے اترو۔"

"کیوں؟" چیف پائلٹ نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔

"یہ ہم کو مارنا چاہتا ہے۔" سیاہ رو کو پائلٹ نے..... مطلع کیا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو..... میں بلا وجہ کسی کو نہیں مارتا ہاں اگر تم مرنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ اب نیچے اترو..... مجھے ایک بات دو بار کہنے کی عادت نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں بٹھا لو۔"

وہ دونوں نیچے اترے تو میں نے کرنل کو کھینچ کر نیچے اتارا اور اس کا بیگ الگ کر دیا پھر اس کی مکمل تلاشی لی تو اس کے پاس سے کئی ہتھیار نکلے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی مسلح تھا۔ اسے مکمل طور پر نہتا کر کے میں نے ساوری سے کہا۔ "اس کی نگرانی کرنا..... میں ذرا ان سے کام لے رہا ہوں۔"

"شونی ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"بچہ..... کی آخری خواہش پوری کرنے۔" میں نے کہا اور ایک طرف رکھے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں کلہاڑیاں اور آریاں بھی تھیں۔ لمبی قینچیاں جن سے شاخیں کاٹی جا سکتی تھیں۔ کام کی چیز کلہاڑیاں تھیں۔ میں نے دو کلہاڑیاں اٹھائیں اور پائلٹوں کے پاس آیا۔ کلہاڑیاں ان کے سامنے پھینکیں اور ایک طرف کر کے بہت

پرانے خشک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے لکڑی کاٹو۔"

"ہم لکڑی کاٹیں؟" سیاہ مرد نے بے یقینی سے کہا۔

"بالکل کاٹو گے اگر مرنا نہیں چاہتے ہو۔" میں نے رائفل کا رخ ان کی طرف کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تمہارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے اگر اس دوران میں تم اتنی لکڑی نہیں کاٹ سکے جتنی ایک چتا کے لیے درکار ہوتی ہے تو میں تم دونوں کو چھلنی کردوں گا۔"

"ہمیں ماردیا تو اسے تم اڑاؤ گے؟" پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں اسے اڑا لوں گا۔ تم دونوں ابھی تک شروع نہیں ہوئے۔ وقت آدھا منٹ کم ہو گیا ہے۔"

وہ حرکت میں آئے۔ یہ بڑا تنا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ کھوکھلا ہو گیا تھا اور یہ بالکل خشک ہو چکا تھا اس لیے آسانی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے خاصی لکڑی نکال لی تھی۔ اس دوران میں میں نے سامان سے پانی نکال کر پیا تھا۔ پیاس سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں نے لکڑی کا جائزہ لیا اور انہیں روک کر لکڑی چتا کے انداز میں رکھنے کو کہا۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔ ایک گھنٹے میں وہ ساری لکڑی کاٹ چکے تھے اور ان کا حشر ہو گیا تھا۔ وہ ایسی مشقت کے عادی نہیں تھے اور پھر یہاں دھوپ بھی تیز تھی۔ وہ ہانپ رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ یہ لکڑی کافی تھی۔ اس لیے میں نے ان سے کلہاڑیاں لے لیں۔ میں ہوشیار رہا تھا کیونکہ یہ خطرناک ہتھیار بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ ایک کین میں ہیلی کاپٹر کے ٹینک سے اس کا ایندھن نکالا۔ یہ بہت تیز حرارت پیدا کرتا ہے جو ایک ٹربو جیٹ انجن چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ تقریباً ایک گیلن تیل لکڑیوں پر اچھی طرح ڈالا۔

وہ مرحلہ آ گیا جس کے بارے میں میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا۔ مگر مجھے اس سے گزرنا ہی تھا۔ میں ہیلی کاپٹر کی طرف آیا تو ساوری نے رونا شروع کر دیا۔ یہاں سناٹے میں اس کی آواز عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ سب چھوڑ کر جینا کو یہاں سے لے جاؤں اسے آگ کی نذر نہ کروں۔ پھر دل پر جبر کر کے میں ہیلی کاپٹر میں آیا۔ جینا کے جسم سے بلٹ پروف اور دوسری چیزیں الگ کیں۔ اس کے جوتے اتارے۔ اب اس کے جسم پر صرف شرٹ اور پتلون تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی چتا تک لایا۔ اس پر لٹا کر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ اس کی شرٹ سامنے سے خون سے بھیگ گئی تھی۔ یہ وہ خون تھا جو جسم میں تھا تو زندگی تھا اور جسم سے نکل گیا تو موت بن گیا۔ اس کے ماتھے پر آخری بوسہ دے کر میں پیچھے ہٹا تو ساوری آگے آ گئی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ چیخیں مار رہی تھی اور میں نے بڑی مشکل سے اسے جینا سے الگ کیا۔

"شولی... جینا... جینا۔" وہ کہتے ہوئے اچانک ڈھیلی ہو کر نیچے گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال لیا اور اٹھا کر ہیلی کاپٹر میں لا کر لٹا دیا۔ پھر اپنی آنکھیں صاف کیں اور پائلٹ سے کہا۔

"تمہارے پاس ماچس یا لائٹر ہے۔"

اس نے خاموشی سے لائٹر نکال کر میرے حوالے کیا اور میں چتا تک آیا۔ لائٹر جلایا تو میرا ہاتھ لرز گیا تھا۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے آگ دکھانا کتنا مشکل کام ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے مردے زمین کے سپرد کرتے ہیں جو سب سے احسن طریقہ ہے۔ کئی بار میرا ہاتھ بڑھتے بڑھتے رکا۔ پھر میں نے ہمت کر کے لکڑیوں کو آگ دکھا دی۔ ہائی فلیمنگ آئل کی وجہ سے لکڑیوں نے بہت تیزی سے آگ پکڑ لی تھی۔ جب تک میں ذرا پیچھے ہوا آگ نے لکڑیوں اور جینا کے بے جان وجود کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔ میں نے چتا کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا لیکن جب آگ نے جینا کے جسم کو چاٹنا شروع کیا تو اس کی بو خود مجھ تک آ گئی تھی۔ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا اس لیے میں کرنل کے پاس آیا وہ کلبلا رہا تھا۔ میں نے کچھ پانی اس کے منہ پر اور کچھ منہ میں ڈالا تو اسے ہوش آ گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"شہباز یہ کیا... تم نے...."

"میں واپس ڈیوڈ شا کے پاس نہیں جاؤں گا اور یہ حفظ ماتقدم کے طور پر کیا ہے۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مجبوراً یہ حربہ استعمال کیا۔ ورنہ تم آسانی سے قابو میں نہ آتے۔"

وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ بیٹھا اس نے چتا کی طرف دیکھا۔ "اوہ ہم وہیں ہیں.... یہ یہ...."

"میرے ساتھی کی چتا ہے اس کی خواہش تھی کہ اس کی چتا کو میں آگ لگاؤں۔"

کرنل کچھ دیر سوچتا رہا۔ "تو تم واپس نہیں جانا

چاہتے۔ یقیناً تم نے سوچ لیا ہوگا کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔ اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں اگر کچھ کرنا ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔ ہیلی کاپٹر مجھے اور ساوری کو کہیں اتار کر تمھیں واپس لے جائے گا۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔ "ویسے میں تمھیں بتادوں تم یہاں محفوظ نہیں ہو.... ڈیوڈ شا تمہارے لیے بہت آسانیاں مہیا کرسکتا ہے۔ ویسے تم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"

"میں اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ جیسے ہی ساوری واپس پاکستان پہنچے گی۔ میں ڈیوڈ شا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میں اس کی ٹیم میں شامل ہوں گا لیکن اپنے طریقے سے۔ میں مکمل طور پر اس پر انحصار نہیں کرسکتا۔"

"تم جانتے ہو.... جو کام وہ بہت آسانی سے کرسکتا ہے۔ تمہارے لیے وہ بہت مشکل ہوگا۔"

میں نے انکار کیا۔ "اس کے باوجود میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر اس نے ساوری کو اپنے قبضے میں کرلیا تو میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"وہ تم پر بالکل جبر نہیں کرے گا۔" کرنل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھکتے ہوئے بچے کی چتا کے دوسری طرف چلا گیا تھا اور اس کی سرخی شعلوں کی سرخی میں مکمل مل کر عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ یہ دل و دماغ کو بوجھل کردینے والا منظر تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ ہیلی کاپٹر اسی راجستھانی راجا کا تھا جس کے ولا میں ڈیوڈ شا مقیم تھا اور جہاں پولیس اور ایجنسی نے مل کر چھاپا مارا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر کو استعمال کیا جائے تو ہم مشرقی پنجاب تک کا طویل سفر بہت کم وقت میں طے کرسکتے تھے۔ وہاں میں عبداللہ اور وسیم سے رابطہ کرسکتا تھا۔ کرنل مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اس نے کہا۔

"یہ بہت خطرناک ہوگا.... یہ ہیلی کاپٹر ہر جگہ پہچانا جائے گا۔"

"کیا خطرناک ہوگا۔"

"یہی کہ تم اسے کہیں دور لے جانے کے لیے استعمال کرو۔"

میں نے ہیلی کاپٹر پر بنے نشانات کا معائنہ کیا یہ پینٹ ہوئے تھے اور اسے آسانی سے خراب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے خنجر کا استعمال کیا مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ پائلٹ نے کہا۔ "یہ خراب نہیں ہوگا۔"

"تمہارے پاس کہاں تک پرواز کا اجازت نامہ ہے؟"

"پورے انڈیا میں پرواز کرسکتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اگر مجھے ہوشیار پور جانا ہو تو؟"

"تقریباً سو کلومیٹرز کا فاصلہ ہے اس میں پون گھنٹا لگے گا لیکن ہیلی کاپٹر میں اتنی لمبی پرواز کا فیول نہیں ہے۔"

میں نے فیول گیج چیک کیا۔ ٹینک تقریباً ساٹھ فیصد بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کتنی پرواز کے لیے کافی ہوگا؟"

"تقریباً ساٹھ سے ستر کلومیٹرز۔"

مجھے خیال آیا۔ ہمیں اوپر کی بجائے نیچے کی طرف جانا چاہیے۔ جتنا نیچے جائیں گے پاکستان کی سرحد اتنا ہی پاس پڑے گی اور اسے عبور کرنا اتنا ہی کم مشکل ہوگا۔ لاہور اور اس سے اوپر سرحد حساس تھی اور اسے عبور کرنا جان جوکھم کا کام تھا۔ "اگر ہم لدھیانہ کی طرف جائیں تو....؟"

"تب بھی اتنا ہی فاصلہ پڑے گا۔"

کرنل غور سے سن رہا تھا مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں اسے بے خبر بھی رکھتا تو جب ہیلی کاپٹر چھوڑتا تو پائلٹ خود کرنل یا اپنے مالک سے رابطہ کرکے اسے بتا دیتا کہ ہم کہاں اترے تھے؟ میں نے فوری فیصلہ کیا۔ "ٹھیک ہے ہم لدھیانہ کی طرف جائیں گے۔"

میرا حلیہ نہایت خراب تھا۔ خون مٹی، چہرے پر کئی زخم تھے جو دیکھنے والے کو فوراً متوجہ کرتے۔ میری جیکٹ بھی کئی جگہ سے خون آلود تھی لیکن اس کے اندر موجود شرٹ محفوظ تھی میں نے جیکٹ اتار دی۔ پھر وہاں موجود پانی لے کر چہرہ اور جسم کے دوسرے حصے صاف کیے۔ اس سے میں کسی حد تک صاف ستھرا نظر آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر میں میڈیکل ایڈ بکس موجود تھا اس کی مدد سے بھی میرا تاثر بہتر ہوا۔ میں نے گیس ماسک پہلے ہی اتار دیا تھا اور اب میرے پاس اپنا اور بچے کا نائٹ ویژن تھا وہ میں نے ساوری کے بیگ میں رکھ دیا۔ میری پتلون کمانڈو ڈیزائن کی تھی لیکن آج کل ہر دوسرا شخص اسی قسم کی پینٹ پہن کر گھوم رہا ہے۔ میں نے خود کو صاف کرنے اور حلیہ بہتر بنانے میں خود کو مگن کرلیا کیونکہ میں

ان شعلوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا جو چیتو کے جوان جسم کو چاٹ چکے تھے۔ اس بُو کو محسوس نہیں کرنا چاہتا تھا جو دھویں کے ساتھ فضا میں پھیل رہی تھی۔ لیکن جب میں ساکت ہوا تو مجھے لگا میں خود کو مصروفیت کا دھوکا دے رہا تھا۔ میرا رواں رواں ان شعلوں کی طرف متوجہ تھا۔

اس سے پہلے میں جان نہیں پایا تھا کہ چیتو میرے لیے کیا ہے۔ مجھے اس کمسن لڑکے سے کتنی محبت ہے جس کی ہمت اور بہادری کا میں خود گواہ تھا۔ جو موت سے یوں کھیلتا تھا جیسے وہ اس کا پسندیدہ کھلونا ہو۔ جو مرنے سے کبھی نہیں ڈرا۔ شاید اسی لیے وہ آسانی سے موت کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرا ہم وطن اور ہم مذہب بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے منسلک ہو گیا۔ مجھ پر جان نثار کرنے لگا اور آخر میں اپنی زندگی مجھ پر وار گیا۔ جو گولی راج کنور نے میری جان لینے کے لیے چلائی تھی وہ اس نے اپنے وجود پر روک لی۔ اب اس کا وجود راکھ میں بدل رہا تھا۔ چتا سے ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا ضبط ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے پیروں کے بل بیٹھ کر زمین پر ہاتھ رکھ لیا اور خاموش آواز میں رونے لگا۔ اس وقت میں آس پاس سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ کرنل قید ہے مگر دونوں پائلٹس تو آزاد ہیں۔ وہ مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔

مگر انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید ان میں اتنی انسانیت تھی کہ مجھے اس سوگ میں نہ چھیڑیں۔ جب میرا دل ذرا ہلکا ہوا تو میں اٹھ کر ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ ساوتری بے ہوش تھی لیکن اس کی نبض نارمل تھی۔ یہ بے ہوشی نہیں جسم کا سیلف ڈیفنس تھا جو قدرت نے خاص طور سے خواتین کو عطا کیا ہے۔ ان کا دکھ ہسٹریا کی صورت میں آنکھوں سے بہہ جاتا ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ کرنل مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "شہباز تم غلطی کر رہے ہو، ایک بار پھر سوچ لو.... تم اکیلے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں سوچنے کی مہلت ہی تو چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گے انڈیا کی سرزمین پر تم کہیں محفوظ نہیں ہو۔"

"میں بہت عرصے یہاں رہا ہوں اور اب تک محفوظ ہی رہا ہوں۔" میں نے کہا اور پائلٹس کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی سیٹوں پر چلے گئے۔ "میں تمہیں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں مجھے اُمید ہے تم خود کو آزاد کرا لو گے اور چند گھنٹوں بعد ڈیوڈ شا کے پاس واپس پہنچ جاؤ گے۔ مجھے کوئی نمبر دو جس پر میں تم سے یا ڈیوڈ شا سے رابطہ کر سکوں۔"

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ایک نمبر ہے لیکن اسے ذہن نشین کر لو کہیں لکھنا مت۔"

"بتاؤ میں بھی لکھنے کا قائل نہیں ہوں۔"

اس نے نمبر بتایا جو میں نے تین چار بار دہرایا اور مجھے یاد ہو گیا۔ کرنل نے سمجھ لیا تھا کہ میں ایسا ہی کروں گا اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔ البتہ جب ہیلی کاپٹر کا انجن اسٹارٹ ہوا تو اتنا کہا۔ "اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کال کر لینا۔"

"یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے سر ہلایا اور پچھلے حصے میں آ گیا۔ میں نے ایک چاقو کرنل کی طرف پھینکا اور سلائیڈنگ ڈور کھینچ کر بند کر دیا اور ساوتری کے گرد سیٹ بیلٹ لپیٹ دی۔ ہیلی کاپٹر کا انجن پوری رفتار سے چلنے لگا اور پھر وہ دھچکے سے اوپر اٹھا۔ میں نے آخری بار چیتو کی چتا دیکھی جس میں شعلے اب مدہم پڑ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ چیتو کی راکھ یہیں رہ گئی تھی۔ وقت کی ہوا اسے منتشر کر دیتی اور اس کا نام و نشان مٹ جاتا۔ لیکن جب تک میں زندہ رہتا وہ میرے دل میں زندہ رہتا۔ ہیلی کاپٹر نے جنوب مشرق کا رخ کیا تو میں چونکا تھا۔ اس کے ریڈیو آف تھے اور وہ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے ہیڈ فون مانگا تو کو پائلٹ نے مجھے ایک ہیڈ فون تھما دیا۔ میں نے اسے پہن کر پائلٹ سے کہا۔ "خیال رکھنا ہم زیادہ بلندی پر نہ جائیں۔"

"ہم اس وقت پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ نارمل بلندی ہے میدانی علاقے میں ہم تین ہزار فٹ کی بلندی پر آ جائیں گے۔"

"جب ایندھن ختم ہونے لگے تو کسی ہائی وے کے پاس رہنا ہم اتریں تو آگے بھی سفر کے لیے کچھ مل جائے اور تم دونوں کو بھی مشکل نہ ہو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔"

میں ساوتری کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور کچھ اس کے منہ میں ٹپکایا۔ وہ ہوش میں آنے لگی۔ میں نے مزید کوشش نہیں کی وہ خود سے جاگتی تو زیادہ اچھا تھا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں

اور دس منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اب ہوش میں تھی لیکن خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے جو وقفے وقفے سے رخساروں پر ڈھلک آتے تھے۔ میں نے اس کی طرف پانی کی بوتل بڑھائی۔ اس نے چند گھونٹ پانی لیا اور بولی۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ کی طرف۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں سے ہم پاکستانی سرحد کی طرف جانے کی کوشش کریں گے۔''

''یہ آپ نے اچھا کیا۔'' سادی نے سر ہلایا۔ ''گوبند شاہ ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔''

''وسیم کی اس طرف سرحد پار آنے جانے والوں سے واقفیت ہے۔ وہ ان لوگوں کی مدد سے ہمیں سرحد پار کراسکتا ہے۔'' پائلٹ کے خیال سے میں نے ہیڈ فون اتار دیا تھا اور ممکن حد تک دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔

''چچا...؟'' سادی نے کچھ دیر بعد کہا تو میں نے سرد آہ بھری۔

''راکھ ہوگیا۔''

سادی پھر رونے لگی تھی مگر اب اس کے رونے میں شدت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا۔ ''سادی مجھے راج اور بڑے کنور کا بھی...''

''کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا افسوس کرنے کی۔'' اس نے تڑپ کر میری بات کاٹی۔ ''میرا ان خود غرض اور سفاک لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کاش میں چچا کی بیٹی ہوتی۔ پلیز آئندہ ان کی بات مت کیجیے گا۔ میرا ماضی چچا ہے اور میرا حال اور مستقبل آپ لوگ ہیں اس کے علاوہ میرا کوئی ماضی نہیں ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ بس اب تم ہماری ہو۔''

''شوبی ان لوگوں کو کیسے بتائیں گے؟'' سادی کا اشارہ پاکستان والوں کی طرف تھا۔

''پتا نہیں... لیکن بتانا تو ہوگا۔''

میں نے سارا اسلحہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ نمایاں ہوتا تھا۔ میں نے صرف ایک چھوٹی شاٹ گن اور اس کے کچھ کارتوس سادی کے بیگ میں ڈال لیے تھے اور ایک پستول اور اس کے کچھ اضافی میگزین میری پتلون کی بیلٹ میں لگے ہوئے تھے۔ سادی کی طبیعت ٹھیک لگ رہی تھی ورنہ مجھے خدشہ تھا کہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد یہ فضائی سفر اس کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ میں گزشتہ تین گھنٹے سے مصروف عمل تھا۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے اور سورج مغربی افق پر جا پہنچا تھا مگر مجھے امید تھی جب تک ہم زمین پر اتریں گے روشنی برقرار رہے گی۔ سادی بھی سولہ سترہ گھنٹے سے بے آرام تھی اور اس دوران میں اسے بہت زیادہ حرکت بھی کرنا پڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سرحد پار کرنے کا مرحلہ بھی آسان نہیں ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں کم سے کم ایک رات مکمل آرام کی ضرورت تھی۔

پائلٹ نے پلٹ کر اشارہ کیا تو میں نے ہیڈ فون لگایا۔ اس نے کہا۔ ''ہم لدھیانہ سے تیس کلومیٹرز دور ہیں اور اب مشکل سے دس منٹ کی پرواز کا ایندھن رہ گیا ہے۔''

''اوکے تم پانچ منٹ میں کوئی ہائی وے تلاش کرو اور اس کے ساتھ ساتھ تین منٹ پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر نیچے اتار لو۔''

''یہ شرط مت لگاؤ اگر اترنے کے لیے مناسب جگہ نہ ملی۔''

''ہائی وے سے مناسب جگہ کون سی ہوگی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''ناؤ گو۔''

پائلٹ نے سر ہلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ پانچ منٹ بعد ہم ایک بڑی ہائی وے پر تھے اور اس چھ لین کی ہائی وے پر بے پناہ ٹریفک تھا۔ ان میں بڑے ٹرکس اور بسیں بہت زیادہ تھیں۔ اس ٹریفک میں ہائی وے پر ہیلی کاپٹر اتارنا خودکشی کے مترادف ہوتا اور اس سے بہت زیادہ افراتفری پھیلتی۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ''آس پاس کوئی جگہ دیکھو اور فوری ہیلی کاپٹر اتار لو۔''

اسی لمحے ایک سرخ روشنی جلنے بجھنے لگی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ ایندھن بہت کم رہ گیا ہے۔ میں اور پائلٹ دونوں بے تابی سے اترنے کے قابل کوئی جگہ دیکھ رہے تھے اور جگہ بیک وقت ہم دونوں کو نظر آئی۔ یہ ایک کبڈی کا میدان تھا جس میں دو ٹیمیں نبرد آزما تھیں۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر میدان کے اوپر لانے لگا۔ کھیلنے والے اپنا کھیل بھول کر ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ ہوئے اور جب وہ نیچے آنے لگا تو سب بھاگ گئے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میدان صاف ہوگیا تھا اور ہیلی کاپٹر آرام سے اس نرم مٹی والے میدان میں اتر گیا۔ پنکھے بے پناہ مٹی اڑا رہے تھے اس لیے میں نے اس وقت تک دروازہ کھولنے سے گریز کیا جب تک پنکھے تقریباً

رک نہیں گئے اور مٹی اڑنا ختم نہیں ہو گئی۔ میں نے ساوی سے کہا۔ ''تم اس اسٹیٹ کی راجکماری ہو جس کا یہ ہیلی کاپٹر ہے میں تمہارا محافظ اور سیکریٹری ہوں۔''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''جو چاہے بتا دیں۔''

یہ کوئی گاؤں تھا جس کے ساتھ ہی میدان میں کبڈی ہو رہی تھی اور تقریباً ساٹھ ستر تماشائی بھی تھے۔ اتنے لوگوں سے الجھنا اور بلاوجہ اسلحے کی نمائش یا زور زبردستی مناسب نہیں تھی اس کے مقابلے میں حکمت عملی سے کام لیا جاتا تو یہی لوگ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے۔ میں نے ساوی کو اندر رکنے کو کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا تا کہ لوگ خود راجکماری کو دیکھ سکیں۔ ویسے ساوی سچ مچ راجکماری ہی تھی۔ کنور خاندان راجا خاندان تھا اور وہ اب اس کی اکلوتی وارث تھی یا شاید اس کی ایک بہن اور بھی تھی۔ جاگیر و دولت اب اسے ملتی یا پھر راج کنور کے بچے وارث ہوتے۔ مگر اس وقت ساوی ریاست چتر پور کی راجکماری تھی۔ ہیلی کاپٹر پر ریاست کا نام بھی تھا۔ اترنے سے پہلے میں نے پائلٹس کو خبردار کر دیا کہ وہ کوئی غلط حرکت یا بات کرنے سے گریز کریں جس کا انجام ان کی وفات کی صورت میں نکلے۔ میرے اترتے ہی دو تنومند سکھ سامنے آئے۔ وہ کبڈی کے کھلاڑی تھے۔

''توں کون اے۔'' ایک نے ہیلی کاپٹر میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ریاست چتر پور کے مہاراجا جگجیت سنگھ کا ہیلی کاپٹر ہے۔ فنی خرابی کی وجہ سے ہیلی کاپٹر یہاں اتارنا پڑا۔ تم لوگوں کا کھیل خراب ہوا لیکن معاملہ جان کا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں ریاست کی راجکماری سفر کر رہی ہیں۔''

''توں کون اے؟'' دوسرے سکھ نے بھی وہی سوال کیا۔

''میں پرنسز کا سیکریٹری اور باڈی گارڈ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ہمیں یہاں سے آگے جانے کے لیے کوئی گاڑی مل سکتی ہے؟''

''آگے کہاں؟''

''ہمیں ہوشیار پور جانا ہے۔ وہاں راجا تیر سنگھ کے پوتے کی سگائی ہے پرنسز اسی میں شرکت کے لیے جا رہی تھیں۔''

راجاؤں کے ذکر سے زیادہ انہیں ہیلی کاپٹر اور اس میں موجود ساوی کی جھلک نے متاثر کیا تھا۔ ایک سکھ بولا۔ ''کیوں نہیں سرکار گڈیاں بہت... تسی حکم کرو۔''

''میری خیر ہے پر پرنسز ہر گاڑی میں سفر نہیں کر سکتی ہیں۔'' میں نے متنبہ کی۔ اس پر وہاں موجود گاؤں کے سرکردہ لوگوں میں مختصر میٹنگ ہوئی اور طے ہوا کہ فتیلے کی گڈی پرنسز کے لیے موزوں رہے گی۔ وہ مضبوط بھی تھی اور طویل سفر کر سکتی تھی۔ نیا سنگھ عرف فتیلا وہیں موجود تھا۔ وہ درمیانے قد اور درمیانے جسم کا صورت سے شریف نظر آنے والا شخص تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ فٹافٹ جا کر گاڑی لے آئے کیونکہ راجکماری کو بہر صورت آج کے دن وہاں پہنچنا ہے اور کل سے شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جائے گا۔ جب تک گاڑی آتی میں نے گاؤں کے معززین کو پابند کر دیا کہ وہ پائلٹس اور ہیلی کاپٹر کی دیکھ بھال کریں گے جب تک مدد نہ آ جائے۔ ان سے فارغ ہو کر میں واپس ہیلی کاپٹر میں آیا۔ میں نے پائلٹس سے کہا۔ ''ہم یہاں سے چلے جائیں گے اور ان کو بتایا ہے کہ ہیلی کاپٹر میں فنی خرابی ہوئی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد تم ریڈیو پر کسی سے مدد طلب کر سکتے ہو لیکن بہتر ہوگا ہمارے بارے میں کسی کو مت بتاؤ۔ ورنہ ممکن ہے تم پر اپنے آقا کی طرف سے عتاب نازل ہو میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری مہربانی کہ ہمیں مار کر نہیں جا رہے۔''

''میں بلاوجہ کسی کو نہیں مارتا اور ہاں کرنل کے بارے میں بھی بتا دینا وہ اب تک وہیں پھنسا ہوگا۔''

اس نے صرف سر ہلایا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں گے۔ فتیلا دس منٹ میں اپنی گڈی لے آیا۔ میری توقع کے عین مطابق یہ خستہ حال بھارتی ساختہ ٹیکسی تھی لیکن گاؤں والوں کے لیے یہ کسی لگژری کار سے کم نہیں تھی۔ مگر میں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا کیونکہ اصل مرحلہ یہاں سے جلد از جلد نکل جانے کا تھا۔ میں نے ساوی کا بیگ اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا اور وہ بہت نزاکت اور نخرے کے ساتھ آ کر ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ راجکماری کی مکمل اداکاری کر رہی تھی۔ ویسے گاؤں والے حیران تھے کہ راجکماری اتنے سادہ حلیے میں اور اتنے معمولی سے سامان کے ساتھ تھی۔ میں نے ان کے شکوک رفع کرنے کے لیے بیان جاری کیا کہ راجکماری فضائی سفر میں ایسا ہی لباس پہنتی ہیں اور ان کا سامان سڑک کے راستے پہلے ہی ہوشیار پور پہنچ چکا ہے۔ ہیلی کاپٹر میں اتنا سامان لے جانے کی گنجائش نہیں

تھی۔ میں نے کہا۔ "اس میں تو راجکماری کے زیورات کے بکس بھی نہیں آتے۔"

ہیلی کاپٹر اترنے کے دس منٹ بعد سورج غروب ہو گیا تھا اور اب مکمل اندھیرا تھا۔ مگر وہاں موجود افراد جانے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے جب ٹیکسی حرکت میں آئی تو میں نے اور ساوی نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے سب سے زیادہ خدشہ یہ تھا کہ کہیں سوال جواب نہ شروع ہو جائیں یا کوئی چتر پور کا واقف کار نہ نکل آئے یا کوئی ہوشیار پور کے مفرور شہزادہ راجا کی ہسٹری سے واقف ہو جس کی الف بے سے بھی ہم ناواقف تھے تو معاملہ خراب ہو جاتا اور پھر بات وہیں طاقت کے استعمال تک آجاتی جس سے آگے مزید خرابیاں پیدا ہوتیں۔ میں قلیچے کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جس کی زبان ٹیکسی کے انجن کے ساتھ ہی حرکت میں آگئی تھی۔ وہ پہلے تو ہمیں اپنی خاندانی تاریخ سناتا رہا، اگر ہم پیچھے کے صدمے میں نہ ہوتے تو بہت ہنستے مگر ہمارے لبوں پر مسکراہٹ تک نہیں آئی۔ ہائی وے تک آنے پر میں نے اسے خبردار کیا کہ پرنسز خاموشی پسند ہیں اور اپنے آس پاس بلا ضرورت شور پسند نہیں کرتی ہیں۔ اس پر وہ خاموش ہوا تھا۔

ہم ہائی وے پر الٹی سمت گئے تھے۔ بظاہر ہمارا رخ واپس شملہ کی طرف تھا لیکن کچھ دیر بعد ٹیکسی ایک ذیلی ہائی وے پر مڑی جو ہوشیار پور کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے قلیچے سے معلومات حاصل کیں اور ان کے مطابق پچھلی ہائی وے لدھیانہ کی طرف جا رہی تھی۔ دیگر معلومات میں نے یہ حاصل کیں کہ راستے میں کوئی پولیس چوکی اور چیک پوسٹ آتی ہے یا نہیں۔ اس نے انکشاف کے انداز میں گالی دے کر کہا۔ "کوئی جگہ ان.... سے خالی ہے۔ ہر جگہ کھانے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

میں نے اچانک کہا۔ "واپس چلو...."

وہ بھونچکا رہ گیا۔ "واپس... کیا گاؤں چلوں؟"

"نہیں... اب ہم لدھیانہ جائیں گے وہاں راجا صاحب کی ایک کوٹھی ہے۔"

"تو پہلے بتانا تھا جی وہیں چلتے۔" اس نے کہا۔

"پرنسز نے ابھی ارادہ کیا ہے پہلے تم کو کہاں سے بتاتا۔"

"انہوں نے کب کہا ہے جی؟" وہ پھر حیران ہوا۔

"ابھی.... ہم تابعدار خادم ہیں آنکھ کا اشارہ سمجھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد آنے والے اولین کٹ سے اس نے ٹیکسی واپس موڑ لی۔ بیس منٹ بعد ہم اس کے گاؤں کے پاس سے گزرے تھے ہیلی کاپٹر اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ ایک دو گھنٹے میں ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ یہاں سے پرواز کر جائیں گے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چیک پوسٹ کے پاس سے گزرے تھے لیکن وہاں موجود پولیس نے ہمیں روکا نہیں۔ وہ صرف بسوں اور ٹرکوں کو روک رہے تھے کیونکہ اسی سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ گاڑیوں کو روکنے سے بعض اوقات لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ انڈیا میں دولت مند اور اونچے طبقے کے لوگ بھی ٹیکسیوں یا عام سی گاڑیوں میں سفر کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ قلیچے نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ ہائی وے پھگواڑے کی تھی۔ ہم چنڈی گڑھ کی طرف جاتے ہوئے ہوشیار پور کی طرف مڑے تھے۔ وہ ہائی وے الگ تھی۔

میں اس کی گفتگو ذہن نشین کر رہا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ ہائی وے پھگواڑے ہی سے آگے فیروز پور کی طرف جاتی تھی اور یہی ہائی وے آگے جا کر پاکستان میں داخل ہونے کے بعد فیروز پور روڈ بن جاتی تھی جو قصور سے ہوتی لاہور تک چلی جاتی تھی۔ فیروز پور مشرقی پنجاب میں اہم ترین شہر تھا کیونکہ اس کے پاس ہی ستلج کا ہیڈ ورکس تھا اور ریڈ کلف نامی بددیانت شخص نے اسے فراخ دلی سے انڈیا کو بخش دیا تھا حالانکہ یہ آبادی اور اہمیت کے لحاظ سے پاکستان کا فطری حصہ تھا۔ اسے انڈیا کو دینے کا مقصد پاکستان کو ستلج کے پانی سے محروم کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا کنٹرول سنبھالتے ہی انڈیا نے پانی بند کر دیا۔ ایک نام نہاد معاہدے کے ذریعے انڈیا کو تین مشرقی دریا بخش دیے گئے حالانکہ وہ سارے کے سارے کشمیر سے آتے ہیں اور کشمیر ہمارا حصہ ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی اس فراخ دلی کا انڈیا کے ہوشیار حکمرانوں نے یہ جواب دیا کہ اب وہ باقی تینوں دریاؤں پر بھی دھڑا دھڑ ڈیم بنا رہے ہیں اور مستقبل میں وہ ہمارا پانی مکمل طور پر بند کرنے کی پوری تیاری کر رہے ہیں۔

فیروز پور کا نام سن کر یہ ساری باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں۔ ٹیکسی والے نے پتا پوچھا تو میں چونکا اور اس سے کہا۔ "فی الحال ہمیں کسی اچھے شاپنگ سینٹر پر اتار دو.... پرنسز نے کچھ لینا ہے ہم وہاں سے واپس جائیں گے۔"

قلیچے کے چہرے پر شک آیا تھا مگر وہ جرأت نہیں کر سکا

کہ نیل کا بچر سے اترنے والوں پر کسی قسم کا شک کر سکے۔ اگر ہم وہ نہیں تھے جو ظاہر کر رہے تھے تب بھی اس کی اوقات سے بہت اوپر کی چیز تھے اس لیے اس نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ اس نے ہمیں لدھیانہ شہر کی سول لائن کے پاس بازار میں اتارا اس میں کئی جدید شاپنگ سینٹر تھے۔ یہ بڑا شہر نہیں ہے مشکل سے چند کلو میٹرز پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس شہر نے تقسیم سے پہلے بے شمار شاعر اور عالم پیدا کیے۔ نیچے اترنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میری جیب تو خالی تھی۔ میں نے بیگ کھولا اور اس میں سے ایک پانچ سو والی گڈی سے ایک نوٹ نکال کر سکھ کے حوالے کیا۔ اس کے چہرے پر جو خوشی دکھائی دی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ "اب جاؤ۔"

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں ساوی کے ہمراہ پہلے ایک ریستوران کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں کا تھکن اور بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ ریستوران میں کھانے کا آرڈر کر کے ہم نے باری باری خود کو اس کے واش روم میں فریش کیا۔ میدانی علاقے میں گرمی بے پناہ تھی اور اے سی میں آ کر سکون ملا تھا۔ ساوی کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوج رہی تھیں۔ منہ دھو کر اس کا چہرہ بہتر ہوا تھا۔ کھانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے میں نے اس کے لیے چائے اور اپنے لیے کافی کے ساتھ اسنیکس کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے ڈنر کے وقت ان چیزوں کے آرڈر پر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں اور خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ساوی نے پوچھا۔ "اب ہم کیا کریں گے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ رات یہاں رک کر ہم صبح کہیں اور جائیں گے اور پھر وسیم اور دوسروں سے رابطہ کریں گے۔"

وسیم کے نام پر اس کا چہرے پر رنگ آیا تھا اس نے لجاجت سے کہا۔ "شوبی کیا آج رابطہ نہیں کر سکتے؟"

"آج۔" میں نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "کوشش کر سکتے ہیں۔"

لیپ ٹاپ اور اس کے ساتھ دوسرا سامان نہ جانے کہاں گیا تھا مگر مجھے موبائل کے مقابلے میں انٹرنیٹ سے رابطہ محفوظ لگا تھا۔ چائے اور کافی کے ساتھ ہلکی پھلکی چیزوں نے ہمیں کسی قدر تازہ دم کر دیا تھا۔ ریستوران سے نکل کر ایک شاپنگ سینٹر میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنے لیے جینز اور ڈریس شرٹ کے جوڑے لیے۔ بنیان اور موزے لیے۔ جوتے مجھے اسی اسٹور میں مل گئے تھے۔ ساوی کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے ایسی چیزوں کی خریداری کی جن سے ہمارا حلیہ مختلف نظر آتا۔ میرے لیے اس نے سن گلاس اور سادہ شیشوں والے فریم لیے۔ ایک پی کیپ تھی۔ اپنے لیے اس نے فیشن ایبل قسم کے دو ہیٹ لیے تھے۔ ٹرائی روم میں میں نے لباس تبدیل کیا۔ اتارا جانے والا لباس میں نے باہر نکل کر ایک ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ میرا اضافی جوڑا اور دوسرا سامان ساوی کے بیگ میں آ گیا تھا اس کے لیے ہمیں الگ سے کوئی بیگ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں سے میں نے معلوم کیا تو اسی بازار میں ایک شاپ کا پتا چلا جہاں مجھے کمپیوٹر اور اسی قسم کا دوسرا سامان مل سکتا تھا۔

انڈیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں بھی کمپیوٹر اور دوسرے سامان کی ایسی جدید شاپ موجود تھی جہاں سب کچھ دستیاب تھا۔ میں اندر داخل ہوا تھا کہ میری نظر ایک ڈسپلے میں سجے بڑی اسکرین والے ٹیب کمپیوٹرز پر گئی۔ یہ اس وقت نئے آئے تھے اور تیزی سے مقبول ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ کمپیوٹر کی بجائے ٹیب کیوں نہ لے لوں۔ میں نے شاپ کیپر کو بتایا کہ مجھے ایسا ٹیب چاہیے جس میں انٹرنیٹ کے لیے الگ سے کچھ لگانا نہ پڑے۔ اس نے فوراً ایک ٹیب نکال کر میرے سامنے رکھا۔ "سر یہ انٹرنیٹ ریڈی ہے اس میں بلٹ ان ہے۔ صرف کنکشن آن کرانا پڑے گا۔"

"کنکشن کیسے آن ہو گا؟"

"سر آپ انٹرنیٹ پرووائڈر سے....."

"سوری میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کیا یہ کام آپ نہیں کر سکتے۔ میں ادائیگی کروں گا۔"

"کیوں نہیں سر۔" اس نوجوان سکھ نے خوشدلی سے کہا۔ "انٹرنیٹ سمیت یہ آپ کو پینتیس ہزار میں پڑے گا۔ اس میں تین مہینے کا انٹرنیٹ بھی شامل ہو گا۔"

"ٹھیک ہے تم اسے ایکٹو کرا دو اور اس دوران میں ذرا اس کا استعمال سمجھا دو۔"

"مجھے آتا ہے۔" ساوی نے مداخلت کی۔ "مانی کے پاس ہے اس نے سکھایا تھا۔"

"بس تو تم انٹرنیٹ آن کرا دو۔"

"آپ بیٹھیں میں یہ کام کراتا ہوں۔" اس نے سامنے لگی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ چند منٹ میں اس

نے انٹرنیٹ آن کرا کے ہمیں چیک کرایا اور بولا۔ "اسے کراس وی اڈاپٹر کہیں بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے سگنل ہر جگہ ملیں گے۔ اس میں ڈبل کیمرا ہے فرنٹ کیمرے سے اسکائپ پر ویڈیو کال کی جا سکتی ہے۔"

"بیٹری ٹائمنگ کتنی ہے؟"

"نارمل یوز پر چار سے چھ گھنٹے اور آڈیو ویڈیو پر تین سے چار گھنٹے۔ یہ ہر طرح کی ویڈیو پلے بیک کر سکتا ہے۔"

اس نے کر کے دکھایا۔ اس کے ساتھ چارجر، چند فری لوڈ کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ سادی کسی قدر پُرجوش ہو گئی تھی۔ باہر آ کر اس نے کہا۔ "اب ہم وہاں بات کر سکتے ہیں۔"

"ہاں لیکن اس کے لیے ہمیں کسی جگہ کی ضرورت ہو گی جہاں ہم کسی کی نظر اور کان میں آئے بغیر پاکستان رابطہ کر سکیں۔" میں نے کہا اور ایک ٹیکسی والے کو روکا۔ اندر بیٹھ کر میں نے اس سے کسی ایسے ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا جہاں کھانے کے ساتھ رات رہنے کا انتظام بھی ہو۔ ٹیکسی والے نے جس معنی خیز نظروں سے سادی کو دیکھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ٹیکسی والے نے کیا سوچا ہے مگر ہماری بلا سے وہ جو چاہے سوچتا رہے۔ اس نے ایک ذرا اچھے درجے کے ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روکی اور جب میں اسے کرایہ دے رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "سر جی اگر کوئی کمرا چاہیے تو وہاں ساگر سے بات کرنا..... وہ ویٹر ہے۔"

سادی ذرا دور تھی وہ نہیں سن سکی ورنہ مزید برا مناتی۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی۔ ہوٹل والے اس کے بغیر کمرا نہیں دیتے۔ ایسے میں ٹیکسی والے کی خراب ذہنیت کام آئی اس نے ہمیں عیاش جوڑا سمجھا اور اپنے جاننے والا کا نام دے دیا۔ ساگر ہماری مدد کر سکتا تھا۔ ڈائننگ ہال بڑا اور اس وقت بھرا ہوا تھا۔ رات کے دس بجے وہاں مشکل سے کوئی میز خالی نظر آ رہی تھی مگر ایک ہیڈ ویٹر نے ہمارے لیے جگہ نکال لی۔ میں نے سی فوڈ کا آرڈر دیا تھا تاکہ حلال حرام کا مسئلہ نہ ہو۔ بھوک ہم دونوں کو نہیں تھی۔ ہم تو یہاں کسی اور مقصد کے تحت آئے تھے۔ جو ویٹر آرڈر لینے آیا میں نے اسے آرڈر کے ساتھ ہی ایک پانچ سو کا نوٹ تھما دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر آیا تھا کہ اگر میں اسے حکم دیتا کہ اپنے باپ کو قتل کر دو تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتا۔ آرڈر ری چیک کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ "سر کوئی خدمت؟"

"ساگر نامی ایک ویٹر ہے یہاں؟"

وہ چونکا۔ "ہے لیکن سر جو کام ساگر کر سکتا ہے وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔"

میں نے سوچا اور آہستہ سے کہا۔ "ہمیں ایک رات کے لیے کمرا چاہیے۔ بغیر کسی لکھا پڑھی کے..... تم سمجھ رہے ہو نا؟"

ٹیکسی ڈرائیور کی نسبت یہ ویٹر نہایت گھاگ اور تجربے کار تھا اس نے نظر اٹھا کر بھی سادی کو نہیں دیکھا اور نہایت نارمل لہجے میں بولا۔ "کیوں نہیں سر..... بالکل مل سکتا ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہ ہو..... نہ ابھی..... نہ رات میں اور نہ صبح۔" میں نے کسی قدر بدلے لہجے میں کہا۔ "میں مسئلے پسند نہیں کرتا ہوں ان کا فوری حل نکال لیتا ہوں۔ اس میں مجھے صرف مالی نقصان ہوتا ہے لیکن دوسروں کا نقصان اس سے آگے کا ہوتا ہے۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ "سر کوئی مسئلہ نہیں ہو گا..... میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

"اس صورت میں تمہاری توقع سے زیادہ ملے گا۔"

"آپ آرام سے ڈنر کریں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "کوشش کریں کم سے کم دو گھنٹے یہاں رکیں تاکہ آپ کو باہر کہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔"

اس کے جانے کے بعد ہم نے ڈنر شروع کیا۔ سادی کم کھا رہی تھی مگر میں نے اصرار کیا۔ "سادی کھاؤ..... ہمیں آنے والے وقت کے لیے توانائی کی ضرورت ہے۔ یہ سوچ کر کھاؤ..... ویسے بھی ہمیں یہاں دو گھنٹے گزارنے ہیں۔"

ہم نے بہت سکون سے ڈنر کیا۔ سب کھایا اس کے بعد میں نے اپنے لیے کافی اور سادی کے لیے اورنج جوس منگوا لیا۔ اسے دوائیاں لینی تھیں۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجے تھے اور آرام دہ نشست پر بھی سادی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ویٹر کے لیے اشارہ کیا تو وہی ویٹر نمودار ہوا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔ "سر پلیز..... صرف پندرہ منٹ اور..... نائٹ شفٹ چینج ہو رہی ہے۔ اس میں اپنا آدمی آئے گا اور وہ کوئی مسئلہ نہیں ہونے دے گا۔"

مجبوراً ہمیں مزید بیٹھنا پڑا اور اس کے لیے مجھے ایک کافی اور پینا پڑی تھی۔ خدا خدا کر کے ویٹر گیارہ پچاس پر واپس آیا۔ اس نے بل میرے سامنے رکھا اور میں نے اسے دیکھ کر رقم بل کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے کہا۔ "میرے

ساتھ آیئے سر۔"

وہ پھرتی سے چند قدم آگے چلا گیا اور ہم اٹھ کر یوں لابی کی طرف آئے جیسے ہوٹل سے جا رہے ہوں۔ ویٹر لابی میں ایک کونے میں دکھائی دیا اور اس نے ہمیں اشارہ کیا۔ میں سادی کا ہاتھ تھام کر اس طرف بڑھ گیا۔ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ سیڑھیوں کی ساخت بتا رہی تھی کہ یہ ہنگامی حالات کے لیے مخصوص تھیں۔ ویٹر ہمیں تیسری منزل پر لایا۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کر سادی کی سانس پھول گئی تھی اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے اسے سہارا دینا پڑا تھا۔

تیسری منزل پر ایک سنسان راہداری میں ویٹر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ ہم اندر آئے اس نے ماسٹر سوئچ دبایا تو پورا کمرا روشن ہو گیا تھا۔ ایک طرف بڑے سائز کا ڈبل بیڈ تھا جس پر قیمتی ویلوٹ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک طرف کھڑکی پر بھاری پردے تھے۔ بیچ میں فانوس لگا ہوا تھا۔ ایک کونے میں دو عدد ڈبل صوفے تھے۔ دیواروں پر پینٹنگز آویزاں تھیں۔ اس نے اٹیچ باتھ کا دروازہ کھول کر دکھایا اور پھر اے سی چلایا۔

"ایوری تھنگ از اوکے اینڈ فائن۔"

"فائن۔" میں نے کہا۔ "ایک رات کا رینٹ کیا ہو گا؟"

"صرف دس ہزار سر۔" اس نے سکون سے کہا۔ "ویسے اس کا رینٹ سات ہزار ہے لیکن اس کے لیے رجسٹر میں نام اور پتا دینا لازمی ہوتا ہے۔ اب آپ سے کوئی نام پتا نہیں پوچھے گا۔"

میں نے پانچ ہزار نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔ "یہ نصف پیشگی ہے۔"

"سوری سر رینٹ مکمل ایڈوانس ہوتا ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے سوچا اور باقی پانچ ہزار بھی اسے دیتے ساتھ ہی میں نے شرٹ اٹھا کر اسے پستول کی جھلک دکھائی۔

"کوئی گڑبڑ نہ ہو ورنہ...."

اس کا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ "کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔"

"گڈ، میں دے کر پیسا واپس لینے کا قائل نہیں ہوں۔"

"سر کسی اور چیز کی ضرورت۔" اس نے اشارہ کیا۔ "یہاں سب دستیاب ہے ملکی بھی اور غیر ملکی بھی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے شکریہ۔" میں کھردرے لہجے میں بولا تو وہ سلام کر کے جانے لگا۔ پھر دروازے پر رکا۔ "سر آپ باہر نہیں جائیں گے نہ روم سروس کو کال کریں گے اور نہ ہی آنے والی کوئی کال ریسیو کریں گے۔ یہاں سے کوئی آواز بھی باہر نہ جائے جس سے آس پاس والے ڈسٹرب ہوں اور سر کمرا صبح نو بجے خالی کرنا ہو گا۔"

"میں جانتا ہوں پہلی بار کسی ایسی جگہ نہیں آیا ہوں۔" میں نے کہا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ سادی ایک طرف مجوب سی بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "سوری گڑیا... یہ مجبوری ہے۔"

"میں جانتی ہوں شوبی۔" اس نے سر ہلایا۔ "پھر بھی مجھے شرم آ رہی ہے۔"

"اسے بھول جاؤ۔" میں نے ٹیپ لگاتے ہوئے کہا۔ "تم فریش ہو کر آجاؤ میں رابطہ کر رہا ہوں۔"

"میں آتی ہوں۔" وہ بولی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے اسکائپ آن کیا اور سفیر کے نمبر پر کال کی۔ جب بیل جا رہی تھی تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں کیسے ان لوگوں کو یہ خبر سناؤں گا۔ جب کہ میں نے خود ابھی تک اسے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ سفیر نے کال وصول کی اور میری آواز سن کر حسب معمول چلایا۔

"ابے تو کہاں مر گیا ہے کوئی رابطہ ہی نہیں۔"

"بس یار ابھی فرصت ملی ہے..... مرا نہیں کہ مرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔" میں نے خالی ذہن کے ساتھ کہا۔ جذبات اور احساسات کی ہلکی سی لہر بھی نہیں تھی۔

"جیتا کہاں ہے تم لوگ سادی کو لے آئے؟"

"جیتا مر گیا ہے.... ہاں سادی کو لے آیا ہوں۔" میں نے اسی کیفیت میں کہا۔ میرے الفاظ نے سفیر کو شاک دیا تھا۔ وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

"بکواس نہ کر ایسی خبیث چیزیں اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتی ہیں۔"

"نہیں یار وہ بہت آسانی سے مر گیا۔" میرا لہجہ گلوگیر ہونے لگا۔ "یار سفیر جیتا مر گیا سچ مچ مر گیا۔"

"نہیں.... ایسا نہیں ہو سکتا۔" سفیر نے کہا پھر وہ بھی رونے لگا۔ "یہ تم دونوں کی سازش ہے تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔ میں اسے بہت تنگ کرتا ہوں نا.... شہباز میرے ساتھ

حماقی پن مت کر... میری بیتو سے بات کرا... وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔"

"سفیر وہ چلا گیا ہے سب کو چھوڑ کر۔"

اسی لمحے سفیر سے موبائل وسیم نے چھین لیا۔ "شہباز صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں... بیتو..." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔

"ہاں یار۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بچاتے ہوئے اس نے اپنی جان وار دی۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی۔"

وسیم بھی رو رہا تھا۔ عبداللہ آ گیا اس نے موبائل لیا تو اسے بھی بتانا پڑا تھا۔ پہلے وہ شاک میں رہ گیا تھا۔ پھر اس نے سادی کے بارے میں پوچھا۔ "وہ میرے ساتھ ہے... واش روم گئی ہے۔ ایک منٹ میں اسے بلاتا ہوں۔"

میں نے دروازے پر دستک دی۔ سادی باہر آئی تو اس کا چہرہ پانی سے نہیں آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم بات کرو میں آتا ہوں۔"

جب تک میں اپنے دل کا بوجھ کم کر کے آیا سادی رو دھو کر خاموش ہو گئی تھی اور اس کی وسیم سے بات بھی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سفیر اور عبداللہ نے بھی وسیم کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ سادی نے ویڈیو کال ملائی تھی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بیتو کا دکھ اپنی جگہ لیکن سادی کو دیکھ کر وسیم کے چہرے پر جو اطمینان آیا تھا وہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ جب تک سادی واپس نہیں آئی وسیم کے دل پر جو قیامت رہی تھی وہ وہی جانتا تھا یا پھر سادی جانتی تھی۔ یہ اطمینان ہی ان کی دلی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا سادی نے مجھ سے کہا۔ "وسیم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

وسیم نے کہا۔ "سادی نے مجھے مختصراً حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"یعنی اب تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟"

"آپ فکر نہ کریں میں خود روانہ ہو رہا ہوں اور اچھے آدمی بھی ساتھ لاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "آپ کل صبح مجھ سے رابطہ کر لیے گا۔ اس وقت تک سچویشن واضح ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے لمبی بات کرنا مناسب نہیں ہے اور ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ سادی کو آرام کی ضرورت ہے۔ کل صبح بات کریں گے۔" میں نے کہا اور ٹیپ آف کر دیا۔ سادی بستر پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اے سی چلنے کے بعد کمرا خنک ہو گیا تھا۔ یہاں دو ہلکے کمبل موجود تھے۔ میں نے ایک کمبل اور تکیہ اٹھایا۔ "تم سو جاؤ... میں نیچے لیٹ رہا ہوں۔"

وہ بے چین ہو گئی۔ "شوبی نیچے صرف قالین ہے آپ بے آرام ہوں گے۔"

"میں تو کھردری زمین پر سوتا آیا ہوں۔ تم فکر مت کرو قالین دبیز ہے۔ میں کمبل بھی بچھا لوں گا۔ تم سو جاؤ۔" میں نے کہا اور قالین پر تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی سردی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ کمبل لیتا۔ سادی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"شوبی کیا ہم بیتو کے لیے دعا نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "ہم ان نبی ﷺ کے امتی ہیں جنہوں نے منافقوں کی بخشش کے لیے بھی دعا کی تھی۔ بیتو منافق تو نہیں تھا۔ ہم اللہ سے مانگ سکتے ہیں آگے وہ مرضی کا مالک ہے کہ بخشے یا نہ بخشے۔"

سادی خاموش ہو گئی پھر اس نے نہیں کہا تھا۔ میں نے دل میں بیتو کے لیے دعا کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جسم خستہ حال ہو رہا تھا اور دل کی کیفیت اس سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ اس کے باوجود بہت مشکل سے نیند آئی۔ میں شاید دو بجے سویا تھا اور صبح سات بجے آنکھ کھل گئی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور سر میں درد تھا۔ سادی بے خبر سو رہی تھی میں نے اسے سونے دیا اور خود اٹھ کر واش روم میں آیا۔ یہ لگژری قسم کا باتھ روم تھا۔ جس میں باتھ ٹب بھی تھا۔ میں نے اسے گرم پانی سے بھرا۔ اس میں نمک اور جراثیم کش ملایا اور کپڑے اتار کر اس میں بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں زخم تھے اور کسی قدر گہرے تھے وہاں مرہم لگی تھیں۔ کچھ دیر میں تکلیف کم ہو گئی اور گرم پانی جسم سے درد کھینچنے لگا تھا۔ میں گردن تک اس میں ڈوب کر لیٹ گیا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نو بجے ہمیں یہاں سے نکلنا تھا اس کے بعد ہم کہیں ناشتا کرتے اور پھر گھومتے پھرتے رہتے۔ اگر وسیم صبح تک یہاں پہنچ کر ان لوگوں سے رابطہ کر لیتا جو سرحد پار کراتے تھے تو ممکن ہے آنے والی رات ہم پاکستان میں ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیں پھر رات گزارنے کے لیے یہ ٹھکانا تو ملا ہوا تھا۔ نو گھنٹے کا آرام کافی ہوتا۔

میں شاید غنودگی میں چلا گیا تھا اچانک برابر والے

کمرے سے ایسی دھمک ہوئی جیسے کوئی دیوار سے ٹکرایا ہو۔ ساتھ ہی ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ میں چونک گیا۔ شاید برابر والے کمرے میں کوئی جوڑا تھا اور مرد نے معاملات سلجھانے کے لیے بازو کا سہارا لیا تھا۔ دھمک خاصی بلند تھی اور اتنی قوت سے کوئی دیوار سے ٹکرائے تو اس کی وفات کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ مگر جب آواز دوبارہ نہیں سنائی دی تو میں واپس لیٹ گیا۔ پھر مجھے وقت کا خیال آیا۔ برابر سے اپنی رسٹ واچ اٹھا کر دیکھی۔ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ میں سوا گھنٹے سے یہاں تھا۔ گرم پانی نے مسل ڈھیلے کے ساتھ درد بھی کھینچ لیا تھا اور میرا جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر میں نے کوئیک شاور لیا اور تولیے سے جسم صاف کر کے کپڑے پہن کر باہر آیا۔ سادی جاگ گئی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر اٹھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "جلدی سے واش روم سے ہو آؤ... ہمیں نو بجے یہاں سے جانا ہے۔"

"میں نہا بھی لوں گی۔"

"اسی لیے جلدی کا کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ کر بال بنائے۔ مجھے حکیم قادری کی دوائیاں کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا لیکن ان کی یہ تاثیر اب تک برقرار تھی کہ میرے زخم بہت تیزی سے بھر جاتے ہیں۔ اب بھی معمولی زخم بھر چکے تھے اور بس کھرنڈ باقی رہ گیا تھا اور جو گہرے تھے وہ بھی بھرنے کی پوزیشن میں آ چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹیب اور انٹرنیٹ کی سہولت اپنی جگہ لیکن مجھے ایک موبائل کی ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے بہت جلد رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ ایک ریک تھا جس پر مختلف شو پیس رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کرسٹل کا بنا ہوا ٹیڈی بیئر تھا۔ یہ ذرا مختلف چیز تھی میں نے پہلی بار کرسٹل کا بنا ہوا ٹیڈی بیئر دیکھا تھا۔ اس کا شیشہ کسی قدر گہرے سبز رنگ کا تھا۔ میں نے ایسے ہی اسے اٹھایا تو اس کے نیچے چھپا ہوا تار نظر آیا۔ تار ٹیڈی بیئر کے اندر جا رہا تھا اور پیچھے یہ دیوار میں غائب ہو رہا تھا۔

بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی نائٹ شو پیس تھا اس کے اندر روشنی ہوتی تھی اور یہ رات کی تاریکی میں نظر آتا۔ تار بجلی کا ہو سکتا تھا۔ مگر میں جن حالات سے گزر رہا تھا اور جس طرح ہمیں یہ کمرا ملا تھا۔ میں مشکوک ہو گیا۔ میں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ یہ وزنی تھا شاید ایک سوا کلو وزن ہو گا۔ پھر میں نے تار کھینچ کر توڑ دیا اور ٹیڈی بیئر نیچے گرا دیا۔ وہ ٹوٹ گیا اور اس کے اندر چھپی چیز سامنے آ گئی۔ یہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
عید کی خوشیوں کے سنگ
جاسوسی کے شمارے کے دلفریب رنگ
اولین صفحات ● جرم کی سنگین دلدل میں پھنستے مسکراتے لوگوں کے دھنسنے کا دل خراش فسانہ... روبینہ رشید کے قلم سے
آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے مشترکہ ساتھیوں کی ایک نرالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سامنا درپیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شمولیت
جواری ● احمد اقبال کے شہرۂ قلم سے ایک جواری کے کھیل کے تحت نیا انداز
مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و ماحول کی عکاسی کرتی محبت کی پاسدار قابل فراموش کہانیاں
سرورق کی کہانیاں
پہلی کہانی ● معصوم بچوں کے اغوا کے سنگ دلوں کے بہیمانہ رویوں کی مظہر دل سوز کہانی
دوسری کہانی ● نصرت حسین کی حسین والہانہ زندگی حیات کے تحفظ کو درپیش خطرات پر مبنی سنسنی خیز تحریر
آپ کے تبصرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

چھوٹا سا لیکن جدید ترین کیمرا تھا اور اس کا لینس بتا رہا تھا کہ یہ بہت واضح تصویر یا ویڈیو لے سکتا ہے۔ بات واضح تھی۔ ویٹر اور اس کے ساتھ دوسرے افراد کا پورا گینگ تھا۔ وہ عیاش طبع لوگوں کو یہاں کمرا مہیا کرتے تھے اور ان کی شرمناک سرگرمیوں کی تصاویر اور ویڈیو بنا کر پھر انہیں بلیک میل کرتے تھے۔ ظاہر ہے جو ایک رات کے لیے دس ہزار دے سکتے ہوں گے وہ دولت مند ہی ہوں گے۔ اگرچہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ ہم یہاں رات گزارنے آئے تھے اور کچھ دیر میں یہاں سے چلے جاتے۔ اس کے باوجود مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

سادی شاور لے رہی تھی اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا تھا وہ باہر آئی تو ٹیڈی بیئر دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے کیمرا دکھایا تو اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے اشارے سے منع کیا اور بولا۔ "تیار ہو تا وہ آنے والا ہوگا وہی ہمیں یہاں سے باہر نکالے گا۔"

"میں تیار ہوں۔" سادی نے جواب دیا اور جو سامان بیگ سے باہر تھا اسے اندر رکھ لیا۔ میں نے کیمرا پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور ٹیڈی بیئر کے ٹکڑے یونہی پڑے رہنے دیے۔ ٹھیک نو بجے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا۔ ویٹر اندر آیا تھا اور اس نے آتے ہی ٹیڈی بیئر کے ٹکڑے دیکھ لیے۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"یہ..... یہ کیا؟"

"غلطی سے ٹوٹ گیا..... میں اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"مگر اس میں....." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"شاید تم اس کی بات کر رہے ہو۔" اب میں نے اسے کیمرا نکال کر دکھایا تو اس کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا۔ مگر ڈھٹائی باقی تھی۔

"مجھے کیا معلوم سر۔"

"تمہیں شاید اپنے باپ کا علم نہ ہو لیکن اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔" میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور سر کی بھرپور ٹکر اس کی ناک پر رسید کی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے ایک دردناک کراہ نکلی اور اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے پستول نکال کر نال اس کے منہ میں رکھ دی۔ اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم لوگ یہاں رات گزارنے والوں کی ویڈیو بناتے ہو..... یہ کام کہاں ہوتا ہے؟"

اس کی ناک سے خون پھوٹ کر نکلا تھا اور اس کی سفید شرٹ پر گر رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس بار میں نے سر کی بجائے گھونسے سے کام لیا اور اس کی ناک کا رہا سہا بھی ملبہ ہو گیا۔ وہ بلبلایا تھا مگر اس نے اونچی آواز نکالنے سے گریز کیا۔ یہ اس کا مسئلہ بھی تھا۔ "اپنی خوب صورت ناک کو تم نے خود چپٹی بنوا لیا ہے مگر تم چپٹی ناک کے ساتھ بہ خوبی زندہ رہ سکتے البتہ اگر میں نے تمہاری گردن توڑ دی تو تم سو فیصد مر جاؤ گے۔ اس لیے میرے سوال کا درست جواب دو۔"

وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا اس لیے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اپنے دو دانت نکلوا کر مان گیا۔ میں نے اسے موقع دیا کہ وہ واش روم میں جا کر اپنی ناک دھولے جو سوج کر اپنے اصل سائز سے دوگنی ہو گئی تھی۔ اس نے منمنا کر کہا۔ "اب اس حلیے کے ساتھ باہر جاؤں گا؟"

"بعد میں وضاحت کر سکتے ہو کہ سیڑھیوں سے گر گئے تھے یا بے خیالی میں دیوار سے ٹکرا گئے تھے۔ اب وقت ضائع مت کرو ورنہ خود ضائع ہو جاؤ گے۔"

بادل ناخواستہ وہ مجھے اور سادی کو لے کر باہر آیا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے کر دوبارہ پتلون کی جیب میں کر لیا تھا اور اسے خبردار کیا کہ میں یہاں سے بھی درست ترین نشانہ لے سکتا ہوں اس لیے وہ خود سے مرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیں اسی فلور کے ایک کمرے میں لایا۔ دستک کے جواب میں ایک شخص نے پوچھ کر دروازہ کھولا اور مجھے ویٹر کے عقب میں دیکھ کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے ویٹر کو اس پر دھکیل کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔ دونوں پیچھے گرے اور ان کے اٹھنے سے پہلے ہم اندر آ گئے تھے۔ وہاں ایک شخص میز پر لگے بڑے ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جس پر مختلف کیمروں کے مناظر آ رہے تھے۔ ایک سکھ ایک طرف کھڑا تھا۔ ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھے شخص نے اٹھنے کی کوشش کی اور پستول دیکھ کر واپس بیٹھ گیا۔ "سب اس طرف دیوار کے ساتھ منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔"

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے ان کی تلاشی لی صرف مانیٹر کے سامنے بیٹھے شخص کے پاس سے ایک گراری والا چاقو نکلا تھا۔ باقی سب نہتے تھے۔ سکھ کے پاس کچھ نہیں

تھا اور مجھے لگا کہ وہ ان کا ساتھی بھی نہیں تھا۔ جلد اس کی تصدیق ہو گئی جب اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”اوئے میتوں جان دیو.... رب دی سوں بے کدی ایتھے آواں۔“

”سردار جی آرام سے۔“ میں نے تلاشی سے فارغ ہو کر کہا اور پھر مانیٹر پر بیٹھے شخص سے پوچھا۔ ”ان کیمروں کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟“

اس نے لرزتے ہاتھوں سے ایک طرف رکھے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”سب اس میں ریکارڈ ہوتا ہے۔“

”اور کل رات کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟“

اس نے مجھے جگہ دکھائی جہاں سب ریکارڈ ہو رہا تھا۔ یہ جدید ترین کمپیوٹر تھا جس میں بڑی گنجائش والی ہارڈ ڈسک لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی رائیٹر بھی تھا گویا ان لوگوں نے مکمل بندوبست کیا ہوا تھا۔ یہ صرف ان تین افراد کا سیٹ اپ نہیں تھا اس میں یقیناً اس ہوٹل کے اور لوگ بھی ملوث تھے۔ میں نے صرف اپنے کمرے کی ریکارڈنگ چیک کی۔ ساوی کی موجودگی میں باقی کمروں کی ریکارڈنگ چیک نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہارڈ ڈسک سے مکمل فولڈر اڑا دیا اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ اسے دوسری دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دے کر میں نے کمرے کی تلاشی لی تو ایک دراز سے کئی ڈبے سی ڈیز کے نکلے۔ ان میں ریکارڈ شدہ سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بھری ہوئی تھیں۔ یہ سب میز پر رکھ کر میں نے سنگھ سے پوچھا۔

”تم کون ہو اور یہاں کس خوشی میں ہو؟“

”میں ہوشیار سنگھ ہوں جی... ادھر فیروز پور سے آگے میری زمین ہے۔“

”تم زمیندار ہو..... یہاں کس لیے آئے تھے؟“

”جس کے لیے تم آئے تھے۔“ دروازہ کھولنے والے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ جوان عمر شخص تھا یہ تینوں ہی جوان عمر تھے۔ جواب میں میں نے عقب سے اس کی گدی پر گھونسا مارا اور آگے سے اس کا منہ دیوار سے لگا۔ اس دوہری ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ نیچے گرا تو مانیٹر والے نے جلدی سے کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”یہ بھی تم دیکھ لو گے۔“ میں نے کہا اور سنگھ سے پوچھا۔ ”یہاں تمہاری موجودگی کا مقصد پوچھا ہے؟“

”وہ ایک لڑکی مجھے یہاں لائی تھی۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

”ٹھیک ہے وہ لڑکی تمہیں یہاں لائی تھی۔“

”وہ ان کی ساتھی تھی۔“ ہوشیار سنگھ نے اس بار رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”یہ کیوں نہیں بتاتا تو نے اسے مار دیا ہے۔“ مانیٹر والا بولا۔ ”تو چھپا رہا ہے۔“

مجھے صبح واش روم میں دیوار کے ساتھ دھم کی آواز اور نسوانی چیخ کا خیال آیا۔ ”یہ میرے برابر والے کمرے میں تھا؟“

ویٹر نے سر ہلایا۔ ”اس نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اب لاش کا کیا کریں؟“

لاش کا سنتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے جلد از جلد روانگی اختیار کی جائے۔ اس سے پہلے کہ پولیس منظر نامے میں داخل ہو۔ ان میں سے ایک بے ہوش تھا۔ ویٹر کے سر پر میں نے پستول کا دستہ مارا اور وہ گرا تو مانیٹر والا چلایا مگر اس سے پہلے کہ وہ صورت حال سمجھتا میں نے اسے بھی بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے گھگیا کر درخواست کی کہ اسے بے ہوش نہ کیا جائے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔“ میں نے کہا اور ان تینوں کی تلاشی لی۔ ان کے پاس موبائل اور دوسری چیزیں تھیں لیکن میں نے صرف موبائل لیے تھے۔ یہاں موجود بلیک میلنگ اسٹف اور سردار جی کے ہاتھوں ماری جانے والی لڑکی سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ہاں سردار جی سے دل چسپی ضرور ہو گئی تھی اسی لیے میں نے اس کی تلاشی بھی لی اور اس کا پرس اور موبائل فون نکال لیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈی وی ڈیز کے ساتھ کمپیوٹر کھول کر اس کی ہارڈ ڈسک بھی نکال لی۔ وقت نہیں تھا ورنہ میں انہیں ضائع کر دیتا۔ اب یہ کام یہاں سے نکل کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ ”اگر تم نے فرار کی کوشش کی تو میں یہ دونوں چیزیں پولیس کے حوالے کر دوں گا اور وہ خود تمہیں تلاش کر لے گی۔“

”نن.... نہیں۔“ وہ ہکلایا۔ ”میں نہیں بھاگوں گا۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ میں نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری سنسان تھی۔ درحقیقت یہ پورا فلور ہی سنسان تھا اور شاید اسی قسم کی سرگرمیوں کے

لیے مخصوص تھا۔ ہم تینوں ان ہی سیڑھیوں سے نیچے آئے اور لابی سے ہوتے ہوئے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے۔ اس وقت لابی میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اندر جاتے ہی ہم نے واپسی کی راہ لی اور لابی میں آئے۔ کسی نے نہیں روکا اور ہم آرام سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے ہوشیار سنگھ سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کوئی گاڑی ہے؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ادھر پاس ہی کھڑی ہے۔“

مہندرا جیپ چند سال پرانی تھی اور اس کا ظاہری حلیہ خراب تھا لیکن جب ہوشیار سنگھ نے اس کا انجن اسٹارٹ کیا تو وہ ایک سیکنڈ میں اسٹارٹ ہوگیا۔ یہ اندر سے بھی آرام دہ تھی۔ بھارت میں تیار ہونے والی یہ جیپ چلنے میں دیرپا ہوتی ہے اس لیے میں مطمئن تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”پہلے کسی اچھے ریسٹوران چلو جہاں ہم ناشتا کر سکیں۔“

”میں.... میں بھی چلوں گا؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل.... اب ہم ساتھ ساتھ رہیں گے۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ مجھے تم اچھے لگے ہو اور جو مجھے اچھا لگتا ہے میں اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”دیکھو تمہاری خاطر میں یہ سارا بکھیڑا اٹھا لایا ہوں ورنہ کیا ہوتا پولیس اس میں تمہاری ویڈیو دیکھتی اور سیدھی تمہارے گھر آتی۔“

”تم لے آئے ہو لیکن اب اپنے پاس رکھو گے مجھے بلیک میل کرو گے۔“ ہوشیار سنگھ نے مردہ لہجے میں کہا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اردو میں بات کر رہا ہوں تو وہ بھی اردو بولنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے کم سے کم کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کی تھی۔

”بالکل بھی نہیں ابھی ناشتے کے بعد ہم کسی مناسب جگہ پہنچ کر انہیں ضائع کریں گے میں یہ کام تمہارے سامنے کروں گا۔“

”واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”بالکل جلد تم دیکھ لو گے، اب چلو۔“

ہوشیار سنگھ نے جیپ ایک اعلیٰ درجے کے ریسٹوران کے سامنے روکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ ساوی نے سادہ شلوار سوٹ پہن لیا تھا جو پنجاب میں عام پہناوا ہے۔ پینٹ شرٹ اور جوگر میں وہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک سینڈل بھی ساتھ رکھا تھا اور اس سوٹ کے ساتھ وہی پہنے ہوئے تھی۔ سامان ہم نے جیپ میں چھوڑ دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کا خیال تھا کہ ناشتا ہم اس کے خرچ پر کریں گے لیکن بل میں نے دیا۔ ناشتا کر کے ہم باہر آئے اور جیپ میں بیٹھے تو ہوشیار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”اب ہم تمہارے گھر چلیں گے۔“

وہ بدکا۔ ”وہ کیوں جی؟“

”میں نے بتایا نا کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“ میں نے کہا اور پستول والی جیب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اب چلو۔“

اس نے جلدی سے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ پارکنگ سے نکلنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تم نے بولا تھا کہ ان چیزوں کو تباہ کر دو گے۔“

”کیوں نہیں.... جیپ کسی ایسی جگہ روکنا جہاں لوگ نہ ہوں۔“

کچھ دیر بعد اس نے جیپ ایک میدان کے ساتھ روکی جس میں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہوشیار سنگھ نے میری ہدایت کے مطابق سوکھی گھاس اور شاخیں جمع کیں اور ان پر سی ڈیز کے ڈبے اور ہارڈ ڈسک رکھ کر اوپر سے کچھ پیٹرول چھڑکا۔ کیونکہ ماچس یا لائٹر نہیں تھا اس لیے ڈیش بورڈ کا لائٹر نکال کر لگایا تو پیٹرول نے فوراً آگ پکڑ لی تھی۔ ساوی جیپ میں بیٹھی تھی اور ہم اس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ نے ان چیزوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے لیا۔ اب ہوشیار سنگھ کچھ مطمئن تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مطمئن لگ رہا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پاجی جی اپنا راستہ لو....“

”راستے کے بچے۔“ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر آگ کی طرف دھکا دیا اور پستول نکال لیا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو میں اس کچرے کا محتاج ہوں۔ میں تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک جاؤں گا اور تمہارے گھر بھی پہنچ جاؤں گا۔“

وہ آگ کے پاس گرا اور جلدی سے اس سے دور ہو گیا۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ”اوئے ایسا نہ کرنا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”بچے ہیں تو ان کی ماں بھی ہوگی۔“

”ہے جی کیوں نہیں ہے ورنہ بچے کہاں سے آتے؟“

”اگر اپنے بچوں کو یتیم اور بیوی کو ودھوا نہیں کرنا

چاہتے ہو تو شرافت سے چلو۔"

اس بار وہ شرافت سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ لدھیانہ پاکستان کی سرحد سے کوئی اسی کلومیٹر دور ہے۔ اس لحاظ سے ہوشیار سنگھ کا گھر بھی اتنا ہی دور ہونا چاہیے تھا کیونکہ فیروز پور سرحد کے بالکل پاس ہے۔ یہ میں نے ٹیب میں گوگل میپ پر دیکھا۔ یہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا لیکن بہترین سڑک اور جیپ کی وجہ سے ایک گھنٹے میں طے ہو گیا۔ یہ کوئی گاؤں نہیں تھا بلکہ فارم ہاؤس تھے۔ ہر فارم ہاؤس میں زمین کے مالک کا گھر بنا ہوا تھا۔ اس لیے سارے گھر الگ الگ تھے۔ یہ چھوٹا سا بنگلا نما مکان تھا جس کی چھت آر سی سی لیکن کھپریل اسٹائل کی تھی۔ یہ ایک منزلہ تھا اور کوئی سات مرلے پر پھیلا ہوا تھا۔ سامنے پتھروں سے بنا ہوا خوب صورت پورچ تھا۔ ہارن کی آواز پر اندر سے ایک نوعمر لڑکی نکلی اور اس نے گیٹ کھولا۔ مکان کے چاروں طرف احاطہ تھا اور اس میں گھاس کے لان کے ساتھ پھولدار پودوں کے تختے بھی تھے۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ساوی پچھلی نشست پر آرام کرتی رہی تھی اور میں سوچتا رہا۔

ہم کوئی بارہ بجے وہاں پہنچے تھے۔ ہوشیار سنگھ نے جیپ پورچ میں روکی اور اترنے لگا تو میں نے کہا۔ "خیال رکھنا کوئی چالاکی دکھا کر اپنے لیے مشکل مت کھڑی کرنا...ابھی تمہاری بیوی نہیں جانتی ہے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں ایک عورت کی لاش چھوڑ آئے ہو۔ کوئی ہنگامہ ہوا تو وہ جان جائے گی۔"

"میں کچھ نہیں کروں گا میرے باپ۔" وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔ "تم کیوں میرے ساتھ چلے آئے ہو؟"

"بس ایسے ہی، ویسے تم فکر مت کرو میں بلیک میلر نہیں ہوں ورنہ وہ سٹف ضائع نہ کرتا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں ان سی ڈیز میں تھیں۔" میں نے کہا۔ "ایک دو دن تمہارے ساتھ رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ بلکہ تم چاہو تو ہم یہاں رکنے کا معاوضہ بھی دے سکتے ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے بس تم میری جان چھوڑ دو۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہے کہ میرے کہے پر حرف بہ حرف عمل کرو۔"

اس نے سر ہلایا اور نیچے اتر گیا۔ میں اور ساوی بھی نیچے آ گئے تھے۔ اس وقت دھوپ کی شدت ناقابل برداشت تھی۔ جیپ اے سی تھی اس لیے اصل موسم کا باہر آنے پر اندازہ ہوا تھا۔ یہ جولائی کا آغاز تھا اور اب تک آسمان صاف تھا یعنی بارشیں نہیں ہوئی تھیں۔ ہوشیار سنگھ ہمیں اندر لایا۔ آغاز میں ہی پرتعیش انداز میں سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا اور یہی بتانے کے لیے کافی تھا کہ ہوشیار سنگھ خاصا دولت مند شخص تھا۔ یہ دولت کا بخار ہی تو تھا جسے اتارنے وہ اس ہوٹل تک گیا تھا۔ وہ مونا سکھ تھا یعنی معمولی سی شیو تھی صرف سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جسے اس نے ایک خاص ٹوپی میں لپیٹا ہوا تھا یہ پگڑی نہیں تھی۔ اس نے نوعمر خادمہ سے کہا۔ "شیلا جا کر ٹھنڈا لے آ۔"

شیلا کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ "واہ گورو کے واسطے میری بیوی کے سامنے کچھ مت کہنا، وہ مجھے شریف آدمی سمجھتی ہے اسے پتا چل گیا تو مجھے معاف نہیں کرے گی۔"

"ویسے تم اسی قابل ہو لیکن بے فکر رہو ہماری زبان سے کچھ نہیں نکلے گا۔"

"اچھا اب میرا پرس اور موبائل دے دو۔"

میں نے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور جیسے ہی ہوشیار کمرے سے نکلا میں نے ایک موبائل نکالا۔ اس پر سفیر کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی۔ میں نے بلا تمہید کہا۔ "ہم سرحد کے پاس ہیں...وسیم کہاں ہے؟"

"وہ اور عبداللہ دو گاڑیوں میں نکلے تھے۔ وہ اس وقت قصور سے آگے گنڈا سنگھ والا روڈ پر فتوحی والا نامی علاقے میں زمیندار کمال کھوکھر کے پاس ہیں۔"

"ٹھیک ہے اسے یہ موبائل نمبر دے دو۔ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ پھر میں نے ٹیب نکال کر اس پر مذکورہ پاکستانی علاقہ دیکھا۔ یہ سرحد سے مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھا۔ کچھ دیر میں لڑکی ہمارے لیے نمکین لسی لے آئی جو اس موسم میں بہترین ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ علاقہ کیا کہلاتا ہے؟"

"دھوب کلے۔" اس نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔ میں نے ٹیب پر دیکھا تو حیرت انگیز پر دونوں جگہوں کو بالکل پاس پایا۔ جیسے فتوحی والا سرحد سے ایک کلومیٹر دور تھا اسی طرح دھوب کلے سرحد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اس سے ذرا آگے فیروز پور کی آبادی تھی۔ یہ سارا علاقہ آباد اور سرسبز و شاداب ہے۔ ساوی کو بتایا تو وہ سن کر بہت پُرجوش

ہو گئی تھی کہ وسیم اور عبداللہ ہم سے صرف دو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھے۔ لیکن یہ دنیا کے مشکل ترین دو کلومیٹرز تھے۔ کیونکہ درمیان میں وہ لکیر تھی جو آگ و خون سے کھینچی گئی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف فوج اور دوسرے پیرا عسکری دستوں کی موجودگی لازمی تھی۔ وسیم جس کمال کھوکھر کے پاس تھا کیا وہ وہی شخص تھا جس کا وسیم نے ذکر کیا تھا یا پھر وسیم اس کے پاس رکا ہوا تھا۔ میں نے لسی کا گلاس ختم کیا تھا کہ موبائل نے بیل دی۔ نمبر پاکستان کا تھا اور اجنبی تھا یعنی کوئی جانا پہچانا نمبر نہیں تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"میں بات کر رہا ہوں۔" وسیم کی آواز آئی۔ "آپ کہاں ہیں۔"

"گنڈا سنگھ والا روڈ انڈیا میں حسینی والا روڈ بن جاتی ہے۔ تقریباً ایک کلومیٹر دور دھوب محلے میں ہیں۔"

"تو مجھے خبر ہے کہ آپ بالکل پاس ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن کراسنگ آسان نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"میں جس کے پاس ٹھہرا ہوں اس کا کہنا ہے آج کل بہت سختی ہو رہی ہے اور چوبیس گھنٹے سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔"

"سادی، کے ہوتے ہوئے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "اس کی بجائے میں کوئی اور راستہ تلاش کرنے کو ترجیح دوں گا۔"

"آپ محفوظ ہیں؟"

"فی الحال۔" میں نے کہا۔ "ایک زمیندار کے گھر ہیں اور زبردستی کے مہمان ہیں۔"

"وہ خطرناک ہو سکتا ہے؟"

"نہیں وہ قابو میں ہے۔"

"تب ٹھیک ہے آپ وہیں رکیں جب تک میں کوئی محفوظ راستہ نکالتا ہوں۔" وسیم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ہم جتنی کم بات کرتے اتنا ہی اچھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہوشیار یا اس کے گھر کے کسی فرد کے سامنے بات نہیں ہوئی۔ ہوشیار تقریباً چالیس برس کا شخص تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے بچے چھوٹے ہوں گے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اور گھر میں بھی کسی اور مرد کے آثار فی الحال نظر نہیں آئے تھے۔ اگر ہوشیار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا تو اسے قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اگر اس سے زیادہ افراد تھے تو پھر سوچا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہوشیار ایک جوان عورت کے ساتھ اندر آیا اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ بہت حسین عورت تھی۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ دوپٹا لیا ہوا تھا اور خود کو مناسب انداز میں ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے تعارف کرایا۔ اس کی بیوی کا نام سومیت تھا۔ اس نے ہمارا نام اجیت اور کوشل بتائے تھے۔ وہ گرم جوشی سے سادی سے ملی۔ اسے گلے لگایا اور سادی سے بولی۔ "ہوشیار کہہ رہا ہے آپ بہت اچھے ہیں۔ کچھ دن ادھر مہمان رہیں گے۔"

"ہاں سردار جی سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔"

"اتفاقاً؟" وہ چونکی۔ "یہ تو کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کالج کے زمانے سے جانتے ہیں۔"

"وہی کہہ رہا ہوں یہاں اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ شاید دس سال بعد۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" میں نے ہوشیار کی طرف دیکھا۔

"ہاں یار..." اس نے نارمل انداز میں کہا۔ "اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔"

سومیت نے سادی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "آپ کی بیوی بہت پیاری ہے اجیت بھیا۔"

سادی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ "تو ایسا کر بھرجائی کو اندر لے جا۔ آرام سے بٹھا۔"

سومیت سادی کو وہاں سے لے گئی۔ ان کے جاتے ہی ہوشیار نے کہا۔ "معاف کرنا مجھے تمہارے ناموں کا خیال ہی نہیں رہا تھا اس لیے جو منہ میں آیا بول دیا۔"

"کوئی بات نہیں بلکہ اچھا ہے تم ہمارے بارے میں نہ جانو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"میں، سومیت اور ہمارے تین بچے ہیں۔ بڑا بیٹا ہے دس سال کا اور اس سے چھوٹی سات اور پانچ سال کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ شیلا ادھر کام کرتی ہے ادھر ہی رہتی ہے۔"

"کوئی مرد ملازم؟"

"کوئی نہیں ہے.... پیچھے زمین پر کام کرنے والے چار آدمیوں کے گھر بنے ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے ہمارے بارے میں کم سے کم لوگوں کو پتا چلے۔ اسی میں تمہارا بھی بھلا ہوگا۔"

وہ ہچکچایا۔ "مجھے تم لوگ کچھ پُراسرار سے لگ رہے ہو۔"

"ہم واقعی پُراسرار ہیں اور ہمارے بارے میں نہ جاننا ہی بہتر ہوگا۔" میں نے اس کا خدشہ جھٹلانے کی کوشش

نہیں کی۔ وہ ہمارے بارے میں جتنا زیادہ مشکوک رہتا کسی بے وقوفی سے اتنا ہی گریز کرتا۔ "ویسے تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں لیکن ایک بار پھر سمجھا دوں۔ اگر تمہارے دماغ میں کوئی الٹا سیدھا خیال ہے یا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے اور تم نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تو ممکن ہے یہاں کرنے والی لاشیں دو سے کہیں زیادہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمیں مہمان بنا کر رکھو اور ہمارے جانے کے بعد ہمیں بھول جاؤ۔ اگر تم چاہو تو میں اس میزبانی کا معاوضہ بھی دے سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی پیشکش کر چکا ہوں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "بس تم جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میری بھی یہی خواہش ہے۔" میں نے کہا۔ "تم زمیندار ہو تم سے ملنے لوگ آتے ہوں گے؟"

"بہت کم۔" اس نے کہا۔ "ابھی چاول کی فصل درمیان میں ہے۔ بیوپاری بھی نہیں آ رہے۔"

"رشتے دار؟"

"وہ امرتسر میں ہوتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تب تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اصل میں یہ میری بیوی کی زمین ہے۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔ "وہ میرے سسر کی ایک ہی اولاد ہے۔ ساری زمین اسے ملی۔"

"یعنی تمہیں ملی... تمہاری بیوی خوب صورت عورت ہے اس کے باوجود تم ادھر اُدھر منہ مارتے پھر رہے ہو۔"

وہ کھسیا گیا تھا۔ "میری توبہ جو اب میں کہیں جاؤں۔"

"وہاں کیا ہوا تھا؟"

جواب میں وہ چپ رہا تو میں نے کہا۔ "تم نہ بھی بتاؤ تب بھی کل سب اخبار یا ٹی وی میں آ جائے گا۔"

اس نے چور نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "وہ مجھے بلیک میل کر رہی تھی۔ میرا جھگڑا ہوا تو میں نے اسے دھکا دیا تھا اس کا سر دیوار سے لگا اور وہ مر گئی۔ میں واہ گرو کی سوہ، میں نے صرف اسے دھکا دیا تھا کیونکہ وہ میرا منہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر اس کے ناخنوں کے نشانات آتے تو میں سوہیت کو کیا منہ دکھاتا۔ جلدی میں دھکا زور سے لگا اور وہ دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر گئی تھی۔"

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس پر دباؤ ڈالا۔ "اس کے باوجود یہ قتل ہی کہلائے گا۔"

"میں نے اسے ایک دھکے کے سوا ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔" ہوشیار کے چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی تھی۔ "اگر معاملہ پولیس تک پہنچا تو وہ یہاں بھی آ سکتی ہے۔"

"کیسے؟... کیا تم نے ان کو اپنا پتا بتایا تھا؟"

"نہیں لیکن تمہیں جب اپنا نام اور فیروز پور کا بتا رہا تھا تو وہ بھی سن رہے تھے۔ یہ جگہ کوئی بہت بڑی نہیں ہے اور یہاں دور دور تک ہوشیار بھی نہیں ہوں گے۔"

میں مسکرایا تھا۔ "مگر وہ سب تمہارے جیسے ہیں تو در حقیقت یہاں کوئی ہوشیار نہیں ہے۔"

"میں ہی سب سے ہوشیار ہوں۔" اس نے تصدیق کی۔ "اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو باقی سب کے بارے میں۔"

اس کی یہ بات قابلِ غور تھی اگر لاش والی بات پولیس تک پہنچی اور وہ تینوں پکڑے گئے تو پولیس کو یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے پوچھا۔ "یہاں ٹی وی کیبل ہے۔"

"بالکل ہے میرے پاس ٹاٹا اسکائی ہے۔" اس نے کہا اور ایک کونے میں رکھا بڑے سائز کا ایل سی ڈی ٹی وی ریموٹ سے آن کیا۔ پھر اس نے پنجابی کا ایک مقامی نیوز چینل لگایا۔ "اگر معاملہ پولیس تک گیا ہے تو لازمی اس پر خبر آئے گی۔"

لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا معاملہ دبا دیا گیا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بات پولیس تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ ایک بڑے ہوٹل کی ساکھ کا معاملہ تھا۔ اس لیے خاموش کارروائی کا بھی امکان تھا۔ اس صورت میں پولیس بہرحال تفتیش کرتی اور یہاں آنے کا بھی بہت زیادہ امکان تھا۔ ایک بج رہا تھا کچھ دیر بعد شیلا نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ وہ تقریباً چودہ چودہ برس کی صحت مند اور مناسب شکل و صورت والی لڑکی تھی۔ میں ہوشیار کے ساتھ ڈرائنگ روم کے ساتھ موجود لاؤنج میں آیا۔ ڈائننگ ایریا بھی یہیں تھا اور اس کے ساتھ جڑا سا کچن تھا۔ سوہیت نے کھانا خود بنایا تھا اور کیونکہ وہ بھی سبزی خور تھے اس لیے یہ خدشہ نہیں تھا کہ کسی ڈش میں کوئی غلط چیز شامل ہوگی۔ کھانے میں مٹر پلاؤ اور روٹی کے ساتھ بھاجی تھی۔ کئی طرح کے اچار اور چٹنیاں بھی تھیں۔ شیلا کھانا

لگا رہی تھی۔ مجھے بچے نظر نہیں آئے۔ میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو سومیت بولی۔

"بھائی جی وہ اپنے دادے کے ہاں گئے ہیں۔ اسکول کی چھٹیاں ہیں۔"

یہ بھی اچھا تھا کہ یہاں بچے نہیں تھے ورنہ بچے اندر کی خبریں سب سے زیادہ باہر پہنچاتے ہیں۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر سومیت نے کہا۔ "بھائی جی اور بھرجائی آپ آرام کریں آج گرمی بہت ہے شام کو زمین پر چلیں گے۔"

کھانے کے بعد لسی کے گلاس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ ساوی کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں میں نے اس سے کہا۔ "تم آرام کرو میں ذرا ہوشیار سے گپ شپ کروں گا۔"

ہوشیار کا خیال تھا کہ میں اس کی جان چھوڑ دوں گا اس لیے میری بات پر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ ساوی کھڑی ہو گئی۔ سومیت نے ہمارے لیے ایک کمرا بھی سیٹ کر دیا تھا۔ میں اور ہوشیار واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ہوشیار نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے تم مجھے اپنے سامنے رکھنا چاہتے ہو؟"

"اس کی بجائے تم کہہ سکتے ہو کہ میں پوری طرح ہوشیار رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں پولیس آ سکتی ہے اور اس صورت میں مجھے اپنا بچاؤ کرنا ہوگا۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں پولیس سے خطرہ ہے؟"

"میں مطلوب تو نہیں ہوں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر پولیس کے ہاتھ آنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ اگر وہ یہاں آئی تو لازمی بات ہے تمہارے ساتھ مجھے بھی لے جائے گی۔"

"اس صورت میں یہاں رکنا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔" اس نے گویا مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں خطرہ مول لینے والا آدمی ہوں۔"

ہوشیار سنگھ ہوشیار آدمی تھا۔ وہ عام شخص تھا اس لیے ہنگامی صورت میں بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک عورت ماری گئی تھی اور پھر وہ بلیک میلنگ کے چکر میں بھی آ رہا تھا۔ میں اسے دونوں چکروں سے نکال لایا تھا۔ مگر یہ کام میں نے فی سبیل اللہ نہیں کیا تھا۔ اس میں میرا مفاد تھا۔ مجھے اس سرزمین پر ایک ٹھکانے کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے یہ سرحد کے بالکل پاس تھا اور اب وسیم بھی دوسری طرف آ گیا تھا اس لیے ہمارا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ہوشیار یہ بات نہیں جانتا تھا مگر وہ اتنا ضرور سمجھ رہا تھا کہ ہم کسی مقصد سے اس کے پاس ٹھہرے ہیں۔ فی الحال اسے بے خبر رکھنا ضروری تھا۔ اگر وہ جان جاتا کہ میں پاکستانی ہوں تو ممکن ہے اس کی حب الوطنی کی رگ پھڑک جاتی اور وہ تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر میری بیخ کنی پر تل جاتا۔ اس لیے میں اسے دھمکانے کے ساتھ ساتھ نرمی سے بات کر رہا تھا اور اسے یقین دلا رہا تھا کہ میں اس کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔ وہ مطمئن نہیں تھا اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ میری طرف سے ٹینشن میں رہے مگر یہ ٹینشن اتنی نہ بڑھے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے پر تل جائے۔

میں نے موبائل کو وائبریٹ پر کر لیا تھا۔ باقی دو موبائل آف کر دیے تھے۔ اگر وسیم مجھے کال کرتا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوشیار کو اس کا علم ہو۔ میں نے کہا۔ "تم اس چکر میں مت پڑو.... اگر پولیس نے تمہیں گرفتار بھی کیا تو تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم سرے سے اس ہوٹل میں رکے ہی نہیں۔"

"وہاں کئی افراد نے مجھے دیکھا ہے۔"

"تم کھانے پینے کے لیے بھی وہاں جا سکتے ہو۔"

"میں دباؤ برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے پریشانی سے کہا۔ "تم جانتے ہو پولیس کس طرح سے پوچھتی ہے۔"

"انسان پر مشکلیں آتی ہیں اسے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ہاتھ پاؤں چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں پر میں بزدل آدمی ہوں۔"

"اگر تم بزدل ہوتے تو یہ سب نہیں کرتے آدمی سب سے زیادہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔"

"سومیت سے میری جان جاتی ہے اگر اسے پتا چل گیا تو وہ لات مار کر مجھے یہاں سے نکال دے گی۔"

"یہ سب اس کا ہے؟"

"ہاں اس کا اور اس کے بعد بچوں کا۔" ہوشیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میں مرتے دم تک ان لوگوں کے لیے بس کام کرتا رہوں گا۔"

"ہر آدمی اپنی بیوی بچوں کے لیے کام کرتا ہے۔ تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ اپنا کام کر رہے ہو، کسی کی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نوکری نہیں کر رہے۔ مجھے تو لگتا ہے سومیت نے سب تمہارے ہاتھ میں دیا ہوا ہے۔"

"یہ تو ہے۔" اس نے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ کہا۔ "سومیت نے آج تک پلٹ کر حساب نہیں مانگا کہ کتنا کمایا ہے اور کہاں خرچ کیا ہے۔"

"اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اب ان چکروں سے گریز کرو۔ یہ یقیناً تمہاری بیوی بچوں کی دعائیں تھیں جو میں وہاں پہنچ گیا ورنہ اس وقت تم حوالات میں ہوتے یا پھر ان سفاک بلیک میلروں کے چنگل میں جو بالآخر تمہارے خون کا آخری قطرہ تک چوس جاتے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں وعدہ کرتا ہوں....."

"وعدہ مت کرو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اگر کوئی وعدہ کرنا ہے تو خود سے کرو۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "میں ذرا آرام کر لوں رات سے جاگا ہوا ہوں اور اب سر بھاری ہو رہا ہے۔"

"بالکل آرام کرو مگر کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا جو تمہارا آرام ہمیشہ کے لیے غارت کر دے۔"

ہوشیار وہاں سے چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو شیلا کو آواز دے لوں۔ میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ رات چند گھنٹے کی بے خواب نیند نے مجھے کسی حد تک تازہ دم کر دیا تھا۔ زخم بھرنے سے جسمانی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ مجھے ابتدائی مرہم پٹی کے بعد کسی دوا کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنے والے کٹھن مرحلے سے پہلے ہمارے لیے آرام کا یہ وقفہ غنیمت تھا۔ ہم دونوں ہی جسمانی اور ذہنی تھکن کا شکار تھے۔ آدھے گھنٹے بعد موبائل وائبریٹ ہوا۔ میں نے سوچا کہ سیم کی کال ہو گی مگر کال سنتانی نمبر سے تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے سنتانی آواز آئی۔ "تم کون ہو یہ موبائل تمہارے پاس کہاں سے آیا۔"

یہ وہی تھا جس کی ناک کو میں نے افسوسناک بنا دیا تھا۔ "میں وہی ہوں اور یہ موبائل اب میرے پاس رہے گا۔"

اس نے بھڑک کر گالی دی۔ "تجھے دیکھ لیں گے... پاتال سے بھی تلاش کر لیں گے۔"

"ضرور۔" میں دھیمی آواز میں ہنسا۔ "مگر تمہیں اس کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ جلد میں تم لوگوں سے خود رابطہ کروں گا۔ اب میں تمہارا باپ ہوں۔ وہ تمام اسٹف میرے پاس ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر اس نے دعویٰ کیا۔ "تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ ہمارے پاس اس کی کاپیاں ہیں۔"

"ہاں لیکن ایک چیز کی کاپی نہیں ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے جب تم تینوں بے ہوش ہوئے تو میں نے کیا کیا تھا؟" میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"کیا..... کیا تو نے؟"

"وہاں ایک عدد لاش تھی اور میں نے باری باری تم تینوں کے ساتھ اس کی تصویریں لی ہیں۔ تم لوگوں نے وہ لاش یقیناً ٹھکانے لگا دی ہو گی۔ لیکن یہ تصویریں بھی کافی ہیں۔ پولیس خود معلوم کر لے گی کہ لاش کہاں گئی؟"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

"سچائی کے ساتھ میں جلد رابطہ کروں گا۔ اس موبائل کو بھول جاؤ اور نمبر بند کرانے کی کوشش مت کرنا ورنہ وہ تصاویر پولیس تک پہنچ جائیں گی۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یہ خیال گفتگو کے دوران ہی میرے ذہن میں آیا تھا مجھے یقین ہے اس کی حالت غیر ہو گئی ہو گی۔ اس جھوٹ پر کہ میں نے لاش کے ساتھ ان کی تصاویر بنائی تھیں۔ وہ اس بات پر یقین نہ بھی کرتے تب بھی ان میں اتنی جرأت نہیں رہی ہو گی کہ اپنے موبائل نمبرز بند کراتے۔ یہ موبائل میرے لیے اشد ضروری ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے اسی نمبر پر کال کی ویٹر نے ہی کال ریسیو کی تھی۔

"اب کیا ہے؟"

"تمیز سے بات کرو۔" میں نے غرا کر کہا۔ "لاش کا کیا کیا؟"

"ٹھکانے لگا دی ہے۔" اس نے کسی قدر حوصلہ کر کے کہا۔ "اب اسے کوئی تلاش نہیں کر سکتا ہے۔"

"گڈ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ لاش غائب تھی اور پولیس کو اس کے قاتل کی تلاش نہیں تھی یعنی پولیس کا ہوشیار سنگھ کے گھر آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے شیلا کو آواز دی۔ وہ فوراً آ گئی۔ "جی سرکار۔"

"مجھے کمرا دکھاؤ۔" میں نے کہا تو وہ مجھے سادی والے کمرے تک لے آئی۔ دستک کے جواب میں اندر سے

سادی نے کہا۔

"آجاؤ۔"

میں اندر آیا سادی آرام کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ یہ جگہ مل گئی ورنہ در بدر بھٹکنا پڑتا۔"

"ہاں واقعی اس کا احسان ہے وہ کبھی آزمائش کو ہماری اوقات سے زیادہ نہیں بڑھاتا ہے۔"

"وسیم کی کال آئی؟"

"نہیں۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سادی جلدی سے بیڈ سے اٹھ گئی۔

"آپ آرام کریں... آپ رات میں بھی کم سوئے تھے۔"

"نہیں کسی کا جاگنا لازمی ہے۔"

"میں جاگوں گی۔" اس نے کہا۔ "دو گھنٹے سو لی ہوں اتنا کافی ہے۔"

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر آرام کرلوں۔ "مجھے دو گھنٹے بعد اٹھا دینا۔" میں نے پستول سادی کے حوالے کیا۔ "کوئی مسئلہ ہو تو اسے استعمال کرنا۔"

"میں کرلوں گی۔" وہ اعتماد سے بولی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں سو گیا تھا۔ اس بار بھی نیند بہت گہری اور بے خواب تھی۔ میں اس وقت چونکا جب سادی نے مجھے اٹھایا۔ اس کا پُرسکون چہرہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔

"اٹھ جائیں دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ سومیت نے باہر لان میں چائے کا انتظام کیا ہے۔"

میں منہ پر پانی مار کر باہر آیا۔ پونے سات بجے دھوپ تقریباً ختم ہو چکی تھی اور لان کو پانی دینے سے ایک نم اور خوشگوار سے ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں جدید ترین لان چیئرز ایک ماربل ٹاپ میز کے گرد رکھی تھیں۔ شیلا چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے لوازمات سجا رہی تھی۔ اس میں سموسے اور کٹلس تھے.. دونوں چیزیں آلو کی تھیں اس لیے ہم نے بے فکر ہو کر کھائیں۔ چائے بہت اچھی بنی تھی۔ سادی اور سومیت اس دوران میں خاصی بے تکلف ہو گئی تھیں اور انہوں نے ایک طرف اپنی محفل جمائی ہوئی تھی۔ ہوشیار نے چائے کے بعد مجھ سے کہا۔ "آؤ میں تمہیں اپنا فارم دکھاتا ہوں۔"

فارم بنگلے کے ساتھ ہی تھا۔ ہم عقبی دروازے سے باہر آئے تو دور تک زمین پر چاول کی فصل لگی ہوئی تھی اور ابھی کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ پودے دو فٹ اونچے ہو چکے تھے۔ ہماری زمینوں پر بھی چاول لگتے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہاں پودے بہت پاس پاس لگے تھے۔ یعنی فی مربع فٹ زیادہ پودے لگے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انڈیا میں چاول کی فی ایکڑ پیداوار ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ حکومت کسانوں کو کھاد اور بجلی میں سب سڈی دیتی ہے۔ پانی مہیا کرنا حکومت کا کام ہے اور وہ پاکستان کے حصے کا پانی چرا کر تندہی سے یہ فریضہ سر انجام دے رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "ابھی بارشیں شروع نہیں ہوئی ہیں پھر پانی کہاں سے لے رہے ہو؟"

"وہ دیکھ رہے ہو؟" ہوشیار سنگھ نے مغرب میں دور ہوا میں بلند ہوتے سیاہ دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس وقت نوٹ نہیں کیا تھا۔

"ہاں یہ کیا ہے کوئی بھٹی کام کر رہی ہے؟"

"نہیں یہ ڈیزل سے چلنے والے میگا ٹیوب ویل ہیں۔" ہوشیار سنگھ نے انکشاف کیا۔ "یہاں ڈھلان ہماری طرف ہے۔ اس لیے جب ہم زمین سے پانی نکالتے ہیں تو پاکستان کا پانی ہماری طرف آتا ہے۔ یہ ٹیوب ویل ایک منٹ میں ایک ہزار گیلن پانی زمین سے کھینچتے ہیں اور یہ پانی بہت بڑے پائپوں کی مدد سے یہاں زمینوں پر دیا جاتا ہے۔ پائپوں کی مدد سے یہ پانی سو میل دور تک پہنچایا جاتا ہے۔"

میں دنگ رہ گیا۔ یہ انکشاف تھا۔ کم سے کم میرے لیے تو انکشاف ہی تھا۔ ممکن ہے میرے ملک کے ارباب اختیار واقف ہوں مگر جب انہیں دریاؤں کے پانی کی چوری کی پروا نہیں ہے تو ٹیوب ویلوں سے پانی چرانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے حکمران ملک و قوم کے مفاد سے کس حد تک لاپروا ہو سکتے ہیں۔ یہ شاخ کاٹنے والا کیس نہیں تھا یہ تو جڑ کاٹنے والی بات تھی۔ انڈیا صرف دریاؤں کا پانی نہیں روک رہا تھا بلکہ وہ زیر زمین پانی بھی چرا رہا تھا اور یہ صرف چوری نہیں تھی بلکہ اس کے پس پشت پاکستان سے دشمنی کا جذبہ پوری شدت سے کارفرما تھا۔ جس خشک سالی اور قحط سے ہمارے چند ماہرین زراعت و معاشیات خبردار کر رہے تھے انڈیا اسے جلد از جلد لانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ بین الاقوامی تجارت کے معاہدوں کی مدد سے وہ بہت جلد ہمیں اپنے

ساتھ تجارت پر مجبور کر کے ہماری رہی سہی زراعت و صنعت تباہ کر دیتا۔ اس کے بعد اسے کسی جنگ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے ہوشیار سے کہا۔ "کیا یہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہے؟"

اس نے کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

مجھے احساس ہوا کہ میں نے پاکستانی بن کر یہ سوال کر دیا تھا اور ہوشیار سنگھ کا تعجب درست تھا کہ میں خود کون سا قانون پسند تھا جو بین الاقوامی قانون کی بات کر رہا تھا۔ "مطلب یہ کہ اس طرح کسی دوسرے ملک کا پانی حاصل کرنا کیا ٹھیک ہے؟"

اس نے شانے اچکائے۔ "یہ غلط تو حکومت جانے.... جب سے یہاں دریا کا بہاؤ کم ہوا ہے حکومت نے پانی دینے کے لیے یہ ٹیوب ویل لگائے ہیں تب سے پانی کی کمی نہیں ہے۔"

میں جتنی بار انڈیا آیا میں نے محسوس کیا کہ یہاں حکومت زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ایک تو اتنی بڑی آبادی کو خوراک بھی بہت زیادہ درکار ہوتی ہے دوسرے انڈیا کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اگر انہیں زراعت میں روزگار نہیں ملے گا تو وہ لازمی شہروں کا رخ کریں گے اور اس سے وہ مسائل جنم لیں گے جس سے آج ہمارا ملک دوچار ہے۔ اس لیے کم سے کم مشرقی پنجاب کی حد تک حکومت نے یہ پالیسی اپنائی ہے کہ کسان کو بجلی اور سڑک مہیا کی ہے۔ وہ اپنی زمین آباد کر سکتا ہے اور اپنی پیداوار کو خود منڈی تک پہنچا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشرقی پنجاب خوشحالی میں جنوب کی ان ریاستوں سے آگے ہے جہاں آئی ٹی کی انڈسٹری بین الاقوامی سطح پر کام کر رہی ہے۔ اس کی ایک مثال ہوشیار سنگھ تھا۔ اس کے پاس کل چودہ ایکڑ زمین تھی اور وہ اس کا ایک ایک انچ استعمال کر رہا تھا۔ جدید زرعی آلات اور بجلی کی وجہ سے اسے صرف چار ملازموں کی مدد درکار تھی۔ اس نے فخر سے بتایا۔

"دس سال سے صرف تین بار میں نے ایک فصل کے لیے زمین چھوڑی ہے اس میں بھی گوار پھلی لگاتا ہوں اس سے زمین پھر زرخیز ہو جاتی ہے اور مجھے اس کا بھی اچھا خاصا مل جاتا ہے۔"

ہوشیار سنگھ پڑھا لکھا تھا اور اس نے محکمہ زراعت سے کورس بھی کر رکھے تھے اسی لیے وہ کاشت کے جدید طریقے اپنائے ہوئے تھا۔ اس کے پاس بہترین گھر تھا اور دو گاڑیاں تھیں۔ جیپ وہ اپنے لیے استعمال کرتا تھا جب کہ خاندان کے ساتھ آنے جانے کے لیے اس کے پاس نئے ماڈل کی چھوٹی کار تھی۔ یہ اس نے چند مہینے پہلے لی تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے اس کی زمین کی آخری حد تک چلے گئے۔ یہاں سے وہ میگا ٹیوب ویل دکھائی دے رہے تھے جو زمین سے پانی کھینچ کر آگے بھیج رہے تھے۔ ان کی تعداد کم سے کم بھی درجن تھی اور یہ سرحد سے کچھ فاصلے پر ہر سو گز کے بعد لگے ہوئے تھے۔ ہوشیار سنگھ نے کہا۔ "یہ بارہ گھنٹے چلتے ہیں۔"

"ان کی تعداد بہت زیادہ ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے جہاں تک دیکھا ہے یہ ہر سو گز بعد اسی طرح لگے ہوئے ہیں۔ انہیں ٹرکوں سے ڈیزل دیا جاتا ہے۔"

"تم لوگ پانی کا معاوضہ دیتے ہو؟"

"بالکل.... ورنہ یہ ٹیوب ویل کیسے چل سکتے ہیں۔ مگر یہ معاوضہ بہت زیادہ نہیں ہے یوں سمجھ لیں مجھے مہینے میں تین چار ہزار روپے سے زیادہ نہیں دینا پڑتا ہے۔"

اچانک پتلون کی جیب میں موجود موبائل نے وائبریشن دی تو میں نے ہوشیار سنگھ کی طرف دیکھ کر چھوٹی انگلی فضا میں بلند کی اور نزدیک موجود چند درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ درختوں میں پہنچ کر پتا چلا کہ وہ ان ہی کاموں کے لیے مخصوص تھے جس کا بہانہ کر کے میں یہاں آیا تھا۔ اس لیے فضا مہک رہی تھی۔ میں نے موبائل نکالا اس بار وسیم کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"کام چل رہا ہے۔" وسیم کی آواز آئی۔ "ممکن ہے آج ہو جائے۔"

"کام پکا ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "خطرہ کم سے کم ہو۔"

"میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ دونوں ٹھیک ہیں؟"

"ہاں یہاں حالات بہتر ہیں۔"

"کل میں پھر رابطہ کروں گا۔" اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں موبائل بند کر کے واپس آیا تو ہوشیار اسی جگہ کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی فصل کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اس کے ہاتھوں ماری جانے والی عورت کی لاش

ان تینوں نے ٹھکانے لگادی تھی اور یہ کام انھوں نے اپنی گردن بچانے کے لیے کیا تھا۔ میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا اس طرح اس پر سے دباؤ کم ہو جاتا جب تک وہ اس خوف میں رہتا کوئی ایسی حرکت کرنے سے گریز کرتا جس سے معاملہ پولیس کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ اب تک اس کا ردِعمل مطمئن کرنے والا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کو اطلاع مل گئی ہوگی کہ میں ساوی کو لے کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ انتقاماً مقامی حکام کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ اسے میرے بارے میں علم نہیں تھا کہ میں کہاں تھا؟

ڈیوڈ شا زیادہ سے زیادہ اس بازار تک پہنچ سکتا تھا جہاں ٹھیلے نے مجھے اور ساوی کو اتارا تھا۔ بازار بہت بڑا تھا اور وہاں بے شمار شاپنگ سینٹرز اور دکانیں تھیں جس ہوٹل میں ہم رکے تھے وہ اس جگہ سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں بھی ہماری موجودگی کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ جب تک وہ تینوں، پولیس یا ڈیوڈ شا کے ہاتھ نہیں آتے ہماری نشان دہی مشکل تھی۔ اس کے باوجود میں سو فیصد مطمئن نہیں تھا۔ دشمن کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے میں ذہنی طور پر مستعد تھا۔ ہم واپس آئے تو سورج ڈوبنے کے بعد رہی سہی روشنی بھی تاریکی میں بدل چکی تھی۔ سومیت نے ہم سے معذرت کی تھی کہ وہ سبزی خور تھے اور کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے اس میں مچھلی بھی شامل تھی ہاں انڈے استعمال کرتے تھے اور ڈنر میں انڈوں سے بنی ایک ڈش موجود تھی۔ یہ اصل میں انڈا بریانی تھی جو میں نے پہلی بار کھائی تھی۔ وہ لوگ جلدی کھانے کے عادی تھے اس لیے ساڑھے آٹھ بجے میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔

جلد کھانے کے ساتھ وہ جلد سونے کے عادی بھی تھے جیسا کہ گاؤں دیہات کا رواج ہے۔ ان کا گھر شہری سہولتوں سے آراستہ تھا مگر معمولات دیہاتی ہی تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ میری کوشش تھی کہ ہوشیار زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ رہے۔ دس بجے ہم اپنے کمروں میں آگئے۔ وہ جلدی سو جانے کے عادی تھے میں نے ساوی سے کہا۔ ”ہم کمرے میں ہوں گے لیکن کوئی ایک جاگتا رہے گا۔ ابھی تم سو جاؤ میں تمھیں صبح چار بجے جگا دوں گا۔“

ساوی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے مختصر شاور لیا اور ایک طرف صوفے پر اپنی جگہ بنالی تھی۔ یہاں اے سی نہیں تھا اس لیے کمبل کی ضرورت نہیں تھی۔ پنکھا چل رہا تھا اور اس کی ہوا گرمی اور حبس دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈنر کے بعد موسم اچانک حبس آلود ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بارش آنے والی تھی۔ مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی آجائے گی۔ بارہ بجے گرج چمک شروع ہوئی اور دس منٹ بعد تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے تھے اندر کی گرمی نکلی اور باہر سے خنک و نم ہوا اندر آئی۔ شدید بارش کا سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے جاری رہا اس کے بعد اس کی شدت میں کمی آگئی۔ مگر گرج چمک کا سلسلہ جاری تھا۔ میں صوفے پر نیم دراز تھا۔ کمرے کی بڑی روشنیاں بند کر کے صرف ایک نیلگوں روشنی والا نائٹ لیمپ آن کیا ہوا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ باہر کوئی گاڑی رکی ہے۔ ویسے تو آواز نہیں آئی تھی لیکن انجن بند کرنے سے پہلے اسے ریس دی جاتی ہے تو اس کی آواز آئی تھی۔ میں چوکنا ہو گیا اور دروازے تک آیا۔ میں نے باہر جھانکا لیکن لاؤنج خالی تھا۔ ہوشیار سنگھ کے گھر میں چار بیڈ روم تھے اور ان چاروں کے دروازے لاؤنج میں کھلتے تھے۔ لاؤنج گھر کے وسط میں تھا۔ مگر لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ہمارا کمرا پورچ اور گیٹ کی طرف تھا اس لیے میں نے آواز سن لی۔ خاصی دیر تک کوئی اور آہٹ نہیں ہوئی تو میں دروازہ بند کرنے والا ہی تھا کہ اسی لمحے کال بیل بجی۔ بجانے والے نے نہایت بدتمیزی سے بیل بٹن پر انگلی رکھ دی تھی اور تقریباً آدھے منٹ تک مسلسل بجاتا رہا۔ اندر سے ہوشیار پاجامے اور بنیان میں افراتفری کے ساتھ برآمد ہوا۔ یقیناً میری طرح اس کے ذہن میں بھی خیال آیا ہوگا کہ پولیس آگئی۔ پولیس... کسی کے گھر آدھی رات کو اسی طرح نازل ہو سکتی تھی۔

میں پلٹا کہ بیگ سے شاٹ گن نکال سکوں تو ساوی کو بیدار پایا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں بیگ کی طرف بڑھا تھا کہ باہر سے ہوشیار سنگھ کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ”سنگیتے تو....؟“

”ہاں بھائی جی...ایک سال بعد ہی تو دیکھا ہے...کیا شکل بدل گئی ہے جو پہچان نہیں رہے تھے۔“

”تو یہاں کیوں آیا ہے؟“

”ہوشیار یار تو میرا بھائی ہے۔“ سنگیتے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ ہوشیار سنگھ سے

بالکل مختلف اور صورت سے ہی جرائم پیشہ نظر آنے والا شخص تھا۔ لہجے سے وہ بھی ہوشیار کی طرح پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ "اپنے بھائی سے ملنے آیا ہوں۔"

"سنگیتے تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا تو جانتا ہے سب نے تجھ سے تعلق ختم کرلیا ہے۔ سویت بھی پسند نہیں کرے گی۔"

"بھر جائی کو چھوڑ اپنی بات کر۔" سنگیتے نے کہا۔ "وہ بے چاری تو اور بھی بہت کچھ پسند نہیں کرے گی جو تو کرتا پھرتا ہے۔"

"آہستہ بول۔" ہوشیار نے برہمی سے کہا۔ "کیا تو میرا گھر برباد کرنے آیا ہے۔"

"میں تیرا بھائی ہوں دشمن نہیں.... یہاں سے گزر رہا تھا سوچا ایک رات تیرے پاس رک جاؤں صبح چلا جاؤں گا۔"

"تو جیل سے کب آیا؟"

"دو ہفتے پہلے رہا ہوا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس علاقے میں تو کہاں جا رہا تھا جو یہاں سے گزر رہا۔" ہوشیار کے لہجے میں شک تھا۔

"بس جا رہا تھا۔" سنگیتے نے ڈھٹائی سے کہا۔

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں آیا ہے۔ کوئی گڑبڑ تو کرکے نہیں آیا ہے کہ پیچھے سے پولیس بھی آرہی ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں بھائی جی۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے کہا نا بس ایک رات رکوں گا اور پھر ہم اپنی راہ لیں گے۔"

"ہم؟" ہوشیار کی چونکی آواز آئی۔ "اور کون ہے؟"

"میرے دو دوست بھی ہیں۔" اس نے کہا تو میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ سنگیتے یقیناً کوئی غلط کام کرکے یہاں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی اسے برداشت نہیں کرے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی لے آیا تھا۔ یہ بات ہوشیار نے بھی محسوس کرلی۔

"سنگیتے میں تجھے نہیں ٹھہرا سکتا اپنے دوستوں کو لے کر اسی وقت نکل جا۔" ہوشیار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "چل نکل یہاں سے۔"

"اب میں نہیں جاؤں گا۔" سنگیتے نے کہا اور آواز دی۔ "آجاؤ یارو اپنا ہی گھر ہے۔"

"سنگیتے یہ کیا کر رہا ہے ان بدمعاشوں کو اندر بلا رہا ہے۔" ہوشیار نے برہمی سے کہا اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں کہیں جاؤں اور وہاں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ یہاں بھی مسئلہ آ گیا تھا۔ سنگیتے کے دونوں آدمی اندر آ گئے اور ہوشیار کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ دونوں آدمی سکھ تھے اور انہوں نے دو عدد بیگ اٹھا رکھے تھے۔

"بھائی جی یہ بدمعاش نہیں ہیں لیکن ضرورت پڑے تو بن جاتے ہیں۔" سنگیتے نے دانت نکال کر کہا۔ "بس ایک رات کی بات ہے صبح ہم چلے جائیں گے۔"

"تم لوگ کوئی واردات کرکے آئے ہو۔" ہوشیار نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ "پولیس سے بچنے کے لیے یہاں آئے ہو۔"

"ہاں، ادھر پولیس سرگرم ہے۔" ایک آدمی نے زبان کھولی۔ وہ طویل قامت اور دبلی جسامت کا مالک تھا۔ "اس وقت ناکے لگائے ہیں صبح تک کھول دیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔"

"کسی کو پتا نہیں چلے گا۔" سنگیتے بولا۔ "مجھے معلوم ہے بچے ماتا پتا کے پاس ہیں۔ ادھر بس بھرجائی ہوگی۔"

"کچھ مہمان بھی ہیں۔" ہوشیار نے آہستہ سے کہا۔ "میرے کالج کے وقت کا دوست ہے، بیوی کے ساتھ ادھر آیا ہوا ہے۔"

"اس کی خیر ہے تم بتا دینا کہ بھائی اور اس کے دوست ہیں۔ کوئی سامنے نہیں آئے گا ہم کمرے تک رہیں گے۔"

ان لوگوں کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر ہوشیار نے انکار کیا تو وہ زبردستی پر اتر آئیں گے۔ طویل قامت کے شانے سے شاٹ گن لٹک رہی تھی اور دوسرے نے اپنی توند کے ساتھ پتلون کی دھنسی بیلٹ میں پستول بھی اٹکایا ہوا تھا۔ سنگیتے خالی ہاتھ تھا لیکن لگ رہا تھا کہ اس کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوگا۔ ہوشیار نے محسوس کیا کہ وہ اب انکار کرکے نقصان میں رہے گا۔ مجبوراً اس نے سر ہلایا۔ "اپنی بات پر قائم رہنا کل صبح یہاں سے چلے جانا۔"

"بھائی جی اندر تو آنے دو۔ ابھی آئے نہیں اور نکالنے کی بات شروع کردی۔" سنگیتے آگے بڑھا تو ہوشیار نے روکا۔

"ادھر نہیں یہاں وہ رکے ہیں۔ تم لوگ اس کمرے میں جاؤ۔"

میں نے آہستہ سے دروازہ بند کردیا تھا۔ کیونکہ اب

وہ آگے آتے تو کھلا دروازہ دیکھ سکتے تھے۔ میری توجہ کا مرکز سگینے کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں موجود بیگ تھے۔ انہوں نے جس طرح اٹھا رکھے تھے اس سے ظاہر تھا کہ ان میں خاصا وزن تھا۔ وہ بیگوں میں کپڑے اور ضرورت کا سامان لے کر گھومنے والے لوگ نہیں تھے۔ ان بیگوں میں یقیناً لوٹ کا مال یا ایسی کوئی چیز تھی جس کے لیے پولیس ان کے پیچھے تھی اور علاقے کو باقاعدہ ناکوں سے بند کیا گیا تھا۔ وہ تینوں اس کمرے میں چلے گئے جو ہوشیار نے ان کے لیے کھولا تھا۔ میں پلٹا تو ساوی کو پیچھے کھڑے پایا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "شوبی لگ رہا ہے مصیبت آ گئی ہے۔"

"لازمی بات ہے ہم جہاں قدم رنجہ فرمائیں اور وہاں کوئی مصیبت یا آفت نہ آئے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔"

"تب کیا کریں پولیس آ گئی تو ان کے ساتھ ہمیں بھی سمیٹ کر لے جائے گی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ اگر پولیس نے ناکا بندی کی ہے تو ان کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں وہ گھروں تک بھی آ سکتی ہے۔ یقیناً یہ کوئی ایسا کام کر کے آئے ہیں جس کی وجہ سے پولیس بڑے پیمانے پر حرکت میں آئی ہے۔"

"شوبی وسیم نے رابطہ کیا پھر؟"

"نہیں بس شام کو اس کی کال آئی تھی، تمہیں بتایا تھا۔" میں واپس صوفے پر دراز ہو گیا۔ "وہ پوری کوشش کر رہا ہو گا لیکن میں نے اسے بتا دیا ہے کہ جب تک خطرہ صرف دس فیصد تک نہ ہو میں تمہیں لے کر بارڈر کراس نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔" ساوی بستر پر بیٹھ گئی۔ "لیکن شوبی مجھے لگ رہا ہے یہ لوگ کچھ گڑبڑ کریں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"جیسے ہم ان سے چوکنا ہیں اسی طرح وہ بھی ہم سے چوکنا ہوں گے۔ بھائی کی بات الگ ہے لیکن ہوشیار کا بھائی ہم پر اعتبار نہیں کرے گا۔"

ساوی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ صرف ایک رات کے لیے یہاں نہیں آئے تھے۔ جب تک پولیس ان کی تلاش میں ہوتی وہ اسی جگہ رہتے اور یہاں انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہوشیار بہر حال اپنے بھائی کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہیں رہتے تو اس کا پورا امکان تھا کہ جلد یا بدیر ہماری ملاقات ہوتی اور یہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوتی۔ وہ تین تھے اور مسلح بھی تھے۔ پھر عادی جرائم پیشہ تھے ان کے لیے کسی پر ہاتھ اٹھانا یا کسی کو مار دینا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں انتظار کرنے کی بجائے پہلے میں ہی کیوں نہ کچھ کر گزروں۔ یہ گھوڑے کے پہلے پھونک مارنے والا کیس بھی ہو سکتا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس نتیجے پر پہنچتے کہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے اور تب وہ اسلحے کے زور پر ہمیں یرغمال بنا لیتے۔ اگر میں پہلے کارروائی کرتا تب بھی خطرہ تھا کہ وہ مزاحمت کریں گے اور یہاں کچھ گولیاں چلیں گی۔ اس صورت میں پولیس کے آنے کا امکان بڑھ جاتا۔ بے شک آس پاس کوئی گھر نہیں تھا لیکن یہ جگہ ویران بھی نہیں تھی۔ بڑی سڑک پاس تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اب کوئی زبردستی اندر نہیں آ سکتا تھا۔

مجھے خود پر اعتماد تھا کہ وہ تینوں میرے لیے مسئلہ نہیں ہوں گے۔ مگر انہیں قابو کر کے رکھنا آسان نہیں تھا اور قتل تو اس مسئلے کا بالکل بھی حل نہیں تھا۔ اس سے دیگر کئی مسائل کھڑے ہو جاتے۔ یہاں ہوشیار کے علاوہ تین بھی اہل خانہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اتنے لوگوں کو خاموش کرانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے جو کرنا تھا خاموشی سے کرنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا ساوی دوبارہ لیٹ گئی۔ اسے وقتی تشویش ہوئی تھی ورنہ اسے بھی یقین تھا کہ میں اس چکر سے نمٹ سکتا ہوں۔ وہ غنودگی میں گئی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور وہ جاگ گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ کون ہے؟"

"میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے تک آیا۔ دستک اتنی ہلکی تھی کہ اگر ہم ذہنی طور پر چوکنا نہ ہوتے تو شاید سنائی بھی نہ دیتی۔ پھر باہر بارش اور بجلی کی گرج چمک کا شور تھا۔ امکان یہی تھا کہ باہر ہوشیار ہو گا اس لیے میں نے ممکن حد تک دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کون؟"

"میں ہوں ہوشیار۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ میں نے گہری سانس لی لیکن مطمئن نہیں ہوا تھا کیونکہ ہوشیار کو گن پوائنٹ پر بھی یہاں لایا جا سکتا تھا۔ میں نے پستول نکال کر ہاتھ پشت پر کیا اور دروازہ کھول دیا۔ ہوشیار تیزی سے اندر آیا۔ ساوی نے جلدی سے دوپٹا ٹھیک کیا اور میں نے پوچھا۔

"یہ کیا حرکت ہے تم اس طرح منہ اٹھائے کس خوشی میں اندر آ رہے ہو؟"

"آئی ایم سوری۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا اور

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

پھر بولا۔ "ہم بڑی مشکل میں پھنس گئے۔"

"ہم سے کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے ہم دونوں۔" اس نے گھبرا کر کہا کیونکہ میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ "واہ گورو کے لیے آواز دھیمی رکھو وہ نہ سن لیں۔"

"وہ کون؟"

"میرا بھائی اور اس کے ساتھی۔"

"میرا تمہارے بھائی یا اس کے ساتھیوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

ہوشیار نے سوچا اور پھر مجھے پوری بات بتانے کا فیصلہ کیا حالانکہ میں پہلے ہی سب جانتا تھا۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ "میرا چھوٹا بھائی ہے سنگیت سنگھ۔ جوانی میں غلط چکروں میں پڑ گیا۔"

"جیسے تم شادی کے بعد غلط چکروں میں پڑ گئے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم ڈرائنگ روم میں چل کر بات کرتے ہیں۔"

ہوشیار نے سر ہلایا تو میں نے سادی کو اشارہ کیا کہ وہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔ وہ سر ہلاتی ہوئی کھڑی ہوئی تو میں اور ہوشیار باہر نکل آئے اور دبے قدموں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ہوشیار نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اور مجھے ممکنہ حد تک دور والے حصے میں لا کر بولا۔ "اس نے جرم شروع کر دیے۔ ایک سال پہلے وہ پکڑا گیا۔ خوش قسمتی سے ایک گواہ مکر ہو گیا اور اسے صرف چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ وہ چھوٹ آیا اور اب یہاں ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"مجھے شبہ ہے جی کہ وہ اور اس کے دو ساتھی کہیں کوئی واردات کر کے آئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے اور علاقے کی ناکا بندی کر رکھی ہے۔"

"ہاں اب میرا مسئلہ بھی بن رہا ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "تمہارا مسئلہ تو ہے ہی۔"

"وہ کہہ رہا ہے کہ صبح چلا جائے گا لیکن مجھے یقین ہے وہ یہاں جم کر بیٹھ جائے گا۔"

"سامنے کی بات ہے پولیس اتنی جلدی اپنی تلاش ختم نہیں کرے گی اور یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"ابھی تو میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم میرے دوست ہو۔"

"سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہاں رکے اور پولیس انہیں تلاش کرتی آ گئی تو وہ اتنی شرافت سے خود کو پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔" میں نے ہوشیار کو قائل کرنا شروع کر دیا۔ "یہ گولیاں چلائیں گے اور مارا ماری ہو گی۔ ممکن ہے پولیس سے بچنے کے لیے یہ تمہیں اور ہمیں یرغمال بنا لیں۔"

درحقیقت وہ پہلے ہی قائل تھا اور جو باتیں میرے ذہن میں تھیں وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اسی لیے تو وہ میرے پاس آیا تھا۔ وہ متفکر ہو گیا۔ "یہ تو ہے۔"

"یہ مقابلہ کریں گے اور گولیاں چلائیں گے تو جواب میں پولیس پھول تو نہیں مارے گی اور گولیاں سامنے آنے والے کو نہیں دیکھتی ہیں۔ ہم بھی مارے جا سکتے ہیں۔"

"یہ بھی ہے۔" اس نے پھر اتفاق کیا۔

"اس صورت میں ہمیں وہ کام کرنا چاہیے جس سے مسئلہ خاموشی سے حل ہو جائے۔"

"خاموشی سے کیسے؟"

"یہ بتاؤ تمہارے پاس نیند کی دوا ہے؟"

"ہاں کچھ مہینے پہلے مجھے نیند نہیں آتی تھی تو میں لایا تھا۔ اس کے بعد خود نیند آنے لگی تو اس کا ڈبا ویسا ہی پڑا ہے۔"

"ٹھیک ہے انہیں چائے میں دوا ملا کر دے دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"چائے اس وقت؟"

"ہاں.... تم کہہ سکتے ہو کہ فکر سے تمہاری نیند اڑ گئی ہے اور تم اپنے لیے چائے بنا رہے تھے تو سوچا کہ ان تینوں کے لیے بھی بنا دو۔ تم ان کے ساتھ ہی چائے پینا تاکہ انہیں شک نہ ہو۔"

"دوا والی۔" اس نے اعتراض کیا۔ "اس سے تو میں بھی سو جاؤں گا۔"

"اپنے لیے تم بغیر دوا والی لینا۔"

"تب ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"تب تو عمل کرو.... اگر وہ سچ مچ سو گئے تو تم اٹھا کر تو چائے نہیں دو گے۔"

"میں ابھی جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرے پاس گولیاں ہیں پہلے انہیں پیس لیتا ہوں۔"

وہ سچ مچ ہوشیار تھا۔ شکر ہے اسے یہ حرکت حادثے ساتھ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ ہم نے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شرافت سے کام لیا تھا اور اس کی مدد کی تھی۔ اسے قتل اور بلیک میلنگ کے چکر سے بچالیا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا کہ سامنے سنگیت اور اس کے دونوں ساتھی دکھائی دیے۔ ان کے چہروں پر شک ہی شک تھا۔ سنگیت نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ ”بھائی جی دروازہ بند کرکے کیا کر رہے تھے؟“

میں خاموش کھڑا رہا ہوشیار نے مڑ کر دیکھا تو اس کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ حوصلہ کرے۔ اس نے اشارہ سمجھ لیا اور کسی قدر گرم لہجے میں بولا۔ ”تو کون ہوتا ہے مجھ سے میرے گھر میں یہ سوال کرنے والا۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو یار ایسے ہی پوچھ لیا۔“

میں آگے آیا۔ ”تم تینوں ساتھ ساتھ رہتے ہو کیا.... ہر وقت؟“

طویل قامت نے غرا کر میری طرف دیکھا اور ہوشیار سے کہا۔ ”اپنے یار کو سمجھا لے ہمارے منہ نہ لگے۔“

”منہ لگنے والی بات بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بات کرنے سے پہلے آئینے میں منہ دیکھ لیا کرو۔“

”لگتا ہے تو اس طرح نہیں مانے گا۔“ طویل قامت آگے آیا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”یہاں نہیں.... یہ میرے دوست کا گھر ہے اس کا نقصان میرا نقصان ہے باہر چلتے ہیں۔“

توند والا خوش تھا اور سنگیت بھی دل چسپی لے رہا تھا ایسا لگ رہا تھا ان کا دل پسند تماشا ہونے والا ہے۔ طویل قامت بولا۔ ”تم خود مقابلے کا کہہ رہے ہو بعد میں رونا مت۔ میں ہاتھ چلاتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ آگے والے کے منہ ناک کا کیا ہوگا؟“

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ہوشیار گھبرا گیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”تم فکر مت کرو ہم ذرا تبادلہ خیال کریں گے۔“ میں نے کہتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ وہ چاروں بھی پیچھے تھے۔ ہوشیار اپنے بھائی سے کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ اس کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی بجائے وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں میری مرمت دیکھنا چاہتا تھا۔ اب وہ ہوشیار ہو گئے تھے اور شاید دوسرا حربہ کام نہ کرتا اس لیے میں نے دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ ہم باہر آئے جہاں ہوشیار کی جیپ کے ساتھ ایک کھٹارا سی پرانی کار کھڑی تھی۔ وہ لوگ اسی میں آئے تھے اور انہوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے گاڑی بھی اندر کھڑی کر لی تھی۔ اس لیے اب پورچ میں جگہ نہیں تھی۔ ہم لان میں آ گئے۔ ہوشیار اب خاموش تھا اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی کوئی نہیں سنے گا۔ سنگیت اور توند والا ذرا دور کھڑے ہو گئے اور طویل قامت آگے آیا۔ میں نے اناڑیوں کی طرح دونوں ہاتھ آگے کیے۔ طویل قامت مسکرایا اور اس کا چہرہ لان لیمپ کی پیلی روشنی میں مزید مکروہ نظر آنے لگا۔ مجھے کمزور محسوس کرکے وہ آگے آیا اور میں نے آدھے منٹ میں کھیل ختم کر دیا۔ اس کے دو وار ناکام بنا کر میں نے پہلے اس کے پیٹ میں مکا مارا اور جب وہ جھکا تو اس کے سر پر پستول کا دستہ رسید کیا وہ وہیں گر گیا۔ توند والے کا ہاتھ اپنی بیلٹ کی طرف گیا تھا کہ میں نے پستول اس کی طرف کر دیا۔ ”ہاتھ اوپر اور حرکت مت کرنا ورنہ....“ میں نے پستول کو جنبش دی تو اس کا ہاتھ رک گیا پھر اس نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ سنگیت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب ہوائیاں ان کے چہروں پر اڑ رہی تھیں۔ وہ میرے پرزے اڑتے دیکھنے آئے تھے اور یہاں تماشا ہی الٹا ہو گیا تھا۔

”ہاتھ گردن پر۔“ میں نے حکم دیا تو انہوں نے اس بار بھی تعمیل کی اور ہوشیار نے میرے کہنے پر ان کی تلاشی لے کر ہتھیار برآمد کر لیے۔ دونوں کے پاس پستول تھے۔ نہتے ہونے پر ان کا رہا سہا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ سنگیت نے کہا۔ ”بھائی جی ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”اتنی آسانی سے نہیں۔“ میں نے کہا اور ہوشیار سے پوچھا۔ ”کوئی جگہ ہے جہاں ان کو بند کیا جا سکے تو صرف ان کی آتمائیں وہاں سے نکل سکیں؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے کہا اور عقبی لان کے ساتھ بنی کوٹھری تک آیا۔ یہ اوزار اور فالتو سامان رکھنے کے لیے تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی اس کوٹھری کی چھت بھی پکی تھی اور دروازہ موٹی لوہے کی چادر کا بنا ہوا تھا۔ یہ انتظام شاید سامان کو چوروں سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا اور یہاں سے سچ مچ ان کی روحیں ہی نکل سکتی تھیں۔ ایسی ساری چیزیں نکال لیں جن کی مدد سے یہ خود کو آزاد کرا سکتے تھے اور پھر انہیں کوٹھری میں دھکیل دیا۔ میں نے کہا۔

”آرام سے بیٹھنا.... ہنگامہ کیا تو اپنا نقصان خود کرو گے۔“

”بھائی جی تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“ سنگیت نے بھائی کو دھمکایا۔

"تو نے بہت اچھا کیا جو ان بدمعاشوں کو لے کر میرے گھر آ گیا۔" ہوشیار نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"ہم صرف رکھتے تیرا کوئی اور نقصان نہیں کرتے۔"

"بکواس مت کر... یہ میرا دوست ہے اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے میرے ساتھی اور تو... تو کہتا ہے میرا نقصان نہیں کر رہے تھے۔ ابھی پہلے معلوم کر لوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے پھر تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔"

ہوشیار اندر سے ایک بڑا اور مضبوط تالا لے آیا اسے باہر ڈال دیا۔ ہم اندر آئے پہلے میں نے سادی کو تسلی دی کہ حالات میرے قابو میں ہیں اور وہ سو جائے پھر میں ہوشیار کے ساتھ اس کمرے میں آیا جس میں یہ تینوں رکے تھے۔ وہاں ان کے اضافی اسلحے کے ساتھ وہی دونوں بڑے بیگ بھی تھے۔ ہوشیار نے ایک بیگ کھولا اور میری توقع کے عین مطابق اس میں کرنسی نوٹوں کا ڈھیر نکلا تھا۔ یہ سارے ہزار اور پانچ سو والے نئے کرنسی نوٹ تھے جن پر بینک کی پٹی لگی تھی۔ ہوشیار نے گھبرا کر کہا۔ "واہ گرو کی سو... کسی بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے دوسرا بیگ بھی کھولا اور وہ بھی اسی طرح کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں بیگوں کا مشترکہ وزن کوئی پچاس کلوگرام تھا۔ ہوشیار نے گڈیاں گنیں اور مجھے آگاہ کیا۔

"دو سو گڈیاں لاکھ والی اور تین سو پچاس ہزار والی ہیں۔"

"ساڑھے تین کروڑ روپے۔" میں حیران ہوا تھا۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور پولیس لازمی چوکنا ہوگی۔"

"اتنی بڑی واردات ٹی وی پر لازمی آ رہی ہوگی۔" ہوشیار نے کہا تو ہم نے نشست گاہ کا رخ کیا۔ اس نے ٹی وی آن کر کے مقامی نیوز چینل لگایا تو اس پر اس وقت یہی خبر چل رہی تھی۔ نامعلوم افراد نے امرتسر سے لدھیانہ آنے والے کیش آرمرڈ ٹرک کو لوٹ لیا تھا۔ ڈاکوؤں نے ٹرک کے چاروں محافظوں کو قتل کر دیا تھا اور اس میں موجود ساڑھے تین کروڑ کی رقم لوٹ کر لے گئے تھے۔ یہ خبر دیکھتے ہوئے رات دو بجے ہوشیار سنگھ کے بارہ بج گئے تھے۔ "یہ تو قاتل بھی ہیں۔"

"پولیس بہت سرگرمی سے ان کی تلاش میں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ اچھی خبر ہے کہ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔ مگر بہت سی باتوں سے دورانِ تفتیش پتا چل جائے گا کہ ڈاکوؤں نے کہاں کا رخ کیا ہے۔"

"وہ سیدھی یہاں آئے گی۔" ہوشیار نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ "اور تم کہہ رہے ہو کہ اچھی بات ہے۔"

"میرا مطلب ہے وہ ناموں سے واقف نہیں ہے ورنہ یہ پتا چلانا کون سا مشکل ہوتا کہ سنگیت سنگھ کا بھائی ہوشیار سنگھ اسی علاقے میں رہتا ہے۔ لدھیانہ یہاں سے بہت دور ہے۔"

"اتنا دور بھی نہیں ہے۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"اب ان کو چھپا کر رکھنا اور ضروری ہو گیا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کے لیے چائے بناؤ، نیند کی دوا والی۔"

"شراب میں نہ دے دوں۔" ہوشیار سنگھ نے بہتر تجویز دی۔ "زیادہ اثر کرے گی۔"

"یہ بہتر رہے گا۔" میں نے کہا تو اسی لمحے نشست گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ سویت ہوگی وہ جاگ گئی ہوگی۔" ہوشیار نے کہا اور باہر چلا گیا۔ وہ دس منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں وسکی شراب کی بوتل تھی۔ اس نے مجھے دکھائی۔ "دوا پیس کر اس میں شامل کر دی ہے۔"

ہم باہر آئے۔ کوٹھری کا تالا کھولا اور ہم اندر آئے۔ طویل قامت کو ہوش آ گیا تھا اور وہ سر تھامے مجھے خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو نے اچھا نہیں کیا ابھی مجھے جانتا نہیں ہے۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "بس ایک دن کی بات ہے پھر تم کو آزاد کر دوں گا۔"

"تم لوگوں نے آرمرڈ ٹرک لوٹا اور اس کے گارڈز کو مار دیا۔" ہوشیار نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے شراب کی بوتل سنگیت کی طرف اچھال دی۔ میں نے اندر آنے سے پہلے پستول نکال لیا تھا اس لیے وہ شرافت کے دائرے میں تھے۔ سنگیت نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تو شراب کیوں لایا ہے۔"

"بتایا تو ہے کہ تم لوگ ایک دن آرام سے رہو گے۔ شاباش اب پینا شروع کر دو۔"

"اس میں زہر ہے۔" سنگیت کا شک زبان پر آ گیا۔

"میں تم تینوں کو خالی ہاتھ سے بھی مار سکتا ہوں تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد..." میں نے پستول کو جنبش دی تو طویل قامت نے

سنگیت سے بوتل لے کر منہ سے لگالی۔ اسے ضرورت بھی تھی اس نے ایک ہی بار میں چوتھائی بوتل صاف کر دی۔ پھر گینڈے نے بوتل کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ سنگیت کو جب میں نے بچایا تو اس نے بوتل منہ سے لگائی تھی۔ اس دوران میں طویل قامت جھومنے لگا تھا مگر پہلے گینڈا لڑھکا پھر طویل قامت گرا اور آخر میں سنگیت نے مزید ایک گھونٹ لیا تھا اتنا غافل ہونے سے پہلے۔ بوتل تقریباً خالی ہوگئی تھی۔

"یہ کم سے کم دس بارہ گھنٹے کے لیے۔" ہوشیار نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی دوا انسان کو آٹھ گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہیں سلا سکتی ہے اس سے زیادہ دیر سونے کی صورت میں انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔ "ہاں یہ دس بارہ گھنٹے تک کسی قابل نہیں رہیں گے۔"

ہم باہر آئے اور ہوشیار نے تالا لگا دیا۔ ہم اندر آئے تو میں نے ہوشیار کا شانہ تھپکا۔ "اب تم سو جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں جاگتا رہوں گا۔ پولیس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے یہ گاڑی کہیں اور نہ چھوڑ دیں۔"

"پیچھے کھڑی کر دیتے ہیں۔" ہوشیار نے تجویز پیش کی۔ "باہر جانا خطرے والی بات ہوگی۔ مین روڈ پاس ہے اور اس پر پولیس موجود ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تب پیچھے کھڑی کر دو بلکہ ابھی یہ کام کر دو۔" میں نے مشورہ دیا اور ہوشیار گاڑی کے لیے چلا گیا۔ اب اس کا رویہ میرے ساتھ تقریباً نارمل ہو گیا تھا اور وہ جھجک نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی نظروں اور انداز میں ملامت تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اپنے ساتھ اس کی مدد بھی کر رہا تھا۔ رقم والے بیگ ابھی تک ان کے کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ ہوشیار آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "انہیں چھپانا ہے۔ صبح شیلا یا کوئی اور بندہ نہ جانے کے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔"

گھر میں ایک اسٹور روم تھا مگر وہ کھلا تھا اس لیے ہوشیار کے کمرے کے باتھ روم کے اوپر والی دو چھتی سے کام لیا گیا۔ ہم نے اسلحہ بھی بیگوں میں ڈال دیا اور انہیں دو چھتی پر سامان کے پیچھے رکھ دیا۔ سومیت جان گئی تھی اور ہراساں تھی۔ مگر وہ ہوشیار کا مسئلہ تھی وہ اسے سنبھال لیتا۔ اس نے گاڑی پیچھے ملازموں کے مکانات کے ساتھ ٹریکٹرز اور دوسری مشینری کے شیڈ میں کھڑی کر دی تھی۔ میں نے سومیت سے کہا۔ "بھرجائی اگر مشکل نہ ہو تو میرے لیے ایک کپ چائے بنا دیں۔"

اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "کیسی بات کرتے ہیں اجیت بھیا آپ نے تو ہمیں ان ڈاکوؤں سے بچایا ہے آپ کی سیوا تو دھرم ہے۔"

سومیت چائے بہت اچھی بناتی تھی اور اس کے پاس پتی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ میں وہیں لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا۔ ہوشیار کمرے میں تھا سومیت مجھے چائے دے کر بولی۔ "بھائی جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لینا اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"شکریہ بھگنی۔" میں نے کہا وہ اندر چلی گئی تھی۔ باہر گرج چمک رک گئی تھی مگر موسم بارش والا ہی ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی تیز ہوا کے خنک جھونکے آتے تھے۔ میں پانچ بجے تک وہاں رہا پھر کمرے میں آیا اور ساوی کو جگا کر سو گیا۔ وہ کمرے سے ہی آس پاس نظر رکھ سکتی تھی۔ اس نے مجھے نو بجے جگایا۔ وہ خود منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر چکی تھی۔

"شولی اٹھ جائیں ناشتا کر لیں۔"

"کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟"

"نہیں ہوشیار بھی سو رہا ہے، میں اور سومیت باتیں کر رہے تھے۔"

میں نے موبائل چیک کیے ان پر کال نہیں آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب دیکم اسی وقت کال کرتا جب وہ ہمارے لیے بندوبست کر لیتا یا پھر نہیں کر پاتا اور ہمیں کوئی متبادل راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ ویسے میری خواہش تھی کہ وہ انتظام کر لے اور ہم یہیں سے سرحد پار کر جائیں۔ میں اور ساوی جتنی جلدی یہاں سے چلے جاتے ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ میں نے منہ ہاتھ دھونے کی بجائے غسل کیا اور اپنے زخموں کا جائزہ لیا جو تقریباً بھر چکے تھے۔ ماتھے کے زخم پر کھرنڈ آگیا تھا جو شاید ایک دن میں اتر جاتا۔ باقی زخم صاف ہو چکے تھے اور معمولی نشان رہ گئے تھے۔ رات میں نے جاگتے رہنے کے خیال سے کم کھایا تھا اس لیے اب بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتے میں دیسی انڈے اور پراٹھے تھے۔ ان کے ساتھ سوجی کا حلوہ اور لسی تھی۔ میں نے ناشتے سے پورا انصاف کیا، سومیت تازہ پراٹھے بنا رہی تھی۔ اسی دوران میں ہوشیار بھی آ کر میرے ساتھ ناشتے میں شامل ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میں کچھ دیر پہلے گیا تھا وہ بے سدھ پڑے ہیں۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر ان میں سے کسی کو ہوش آ گیا ہوتا تو تم مشکل میں پڑ جاتے۔"

"میں صرف نام کا ہوشیار نہیں ہوں۔" اس نے فخر سے کہا۔ "پستول لے کر گیا تھا۔"

"یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "خاص طور سے جب ان میں تمہارا بھائی بھی شامل ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "مشکل ہے اگر سنگیت نہ ہوتا تو میں ایسا کر گزرتا۔"

"دوسری صورت میں کیا یہ تمہیں بخش دیں گے؟ کل رات ان کے ساتھ جو ہوا ہے۔"

اس بار ہوشیار سنگھ کا رنگ اڑ گیا تھا اور نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا جسے اس نے جلدی سے لسی سے نیچے اتارا۔ وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "جو سوچنا ہے جلدی سوچ لو میرے پاس وقت نہیں ہے شاید ہمیں بھی جلد جانا پڑے۔"

"میں سوچتا ہوں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ ظاہر ہے یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ میں ناشتا ختم کر رہا تھا کہ موبائل وائبریٹ ہوا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں واش روم سے آتا ہوں۔"

واش روم میں آکر میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف وسیم تھا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔ "سیاہ لباس کا بندوبست کرلیں، جوتے ایسے ہوں کہ ہلکی اور ناہموار زمین پر تیزی سے حرکت کرسکیں اور سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ کے سوا کچھ نہ ہو۔"

"میں بندوبست کرتا ہوں۔"

"یہ کام آج رات تک کرلیں اور ہاں نائٹ ویژن بھی ہوں۔"

"وہ ہیں اور بہت اچھی کوالٹی کے ہیں۔"

"بس تو کام بن گیا۔" وسیم بولا۔ "تیسرے آپ کو یہ موبائل بھی ساتھ رکھنا ہوگا، ونڈ فری کے ساتھ رہنمائی کے لیے۔ اسے پوری طرح چارج ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا ورنہ میں کوئی بھی چارجنگ والا سیٹ لے لوں گا۔"

"آج رات تیار رہے گا میں شام کے وقت رابطہ کروں گا۔"

میں ہاتھ دھو کر آیا تو ساوی سراپا انتظار بنی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھے کال آئی تھی۔ میں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ ذرا صبر کرے اور ہوشیار سے کہا۔ "ہمیں کچھ کپڑے چاہئیں یہاں سے مل سکتے ہیں۔"

"یہاں تو مشکل ہے۔" اس نے کہا۔ "ادھر فیروز پور جانا پڑے گا۔ وہاں کچھ دکانیں ہیں جہاں کپڑے مل جاتے ہیں۔"

"بس تو ابھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی۔" وہ متفکر ہو گیا۔ "ان کو چھوڑ کر؟"

"وہ آرام سے پڑے ہیں اور کوٹھری سے باہر نہیں آسکتے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ہم ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں واپس آجائیں گے۔"

میں نے اسے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں ساوی کے ساتھ کمرے میں آیا اور اسے مختصراً وسیم سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا کہ ہم آج رات ہی واپس جا رہے تھے۔ "میں سامان لینے جا رہا ہوں تم ہوشیار رہنا اور کسی مشکل صورت حال میں پستول کے استعمال سے مت ہچکچانا۔"

"آپ فکر نہ کریں میں سب دیکھ لوں گی۔" اس نے اعتماد سے کہا۔

ہم فیروز پور کی طرف روانہ ہوئے۔ درحقیقت دھوب محلہ فیروز پور شہر میں ہی ہے لیکن آبادی کم ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ لگتا ہے۔ ہائی وے یا حسینی والا بارڈر روڈ کی طرف جانے کی بجائے ہوشیار نے اندرونی سڑکوں کا انتخاب کیا اور ہم بغیر پولیس سے مڈبھیڑ کیے فیروز پور کنٹونمنٹ ایریا پہنچ گئے وہاں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا بازار تھا۔ میں نے ریڈی میڈ ہوزری گارمنٹ کی ایک دکان کا انتخاب کیا۔ اس کے پاس ہر سائز کے زنانہ مردانہ ٹراؤزر اور پورے آستین کی ٹی شرٹ موجود تھیں میں نے سیاہ رنگ میں دکھانے کو کہا۔ دکاندار ذرا حیران ہوا تھا کہ میں نے اس موسم میں پوری آستین کی ٹی شرٹ مانگی تھیں۔ مگر اسے دکانداری سے مطلب تھا اس نے مجھے مطلوبہ سائز کے ٹراؤزر اور ٹی شرٹس دے دیں۔ ایک میں نے اپنا سائز کا لیا تھا اور ایک ساوی کا لیا تھا۔ اس کے پاس مکمل کرلیس ہو جانے والی ٹوپیاں بھی تھیں۔ یہ سردی کا مال تھا جو فروخت سے بچ گیا تھا۔ میں نے وہ بھی لے لیں اور سیاہ ہی رنگ کے باریک دستانے لیے۔ اس کے بعد ہم ایک شو اسٹور آئے

یہاں سے کپڑوں کے کریپ ربر سول والے جوتے لیے۔ ان کا رنگ گہرا تھا مگر انھیں سیاہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ساری خریداری مشکل سے آدھے گھنٹے میں نمٹ گئی۔ پھر میں نے وہیں ایک موبائل شاپ سے ایک سادہ اسکرین مگر لمبی بیٹری والا موبائل لیا۔ یہ نیا تھا اس لیے قابلِ بھروسا تھا۔ ہم ٹھیک ایک گھنٹے میں واپس آگئے تھے۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری اس خریداری نے ہوشیار کو ہوشیار کردیا تھا۔ اس نے راستے میں دو تین بار مجھ سے پوچھا کہ میں نے یہ کپڑے اور جوتے کیوں لیے ہیں لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ واپس آتے ہی میں نے کمرے میں آکر سب سے پہلے ناپ چیک کیے۔ خاص طور سے جوتوں کے۔ اپنا سائز تو دکان پر دیکھ لیا تھا مگر ساوی کا اندازے سے لایا تھا اس نے پہلے جوتے چیک کیے۔ یہ اسے معمولی سے بڑے تھے۔ اس نے کہا۔ "کوئی بات نہیں میں موزے پہن لوں گی۔"

پھر اس نے واش روم میں جاکر چست ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہنی اور جھجکتی ہوئی باہر آگئی۔ میں ہنسا تو وہ شرما گئی۔ "واہیات لگ رہی ہوں اس میں۔"

"مجبوری ہے تمہارے میاں جی کا حکم ہے۔" میں نے موبائل کو چارجر پر لگاتے ہوئے کہا۔ "دوپہر میں ہم ڈیمو کریں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ فل ڈریس ریہرسل ہوگی رات کے اصل ڈرامے کے لیے۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ ہوشیار سنگھ لاؤنج میں تھا اور سنگیت سے کچھ کہہ رہا تھا مجھے دیکھ کر یک دم چپ ہوگیا۔ میں نے پوچھا۔

"ان کو چیک کیا؟"

"نہیں۔"

"آؤ دیکھ لیں۔" میں نے کہا اور ہم کوٹھری تک آئے۔ ہوشیار نے تالا کھولا۔ وہ تینوں ہوش میں تھے مگر ان کی صورتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ سنگیت نے بھائی کو دیکھتے ہی وہی راگ الاپنا شروع کردیا جس میں دھمکیاں بھی تھیں اور التجائیں بھی۔ درحقیقت وہ تینوں ہی خوفزدہ تھے۔ وہ جو کرکے آئے تھے انھیں اندازہ تھا کہ اب تک ہم واقف ہو چکے ہوں گے۔ میں نے کہا۔ "پولیس تمھیں پاگلوں کی طرح تلاش کررہی ہے۔ چار قتل اور ساڑھے تین کروڑ کی ڈکیتی معمولی بات نہیں ہوتی ہے۔"

"تو خود کو میرا بھائی کہتا ہے اور یہاں چلا آیا۔" ہوشیار نے نفرت سے سنگیت کو دیکھا۔ "تیرے پیچھے پولیس آتی تو میں بھی مارا جاتا۔"

سنگیت کا سر جھک گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "ویسے تم تینوں اس قابل ہو کہ پھانسی چڑھ جاؤ لیکن ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے ممکن ہے تمہیں چھوڑ دیں۔ اس لیے آرام سے بیٹھو اور کوئی ہنگامہ مت کرنا۔"

"ہم کوئی ہنگامہ نہیں کریں گے۔" سونو نے یقین دلایا۔

لمبے نے چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ "پیشاب آرہا ہے۔"

"یہیں کرلو۔" ہوشیار نے کہا۔ "کچھ دیر میں تمہیں کھانے کو مل جائے گا۔"

"شراب نہیں مل سکتی۔" سونو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ابھی نہیں شام کو دوں گا۔" ہوشیار نے انکار کیا۔ ہم انھیں بند کرکے اندر آئے۔ اس بار میں ہوشیار کو نشست گاہ میں لے آیا۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"میری ایک تجویز ہے۔" میں نے کہا۔ "انھیں ایک بار پھر شراب میں دوا دے دو اور ان کی گاڑی میں ڈال کر انھیں یہاں سے دور کہیں چھوڑ آؤ۔"

"دور جانا ممکن نہیں ہے۔ پولیس نے ناکے لگائے ہوں گے۔"

"تم پہلے خود جاکر دیکھ لو کہ پولیس کتنی سرگرم ہے اور انھیں چھوڑنے کا کام تاریکی کے بعد کرنا۔"

اس نے غور کیا۔ "تم میری مدد کرو گے۔"

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ہاں میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"ان کا اسلحہ اور وہ رقم؟" ہوشیار کا لہجہ رقم کا ذکر کرتے ہوئے ذرا تبدیل ہوا تھا۔

"وہ بھی ساتھ ہوگی۔ اس رقم کے چکر میں مت پڑو۔ تم نے غور نہیں کیا وہ ساری نئی اور سیل گڈیاں ہیں ان کے نمبر ضرور پولیس کے پاس ہوں گے اور تمہارے پاس سے ایک نوٹ بھی نکل آیا تو تم بھی ان کے ساتھ مارے جاؤ گے۔"

ہوشیار فوراً سیدھا ہوگیا۔ اس نے صفائی پیش

کی۔ ”میری نیت خراب نہیں ہے میں صرف پوچھ رہا تھا۔“

”تم ابھی کھانے کے بعد نکلنا اور دیکھ کر آجانا۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے۔“

سومیت نے دال چاول بنائے تھے جس کے ساتھ چٹنیاں اور اچار تھا۔ ایک ڈونگے میں سب ڈال کر ان تینوں کو پہنچا دیا گیا اور پھر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہوشیار اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں ساوری کو لے کر کمرے میں آگیا۔ اگرچہ سومیت اس سے گپ شپ کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے کپڑے بدلے اور سیاہ ٹراؤزر اور فل آستین کی ٹی شرٹ میں آگئے۔ جوتے ڈارک براؤن کلر کے تھے اور تاریکی میں یہ سیاہ ہی نظر آتے۔ میں جو ٹوپیاں لایا تھا انہیں سر پر چڑھا کر دیکھا۔ یہ گردن تک آرہی تھیں۔ پھر ان میں آنکھوں والی جگہ بلیڈ سے کاٹ کر سوراخ کیے اور آخر میں کمرے میں تاریکی کر کے نائٹ ویژن لگا کر ایک دوسرے کا معائنہ کیا۔ چست سیاہ لباس اور سرتاپا سیاہ ہونے کی وجہ سے رات کی تاریکی میں نظر آنے کا امکان کم تھا اور آج رات بھی بادل ہوتے تو کام اور آسان ہو جاتا۔ ساوری نے جوتوں میں موزے پہن کر دیکھے اور وہ مطمئن تھی اب جوتے اسے فٹ تھے۔

ریہرسل سے فارغ ہو کر وہ باہر چلی گئی اور میں لیٹ کر آرام کرنے لگا مجھے ہوشیار کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ چار بجے واپس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں باہر نکلا تو وہ نہا دھو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس علاقے میں پولیس معمول کے مطابق ہے۔ ”ہم آرام سے انہیں دور تک چھوڑ کر آسکتے ہیں۔“

”گڈ تب ہم تاریکی چھاتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں انہیں شراب دے آتا ہوں۔“

”صرف دے کر نہیں آنی ہے انہیں پہلے کی طرح پلانی ہے۔ ورنہ وہ پینے کا دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔“

”تب تم بھی چلو۔“

ہم کوٹھری تک آئے۔ اس بار بھی ہوشیار دیسی شراب کی بوتل لایا تھا اور انہیں اس بار بھی پلانا پڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ٹن ہو گئے تھے۔ ہوشیار ان کی گاڑی لانے چلا گیا۔ میں اندر آیا۔ مجھے اب وسیم کی کال کا انتظار تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چھ بجے تک اس کی کال نہیں آئی تو میں اسے کال کروں گا۔ مگر پونے چھ بجے ہی اس کی کال آگئی۔ اس نے کہا۔ ”گوگل میپ پر یہ علاقہ نکالیں۔“

میں نے لیپ ٹاپ آن کر کے اس پر گوگل میپ پر سرحدی علاقہ نکالا اور وسیم کو آگاہ کیا۔ ”نکال لیا۔“

”اس میں فیروز پور روڈ پر دیکھیں۔ دریا کراس کرنے کے لیے ایک پل ہے۔“

”بالکل ہے۔“

”یہاں دریا انڈیا کی حد میں ہے لیکن اس سے پیچھے چند سو گز کے بعد یہ گھوم کر پاکستان کی حد میں چلا جاتا ہے۔“

”ٹھیک۔“

”آپ نے اس جگہ آنا ہے۔ یہاں سے کراسنگ کرتے ہی آپ نشیب میں آجائیں گے اور انڈیا کی طرف سے محفوظ ہو جائیں گے۔“

”رہنمائی کیسے ہوگی؟“

”آپ نائٹ ویژن استعمال کریں گے اور ہماری طرف سے ایک انفرا ریڈ ٹارچ آپ کو گائیڈ کرے گی۔ لیکن خیال رہے یہاں انڈیا نے کسی زمانے میں بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں اور آپ نائٹ ویژن سے زمین دیکھ کر آئیں گے۔ جہاں بارودی سرنگ ہوگی وہاں اسپاٹ سا نظر آئے گا۔“

میں فکرمند ہو گیا۔ ”یہ خطرناک چیز ہے۔“

”اسی لیے میں نے نائٹ ویژن کا کہا ہے۔ سمجھ لیں صرف ایک فیصد خطرہ رہ جائے گا۔ آپ موبائل سے رابطے میں ہوں گے اور آپ کو گائیڈ کیا جائے گا۔“

”تم لوگ علاقے کی نگرانی کر رہے ہو گے؟“

”بالکل، کسی کی آمد سے ہم پہلے ہی خبردار ہو جائیں گے۔“

”وقت کیا ہوگا؟“

”رات بارہ کے بعد۔ آپ اشارہ ملنے پر روانہ ہوں گے لیکن بارہ تک بالکل تیار رہیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور وسیم نے کال کاٹ دی۔

موبائل چارج ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ہینڈ فری آزما کر دیکھا وہ بہترین کام کر رہا تھا۔ میں نے سم اس میں منتقل کر دی۔ سومیت نے آج بھی چائے پر اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم نے خواتین کو اندر بھیج دیا اور جیسے ہی تاریکی ہوئی باری باری ان تینوں کو لا کر کار

کی پچھلی نشست پر ڈھیر کر کے ان پر چادر ڈال دی تھی۔ اسلحہ اور رقم والے بیگ ڈکی میں رکھے۔ میرے مشورے پر ہوشیار نے گاڑی کی ان تمام جگہوں کو صاف کر دیا تھا جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ اس نے اس گاڑی کی ڈرائیونگ سنبھالی اور میں ہوشیار کی جیپ میں اس کے پیچھے تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے میرے دل میں خدشہ تھا کہ کہیں کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں اور ہماری روانگی کھٹائی میں پڑ جائے۔ اَن ہونیاں میرے آس پاس ہی رہتی تھیں۔

مگر سب آسانی سے ہو گیا۔ ان تینوں کو گاڑی سمیت لدھیانہ سے کوئی چالیس کلومیٹرز پہلے سڑک کے ساتھ چھوڑا۔ ان پر سے چادر ہٹا دی تھی اور سنگھیت کو اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ دیسی شراب کی خالی بوتل گاڑی میں ڈال دی اور اس کے دونوں پچھلے دروازے کھلے چھوڑ دیے تھے۔ اُمید تھی کہ پولیس جلد یا بدیر ان تک پہنچ جائے گی۔ ہم نو بجے تک واپس پہنچ گئے تھے۔ ہوشیار کسی قدر فکرمند مگر مطمئن بھی تھا میں نے اسے تسلی دی کہ پولیس ڈاکوؤں کی بجائے اس پر توجہ نہیں دے گی جب کہ اسے لوٹ کا مال بھی مل جائے گا۔ ان تینوں کی بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھانسی سے بچ گئے تب بھی ساری عمر جیل میں گزرے گی۔ لہٰذا اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کا کھانا دیر سے اور ہلکا کھایا تھا۔ پھر تھکن اور نیند کا بہانہ کر کے کمرے میں آ گئے۔ خود ہوشیار بھی تھکا ہوا تھا۔ وہ سومیت سمیت اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

رات دس بجے تک ایک بار پھر بادل آ گئے مگر آج گرج چمک نہیں ہو رہی تھی۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ اس میں نائٹ ویژن کا استعمال بہت مشکل ہو جاتا۔ گیارہ بجے ہم تیار ہونے لگے اور بارہ بجے تک ہم بالکل تیار تھے۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر وسیم کی کال آئی۔

''نکل جائیں اور پوائنٹ پر پہنچ کر مجھے اشارہ دیجیے گا میں کال کروں گا۔''

''چلو۔'' میں نے ساوی سے کہا اور ہم خاموشی سے مکان سے نکل آئے۔ عقبی حصے سے نکلنے کی بجائے ہم گھوم کر کھیتوں والی طرف آئے۔ نائٹ ویژن کی وجہ سے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں چار کلومیٹرز تک پیدل چلنا تھا۔ مجھے ساوی کی فکر تھی مگر اس نے کہا۔ ''میں چل لوں گی۔ ویسے بھی چلنا ہے بھاگنا تو نہیں ہے۔''

''ممکن ہے بھاگنا پڑے۔''

''تو بھاگ بھی لوں گی۔''

ہم ساڑھے بارہ بجے سرحد کے پاس تھے۔ یہاں انڈین سائیڈ پر انہوں نے ایک چمکنے والی بجلی لائن بنا رکھی تھی تاکہ مقامی لوگ سرحد سے ہوشیار رہیں اور غلطی سے بھی پار نہ جائیں۔ ہم حسین والا بارڈر روڈ کراس کر کے یہاں تک آئے تھے۔ علاقہ صاف اور خالی تھا۔ یہاں نہ تو آبادی تھی اور نہ کھیت تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے وسیم کو مس کال دی اور اس نے مجھے کال کر لی۔ ''ہم پہنچ گئے ہیں۔''

''رائٹ آپ دونوں نظر میں ہیں۔ کراس کر کے اس طرف آئیں اور دریا کے کنارے تک بہت احتیاط سے زمین چیک کر کے چلیں۔ ساوی آپ کے پیچھے ہے۔ دریا پار دیکھیں روشنی نظر آ رہی ہے۔''

دریا پار سرخ روشنی بار بار جل بجھ رہی تھی۔ ''ہاں نظر آ رہی ہے۔'' میں نے کہا اور ساوی کو ہدایت کی۔ ''تم ٹھیک میرے نقش قدم پر مجھ سے دس قدم پیچھے چلو گی۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''یہاں بارودی سرنگیں ہیں۔ زمین کو غور سے دیکھتی رہنا کوئی سپاٹ الگ سے دکھائی دے تو سمجھ لینا یہ بارودی سرنگ ہے۔''

ساوی نے سر ہلایا۔ میں جھکے جھکے آگے بڑھا۔ وسیم نے کہا۔ ''سو گز کا ٹکڑا خطرناک ہے دریا میں اتر کر بائیں طرف مڑ جائیے گا پانی ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔''

اس طرح جھکے جھکے چلنا آسان نہیں تھا میں نظر جما کر زمین بھی دیکھ رہا تھا۔ اپنے آس پاس کی نگرانی میں نے وسیم کے سپرد کر دی تھی جو یقیناً سرحد پار سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے دریا کی ڈھلان پاس آ رہی تھی میرے دل کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ ساوی ٹھیک میرے پیچھے تھی اور اس کے لیے اس طرح جھک کر چلنا زیادہ مشکل کام تھا۔ بالآخر ہم دریا کی ڈھلان تک پہنچ گئے۔ وسیم نے تصدیق کی۔ ''آپ ڈھلان پر ہیں۔''

میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ ہم نے کسی دشواری کے بنا ایک طرف سے سرحد پار کر لی تھی۔ اسی لمحے میرا پاؤں کسی چیز پر گیا اور کلک کی آواز آئی تھی۔ میرا تیز رفتاری سے دھڑکتا دل تھم گیا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قرنین

(آفاق حیدرآباد کا جواب)

نسرین امتیاز۔۔۔۔حیدرآباد

عید کے دن اداس ہے گھر میں
ایک بیوہ غریب روتی ہے
اس کا بچہ یہ پوچھ بیٹھا تھا
عید بنگلوں ہی میں کیوں ہوتی ہے

(ذیشان احمد نواب شاہ کا جواب)

ماہ رخ۔۔۔۔۔۔۔تقسیر کالونی حیدرآباد

نشان منزل جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوق جستجو اپنا

(عارف ممتاز میانوالی کا جواب)

حکیم سید محمد رضا شاہ۔۔۔۔۔۔۔روکھڑی موڑ

موت کی آخری ہچکی کو ذرا غور سے سن
زندگی بھر کا خلاصہ اسی آواز میں ہے

(امجد حبیب راولپنڈی کا جواب)

نذیر حسن عابدی۔۔۔۔۔۔۔۔لاہور

یہ ڈاکے کیوں یہ تمنائے خودکشی کیسی
نوید صبح ہے قلب عوام کی دھڑکن

نوید صبح دین۔۔۔۔۔۔۔جہلم

یہ حادثہ سر ساحل رلا گیا سب کو
بھنور میں ڈوبنے والوں کے ہاتھ بھی ہیں

انتصار حسین۔۔۔۔۔۔۔ایبٹ آباد

یہ سوچ کر پلکوں میں چھپا لیتا ہوں آنسو
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں

نگار صہبائی۔۔۔۔۔۔۔کراچی

یہ زندگی تو کسی اور کی بخشی ہوئی امانت ہے
ہم تو صرف سانسوں کی رسم ادا کرتے ہیں

(انجم لاہور کا جواب)

مظہر علی خان۔۔۔۔۔۔۔۔لاہور

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

(یاسین مشتاق لاہور کا جواب)

ایم افضل گھرل۔۔۔۔۔۔ننکانہ صاحب

تیری تلاش میں میرا وجود بھی نہ رہا
مٹا گئی میری ہستی کو تمہاری آرزو

(عزیز الدین لاڑکانہ کا جواب)

منیر الحسن۔۔۔۔۔۔۔۔چنیوٹ

ان کا جنگل تھا ان کا قانون تھا
جس طرح جی میں آیا بدلتے رہے

نسیم احسان۔۔۔۔۔۔۔فیصل آباد

آ کسی خوف میں اتریں کسی غم کو اوڑھیں
کسی اجڑے ہوئے لمحے میں سجائیں خود کو

امتیاز احمد۔۔۔۔۔۔۔کوٹ سیداں

اس عمر میں خوش فہمیاں اچھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو وعدوں کے حوالے نہیں کرنا

قاضی شرف۔۔۔۔۔۔۔۔معروف حیدری

اپنے حالات سے میں صلح تو کر لوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مر جائے گا

(نورین اصغر وہاڑی کا جواب)

پروین اختر۔۔۔۔۔۔۔حاصل پور

یہ اور بات کہ دل کی اجاڑ بستی میں
تیرا خیال گل تر دکھائی دیتا ہے

نصیب خان۔۔۔۔۔۔۔کوئٹہ

یہ تیرہ ہی تو ہے اپنی زمین کا ہم کو
بھنور میں ہوتا کہیں ہے اگر خبر کرتی

انیس الرحمٰن۔۔۔۔۔کوٹ ادو

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن

نسیم الدین۔۔۔۔۔ خان پور

یوں تو چہرے ہزار تھے لیکن
ایک چہرے کو آشنا رکھنا

(انجم ریاض لاہور کا جواب)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مُکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مُکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

گلزار۔۔۔۔۔۔۔۔۔پشاور
زندگی جب اسی مشکل سے گزر گئی غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
(محمد عزیز مئے لندن کا جواب)

انجم سہیل۔۔۔۔۔لاڑکانہ
ان کے سروں پہ کاش سلامت رہیں سدا
ملت کی بیٹیوں کی رداؤں کی خیر ہو

نیاز کھوکھر۔۔۔۔شیخوپورہ
اس کے قریب جاؤں
اس تک نہ پہنچ پاؤں

نظام الدین۔۔۔۔لاہور
آ بسیں جو آنکھ میں صورت دل وجاں بن گئی
جو لگا اچھا ہمیں وہ عمر بھر اچھا لگا

دریاب خان۔۔۔۔کراچی
ایسے جیون میں کہیں اپنے تصور میں ہی سہی
آنے جانے کی اجازت ہی مجھے دے جانا
(جاویدہ صدیقی فیصل آباد کا جواب)

ارباب خان۔۔۔۔جھنگ صدر
قتل حسین روز کا معمول بن گیا
دنیا میں آج بھی ہے حکومت یزید کی
(نسیم الہیٰ ملتان کا جواب)

مرزا ہادی بیگ۔۔۔۔۔حیدرآباد
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
(اکرم علی بھٹو میرپور خاص کا جواب)

شکیل الرحمٰن۔۔۔۔کھاریاں
تیرے لہجے کی تھکن میں تیرا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آ گئی دوست
(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

اسماعیل رند۔۔۔۔مظفر گڑھ
یہ بھی کیا امن کا معیار بنا رکھا ہے
شاخ زیتون کو تلوار بنا رکھا ہے

روبینہ زیدی۔۔۔۔ملتان
یادوں کے کاغذ پہ لکھیں اشکوں سے میں دل پہ
شعر و ادب کی دنیا ورنہ کون سی دیکھی بھالی ہے

احمد یار خان۔۔۔۔کراچی
یہ لوگ کراچی کے کیا ہیں دیوانے ہیں فرزانے ہیں
کیا ہوش سے بیگانے ہیں سیدھے ہیں انجانے ہیں
(مرزا ہادی بیگ حیدرآباد کا جواب)

ارباز خان۔۔۔۔کوئٹہ
وہی شب ہے جو کہ ٹھہر گئی
مرے بے ہنر تجھے کیا خبر

نسیم بھٹو۔۔۔۔لاڑکانہ
وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
انہیں کہیں سے بلاؤ بڑا اندھیرا ہے
(نوشین عارف فیصل آباد کا جواب)

منشی محمد عزیز مئے۔۔۔۔لندن
ادا سمجھوں حیا سمجھوں یا اظہار وفا سمجھوں
تیری ہر مسکراہٹ مجھ سے پہچانی نہیں جاتی
(منشی عزیز مئے لندن کا جواب)

حمیر حسین۔۔۔۔راولپنڈی
ہنسنا عذاب تھا کبھی رونا عذاب تھا
سچ پوچھیے تو دوستو ہونا عذاب تھا

نازیہ نوشین۔۔۔۔کوٹ ادو
ہو کے دھرتی پہ عرش پہ ہونا
ایک جنت ہے بے خبر ہونا
(نزہت گل کا جواب)

طالب حسین طور۔۔۔۔ملتان
اک قیامت ہے کہ ہر شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا کہیں نقشہ میری تنہائی کا
(منشی عزیز مئے لندن کا جواب)

محمد عقیل چیمہ۔۔۔۔حافظ آباد
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہوتا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
30 اگست 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

30 اگست 2014ء

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اگست 2014ء تک علمی آزمائش 135 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت،

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

جلال الدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے) 66

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

علمی آزمائش۔ 105

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان سے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کا سوال

قرآن پاک میں شہر سوئز کے قریب کے ایک سمندر کا ذکر سورہ اعراف آیت 16۔ طہ 5-4-12 قصص 1-4 میں آیا ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے لیے یہ نام حیرت انگیز تھا مگر آج سائنس کہتی ہے کہ دنیا بھر کے سمندر میں سب سے ٹھہرا ہوا پانی یہیں ہے اور اس وجہ سے اس کا نام بھی ہونا چاہیے تھا۔ قرآن پاک میں اس سمندر کے حصے کو کس نام سے یاد کیا گیا ہے؟ وہ دو حرفی نام ہے۔۔۔۔۔؟

علمی آزمائش 103 کا جواب

دریائے فرات کے مغربی کنارے واقع ایک مشہور شہر کوفہ ہے جسے فارس کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں سپاہیوں نے آباد کیا تھا تاکہ فارس کے باغی اگر کبھی حملہ کریں تو انہیں روکا جائے۔ اس شہر کے قریب کبھی شہر بابل ہوا کرتا تھا جو کھنڈر میں تبدیل ہو کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ ابوالعباس نے 750 ہجری میں اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس دوران یہ شہر بہت بارونق تھا اور تجارتی و مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ اس شہر کو علمی مرکز ہونے کا بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کی رسم الخط نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ اس شہر کوفہ کو کئی اور وجہ سے بھی شہرت حاصل ہے۔

انعام یافتگان

1۔ نسیم جوکھیو، ہالہ نیو 2۔ زاہد شیرازی، ملتان 3۔ باقر علی اصفہانی، کراچی

4۔ کنول، حیدرآباد 5۔ بی بی شیریں خان، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عمران جوانی، محمد احمد (سلمان فارسی ٹیپر) سید عزیز الدین، عطیہ نورین، فرید الدین بلوچ، نہال قیوم، شکیل اعظم، اشرف سائیں، حمید اختر، قمر عباس، کوکب فاروقی، شازمین ظفر اسماعیل، رضوان احمد ہاشمی نصرت حسین۔ اسلام آباد سے فتح دین، ناصر اختر ناصر، ممتاز الدین شیخ، عباد انصاری، نسیم بٹ، نعمان شاہ، انور یوسف زئی۔ مظفر گڑھ سے خاقان خان، جان محمد عباسی، زاہد سونگی، احمد توحید، ساجد انور، وجاہت مرزا، اسد علی، عبدالرؤف کھتری، دانش قریشی، عثمان عثمانی، نشاط خان، میر جاوید میر، ظفر انجم، بلقیس عثمانی، سعید حیدر، انجم پرویز، افتخار علی، رابعہ اختر، پروین بھٹو، نعمان اشرف، ملک محمد اعجاز۔ لاہور سے امروز اسلم ملک، منظر علی خان، امروز اختر، ثاقب نعیم، محمد چھتو، محمد احسن، نواز کبیر، عبدالخالق چوہان، چوہدری رب نواز، زینت جہاں، کائنات مرزا، توسیف بارہوی، عنبرین اختر، بشریٰ خالق، نیاز چوہان، یاسمین فرحت۔ تونسہ شریف سے میاں جمال محمود، نعمان شہزاد۔ ملتان سے محمد محسن چشتی، گل باز خان، خالد آفریدی، ذکیہ حسین، نفیسہ جمال، رخسانہ یاسمین، فوزیہ اختر، الطاف گھمن، حسن محمود۔ بہاولپور سے سید محمد شفیق (شاہدرہ) نواز علی، مہوش خان، جعفر افتخار۔ بہاولنگر سے صغراں بیگم، اطہر احمد لاشاری، افضل ابڑو، فرید عباسی، محمد ارشاد ظفر حسین۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ، انعام اللہ، ماہ رخ، نسیم امتیاز انصاری، زریاب فرحان، اقرا مظہر، مومن خان، مشتاق احمد، نسرین قریشی، فصاحت اللہ، انورین ایاز۔ کوئٹہ سے عبدالقادر، فصیح الدین، نواز بلوچ، فخر الدین لاشاری، سید محمد رضا کاظمی۔ میر پور خاص سے ضوریز اختر (سیٹلائٹ ٹاؤن)۔ عقیل احمد، تہذیب منصور، فتح الباری، عنایت اللہ، آغا مظہر، ذیشان قزلباش، مرزا استار بیگ، مرزا ہادی بیگ۔ ٹنڈو آدم سے انعام الحسن، ناصر زیدپوری، انصار حسین، احمد صفی افتخار۔ فیصل آباد سے امتیاز حسن، قمری اعوانکہ۔ میر پور آزاد کشمیر سے نیاز بھٹ، افتخار احمد، محمود نیاز، فتح الباری، محمد توقیر، ارشاد حسین، فہیم الدین، ناصر حسین، خان محمد خان۔ قاسم خان، قمبر حسن، غلام حسین، نازش خان۔ ڈوب وچشتیاں سے تقی چنگیزی، نصرت اللہ، محمد سالکین، دردانہ قمر، احباب خان۔ میرپور آزاد کشمیر سے محمد ہارون۔ خیرپور میرس سے سید تقی زیدی، گل لیاقت۔ سکھر سے ارشد ولی محمد، بشریٰ اصغر، مسکان علی، سلمان منگریو۔ شیخوپورہ سے چوہدری اللہ دتہ، کائنات علی، سفیر احمد، سید ساحل۔ گجرات سے نعمان سعید۔ جہلم سے محمد تنویر، کمال اللہ خان، کاشف خان، وردہ بتول، سعید احمد۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی، محمد ہارون، اسما حیدر، فیروز رحمانی۔ سوئی (ڈیرہ بگٹی) سے خاقان احمد، عنایت قمر۔ کوٹ ادو سے طیب احمد، صالح احمد۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، جویریہ حلیم احمد، محمد سعید اقبال، مصباح الرضا۔ کوہاٹ کینٹ سے ڈاکٹر مدثر سجاد، احمد علی، نیاز خان۔ وہاڑی سے شیخ محمد عزیز حسنے، گلشن خورشید احمد کنول (لڈن) محمد اقبال راے (بوریوالہ)۔ جامشورو سے منصور احمد، مجاہد علی، زینت جوکھیو۔ مظفر گڑھ رانا محمد سجاد (نواں شہر) ارباب رضا، عندلیب احمد، فاخرہ یاسمین۔ ٹھٹھہ سے ملک جاوید محمد خان سرگانی (بروزئی)۔ ڈی جی خان سے سجاد احمد جے ایس، جمیل چیمہ، سعدیہ گل، شمس اصغر۔ ڈی آئی خان سے محمد اکبر، مدیحہ ناز، ساجد علی، عابد علی، رخسانہ اکمل۔ رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، مظہر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ۔ لیہ سے نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ نگار افروز، اقبال حسن، فہیم آزاد، ذیشان حیدر، بہادر علی۔ بہاولنگر سے سید حسن، غازی اختر، تبسم زہرہ، نیاز احمد، قطب الدین احمد۔ سرگودھا سے ظفر اقبال جاوید (سلانوالی) اقرا سلطان، شائلہ سلطان۔ ساہیوال سے محمد افضل، منظور حسین قادری، طاہر علی، انعام اللہ، سبطین آغا۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، اشرف خان، دردانہ خان۔ جھنگ سے عطا المصطفیٰ، فہد علی، عدنان رفیع، کاظم علی سید۔ میانوالی سے ندا خالق (عیسیٰ خیل) حکیم سید محمد رضا شاہ (نورنگ روکھڑی)۔ ٹنڈو جان محمد سے قمری اعوانکہ۔ تلہ گنگ سے تنویر حسین، فصاحت عثمان۔

ممالک غیر سے اشرف سلطان (بیڈ فورڈ انگلینڈ) سلمان فردوس۔ عقیل صدیقی۔ زونی کشمیری (العین) ساجد علی پاکستانی (دمام) امیر صادق، سلمان اشرف، کنیز زینب، اشرف زیدی (شارجہ) صبیحہ وقار (ٹوکیو جاپان) سعادت علی خان (ہمبرگ) سلمان منگریو (اوہاما) وکیل قریشی (اومان)۔

آخری راستہ

محترمہ عذرا رسول!
السلام علیکم!

امید تو یہی ہے بخیریت ہوں گی۔ ہمارے ہاں برادری سسٹم رائج ہے اور اس سسٹم میں زیادہ مردوں کا غصہ، انا کا سوال۔ اس کا خمیازہ عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اگر ہوسکے تو میری اس روداد کو شائع کردیں تاکہ لوگوں کو ہوش آئے کہ غصے کی وجہ سے کس طرح عورتوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

رباب
(حیدرآباد)

* * *

جیسے ہی کوچ کراچی سے نکلی مجھ پر قنوطیت چھانے لگی تھی۔ میرا دل مرجھا گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ کہیں کوچ سے اتر جاؤں۔ شاید برابر میں امی نہ ہوتیں تو میں یہی کرلیتی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہم کوچ سے حیدرآباد جارہے تھے۔ جہاں ایک متوسط علاقے میں ہماری رہائش ہے۔ گھر میں میرے علاوہ امی بابا اور میرے دو بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ میں اور امی کراچی میں خالہ کے گھر آئے ہوئے تھے۔ حیدرآباد سے بابا نے ہمیں کوچ میں بٹھا دیا اور یہاں کراچی میں میرے خالو بس اڈے پر موجود تھے۔ ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار کراچی آچکی تھی لیکن اس بار کا مزہ ہی الگ تھا۔ خالہ کے دو بچے ہیں۔ بڑے صائم ہیں جو چار سال سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں، وہ وہاں پڑھ رہے ہیں اور ان کو وہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے۔ ان سے چھوٹی علیجا میرے برابر ہی ہے۔ ہم دونوں نے اتفاق سے اسی سال گریجویشن کے پیپر دیے تھے۔

میں فارغ تھی اس لیے امی کے ساتھ کراچی آگئی۔ امی کو اپنی بہن سے بہت محبت ہے اور وہ سال میں تین چار بار لازمی ان سے ملنے آتی ہیں۔ خالہ بہت سالوں بعد ہمارے ہاں آئی ہیں۔ بابا اور بھائی خالہ کے گھر بالکل نہیں جاتے کیونکہ برسوں پہلے بابا کا خالو سے کسی بات پر جھگڑا ہوا اور آج تک ان کے درمیان بات چیت بند تھی۔ خالو بھی ہمارے ہاں نہیں آتے تھے اسی طرح صائم بھی کبھی نہیں آئے تھے البتہ علیجا خالہ کے ساتھ دو بار آئی تھی اور میں تو امی کے ساتھ بہت بار خالہ کے ہاں جاچکی تھی۔ خالو کے ڈی اے میں آفیسر تھے۔ ان کی رہائش گلشن اقبال کے ایک خوبصورت علاقے میں تھی۔ یہاں درمیانے سائز کے بنگلے ہیں اور صاف ستھرا پوش علاقہ ہے۔ خالہ کا اپنا بنگلا ہے جو پارک کے سامنے ہے۔ یہاں پڑھے لکھے اور مہذب لوگ رہتے ہیں۔ جب بھی ہم یہاں آتے تو عام طور سے رات کو ٹہلنے اور ہوا کھانے کے لیے پارک چلے جاتے تھے۔

میں نے ایک بار امی سے پوچھا کہ بابا اور خالو میں کیا اختلاف ہے؟؟ امی نے بتایا کہ غلطی بابا کی تھی۔ اصل میں بابا بہت غصیلے اور سخت طبیعت کے مالک ہیں۔ امی سے محبت کی شادی کی، اس کے باوجود بعض اوقات ان پر بھی غصہ ہوجاتے ہیں اور ایسے میں جو منہ میں آئے بولتے جاتے ہیں۔ امی ان کی فطرت سمجھتی ہیں اس لیے خاموش رہتی ہیں۔ جب بابا کا غصہ اتر جاتا ہے تو وہ امی کو منا لیتے ہیں لیکن وہ معافی نہیں مانگتے۔ معافی مانگنا یا شرمندہ ہونا ان کی

سرشت میں نہیں ہے۔ اصل میں بابا کا تعلق اندرونِ صوبے کے ایک قبائلی علاقے سے ہے۔ وہاں کے رسم و رواج اور خاص طور سے عورتوں کے حالات اتنے سخت ہیں کہ میں نے سن کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بھی میرا دم گھٹتا تھا مگر ہم یہاں باہر تو نکل سکتے تھے۔ میں نے بابا کے نہ چاہنے کے باوجود کالج سے گریجویشن کیا تھا۔ اس کی اجازت مجھے امی نے دلوائی ورنہ بابا اور ان سے بھی زیادہ بھائی تو اس کے بالکل حق میں نہیں تھے۔ ایک بار وہ خالو کے سامنے امی کو سنا رہے تھے اور خالو نے درمیان میں مداخلت کر دی اور بابا اس پر ان سے لڑ پڑے۔

میرے دونوں بڑے بھائی انور اور منور پڑھے لکھے ہیں۔ انہوں نے بھی گریجویشن کیا ہے مگر ان کی ذہنیت بابا سے بھی زیادہ قبائلی ہے۔ بابا تو سترہ سال کے تھے جب کراچی آئے اور انہوں نے وہاں کالج میں تعلیم حاصل کی۔ پھر جاب کرنے لگے تھے۔ وہیں امی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں میں پسندیدگی ہوئی اور بابا نے امی کے والدین سے رشتے کی بات کی۔ انہوں نے صاف بتا دیا تھا کہ ان میں ذات برادری سے باہر رشتہ نہیں ہوتا ہے اس لیے ان کی طرف سے کوئی نہیں آئے گا۔ اگر وہ اکیلے انہیں رشتہ دینا چاہیں تو یہ شادی ممکن ہے۔ امی کے والدین نے امی کی پسند دیکھی اور انہوں نے بابا کو ہاں کر دی۔ بابا سادگی سے برات لے کر آئے اور امی کو بیاہ کر لے گئے۔ دو سال بعد وہ حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں انہوں نے آٹو شاپ کا کاروبار کر لیا تھا۔ چند سال میں کاروبار جم گیا۔ بابا چاہتے تو حیدرآباد کے کسی اچھے علاقے میں مکان لے سکتے تھے مگر اس جگہ ہماری برادری کے لوگ آباد تھے اس لیے بابا نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔

حیدرآباد کے اس محلے میں آنے کے بعد امی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ بابا کی برادری کس قسم کی ہے۔ وہ آج کے جدید دور میں بھی وہی قبائلی سوچ رکھتے تھے۔ جہالت اور تنگ نظری تھی۔ آپس میں لڑائی جھگڑے تھے اور عورت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسے تعلیم اور پسند کی شادی کا حق نہیں تھا۔ خاص طور سے پسند کی شادی کا حق تو بالکل نہیں تھا۔ اگر کوئی لڑکی یہ حق استعمال کرنا چاہتی تو اسے دلہن کے سرخ جوڑے کی بجائے سفید کفن نصیب ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ رہنے والے ایسی سوچ رکھتے تھے تو ان لوگوں کے بارے میں سوچیں جو اندرونِ صوبہ آباد تھے۔ یہاں بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ دس میں سے ایک ہی لڑکی اسکول جاتی تھی اور کالج جانا تو بہت ہی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں اسکول کے بعد کالج جانے لگی تو اس پر بہت باتیں ہوئی تھیں۔ بابا تو ایک بار فیصلہ کر کے خاموش ہو گئے تھے مگر بھائی کہنے والوں کی باتوں پر مشتعل ہو جاتے اور بابا امی سے کہتے کہ مجھے کالج سے نکال کر گھر

بٹھائیں۔

جب میں چھوٹی تھی تب بھی ہمارے گھر کا ماحول گھٹا ہوا اور خاموش سا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بابا مجھ سے محبت کرتے تھے مگر جیسے باپ بیٹیوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں ایسا انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ ہماری برادری میں بیٹیوں سے تقریباً سب ہی ایسا برتاؤ کرتے تھے بلکہ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس لیے مجھے پتا بھی نہیں تھا لیکن جب میں چھ سال کی تھی تب پہلی بار امی کے ساتھ خالہ کے گھر گئی تھی۔ اس سے پہلے بابا مجھے کبھی جانے نہیں دیتے تھے۔ امی کو بھی بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ خالو سے جھگڑا میری پیدائش کے بعد ہی ہو گیا تھا اس لیے میں نے زندگی میں پہلی بار خالہ، خالو اور ان کے بچوں کو دیکھا تھا۔ چھوٹی ہونے کے باوجود میں نے کچھ دیر میں جان لیا تھا کہ ان کے گھر کا ماحول ہمارے گھر سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ماحول کھلا، روشن اور محبت سے بھرپور تھا۔ ہمارے ہاں جب بابا گھر آتے تو ہم بہن بھائی کس قدر سہم جاتے اور باادب ہو جاتے۔ بابا کے ہوتے ہوئے کوئی اونچی آواز میں نہ تو بات کرتا تھا اور نہ ہی ہنستا بولتا تھا۔ بھائی بھی بچپن سے بابا کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

اس کے برعکس جب خالو گھر آتے تو ان کے بچے کھل جاتے تھے۔ صائم اور علینا دوڑ کر خالو سے لپٹ جاتیں اور وہ ان کو پیار کرتے اور ان کے بارے میں پوچھتے تھے۔ خالہ اور خالو کی شادی ارینج تھی اس کے باوجود ان میں جو محبت اور آپس کا تعلق تھا وہ میں نے امی ابو میں کبھی محسوس نہیں کیا حالانکہ ان کی تو محبت کی شادی تھی۔ صائم اور علینا خالو کی غیر موجودگی میں جتنے شوخ ہوتے تھے ان کے آنے کے بعد تو اس سے بھی زیادہ شوخی اور شور شرابے پر اتر آتے تھے۔ خالو برا ماننے یا انھیں ڈانٹنے کی بجائے ان کا ساتھ دیتے تھے۔ خالہ ان سے کہتیں کہ آپ بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے ہیں اور میں حیرت سے سوچتی کہ کیا باپ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت مجھے شدت سے اپنے گھر کے گھٹے اور بوجھل ماحول کا احساس ہوتا اور میں دل سے دعا کرتی کہ اللہ ہمارا گھر بھی ایسا ہی کر دے۔ مگر میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کا ماحول خراب سے خراب ہوتا چلا گیا۔ بابا پہلے سے زیادہ غصہ کرنے لگے تھے اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے۔ بھائی جو مزاج میں ان کے قریب تھے ان کے غصے سے ڈرتے تھے اور جب بابا کو غصہ آتا تو وہ گھر سے کھسک جاتے۔

گھر میں اور امی کہاں جاتیں؟ ہم گھر میں ہوتے تھے اور بابا کا سارا غصہ ہم پر اترتا تھا۔ ہم خاموشی سے سننے پر مجبور تھے۔ امی کا تعلق کیونکہ برادری سے نہیں تھا اس لیے بابا کا خاندان تو ایک طرف رہا برادری کی عورتیں بھی امی سے بہت کم ملتی تھیں۔ پچیس سالوں میں چند ایک گھروں میں ہی امی کا آنا جانا ہوا تھا اور وہاں بھی وہ کئی دنوں میں ایک آدھ بار جاتی تھیں۔ اسی طرح یہ عورتیں بھی بہت کم ہمارے ہاں آتی تھیں۔ جب میں چھوٹی تھی تب میری چند ایک سہیلیاں تھیں۔ لیکن جب دس سال کی ہوئی تو میرے بلا وجہ گھر سے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔

دس سال کی عمر کے بعد میں یا تو اسکول جاتی تھی یا پھر امی اور بابا کے ساتھ کہیں نکلتی تھی۔ خاص طور سے محلے میں امی کے ساتھ ہی آتی جاتی تھی اور تب ہی مجھے اپنی عمر کی لڑکیوں سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ مگر جیسے جیسے میں آگے بڑھتی گئی تو ان لڑکیوں سے میرا ذہن ہٹنے لگا۔ ان میں سے کوئی بھی تعلیم یافتہ نہیں تھی صرف ایک لڑکی نے چار جماعت تک پڑھا تھا اور اس کے بعد اسے گھر بٹھا لیا گیا تھا۔ وہ بھی خوش تھی کیونکہ پڑھنا اسے پسند ہی نہیں تھا۔ مجھے پڑھنا پسند تھا۔ صرف نصابی تعلیم ہی نہیں بلکہ میں اس کے علاوہ بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر ہمارے گھر میں ایسی کسی چیز کی سختی سے ممانعت تھی۔ حد یہ کہ بابا بچوں کے رسائل کے قائل بھی نہیں تھے۔ اس لیے میں اپنا شوق اسکول میں پورا کر لیتی تھی۔ وہاں لڑکیوں کے پاس رسائل اور کتب ہوتی تھیں۔ آدھی چھٹی میں جب دوسری لڑکیاں کھانے پینے اور کھیلنے یا گپوں میں مصروف ہوتی تھیں تو میں کلاس میں بیٹھی کوئی نہ کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ رہی ہوتی تھی۔

پڑھنے میں تیز تھی، میں نے صرف ساڑھے چودہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان دیا اور جب میرا رزلٹ آیا تو میں اس وقت پندرہ کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے امتحان میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کی جس کی مجھے بھی امید نہیں تھی۔ میں نے حیدرآباد بورڈ میں ساتویں اور لڑکیوں میں چوتھی پوزیشن لی تھی۔ اس پر میرے اسکول والوں نے ایک خصوصی تقریب منعقد کی تھی اور اس میں ایک صوبائی وزیر کو بھی بلایا تھا۔ بابا صرف وزیر کا سن کر چلے گئے ورنہ ان کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وزیر نے مجھے انعام اور شیلڈ کے

ساتھ بہت شاباشی بھی دی اور بابا سے کہا کہ وہ مجھے آگے بھی تعلیم دلائیں۔ اگرچہ بابا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اس وقت ان کے منہ سے نکل گیا۔ "کیوں نہیں سائیں اگر میری بچی آگے پڑھنا چاہے گی تو میں اسے ضرور پڑھاؤں گا۔"

میں نے اور امی نے بابا کے یہی الفاظ پکڑ لیے اور ان سے مطالبہ کیا کہ مجھے کالج میں داخل کرائیں۔ بابا نہیں مان رہے تھے اور بھائی تو بالکل بھی تیار نہیں تھے مگر امی نے نہ جانے کیسے بابا کو منالیا۔ مگر جب میں کالج جانے لگی تو بابا اور بھائیوں نے مجھ سے کھل کر کہا کہ اگر میں نے کہیں ان کی عزت کو بٹا لگایا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ اچھا نہیں کیا ہوگا۔ ہماری برادری میں ایسی باتوں پر قتل سے کم بات نہیں ہوتی تھی۔ اول تو پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اگر لڑکی کسی کے ساتھ فرار ہو جائے تو اسے اور لڑکے کو تلاش کرکے باقاعدہ جرگے کی مدد سے سزا دی جاتی تھی۔ اگر لڑکا اور لڑکی ہاتھ نہیں آتے تھے تو ان کے گھر والوں کو سزا ہوتی تھی اور یہ سزا عام طور سے لڑکی کے بدلے لڑکی یا پھر بھاری مالیت کا جرمانہ ہوتا تھا۔ میں سن کر رہ گئی کیونکہ میری طرف سے کسی قسم کی یقین دہانی کی بابا اور بھائیوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔

جب میں نے انٹر کیا تب بھائیوں نے ایک بار پھر زور دیا کہ مجھے گھر بٹھا لیا جائے بلکہ میری شادی کر دی جائے۔ یہ مطالبہ سن کر میری جان نکل گئی۔ کیونکہ مجھے برادری میں ہی رشتہ ملتا اور یہاں سب مرد ایک جیسے ہی تھے۔ میں بابا کے گھر سے نکل کر کسی ایسے ہی یا اس سے بھی بدتر ماحول والے گھر میں جا سکتی تھی لیکن بہتری کی امید نہیں تھی۔ میں نے رو دھو کر اور امی کے پیچھے پڑ کر بابا سے کسی نہ کسی طرح بی اے کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ پتا نہیں امی نے کیسے ان سے یہ بات منوائی مگر اس کے بعد بابا کا موڈ بہت دن تک خراب رہا تھا وہ مجھ سے بات کرتے ہی نہیں تھے اور امی سے کرتے تب بھی ان کا لہجہ سخت ہوتا تھا۔ بھائی مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف، دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا انہوں نے میری تعلیم کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اگر وہ بابا پر ذرا بھی حاوی ہوتے تو لازمی مجھے گھر بٹھا دیتے۔

بہت دنوں بعد بابا کا موڈ ٹھیک ہوا تھا تب انہوں نے امی کو کراچی جانے کی اجازت دی مگر میرے لیے منع کر دیا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے میرے لیے کیوں منع کیا ہے۔ میں امی کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر اجازت نہ ملنے پر تڑپ کر رہ گئی۔ واپس آنے کے بعد امی نے ایک دن میرے پوچھنے پر چپکے سے بتایا کہ خالہ کی خواہش تھی کہ وہ مجھے صائم کے لیے لے جائیں۔ مگر جب امی نے ابو سے یہ بات کی تو وہ اتنے غصے میں آگئے کہ امی کو ڈر لگا کہ کہیں طلاق نہ دے دیں۔ برادری سے باہر شادی اگر مرد کے لیے گناہ صغیرہ تھی تو عورت کے لیے گناہ کبیرہ تھی۔ گناہ تو اللہ معاف کر دیتا ہے لیکن اس کی تو معافی بھی نہیں تھی۔ پھر انہوں نے امی سے کہا کہ اب انہوں نے یہ بات دوبارہ کی تو ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا اور اس کے بعد ہی ابو نے مجھے امی کے ساتھ خالہ کے گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ان دنوں میں بی اے پارٹ ون میں تھی۔ پھر جن دنوں میرے امتحان ہو رہے تھے خالہ کے گھر سے اطلاع آئی کہ صائم نے اپنے ساتھ آسٹریلیا میں پڑھنے والی ایک پاکستانی لڑکی کو پسند کر لیا ہے اور جلد خالہ اس کے گھر رشتہ لے کر جا رہی ہیں۔

صائم اچھے خوش شکل اور گورے رنگ کے تھے۔ قد طویل تھا شاید چھ فٹ سے ذرا زیادہ تھا۔ لیکن میرے ننھیال میں سب کا قد طویل ہی ہوتا ہے۔ خود میں ننھیال پر گئی تھی اور میرا قد پانچ فٹ سات انچ تھا۔ میں کئی بار ان سے ملی تھی مگر ہمیشہ نارمل کزن ہی سمجھا تھا۔ وہ دو سال پہلے گریجویشن کے بعد آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ جب امی نے بتایا کہ خالہ مجھے لینا چاہ رہی تھیں تب بھی میں نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کا افسوس تھا کہ میں خالہ کے ہاں نہیں جا سکتی۔ مجھے ان کے گھر کا ماحول بہت پسند تھا۔ بہرحال جب صائم کی منگنی ہو گئی تب بابا کو اعتراض نہیں رہا اس لیے جب میں نے گریجویشن کے پیپر دے لیے تب مجھے بھی امی کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ علینا بھی فارغ تھی اور ہم نے مل کر خوب انجوائے کیا۔ صائم باہر تھے لیکن اکثر وہ اسکائپ پر گھر والوں سے رابطے میں رہتے تھے۔ بلکہ ان کا اسکائپ ہر وقت آن رہتا تھا۔

صائم نے ایم فل مکمل کر لیا تھا اور اب پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی جز وقتی جاب بھی کرتے تھے جس سے ان کو اتنی رقم مل جاتی کہ اپنا گزارہ ہو جاتا تھا۔ آسٹریلیا کی شہریت اتنی آسانی سے نہیں ملتی ہے لیکن صائم کو مل گئی تھی۔ ان سے بھی گپ شپ ہوتی تھی۔ موسم سرد تھا مگر خالہ اور خالو نے ہمیں ہر جگہ گھمایا پھرایا۔ ہم ساحل سمندر پر بھی

گئے تھے۔ ایک مہینا کیسے گزرا اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ جب ہم واپس جارہے تھے تو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کاش بابا مان جاتے اور میں آج خالہ کے گھر ہوتی۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ بابا کی برادری میں لڑکی باہر سے لائی جائے تو اسے پھر بھی مان لیا جاتا ہے، بے شک قبول نہ کیا جائے مگر لڑکی برادری سے باہر دینا کسی صورت قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والوں کو برادری اور علاقے سے نکال دیا جاتا ہے۔ ان کو پھر کوئی لڑکی نہیں دیتا اور نہ کوئی لین دین کیا جاتا ہے۔

انور بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ وہ پورے پانچ برس بڑے تھے۔ اس لیے ایک سال پہلے بابا نے ان کی برادری میں منگنی کردی۔ میری ہونے والی بھابی اریشا کا ایک بھائی تھا۔ ارشد معمولی پڑھا لکھا تھا اور موٹر سائیکلوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کی حیدرآباد میں ہی دکان تھی۔ جن دنوں میں بی اے فائنل کے پیپرز دے رہی تھی میرے کانوں میں کچھ ایسی باتیں پڑیں کہ شاید ارشد کے گھر والے مجھے مانگ رہے تھے۔ یعنی وٹے سٹے کا معاملہ تھا۔ مگر بابا اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک گھر میں آدمی ایک ہی رشتہ کرے تاکہ اگر ایک کا معاملہ خراب ہو تو دوسرے پر اس کا اثر نہ پڑے۔ اس سے مجھے اُمید ہوئی کہ یہ رشتہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ارشد مجھے زہر لگتا تھا۔ شکل صورت کا مناسب تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی گندگی تھی۔ وہ دو تین بار ہمارے ہاں آیا اور ہر بار سامنا ہونے پر اس نے جس طرح مجھے دیکھا تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

میں بس کی کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی کہ امی نے پوچھا۔ "رباب کیا سوچ رہی ہے؟"

"کچھ نہیں امی۔" میں نے بے دلی سے کہا پھر پوچھا۔ "امی آپ اور بابا کراچی میں نہیں رہ سکتے تھے، حیدرآباد میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

امی کچھ دیر خاموش رہیں پھر سرد آہ بھر کر بولیں۔ "میری بچی بات شہر کی نہیں ہے، ہمارے گھر کی ہے، یہ گھر کہیں بھی ہوتا اس کا یہی ماحول ہوتا اور یونہی دم گھٹتا۔"

امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بابا اور بھائیوں کے ساتھ ہم اگر امریکا یا یورپ کے کسی ملک میں رہتے تب بھی ہمارے گھر کا یہی ماحول ہوتا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں نے ضد کرکے گریجویشن کرلیا تھا مگر مجھے اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ امکان یہی تھا کہ مجھے کسی جاہل یا معمولی پڑھے لکھے سے بیاہ دیا جائے گا۔ بابا نے تو امی سے محبت کی شادی کی تھی اس کے باوجود وہ کس طرح رہ رہی تھیں۔ میرے ساتھ نہ جانے کیا ہوگا۔ ان ہی سوچوں میں سفر کٹ گیا اور بس اڈے پر منور موجود تھا۔ وہ گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ہمارے ہاں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک کمرشل تھی جو آئل سپلائی کرنے کے کام آتی تھی بابا اور بھائی عام طور سے اسے استعمال کرتے تھے۔ ایک کار تھی جو گھر کے کاموں اور آنے جانے کے لیے مخصوص تھی لیکن کبھی کبھی ضرورت ہوتی تو بابا اور بھائی دونوں گاڑیاں لے جاتے تھے۔

بابا اور انور کے مقابلے میں منور کا رویہ مجھ سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ وہ نارمل بات بھی کرتا تو ایسا لگتا جیسے ڈانٹ رہا ہو۔ اس کی نظریں ہر وقت یوں مجھے شک سے گھورتیں جیسے نہ جانے میں نے کیا جرم کردیا ہے۔ خاص طور سے جب میں کالج سے آتی اور وہ گھر میں ہوتا تو پانچ دس منٹ دیر سے آنے پر بھی لاتعداد سوالات کرتا تھا۔ بعض اوقات تو اس کے سوالوں سے زچ آکر میں رونے لگتی تھی مگر ہمارے گھر میں مردوں سے زبان چلانے یا جواب دینے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ منور غصے کا بہت تیز تھا اور امی بھی اس سے ڈرتی تھیں وہ خود صرف بابا سے ڈرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت بھی اس کا موڈ خراب تھا۔ اس نے بہ مشکل امی کو سلام کیا اور میرے سلام کا جواب دیے بغیر سامان کار کی ڈکی میں رکھنے لگا۔ راستے میں امی نے پوچھا۔ "منور گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے۔" اس نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ مگر امی اور میں کھٹک گئے تھے۔ کوئی مسئلہ تھا۔ ہم گھر پہنچے تو خلاف معمول بابا گھر پر تھے اور وہ فوراً ہی امی کو اندر لے گئے۔ اس سے میرا ماتھا اور ٹھنکا کیونکہ ہمارے ہاں کسی بھی معاملے میں عورتوں کو شامل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ انھیں صرف فیصلے سنائے جاتے تھے۔ ایسی کیا بات تھی جو بابا امی کو الگ لے گئے تھے۔ ایک گھنٹے بعد امی کمرے سے نکلیں تو ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ منور ہمیں گھر لاتے ہی باہر چلا گیا تھا۔ امی سے بات کرنے کے کچھ دیر بعد بابا بھی چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں امی کے پاس آگئی۔

"امی کیا ہوا ہے، بابا آپ سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں ہوا۔" امی نے مجھے ٹالنا چاہا مگر میں ان کے سر ہوگئی۔ اس گھر میں وہی ایک فرد تھیں جن پر میرا بس چلتا تھا اور میں ان سے ضد بھی کرلیتی تھی۔ آخر میں نے ان

سے اگلوا ہی لیا۔ امی نے انکشاف کیا۔

"منور... غیر برادری کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

یہ ہماری مخالف برادری تھی اور ان سے تو صرف خون وکشت کا رشتہ تھا شادی بیاہ کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسری حیرت مجھے اس بات پر ہوئی تھی کہ منور جو اس بارے میں اتنا بولتا تھا اور برادری سے باہر شادی کو گناہ قرار دیتا تھا وہ خود نہ صرف برادری سے باہر شادی کرنا چاہ رہا تھا بلکہ لڑکی بھی اس نے مخالف برادری کی چنی تھی۔ اگر یہ بات کھل جاتی تو اس پر بہت بڑا فساد ہو جاتا۔ ہمارے ہاں برادریوں کی لڑائی میں قتل ہونا اور کر دینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ میں بابا اور بھائیوں کے لیے پریشان ہو گئی۔ اگر منور کوئی الٹا سیدھا کام کر جاتا تو زد میں بابا اور بھائی بھی آ جاتے۔ میں نے امی سے بھی یہی کہا تو وہ بولیں۔ "مجھے بھی یہی ڈر ہے۔ تو جانتی ہے منور کتنا اکھڑ ہے۔"

"ہاں ویسے تو برادری کا راگ الاپتا تھا اور اب خود برادری سے باہر شادی کا کہہ رہا ہے، کیا اسے نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ لوگ بھی نہیں مانیں گے۔"

"بات ان کے ماننے کی نہیں ہے۔" امی نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "منور پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے تیرے بابا سے کہا ہے کہ وہ لڑکی کو لے کر بھاگ جائے گا اور اس سے کورٹ میرج کرے گا۔"

اس بار میں سچ مچ دہل گئی۔ "امی وہ اتنا خود غرض ہو گیا ہے اسے اپنے باپ بھائی کی بھی پروا نہیں ہے تو ہماری کیا ہو گی۔"

"میں نے کہا نا وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"بابا یا انور بھائی کچھ نہیں کر سکتے؟"

"انہوں نے سب کر کے دیکھ لیا ہے۔ اسے مارا تک ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے مر جاؤں گا مگر شادی اسی سے کروں گا۔"

منور کا تو نہیں پتا تھا لیکن اگر وہ اس لڑکی کو لے کر بھاگ جاتا تو ہم گھر والوں کی عافیت خطرے میں پڑ جاتی۔ یہ ایسا خطرہ تھا جس کے بارے میں سب جانتے ہیں کیونکہ میں بچپن سے یہی دیکھتی اور سنتی آئی تھی۔ ایسی باتوں پر قتل و خون ہی ہوتے تھے۔ خود ہمارے محلے میں کئی ایسے واقعات پیش آ چکے تھے۔ دو گھر چھوڑ کر ایک لڑکی حیدرآباد کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تو برادری والے اسے اور لڑکے کو کراچی سے پکڑ کر لائے اور اپنے علاقے میں لے جا کر جرگے میں انہیں سزا سنا کر اسی وقت اس پر عمل درآمد بھی کرا دیا۔ ان کو قتل کر کے ان کی لاشیں کسی خفیہ جگہ دفنا دی گئی تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ برادری کا ایک خفیہ قبرستان ہے جہاں ایسی ہی لاشوں کو دفنایا جاتا ہے اور ان میں اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ مرد عام طور سے بھاگ جاتے ہیں یا بھاری جرمانے دے کر بچ جاتے ہیں مگر عورت کے حصے میں صرف موت آتی ہے۔ اگر سزائے موت سے بچنے کے لیے جرمانہ کیا جاتا ہے تو عورت کی طرف سے کوئی ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور بالآخر اسے موت ہی نصیب ہوتی ہے۔

رات بابا اور انور آئے تو سب نے میٹنگ کی اور اس میں زندگی میں پہلی بار امی کو بھی شامل کیا گیا۔ منور نہیں آیا تھا۔ پھر وہ رات گئے تک نہیں آیا تو بابا اور انور پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل گئے۔ میں اور امی پریشانی کے ساتھ جاگتے رہے۔ بابا فجر کے قریب آئے تو ان کی پریشانی ان کے چہرے سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ میں امی کے ساتھ تھی مگر انہوں نے میرے سامنے ہی امی سے کہا۔ "حبیبہ بہت برا ہوا ہے، منور اس لڑکی کو لے کر کہیں بھاگ گیا ہے۔"

امی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "ہائے یہ اس نے کیا کیا؟"

بابا زندگی میں پہلی بار شکستہ لگ رہے تھے۔ وہ پتھر تھے جس میں اب دراڑ آ گئی تھی۔ انہوں نے تھکے لہجے میں کہا۔ "بات اب تک کھلی نہیں ہے۔ انور اسے تلاش کر رہا ہے۔ اگر وہ مل گیا تو بات اب بھی بن سکتی ہے۔ لیکن وہ نہ ملا تو..."

اس کے آگے جو تھا اس سے ہم بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لڑکی کے گھر والے شاید بے خبر تھے کہ ان کی لڑکی کس کے ساتھ بھاگی ہے ورنہ وہ اب تک ہمارے گھر پر دھاوا بول چکے ہوتے۔ ایسے معاملات میں تاخیر نہیں کی جاتی تھی لیکن چند دن بعد خود واضح ہو جاتا جب منور بھی غائب ہوتا اور اس کے بعد جو ہوتا اس کا سوچ کر میری روح کانپنے لگی تھی۔ امی رو رہی تھیں اور بابا گم صم سے ٹہل رہے تھے۔ انور کئی گھنٹے بعد آیا اور اس نے آتے ہی بابا کو نفی میں سر ہلا کر بتا دیا کہ وہ ناکام رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ منور لڑکی کو لے کر حیدرآباد سے ہی چلا گیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کار بھی غائب تھی۔ حیدرآباد جیسے چھوٹے شہر میں ان کا چھپنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح اندرون صوبہ بھی وہ کہیں چھپتے تو یہ

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بات زیادہ دیر چھپی نہیں رہتی۔ اگر وہ کراچی چلے جاتے تو ان کے بچنے کا امکان تھا۔ کچھ دیر بعد انور اور بابا بھی یہی بات کہہ رہے تھے کہ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ منور کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ بابا شام تک بار بار ٹرائی کرتے رہے مگر موبائل آن نہیں تھا۔

ہماری برادری میں گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو لیکن اسلحہ ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی خاصا اسلحہ تھا۔ بابا کے پاس ایک رائفل اور ایک پستول کا لائسنس تھا۔ انور کے نام پر شاٹ گن اور منور کے نام پستول کا لائسنس تھا۔ اس کا پستول بھی اس کے ساتھ ہی غائب تھا مگر ہمارے ہاں لائسنس سے ہٹ کر بھی کچھ اسلحہ تھا۔ اس میں ایک کلاشنکوف بھی شامل تھی۔ شام تک بابا اور انور نے وہ سارا اسلحہ نکال لیا۔ عام حالات میں وہ دکان پر جاتے ہوئے پستول وغیرہ ساتھ رکھتے تھے کیونکہ چوری ڈکیتی کا خطرہ رہتا ہے مگر اگلے دن وہ جب گئے تو انہوں نے گاڑی میں کلاشنکوف اور رائفل بھی رکھ لی تھی۔ اس شام بابا نے گھر آنے پر بتایا کہ انہوں نے سب جاننے والوں کو یہی بتایا ہے کہ منور تیل کی خریداری کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔

یہ بہانہ بھی چند دن چل سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگوں کو کیا بتاتے کہ منور کہاں ہے۔ ہمارے ہاں ذات برادری میں کوئی بات چھپتی نہیں ہے۔ اگر لڑکی ہماری برادری کی ہوتی تو اب تک پتا بھی چل چکا ہوتا مگر وہ دوسری برادری کی تھی اس لیے لڑکی کے گھر والے اب تک جان نہیں سکے تھے مگر وہ کوشش میں ہوں گے۔ اس معاملے میں ان جاہل لوگوں کی عقل بعض اوقات پڑھے لکھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ وہ اتنی محنت اور جانفشانی سے اپنے مجرموں کو تلاش کرتے ہیں کہ کیا پولیس کرتی ہوگی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان کا مجرم بچ جائے کیونکہ ان کی تلاش دنوں یا مہینوں نہیں بلکہ سالوں اور عشروں جاری رہتی ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے پندرہ بیس سال بعد اپنے مجرموں کو تلاش کر لیا جو کہیں چھپ کر زندگی گزار رہے تھے اور انہیں مع ان کے بچوں کے قتل کر دیا گیا۔

بابا اور انور کسی قدر پر امید تھے کہ اگر منور مل جائے تو وہ اسے سمجھا سکتے تھے اور اسے واپس لے آتے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیسے واپس لا سکتے تھے؟ اور اگر اسے واپس لے بھی آتے تب بھی وہ اس لڑکی کا کیا کرتے جو منور کے ساتھ بھاگی تھی۔ اس کا پتا مجھے اس وقت چلا جب رات کو پیاس لگنے پر میں کمرے سے نکلی اور نشست گاہ میں بیٹھے بابا اور انور کی گفتگو سن لی۔ انور کہہ رہا تھا۔ "بس ایک بار وہ ہاتھ آجائیں۔"

"اس مسئلے کا بھی حل ہے۔" بابا نے کہا۔ "منور کو چپ کرا دیں گے اور لڑکی ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گی۔ اس کے گھر اور برادری والوں کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ کہاں گئی۔"

"ایسی جگہ گاڑیں گے کہ پھر قیامت کے دن ہی اٹھے گی۔" انور نے نفرت سے کہا۔

میں دنگ رہ گئی تھی۔ وہ اس لڑکی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے جس کا جرم یہ تھا کہ وہ منور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو منور بڑا مجرم تھا۔ پہل تو مرد کرتا ہے اور وہ آگے بڑھتا ہے۔ انور کو اپنے بھائی کی فکر تھی اور اس کے لیے وہ ایک لڑکی کو قتل کرنے کو بھی تیار تھا۔ میں دبے قدموں واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ اب تک میری خواہش تھی کہ کاش منور اور وہ لڑکی مل جائیں۔ اگرچہ ان کے ملنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مگر یہ جان کر کہ بابا اور انور نے مسئلہ حل کرنے کے لیے کیا سوچا ہے۔ اب میری خواہش تھی کہ وہ نہ ملیں۔ اس صورت میں بھی یہ راز کھل کر رہتا اور دونوں برادریوں میں کشیدگی آجاتی۔ بابا اور انور خطرے میں پڑ جاتے کیونکہ وہ مرد تھے اور باہر جانا ان کی مجبوری تھی۔ وہ گھر نہیں بیٹھ سکتے تھے اور ان کو نشانہ بنانا آسان تھا۔

دو دن بعد بابا اور انور نے دکان پر ہی ڈراما کیا اور ایک جعلی فون کال ریسیو کی جس میں بتایا گیا کہ منور کا کراچی میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ بابا اور انور مارکیٹ اور برادری میں یہ خبر پھیلا کر خود کراچی روانہ ہو گئے۔ اللہ جانے وہ کہاں گئے تھے۔ بابا دو دن بعد آگئے لیکن انور ایک ہفتے بعد آیا تھا۔ چھپ کر بابا اور اس کی گفتگو سنی تو پتا چلا کہ وہ سچ مچ کراچی ہی گئے تھے۔ انور ایک ہفتے تک وہاں ہوٹلوں میں منور اور لڑکی کو تلاش کرتا رہا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ منور کے چند ایک دوست اور واقف کار کراچی میں تھے۔ انور نے ان سے بھی رابطہ کیا مگر منور کہیں نہیں ملا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی بہت محفوظ جگہ تھا جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ دوسری برادری والوں کو شک ہو گیا تھا اور بڑی خاموشی اور ہوشیاری سے منور اور لڑکی کے ساتھ ثبوت کی تلاش میں بھی تھے۔

انور کی کراچی واپسی سے چار دن بعد کی بات

تھی۔ میں ٹی وی پر نیوز چینل دیکھ رہی تھی کہ اچانک خبر آنے لگی، ایک پوش علاقے میں بنگلے میں فائرنگ جس سے تین افراد ہلاک ہو گئے۔ مارے جانے والوں میں ایک عورت اور دو مرد شامل تھے۔ ان کا تعلق اندرونِ صوبہ سے تھا۔ یہ سن کر اور پھر عورت کا جان کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے جلدی سے ٹی وی کی آواز دھیمی کر دی اور انتظار کرنے لگی کہ کب اس خبر کی تفصیل آتی ہے۔ امی کچن میں کھانا بنا رہی تھیں۔ اس دوران میں چینل گھماتی رہی اور امی آجاتیں تو میں جلدی سے کوئی انٹرٹینمنٹ چینل لگا لیتی تھی۔ بالآخر دو گھنٹے بعد اس کی تفصیل آئی۔ مارے جانے والوں کے نام نشر ہوئے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ ان میں ایک نام منور کا تھا۔ لڑکی کا نام ثمینہ تھا اور دوسرا مرد جو مارا گیا وہ اس بنگلے کا مالک تھا اور اس کا تعلق بھی ہماری برادری سے ہی تھا۔

اس کے دو ملازموں کے مطابق چار نقاب پوش مسلح افراد اچانک بنگلے میں گھسے اور انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے ان تین افراد کو قتل کیا اور اس کے بعد فرار ہو گئے۔ کسی نے انہیں روکنے کی جرأت نہیں کی اور یہی نہیں بلکہ کسی نے حملہ آوروں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ان کا تعلق ہماری مخالف برادری اور ثمینہ کے گھر سے ہوگا۔ میں اپنی چیخیں روک رہی تھی اور جب میری برداشت سے باہر ہو گیا تو میں ٹی وی بند کر کے باتھ روم میں آئی اور وہاں آنسو بہانے لگی۔ منور کیسا ہی تھا میرا بھائی تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے یہ چکر شروع ہوا تھا تب سے مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا ایسا ہی انجام ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ میں واش روم سے باہر آئی تو امی نے دیکھ لیا۔ "کیا ہوا ہے؟ تو کیوں رو رہی ہے؟"

"کچھ نہیں امی۔" میں نے کہا اور پھر بہانہ بنایا۔ "منور بھائی کی طرف سے دل پریشان ہے اس لیے رونا آ گیا۔"

میں امی کو یہ خبر سنانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اس لیے جیسے ہی امی کچن کی طرف گئیں میں نے بابا کو فون کر کے صرف اتنا کہا کہ وہ ٹی وی لگا کر دیکھیں۔ منور کے بارے میں خبر آ رہی ہے۔ دکان پر ٹی وی تھا کیونکہ آج کل کا کام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بہت دیر بعد کوئی گاہک آتا ہے اور زیادہ تر تو فون پر آرڈر کرتے تھے اور کوئی جا کر سپلائی دے آتا تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے بابا نے دکان پر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ انور کو کرکٹ کا شوق تھا۔ اس لیے بابا نے فوری خبر دیکھ لی اور اس کے فوراً بعد وہ دکان بند کر کے انور کے ساتھ گھر آئے اور انہوں نے برادری کے بڑوں کو بلا لیا۔ ہمارے گھر ایک طویل میٹنگ ہوئی۔ محلے کی عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ ایک طرف میٹنگ ہو رہی تھی اور دوسری طرف عورتیں امی اور میرے ساتھ مل کر رو دھو رہی تھیں۔ میٹنگ کے بعد بابا، انور اور برادری کے کوئی درجن بھر افراد پوری طرح مسلح ہو کر کراچی روانہ ہو گئے اور یہاں محلے میں بھی سب ہوشیار ہو گئے تھے۔

اتفاق سے مخالف برادری کا محلہ بھی ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ اس لیے آمنے سامنے مورچے بن گئے۔ ایک فائرنگ جنگ چھڑ سکتا تھا جس میں نہ جانے اور کتنی جانیں ضائع ہوتیں مگر اس موقع پر دونوں طرف کے بزرگ آڑے آئے اور انہوں نے امن برقرار رکھا۔ مگر جیسے ہی بابا اور انور، منور کی لاش لے کر واپس آئے ماحول بدل گیا۔ وہ انتقام کے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ امی نے بابا کو سمجھانا چاہا تو انہوں نے زندگی میں پہلی بار امی پر ہاتھ اٹھایا اور تھپڑ مار کر بولے۔ "میرا جوان بیٹا مرا ہے اور میں چوڑیاں پہن کر بیٹھا رہوں گا۔"

"منور کی لاش پہلی ضرور ہے لیکن آخری نہیں ہے۔" انور نے بھی خطرناک لہجے میں کہا۔ ان دونوں کو سمجھانا بیکار تھا اس لیے میں امی کو ان کے سامنے سے ہٹا کر لے گئی۔ منور کی تدفین اگلے دن کی گئی اور اس کے فوراً بعد برادری کا اجلاس ہوا۔ کیونکہ مرنے والا دوسرا فرد بھی ہماری برادری کا ہی تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مخالف برادری انکار کر رہی تھی کہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ ہماری برادری اس پر اپنے علاقے کے بڑوں کا جرگہ بٹھانے کی بات کر رہی تھی اور وہ مان نہیں رہے تھے کہ جب ہم نے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو جرگہ کس بات کا بٹھایا جائے۔ بابا اور انور کو شبہ تھا کہ یہ ثمینہ کے گھر والوں کا کام ہے۔ اس کے چار بھائی تھے اور چاروں بدمعاش قسم کے تھے۔ وہ تو کھلے عام اسلحہ لے کر گھومتے تھے۔ انور سخت طیش میں تھا لیکن وہ ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اکیلا تھا اور مخالف چار بھائی تھے اور ان کے پاس دوسرے بھی کئی بدمعاش قسم کے ملازم تھے۔

بابا نے منور کے قتل کی ایف آئی آر کراچی میں مخالف برادری کے نام کٹوا دی تھی مگر کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ کوئی گرفتاری بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ منور کے چالیسویں تک

سکون ہو رہا تھا۔ خالہ اور خالو واپس جا چکے تھے۔ وہ پہلے تدفین کے وقت آئے تھے اور اس کے بعد دوبارہ کئی دن کے لیے آئے تھے۔ یہ موقع ہی ایسا تھا کہ وہ اپنا اختلاف بھول کر آگئے اور اب بابا بھی ان سے اچھی طرح سے ملے تھے۔ دوسری بار میں علینا بھی آئی تھی اور وہ میرے گھر کا ماحول دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ اس نے تنہائی میں مجھ سے پوچھا۔ ”رباب تو کیسے رہ سکتی ہے اس ماحول میں؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بس مقدر کا لکھا سمجھ کر رہ لیتی ہوں۔“

”معاف کرنا لیکن میں نے اتنے روکھے اور سخت باپ بھائی کہیں نہیں دیکھے۔“

”سچی بات ہے میں نے بھی اپنے گھر کے علاوہ کہیں نہیں دیکھے ہیں۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”کاش میں تم کو یہاں سے لے جا سکتی۔“ علینا نے کہا۔ ”صائم بھائی بُرے تو نہیں ہیں جو تمہارے بابا نے یوں انکار کیا۔“

”وہ بالکل بھی بُرے نہیں ہیں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”بُرے تو میرے نصیب ہیں۔ ہماری برادری کے رسم و رواج ہیں جن میں بیٹیوں کو جہنم میں جھونکا جاتا ہے۔“

خالہ خالو اور علینا کے جانے کے بعد ماحول پھر ویسا ہی ہو گیا۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ انور اب منور بنتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے بالکل ان نظروں سے دیکھتا تھا جن سے منور دیکھتا تھا اور بابا چپ چاپ سوچوں میں گم رہنے لگے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے رات کو امی سے کہا۔ ”حبیبہ مجھے لگ رہا ہے انور کسی چکر میں ہے۔“

”کیسے چکر میں؟“ امی پریشان ہو گئیں، وہ پہلے ہی ایک بیٹا گنوا چکی تھیں۔ ”کسی لڑکی کا چکر ہے؟“

”نہیں.... مجھے لگ رہا ہے وہ بدلے کے چکر میں ہے۔“ بابا بولے۔ ”بدلا تو ہمیں لینا ہے لیکن ابھی وہ ہوشیار ہیں۔ چوٹ اس وقت مارنی ہے جب لوہا گرم ہو۔“

امی کو بابا کا مزاج پتا تھا اس لیے انہوں نے مخالفت تو نہیں کی لیکن پوچھا۔ ”وہ کیسے.... آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”آج کل وہ دکان پر کم آتا ہے۔ وہ تین دوست ہیں جن کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ ہر وقت مسلح رہتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدلے کے چکر میں ہے۔“

میرے ایک واقف کار نے اسے دو بار مخالف برادری کے محلے میں دیکھا ہے اور وہاں جانا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ٹھنڈے نہیں پڑے ہیں۔“

”پھر اپنا مار تو دیا ہے اب کیا چاہتے ہیں؟“

”حبیبہ عزت کا معاملہ ہے ہمارے ساتھ ایسا ہوتا تو ہم بھی آسانی سے ٹھنڈے نہیں ہوں گے۔“ بابا نے گہری سانس لی۔ ”منور نے بہت برا کیا اسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بھی بہن ہے۔“

امی خوفزدہ ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تو کہہ رہی ہوں رباب کی شادی کر دیتے ہیں۔“

”کس سے، ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔“

”اریبا کا بھائی ارشد ہے نا؟“

میں جو چھپ کر امی بابا کی باتیں سن رہی تھی میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ بابا نے کہا۔ ”میں انکار کر چکا ہوں۔“

”ان کو تو نہیں کیا نا۔“ امی بولیں۔ ”اب ہم بات کر سکتے ہیں۔“

بابا سوچ میں پڑ گئے اور پھر انہوں نے کہا۔ ”ہاں ہم نے ان کو تو انکار نہیں کیا لیکن گھر میں بات ہوئی تھی۔“

تب میں جان گئی کہ بابا امی کی بات مان گئے ہیں اور میں کسی صورت ارشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

عارف ہماری برادری سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا گھر ہماری گلی کے کونے پر تھا وہ کسی بھی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا اور جب میں کالج آتی جاتی تو اکثر وہ ان اوقات میں گلی کے کونے پر موجود رہتا تھا۔ اسی طرح جب بھی شام کو چھت پر جاتی تو کچھ دیر بعد وہ بھی آ جاتا اور اس کی نگاہ کا مرکز میں ہی ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ اس کا انداز ہوس زدہ نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ دلچسپی سے اور سراہنے والے انداز میں دیکھتا تھا۔ کسی لڑکی یا عورت کو ایسی نگاہ بہت کم بری لگتی ہے۔ مجھے بھی بری نہیں لگتی تھی۔ اس لیے وہ جب مجھے دیکھتا تو میں بے نیازی بن جاتی۔ پھر صورت شکل کا بھی مناسب تھا لیکن میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ کئی بار اس سے یوں آمنا سامنا ہوا کہ اس کی امی اور میری امی کی آپس میں اچھی سلام دعا تھی۔ امی ہفتہ دس دن میں ان کے گھر جاتی تھیں اور وہ بھی اسی طرح ہمارے گھر چکر لگا لیتی

تھیں۔ جب ان کے ہاں جاتے تب بھی عارف سے سامنا ہو جاتا تھا۔

پھر منور کی تدفین میں بھی عارف اور اس کے بھائی آگے آگے رہے تھے۔ اگلے دن امی جا رہی تھیں تو میں نے پوچھا۔ "امی کہاں جا رہی ہیں؟"

"زینت کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"میں بھی چلوں؟" میں نے پوچھا تو امی نے حیرت سے میری طرف دیکھا کیونکہ میں نے بہت عرصہ ہوا ان کے ہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

"ہاں چلو۔" امی نے حجت نہیں کی اور مان گئیں۔

میں ان کے ساتھ عارف کے گھر پہنچی اور اتفاق سے اسی نے دروازہ کھولا۔ مجھے امی کے پیچھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آئی تھی کہ میری آنکھیں خود بہ خود جھک گئیں اور شاید چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ عارف نے اپنی امی کو آواز دے کر بتایا اور پیچھے ہٹ کر راستہ دیا۔ میری چپل اندر آتے ہوئے سلپ ہوئی اور جب تک میں اسے ٹھیک کرتی امی آگے چلی گئی تھیں۔ میں اندر آئی اور عارف کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے سرگوشی میں کہا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

میرا دل دھڑک اٹھا تھا اور میں جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ جب تک میں اندر کمرے میں نہیں چلی گئی عارف کی نگاہیں میرا تعاقب کرتی رہیں تھیں۔ زینت آنٹی نے گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنی بہو کو ٹھنڈا لانے کو کہا۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھے اور پھر اٹھ گئے۔ اتفاق سے اس بار بھی صحن میں عارف سے سامنا ہوا۔ اس کی نگاہوں کا پیغام بہت واضح تھا اور اس بار بھی میں نے سر جھکا لیا تھا۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جب عورت نہ نہیں کرے تو اسے ہاں سمجھنا چاہیے اور عارف نے سمجھ لیا تھا۔ آج کل اگر لڑکا اور لڑکی رابطہ کرنا چاہیں تو یہ ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ موبائل نے اسے بہت آسان کر دیا ہے۔ میرے پاس موبائل تھا اور بابا نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ امی نے یہ کہہ کر دلوایا تھا کہ میں کالج جاتی ہوں کسی مشکل میں ہوں تو گھر کال کر کے بتا تو سکتی ہوں۔ بھائی اس معاملے میں بھی خلاف تھے مگر مجھے موبائل مل گیا اور اب تک میرے پاس تھا۔

ایک بار ہمارا موبائل پر رابطہ ہوا تو معاملہ تیزی سے آگے بڑھا۔ پہلے ایس ایم ایس پر بات ہوئی اور اس کے بعد عارف نے کال کی۔ میں نے امی سے چھپ کر اس سے بات کی۔ بابا اور انور بھائی کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں کال پر اس سے بات کرتی۔ میں تو ایسے میں موبائل کو بھی کم ہی ہاتھ میں لیتی تھی مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں موبائل واپس نہ لے لیا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں انکار بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب بہ ظاہر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ بابا یا انور کی نظر میرے موبائل پر نہ جائے۔ اس کال پر عارف نے ذرا کھل کر اپنی پسند کا اظہار کیا اور دوسری کال میں اس نے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ میں جھجکی تھی مگر میں نے بھی ڈھکے چھپے انداز میں کہہ دیا کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ عارف خوش ہو گیا تھا۔ تیسری بار اس نے کال کی تو اس نے کہا۔ "رباب میں اپنی امی ابو کو تمہارے گھر رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "عارف یہ ممکن نہیں ہے۔"

وہ حیران ہوا۔ "کیوں، میں تمہاری برادری کا تو ہوں۔"

"بات یہ نہیں ہے، اصل میں بابا نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

وہ دنگ رہ گیا اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"تب تم نے اقرار کیوں کیا، بات کو یہاں تک لے کر کیوں آئیں؟"

"اس معاملے میں، میں اتنی ہی بے بس ہوں جتنا کہ تم ہو۔"

"تب کیا ہوگا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"یہی بات ہے کہ عارف میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی مگر میں کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے ارشد سے نفرت ہے مگر میں بابا کے سامنے انکار کی جرأت نہیں کر سکتی۔"

عارف جیسے پاگل ہونے لگا تھا۔ "رباب کچھ کرو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا۔ "میں ایک کمزور لڑکی ہوں تم مرد ہو کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟"

"ہاں میں کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں

لے کر کہیں دور جاسکتا ہوں۔ بولو تم میرے ساتھ چلو گی۔"

میں ڈر گئی۔ "عارف یہ بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔ تم جانتے ہو ہمارے ہاں ایسے موقع پر کیا ہوتا ہے، میرے بھائی منور کا واقعہ پرانا نہیں ہے۔"

اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں مرنے کا خطرہ مول لے سکتا ہوں لیکن تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"

"عارف مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔" میں نے التجا کی۔

"سوچ لو مگر جلدی، ایسا نہ ہو کہ تمہارے گھر والے اچانک تمہاری شادی کردیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ہمارے ہاں ایسا ہی رواج تھا۔ لڑکیوں کی اچانک ہی شادی کردی جاتی تھی اور بعض اوقات تو ان کو اپنی شادی والے دن پتا چلتا تھا کہ آج ان کی شادی ہے۔ اگرچہ عام طور سے ایسا اس وقت ہوتا تھا جب گھر والوں کو بھنک مل جاتی کہ لڑکی کسی اور میں دل چسپی لے رہی ہے اور انہیں خطرہ ہو کہ وہ ان کی عزت پاؤں تلے روند کر گھر سے فرار ہوجائے گی۔ عارف سے اس گفتگو کے بعد میں کشمکش میں پڑ گئی تھی۔ اگر میں بھی ایسا ہی کرتی تو بابا اور امی پر کیا گزرتی۔ سچی بات ہے مجھے امی کی زیادہ فکر تھی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے عارف سے محبت نہیں تھی، بس میں کسی صورت ارشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے مجھے اس سے چڑ تھی مگر جب سے میں نے امی اور بابا کی گفتگو سنی تھی مجھے اس سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس سے شادی کی نسبت مجھے یہ زیادہ آسان لگ رہا تھا کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں۔ بے شک اس جرم میں، میں بھی منور اور ثمینہ کی طرح قتل کردی جاؤں۔ عارف کی طرف میں اسی وجہ سے بڑھی تھی مگر جب اس نے یہ تجویز پیش کی تو میں سوچ میں پڑ گئی۔ جب ارشد کا سوچتی تو مجھے فرار آسان لگتا تھا مگر جب امی کا سوچتی تو میری ہمت جواب دے جاتی اور مجھے خیال آتا کہ اس سے بہتر ہے میں اسی جہنم میں جلتی رہوں۔

کئی دن تک اسی کشمکش میں رہی۔ جس واحد چیز نے مجھے فیصلہ کرنے سے روکا ہوا تھا وہ امی اور بابا کی خاموشی تھی۔ اگر انہوں نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہوتا تو امی کے توسط سے لازمی میرے علم میں آجاتا اور میں اس بارے میں ازخود کوئی بات نہیں کرسکتی تھی۔ امی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر بابا فیصلہ کرلیتے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس شادی سے نہیں بچاسکتی تھی۔ عارف ہر دوسرے تیسرے دن مجھے کال کرکے پوچھتا تھا اور میں ہر بار اسے ٹال دیتی تھی۔ مگر اب میرے لیے بھی مشکل ہوتا جارہا تھا۔ یہ دس دن بعد کی بات تھی۔ اس دن بابا دکان پر گئے تھے اور انور گھر میں تھا۔ وہ ناشتا کررہا تھا۔ وہ ذرا دیر سے جاتا تھا کیونکہ سپلائی پر عام طور سے انور اور منور ہی جاتے تھے اس لیے وہ دیر سے جاتے تھے۔ میں چائے نکال رہی تھی کہ انور کے موبائل پر کال آئی اس نے ریسیو کی۔

"ہیلو... ہاں... کیا؟" وہ چیخ کر کھڑا ہوگیا۔ "بابا کو..."

"انور... کیا، کیا ہوا؟" امی نے بدحواس ہوکر پوچھا۔

"کسی نے بابا پر فائرنگ کی ہے۔" اس نے غضب ناک لہجے میں کہا اور تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ پھر وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ امی نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ انہیں دھکیلتا ہوا نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ جب میں باہر گلی میں آئی تو وہ گاڑی میں بیٹھ کر جارہا تھا۔ پیچھے امی دھاڑیں مار کر رورہی تھیں۔ میں واپس آئی اور پریشانی میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ امی کی حالت خراب تھی اور میں انہیں سنبھال رہی تھی۔ ان کے لیے پانی لا رہی تھی کہ ہمارے گھر کے سامنے کسی بھاری گاڑی کا انجن غرایا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں دروازے کی طرف لپکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازہ اندر سے بند کرتی وہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو ڈھاٹا پوش افراد اندر آئے۔ میں پلٹ کر واپس بھاگی تو ان میں سے ایک دھاڑا۔

"یہی ہے پکڑو اسے۔"

دوسرا گالیاں دیتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کی زبان گندگی اگل رہی تھی۔ اس سے پہلے میں اندر داخل ہوکر کمرے کا دروازہ بند کرتی اس نے عقب سے میری چوٹی پکڑ کر مجھے واپس صحن میں پھینک دیا۔ پیچھے گرتے ہی میرا سر بہت زور سے فرش سے ٹکرایا اور مجھے چکر آنے لگے۔ پھر مجھے بس اتنا یاد تھا کہ کوئی مجھے اٹھا کر شانے پر ڈال کر لے جارہا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تنگ و تاریک اور گرم کوٹھری میں فرش پر پڑی تھی۔ میرے سر کی چوٹ سے خون بہہ کر میرے چہرے تک آگیا تھا اور جب میں بہ مشکل اٹھی تو یہ شرمناک انکشاف ہوا کہ میرے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں بے حد خوف کے عالم میں سکڑ سمٹ کر دیوار کے کونے میں گھس کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لباس اتارنے کے علاوہ میرے ساتھ اور کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی، لیکن ایک

کنواری لڑکی کے لیے یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ اسے یوں بے لباس کر دیا جائے۔

میں اتنی خوفزدہ تھی کہ چاہنے کے باوجود بھی کھل کر نہیں رو سکی تھی۔ میں دبی دبی سسکیاں لے رہی تھی۔ نہ جانے میں کہاں تھی اور مجھے یہاں لانے والے کون لوگ تھے۔ ان کے قبیح عزائم تو میری بے لباسی سے واضح تھے۔ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور مجھے اپنے اندر سمو لے۔ میں اس ذلت سے گزرنے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے دل کی گہرائی سے اللہ سے دعا کی کہ مجھے ذلت کی زندگی کی بجائے عزت کی موت دیدے۔ یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی کیونکہ چند منٹ بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا اور میں خود میں مزید سمٹ گئی۔ خود کو آنے والے کی نگاہ سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی اگرچہ میں کتنا چھپا سکتی تھی؟ مگر آنے والی عورت تھی۔ اس نے اندر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور میرے پاس آ کر ایک جوڑا میری طرف بڑھایا۔

"ادی یہ پہن لو۔"

میں نے جھپٹ کر اس سے لباس لیا اور جلدی جلدی پہن لیا۔ اس دوران میں عورت منہ دوسری طرف کر کے کھڑی رہی تھی۔ کپڑے پہن کر مجھے ایسا سکون ملا کہ اگر اس وقت وہ عورت مجھ سے جان بھی مانگتی تو میں ان کپڑوں کے بدلے خوشی سے دے دیتی۔ میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں۔"

"یہ سائیں کمال کا گھر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔"

"وہ مجھے اغوا کر کے لایا ہے۔"

"سائیں کے ساتھ چار آدمی اور تھے۔" عورت نے کہا۔ "ادی تیرا لباس بالکل پھٹ گیا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے جانے کے بعد اتار دیا۔ اب یہ دوسرا لباس لائی ہوں۔"

میرا لباس یقیناً ان درندوں کی دست درازی سے پھٹا تھا لیکن یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا لباس اس عورت نے اتارا تھا اور اب مجھے دوسرا جوڑا دیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور لجاجت سے بولی۔ "تم نے مجھے ادی کہا ہے... اب ادی بن کر دکھاؤ... مجھے یہاں سے نکال دو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تب مجھے زہر لا دو یا مٹی کا تیل دے دو۔ میں عزت دینے کی بجائے جان دینا پسند کروں گی۔"

عورت تقریباً تیس برس کی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں کچھ کرتی ہوں مگر تو شور بالکل مت کرنا ورنہ..."

"میں چپ رہوں گی۔" میں نے جلدی سے کہا پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تم لوگ کس برادری سے ہو؟"

عورت کے جواب نے تصدیق کر دی تھی وہ اور سائیں کمال ہماری مخالف برادری سے تھے۔ اپنی طرف سے ذرا سکون ہوا تو مجھے بابا اور انور کا خیال آیا۔ یہ کام کرنے والوں نے یقیناً پوری تیاری سے کیا تھا۔ ایک طرف انہوں نے بابا پر حملہ کیا اور جب انور گھر سے نکلا تو وہ پیچھے سے اندر گھس آئے اور مجھے اٹھا لائے۔ پتا نہیں امی پر کیا گزری ہو گی؟ بابا کیسے ہوں گے؟ یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا اور میں رونے لگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی فکر لاحق ہو گئی تھی اگرچہ اس عورت نے کہا تھا کہ وہ کچھ کرے گی لیکن وہ بہرحال بے بس عورت تھی۔ ممکن ہے وہ میری مدد نہ کر پاتی اور مجھ پر وہ سب گزر جاتا جس کا سوچ کر میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس ذلت سے موت بہت آسان اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے اور یہ میری زندگی کے مشکل ترین دو گھنٹے تھے جو دو صدیاں بن کر گزرے۔ کبھی دل بہت تیز دھڑکتا اور کبھی ایسا لگتا جیسے رک گیا ہو۔

ایک بار پھر دروازہ کھلا تو میں آنے والے حالات کے لیے تیار ہو گئی۔ اندیشہ تھا کہ اب کوئی مرد آئے گا مگر وہی عورت تھی اس نے اشارے سے مجھے باہر آنے کو کہا اور میں تیزی سے اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ یہ ایک پرانا حویلی نما مکان تھا اور کوٹھری اندر کمرے میں تھی۔ عورت نے ہاتھ میں کینوس کے جوتے تھام رکھے تھے اور یہ میرے لیے تھے کیونکہ گھر میں میرے پیروں میں چپل تھی جو لانے کے دوران میں کہیں گر گئی تھی۔ عورت مجھے گھر کے پچھلے حصے میں لائی اور جوتے پہننے کو دیے۔ یہ ذرا تنگ تھے لیکن مجھے ننگے پاؤں نہیں چلنا پڑتا۔ میں نے جوتے پہنتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے۔"

اس نے حیدرآباد کی ایک جگہ کا نام بتایا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ جگہ میرے گھر سے خاصی دور تھی۔ میں نے عورت سے کہا۔ "میں اتنی دور کیسے جاؤں گی؟"

"یہاں سے رکشے مل جاتے ہیں۔" وہ بولی اور پھر ایک چادر میرے حوالے کی۔ "اس سے خود کو چھپا لینا۔"

یہ مکان کا پچھلا حصہ تھا جو ایک چھوٹی سی گندی گلی میں کھل رہا تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کوٹھریوں جیسے مکانات تھے۔ درمیان میں گندا پانی بہہ رہا تھا۔ میرے باہر آتے ہی عورت نے دروازہ بند کر لیا اور میں اندازے سے ایک طرف بڑھ گئی۔ یہ پرانے حیدرآباد کا علاقہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی بھول بھلیوں کی سی گلیاں تھیں۔ دن کا وقت تھا اور گرمی شدت کی تھی اس لیے گلیاں ویران تھیں۔ بہت دیر بعد جا کر میں ایک سڑک پر نکلی اور ایک رکشا روک کر اسے اپنے محلے کا بتایا۔ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "چلو بی بی۔"

میں بیٹھ گئی یہ سوچے بغیر کہ میرے پاس رقم کے نام پر ایک سکہ بھی نہیں تھا۔ مگر اس وقت مجھے جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانے کی فکر تھی جب گلیوں میں چل رہی تھی تب بھی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی پیچھے سے وہی لوگ نہ آ جائیں اور مجھے پھر پکڑ کر لے جائیں۔ رکشے والے کو میں گھر پہنچ کر بھی کرایہ دے سکتی اسی خیال نے تقویت دی تھی۔ یہ جگہ میں نے پہلی بار دیکھی تھی لیکن آدھے گھنٹے بعد رکشا ہمارے علاقے میں داخل ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں اسے گلیوں کا بتاتی رہی اور چند منٹ بعد رکشا گلی میں داخل ہوا تو وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ سب مرد تھے اور جب رکشا گھر کے سامنے رکا تو اندر سے رونے دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اتری تو چادر کے باوجود لوگوں نے پہچان لیا۔ مختلف آوازیں بلند ہوئیں جو میری آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ میں انہیں نظرانداز کر کے اندر داخل ہوئی تو امی عورتوں کے درمیان گھری سکتے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رونے والی دوسری عورتیں تھیں۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا.... کیا ہوا ہے یہاں؟"

"تجھے لے جانے والوں نے نہیں بتایا۔" ایک عورت طنزیہ لہجے میں بولی۔ "وہ تیرے باپ اور بھائی کو مار کر یہاں آئے تھے تجھے لے جانے کے لیے۔"

یہ سنتے ہی میرا سر جو پہلے ہی چکرا رہا تھا یک دم تاریکی میں ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو بابا اور انور کی لاشیں آ چکی تھیں۔ امی ان سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ مکان میں مزید لوگوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ بابا کے دور نزدیک کے سبھی رشتے دار آ گئے تھے اور رات کے قریب خالہ خالو بھی آ گئے۔ تدفین اگلے دن صبح کے وقت طے پائی تھی۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب گھر کے اندر کے معاملات میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سب ہی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سوائے خالہ کے کسی عورت نے مجھ سے بابا اور بھائی کی تعزیت نہیں کی تھی۔ اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا لیکن جب میں نے کچھ عورتوں کے منہ سے لفظ کاری سنا تو میں چونک گئی تھی اور تب مجھے پتا چلا کہ یہ مجھے عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ میں ہراساں ہو گئی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر کوئی لڑکی یا عورت اس طرح غیر مردوں کے قبضے میں رہ کر آئے تو بے آبرو سمجھا جاتا ہے اور ہمارے رواج میں اسے کاری قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

"لیکن میں تو پاک دامن ہوں۔" میں نے خود کو تسلی دی۔

رات کے وقت محلے والیاں چلی گئیں اور صرف کچھ رشتے دار خواتین تھیں۔ خالو اور دوسرے مردوں نے لاشیں گرمی کی وجہ سے سرد خانے میں رکھوا دی تھیں۔ صبح انہیں وہیں سے نہلا کر اور کفن پہنا کر لایا جاتا اور چہرہ کرا کر قبرستان لے جاتے۔ خالو جب یہ کام نمٹا کر آئے تو وہ بھی کچھ پریشان تھے۔ انہوں نے خالہ سے چپکے سے بات کی اور خالہ امی کے پاس آئیں۔ میں وہیں تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "رباب مجھے باجی سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

مجھے فوراً خیال آیا۔ "میرے بارے میں؟"

خالہ ہچکچائیں۔ "ہاں۔"

"خالہ میرے سامنے بات کریں۔"

"تیرے خالو بتا رہے ہیں کہ باہر کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ برادری کی عزت کا معاملہ ہے۔"

"اگر عزت کا معاملہ ہے تو یہ جا کر ان لوگوں سے نمٹیں جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے اور جنہوں نے بابا اور بھائی کو مارا ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں جانتی ہوں وہ مجھے کاری کر کے مارنے کو کہہ رہے ہوں گے لیکن خالہ میں پاک دامن ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے خالہ اور امی کو ساری بات بتائی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے بھی دونوں تجربے کار تھیں اور انہوں نے جان لیا تھا کہ مجھے کسی نے نہیں چھوا ہے۔ بس امی نے یہ پوچھا کہ میرے کپڑے کہاں گئے تو میں نے بتایا کہ وہ پھٹ گئے تھے تو اس نیک دل عورت نے مجھے اپنا جوڑا دے دیا۔ خالہ نے خالو کو بلا کر سب بتایا وہ بولے۔

"بات ہمارے ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے اصل مسئلہ تو ان جاہلوں کا ہے۔"

"ہم باجی اور رباب کو ساتھ لے جاتے ہیں۔" خالہ نے کہا۔

"میں نے بھی یہی سوچا ہے بعد میں اس مکان اور دکان کا معاملہ دیکھتے رہیں گے۔"

"بس تو ہم سوئم کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔" خالہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ امی اگرچہ اب ہوش میں تھیں مگر ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس خطرے کو محسوس کر سکتیں۔ خالہ کی بات پر انہوں نے تڑپ کر کہا۔

"صبیحہ ہم اتنی جلدی نہیں جائیں گے۔ یہاں میرے شوہر اور بچوں کی لاشیں ہیں۔" وہ رونے لگیں۔ "میں ان کی قبروں کو کیسے چھوڑ کر جاؤں میرا تو سب لٹ گیا ہے۔"

"باجی آپ رباب کی طرف دیکھیں اب یہ خطرے میں ہے۔ برادری والے اسے کاری کر کے مارنے کی بات کر رہے ہیں۔"

امی چونک گئیں اور جلدی سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ "نہیں میں اپنی بچی کے قریب کسی کو آنے نہیں دوں گی۔ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ میرے پاس اب اس کے سوا ہے ہی کیا؟"

"آپ جانتی ہیں نا یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ کسی کی نہیں سنیں گے۔ بس اپنی من مانی کریں گے۔" خالہ امی کو سمجھاتے ہوئے کمرے میں لے گئیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

یہ سچ ہے کہ خالو کی بات نے مجھے ہراساں کر دیا تھا۔ میں اپنی برادری والوں کو جانتی تھی۔ انہوں نے یہ بات کی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ میرے بابا اور بھائی نہیں رہے تھے اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا لیکن اگر وہ ہوتے تب بھی وہ برادری کا ساتھ دیتے۔ مجھے نہیں بچاتے۔ ہمارے ہاں یہ بہت بڑی بات تھی کہ لڑکی کہیں اور رہ کر آئے۔ اسے لازمی بے آبرو سمجھا جاتا تھا اور اس سلسلے میں میڈیکل رپورٹ کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ایک بار امی نے مجھے بتایا تھا کہ بابا کے آبائی علاقے میں ایک باپ نے اپنی چودہ سال بیٹی کو ذرا سے شبے پر اینٹوں سے مار مار کر قتل کر دیا تھا۔ وہ صبح کے وقت جلانے کے لیے لکڑی لینے گئی تھی اور واپسی میں گلی میں آتے ہوئے گلی کا ایک لڑکا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ باپ یہ منظر دیکھ رہا تھا اور اس نے بیٹی پر بدکاری کا الزام لگاتے ہوئے اسے مار دیا۔ یہ واقعہ سن کر میں اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ کئی دن کالج ہی نہیں گئی تھی۔

خوف کے ساتھ اطمینان کی بات یہ تھی کہ خالو اور خالہ ہمیں یہاں سے لے جا رہے تھے۔ اگرچہ محفوظ تو ہم کراچی میں بھی نہیں ہوتے۔ منور اور اس لڑکی کو کراچی کے انتہائی محفوظ علاقے میں گھر میں گھس کر قتل کیا گیا تھا۔ مگر یہاں تو خطرہ میرے چاروں طرف تھا۔ میں تھکی ہوئی تھی اور نیند آنکھوں سے دور تھی۔ اچانک میرے موبائل نے بیل دی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا تو عارف کا نمبر تھا۔ میں نے اس کا نمبر محفوظ نہیں کیا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ مگر وہ مجھے زبانی یاد تھا۔ عجیب بات تھی کہ واپس آنے کے بعد مجھے ایک بار بھی عارف کا خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ اب اس کی کال آئی تو پہلی بار مجھے خیال آیا۔ پہلے میں نے موبائل سائلنٹ پر کیا اور پھر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"رباب۔" عارف نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم کل اپنے بابا اور بھائی کی تدفین مکمل ہونے سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کیوں؟" میں چونکی۔

"کیونکہ برادری نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تدفین سے آتے ہی بڑے بیٹھیں گے اور تم جانتی ہو وہ کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ "وہ مجھے کاری قرار دیں گے؟"

"بالکل اور اس کے بعد تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ کوئی تمہیں بچا نہیں سکے گا۔ اس سے پہلے بھاگ جاؤ تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔"

"عارف تم مجھے نہیں بچا سکتے... تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "اب میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

عارف نے فون بند کر دیا تھا اور میں ہراساں سی بیٹھی رہ گئی۔ عارف برادری کا فرد تھا اور وہ سب جانتا تھا۔ یقیناً اس کے سامنے بات ہوئی تھی تب ہی وہ مجھے اتنے یقین سے بتا رہا تھا۔ امی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ان سے بات کی جاتی اس لیے میں نے خالہ سے بات کی۔ وہ سو گئی تھیں میں انہیں جگا کر دوسرے کمرے میں لائی اور آنے والے خطرے کے بارے میں بتایا۔ البتہ میں نے عارف کی بجائے محلے کی ایک لڑکی کا ذکر کیا جو اتفاق سے یہ بات جان

گئی تھی۔ خالہ بھی ہراساں ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”میں تیرے خالو سے بات کرتی ہوں وہی کوئی حل نکالیں گے۔“

یہ معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑا مسئلہ ہی قبائلی انا کا ہے۔ اس کے سامنے انسانیت اور مذہب تک کو کم سمجھا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد خالہ خاموشی سے میرے کمرے میں آئیں۔ ”رباب اپنی چیزیں اور سامان تیار کرلو۔“

”کیا ہم ابھی جارہے ہیں؟“

”نہیں۔“ خالہ بولیں۔ ”تیرا اور باجی کا سامان اور ضروری چیزیں ہم تیرے خالو کی گاڑی میں رکھ رہے ہیں۔ گلی میں پہرہ ہے۔ محلے کے لڑکے پہرے پر ہیں۔ صبح جنازے کے وقت تم ہماری گاڑی کی ڈکی میں چھپ جاؤ گی۔ قبرستان کے باہر جب سب چلے جائیں تو تم اتر کر رکشے سے بس اڈے پہنچو گی۔ وہاں کراچی جانے والی کسی بھی بس پر بیٹھ جانا اور سہراب گوٹھ میں اتر کر اس پتے پر چلی جانا۔ جب ہم آئیں گے تو موقع دیکھ کر تمہیں لے آئیں گے۔“

خالہ نے مجھے ایک کاغذ دیا جس پر پتا لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ سارا سامان لینا ممکن نہیں تھا۔ بس چند جوڑے اور اہم چیزیں خاص طور سے ڈاکومنٹس رکھ لیے۔ کچھ رقم اور زیور تھا وہ بھی رکھ لیا۔ خالہ نے کہا کہ باقی سامان وہ لے آئیں گے۔ ممکن ہے انہیں آنے میں دیر لگے اس لیے میں گھبراؤں نہیں۔ خالو کو مکان اور دکان کا بندوبست بھی کرنا تھا اس لیے دیر ہو سکتی تھی۔ خالہ نے مجھے ایک سم بھی دی کہ میں اپنی سم کی بجائے اسے اپنے موبائل میں لگا لوں۔ وہ اسی پر مجھ سے رابطہ رکھتیں۔ میں اسی سم سے بوقت ضرورت ان سے رابطہ کرسکتی تھی۔ جنازے صبح نو بجے اٹھانے تھے۔ بابا کی پک اپ باہر کھڑی ہوتی تھی۔ ہماری کار کراچی میں پولیس کی تحویل میں تھی اس لیے خالو کی کار صحن میں کھڑی کردی گئی تھی۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے خالہ نے مجھے لے جا کر ڈکی میں چھپا دیا تھا۔ روشنی ہونے کے بعد میری گمشدگی کا ڈراما ہونا تھا اس کے بعد میری تلاش کا ڈراما ہوتا۔

امکان یہی تھا کہ کار کی ڈکی کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی توجہ دیتا اور میں پکڑی جاتی۔ گرمی ابھی خاصی تھی اور کچھ ہی دیر میں میرا حشر ہو گیا جب کہ مجھے کئی گھنٹے اس میں گزارنے تھے۔ خالہ نے مجھے چھپانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ موبائل وائبریٹ پر رکھوں اور جب خالو مجھے سگنل دیں تو میں ڈکی سے نکل آؤں۔ بیگ کے ساتھ ایک عبایا بھی تھا۔ میں عبایا پہن کر دوسروں کی نظروں سے محفوظ ہو جاتی۔ مگر جب تک مجھے ڈکی میں رہنا تھا۔ یہ چند گھنٹے میں نے کیسے گزارے یہ میں ہی جانتی ہوں۔ باہر کئی بار میری تلاش کا شور اٹھا۔ خالہ نے امی کو نہیں بتایا تھا اسی لیے ان کے رونے میں حقیقی کی تڑپ تھی اور وہ دوسروں سے کہہ رہی تھیں کہ میری رباب کو تلاش کر کے لاؤ۔ باہر بھی اس حوالے سے بھاگ دوڑ جاری تھی۔ ایک بار خالو چند آدمیوں کے ساتھ اندر آئے وہ شبہ ظاہر کر رہے تھے کہ مجھے شاید ان ہی لوگوں نے اغوا کیا ہے جو پہلے بھی اٹھا لے گئے تھے۔

مگر مرد ان سے اختلاف کر رہے تھے کہ اتنے پہرے میں کون یہاں تک آسکتا ہے؟ گویا یہ بات درست تھی کہ پہلے ہی پہرہ لگا دیا گیا تھا کہ میں فرار نہ ہو سکوں۔ خالو نے کہا کہ جنازہ اٹھا لیتے ہیں اس کے بعد ایف آئی آر درج کرائیں گے۔ کچھ دیر میں ایمبولینس میں بابا اور بھائی کی میتیں آگئیں۔ گھر میں ایک بار پھر رونے دھونے کا شور بلند ہوا۔ میں ڈکی میں اپنے منہ میں دوپٹا ٹھونس کر رو رہی تھی کہ آواز ڈکی سے باہر نہ جائے۔ نو بجے جنازے اٹھے تو خالو بھی اپنی کار لے کر نکلے تھے۔ ان کی کار میں کئی افراد اور تھے کیونکہ ان کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ قبرستان ہمارے محلے سے کچھ ہی دور ہے۔ گاڑی خالو نے ایسی جگہ روکی جو قبرستان کی گزرگاہ سے دور تھی۔ یہ انہوں نے میری آسانی کے لیے کیا پھر سب مرد جنازے لے کر اندر چلے گئے۔ میں نے موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد موبائل وائبریٹ ہوا۔ میں نے دیکھا خالو کا نمبر آ رہا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں نکل جاؤں۔ ڈکی اندر سے آرام سے کھل جاتی تھی میں نے کھولا اور اپنا بیگ اور عبایا لے کر باہر آئی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے ایک طرف چل پڑی۔ پھر ایک جگہ موقع دیکھ کر میں نے عبایا پہن لیا۔ رکشا مجھے چند منٹ بعد مل گیا اور اس نے مجھے پندرہ منٹ میں بس اڈے پر پہنچا دیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کراچی جانے والی ایک بس بالکل تیار تھی اور اس میں جگہ تھی۔ میں سوار ہو گئی ٹکٹ بنوا لیا۔ سوا دس بجے بس حرکت میں آئی اور گیارہ بجے تک میں حیدرآباد کی حدود سے نکل چکی تھی۔ اگرچہ محفوظ اب بھی نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اطمینان محسوس ہوا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے بس سہراب گوٹھ پہنچی تو میں وہیں اتر گئی۔ کراچی میں موسم اچھا تھا یا مجھے اچھا

لگا۔ گرمی اتنی شدت کی نہیں تھی۔ میں نے چند رکشے والوں سے بات کی اور جس نے پتے پر پہنچانے کا دعویٰ کیا اس کے رکشے میں بیٹھ گئی۔

پتا ایف بی ایریا کا تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور مجھے ایک فلیٹ تک جانا تھا۔ گیٹ پر موجود گارڈ نے میری رہنمائی کی اور میں دوسری منزل پر واقع اس فلیٹ تک پہنچی اور کال بیل بجائی تو ایک خاتون نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تذبذب کے ساتھ اپنا تعارف کرایا اور خالہ کا حوالہ دیا تو خاتون پُرجوش ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ "مجھے صبیحہ کی کال آگئی تھی تم باہر کیوں کھڑی ہو آؤ اندر آؤ۔"

فلیٹ اندر سے صاف ستھرا اور سجا سنورا ہوا تھا۔ "میرا نام ریحانہ ہے اور میں صبیحہ کی بچپن کی دوست ہوں۔ ہم اسکول سے کالج تک کلاس فیلو رہے ہیں۔ یہ عبایا اتار دو.... یہاں کوئی نہیں ہے۔ میری بیٹیاں کالج سے آنے والی ہیں اور میاں شام کو آتے ہیں۔"

میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ ڈکی میں بند بند میرا حشر ہو گیا تھا۔ ریحانہ آنٹی نے غسل کا مشورہ دیا اور مجھے غسل خانہ دکھایا۔ جب تک میں نہائی دھوئی ریحانہ آنٹی کی دونوں بیٹیاں کالج سے آگئی تھیں۔ ایک میری ہم عمر تھی اور دوسری دو سال چھوٹی تھی۔ ریحانہ آنٹی کی طرح ان کی بیٹیاں بھی دوستانہ فطرت کی تھیں اس لیے میں تین دن ان لوگوں کے ساتھ بہت سکون سے رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بابا اور انور کا دکھ ہلکا ہو رہا تھا مگر اب مجھے امی کی فکر ہو رہی تھی۔ خالہ دن میں ایک دو بار ایس ایم ایس کرتی تھیں کہ سب ٹھیک ہے اور وہ جلد کراچی آجائیں گی۔ لیکن انہیں آنے میں تین دن لگ گئے تھے۔ خالو نے برادری والوں سے مل کر مخالف برادری پر میرے اغوا کی ایف آئی آر درج کرادی تھی۔ اگرچہ وہ ایک بار مجھے اغوا کر چکے تھے اور اس قابل تھے کہ ان پر ایف آئی آر کٹوائی جاتی لیکن اس بار یہ ایف آئی آر دراصل مجھے میری اپنی برادری سے بچانے کے لیے کٹوائی گئی تھی۔

مکان بند کر دیا تھا اور دکان فروخت پر لگا دی۔ امی کا ارادہ تھا کہ دونوں چیزیں فروخت کر کے ہمیشہ کے لیے کراچی آجائیں گی۔ خالو نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کرلی تھیں جو وراثت کی منتقلی کا کام کرواتا اور اس کے لیے امی کا حیدرآباد جانا بھی ضروری نہیں تھا۔ چار دن بعد جب میں امی سے ملی تو وہ مجھ سے لپٹ کر دیر تک روتی رہیں۔ معاملہ تازہ تھا اور اس کا خدشہ تھا کہ برادری والے پیچھا اور جاسوسی کرتے کہیں کراچی تک نہ چلے آئیں۔ اس لیے مجھے چھپا کر خالہ کے گھر تک لایا گیا تھا اور بہت دن میں اندر والے کمروں میں رہی۔ امی مجھے باہر تو کیا، صحن اور چھت پر بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ دو مہینے بعد سب امی کے نام ہو گیا تو انہوں نے سب فروخت کر دیا۔ عجلت میں بیچنے کی وجہ سے قیمت کم ملی تھی۔ پھر بھی دکان، مکان اور گاڑی کی قیمت کے ملا کر ایک کروڑ روپے مل گئے تھے۔

امی نے خالہ اور خالو کے مشورے سے ان کے بنگلے کی چھت پر دو کمرے اور ایک لاؤنج بنوا لیا جس میں کچن بھی تھا۔ اس میں زیادہ خرچا نہیں آیا تھا۔ باقی رقم سے امی نے خالو کے مشورے سے اچھے اچھے پروجیکٹس میں فلیٹس لے کر کرائے پر چڑھا دیے۔ ان سے ماہانہ چالیس پچاس ہزار روپے ملنے لگے تھے جو ہم ماں بیٹی کے لیے کافی تھے۔ اس طرف سے اطمینان ہوا تو امی کو میری فکر لاحق ہوئی۔ ان ہی دنوں صائم کی شادی کے سلسلے میں بات ہو رہی تھی۔ اس کی منگیتر نے تعلیم مکمل کرلی تھی۔ جب کہ صائم جاب کے ساتھ آگے پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے تھے۔ خالہ اور صائم دونوں ہی شادی کے لیے تیار تھے۔ علینا نے تاریخ طے ہونے سے پہلے صائم کی شادی کی شاپنگ شروع کر دی تھی۔ کئی مہینے گزر جانے کے بعد مجھے اعتماد آگیا تھا اور میں بھی کبھی باہر چلی جاتی۔ لیکن باہر جاتے ہوئے میں مکمل عبائے اور نقاب میں ہوتی تھی۔ شروع میں احتیاط کی وجہ سے ایسا کیا لیکن بعد میں مجھے عادت ہو گئی۔

اس روز بھی میں اور علینا اپنی گاڑی میں تھے۔ خالو نے کوشش کر کے ہماری کار پولیس کی تحویل سے نکلوا دی تھی۔ اس کا حشر ہو گیا تھا۔ مرمت پر اچھا خاصا خرچ آیا تھا۔ مگر ہمیں آنے جانے کے لیے اپنی گاڑی مل گئی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی لیکن صرف کالونی کی سڑکوں پر چلاتی تھی۔ باہر جاتے ہوئے علینا ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ ہم نزدیک ہی ایک شاپنگ مال تک آئے۔ وہاں کئی گھنٹے خریداری میں گزر گئے اور جب باہر نکلے تو میں چونک گئی۔ ہماری گاڑی کے پاس ایک جانا پہچانا شخص کھڑا تھا اور وہ ہماری برادری کا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے اسے پہلے دیکھ لیا اور ہراساں ہو کر علینا کو بھی بتا دیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی، اس نے کہا۔ "تم یہاں رکو میں اس سے پوچھتی ہوں کہ یہ

ہماری گاڑی کے پاس کیا کر رہا ہے؟"

"نہیں تم انہیں جانتی نہیں ہو یہ بہت وحشی ہوتے ہیں تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہ کریں۔ اس لیے بات کرنے کے بجائے تم گاڑی لے کر بہ ظاہر یہاں سے جاؤ لیکن مال کے پیچھے والے حصے میں آجانا۔"

علینا نے ایسا ہی کیا وہ اس شخص کو نظر انداز کر کے سامان سمیت گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی پارکنگ سے نکال کر لے گئی۔ وہ شخص مایوس نظر آنے لگا کیونکہ اسے میری تلاش تھی۔ علینا کا چہرہ کھلا تھا۔ اس نے صرف عبایا پہن رکھا تھا۔ جب تک میں شاپنگ مال کے پچھلے حصے میں پہنچی وہ گاڑی لے کر آ گئی تھی اور میرے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی دوڑا دی۔ کالونی آنے تک ہم بار بار پیچھے دیکھتے رہے کہ کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ گھر پہنچ کر ہمارے دم میں دم آیا لیکن جب میں نے امی اور خالہ کو بتایا تو ان کا دم خشک ہو گیا تھا۔ شام کو خالو آئے تو اس سلسلے میں میٹنگ ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ مجھے یہاں سے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ صائم بھی اسکائپ پر آ گئے تھے اور انہوں نے مشورہ دیا۔ "رباب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے آسٹریلیا بھیج دیں۔"

خالہ نے اعتراض کیا۔ "وہاں یہ اکیلی کیسے رہے گی؟"

"صبا کیسے رہ رہی ہے؟" صائم نے اپنی منگیتر کا نام لیا۔ "ایسے ہی رباب بھی رہے گی یہ یہاں بالکل محفوظ ہو گی۔ میں اس کا یہاں داخلہ کرا دیتا ہوں اس کی بنیاد پر اسے ویزا مل جائے گا اور یہ یہاں آ جائے۔"

امی مجھے اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھیں مگر برادری کے آدمی کا یہاں پایا جانا ایسی بات نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جاتا اس لیے وہ مجبوراً مان گئیں۔ صائم نے تسلی دی تھی کہ اگر رباب کو آسٹریلیا کی شہریت مل گئی تو امی بھی وہاں آسکیں گی جیسے صائم کو مل گئی تھی تو اب خالہ اور خالو وہاں جا سکتے تھے۔ بلکہ صائم نے کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی خالو ریٹائر ہوں گے وہ سب کو وہیں بلا لیں گے۔ اس وقت تک علینا کی شادی ہو جاتی۔ اگرچہ علینا کی خواہش تھی کہ وہ بھی آسٹریلیا جائے مگر خالہ اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ امی کے ماننے کے بعد خالو نے سب سے پہلے میرا پاسپورٹ بنوایا اور اس دوران میں صائم نے سڈنی کی ایک یونیورسٹی میں میرا ماسٹر میں داخلہ کرا دیا۔ میں نے یہاں ویزے کے لیے درخواست دی اور ساتھ ہی انگلش لینگویج کورس بھی کرنے لگی کیونکہ گریجویشن میں بہت اچھے مارکس کے باوجود میری انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی۔ صائم نے بتایا تھا کہ مجھے وہاں جا کر پیپرز دینے ہوں گے اور جب میں ان کے معیار پر پورا اتروں گی تو مجھے ماسٹر میں داخلہ ملے گا۔

مجھے ویزا مل گیا اور میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ ان ہی دنوں اچانک صائم کی منگیتر صبا نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ صائم اور خالہ کے گھر والے حیران رہ گئے تھے۔ یہ اطلاع ہمیں صبا کے گھر والوں سے ملی تھی۔ صائم نے صبا سے پوچھا کہ اس نے کیوں انکار کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ اس کا ذہن بدل گیا ہے اب وہ صائم سے شادی نہیں کر سکتی ہے۔ صائم نے کھوج لگایا کہ اس کے پس پشت کیا بات ہے تو اسے پتا چلا کہ صبا جہاں جاب کر رہی تھی وہاں اس کی ایک مقامی آدمی سے ملاقات ہوئی اور وہ صائم کو بھول کر اس کے چکر میں پڑ گئی۔ صائم کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ خالہ اور باقی سب بھی شاک میں تھے۔ علینا نے تو خاصی تیاری بھی کر لی تھی۔ خود میں بھی دکھی تھی۔ خالہ کے گھر کی مکمل خوشی تھی اور وہ یوں اچانک ملیامیٹ ہو گئی۔

یہ سب ہو جانے کے باوجود میرے ذہن میں صائم کا خیال نہیں آیا تھا۔ امی اور خالہ نے آپس میں کچھ بات کی اور ایک رات امی نے مجھ سے صائم کے بارے میں پوچھا۔ "صبیحہ چاہتی ہے کہ اس کی جلد از جلد شادی کر دی جائے اور وہ پہلے ہی تمہیں چاہتی تھی۔"

خود میرے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ہاں کر دی اور میری روانگی سے پہلے صائم سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ اب وہ اپنی بیوی کو ریسیو کرتے۔ اس خوشی کے موقع پر سب کسی قدر افسردہ بھی تھے کہ وہ ہماری شادی کو اس بھرپور انداز میں نہیں کر سکیں گے جس طرح کرنا چاہتے تھے اور وجہ وہی تھی کہ میں تقریباً روپوش زندگی گزار رہی تھی۔ کل میری آسٹریلیا روانگی ہے اور جانے سے پہلے میں اپنی یہ سچ بیانی اپنے پسندیدہ پرچے سرگزشت کے لیے بھیج رہی ہوں مجھے امید ہے یہ شائع ہو گی اور لوگوں کو مزید پتا چلے گا کہ بعض لوگوں کے لیے اس ملک میں رہنا اور زندہ رہنا کتنا دشوار بنا دیا جاتا ہے اور انہیں وطن چھوڑ کر دیارِ غیر میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ امکان ہے کہ میں بھی اب کبھی واپس نہیں آسکوں گی۔ صائم نے سوچ لیا ہے کہ وہ ایک سال کے اندر باقی سب کو بھی آسٹریلیا بلوا لیں گے۔ اللہ کرے یہ کام خیر و خوبی سے ہو جائے آمین۔

مرد ناداں

محترم ومکرم معراج رسول

مودبانہ آداب

ہمارا معاشرہ کس رخ پر جارہا ہے اس کے لیے صرف اتنا کہہ دوں کہ تباہی مقدر بننے والی ہے اگر لوگوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے۔ کاش قیصر صاحب یہ غلطی نہ کرتے تو شاید اتنا بڑا حادثہ نہ ہوتا، قارئین کو بیدار کرنے کے لیے میں نے یہ واقعہ من وعن لکھ دیا ہے۔ اب لوگ سبق حاصل کریں نہ کریں یہ ان کی مرضی ہے۔

شمس احمد
(لاہور)۔

اس بات کو چار برس گزرے۔ قیصر صاحب ہمارے گھر کے سامنے رہتے تھے اور ان سے میرے ابو کی بہت اچھی دوستی تھی۔ ابو عمر میں ان سے خاصے بڑے تھے۔ ابو پچاس کے تھے اور وہ چالیس کے تھے۔ دونوں ساتھ ہی ایک ہی مارکیٹ میں کام کرتے تھے اس لیے دوستی ہوگئی تھی۔ پھر پڑوسی بھی تھے۔ قیصر صاحب تاجر تھے اور ہول سیل کا کام کرتے تھے۔ اچھا کماتے تھے تبھی اس پوش سوسائٹی میں یہ دو سو گز کا گھر بنالیا تھا۔ گھر میں ہر سہولت اور

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آسائش تھی۔ ان کے چاروں بچے ایک اعلیٰ درجے کے اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کے پاس تقریباً نئی کار تھی۔ خرچ بھی کھلا تھا۔ ہر ہفتے کہیں باہر جا رہے ہوتے تھے، کبھی تفریح پر اور کبھی باہر کھانے پر۔ آنا جانا اور مہمان نوازی بھی بہت تھی۔ رشتے دار محدود تھے۔ لیکن دوست احباب بہت تھے اور پھر محلے والوں سے ملنا ملانا تھا۔ ان کے چاروں بچے جو سب بیٹے تھے بہت پیارے اور دوستانہ فطرت رکھتے تھے اس لیے محلے میں سب بچوں سے ان کی بنتی تھی۔ سب سے بڑا پندرہ سال کا تھا اور سب سے چھوٹا آٹھ سال۔ کھیل کود اور پڑھنے میں ہی نہیں محلے والوں کے کام آنے میں بھی آگے آگے تھے۔ کسی خاتون کو دکان سے کچھ منگوانا ہوتا اور گھر میں کوئی نہ ہوتا تو وہ بلا جھجک ان سے کہہ دیتی تھی اور وہ فوراً لا کر دے دیتے تھے۔

قیصر صاحب آزاد خیال تھے۔ میں نے ان کو جمعے کی نماز کے لیے بھی جاتے نہیں دیکھا۔ بس عید بقر عید پر چلے جاتے تھے۔ کلین شیو تھے اور بڑے ماڈرن انداز کے بال رکھے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ بھی ایسی ہی کرتے تھے۔ البتہ ان کی بیگم اتنی آزاد خیال نہیں تھیں۔ باہر ڈھک چھپ کر جاتی تھیں۔ باقاعدہ پردہ تو نہیں کرتی تھیں مگر چادر لیتی تھیں۔ میں نے بھی ان کو خالی سر نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی ہمارے ہاں آتی تھیں تو اسی طرح آتی تھیں۔ اسی سے زیادہ ان کی میری بیوی راحیلہ سے بنتی تھی۔ میری شادی ایک سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ مسز قیصر کا نام شگفتہ تھا اور وہ چھتیس سے زیادہ کی نہیں تھیں۔ مگر دیکھنے میں تیس کی بھی نہیں لگتی تھیں۔ چہرے کے نقوش بہت خوب صورت اور معصومانہ تھے۔ جسم ڈھکا چھپا ہوتا تھا پھر بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس لحاظ سے بھی خوب صورت ہیں۔ چار بچوں کے باوجود ان کی خوب صورتی ماند نہیں پڑی تھی۔ راحیلہ نے بھی ایک دو بار مجھ سے کہا تھا کہ شگفتہ باجی بہت خوب صورت ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ چھتیس برس کی اور چار بچوں کی ماں ہیں۔

میرے ابو حمزہ احمد بھی اسی مارکیٹ میں کام کرتے تھے۔ ان کا کام بیک وقت ہول سیل اور ریٹیل کا تھا۔ میں امی ابو کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ میرے بعد ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں... ابو چاہتے تھے کہ میں تعلیم حاصل کر کے ان کے ساتھ کام کروں مگر میں نے آئی ٹی کی فیلڈ چنی اور... بی ایس کے بعد ایک فرم میں جاب کر رہا تھا۔ جاب کے دو سال بعد میری شادی ہو گئی۔ مجھ سے چھوٹا شہزاد ایم بی اے کر رہا تھا اور دونوں بہنیں شازیہ اور ثمرین ابھی کالج میں تھیں۔ قیصر صاحب کے بچے ہماری عمروں سے مختلف تھے۔ میں چھبیس برس کا تھا اور شہزاد بیس کا تھا۔ اس لیے بچوں سے بس ہیلو ہائے تھی۔ البتہ کبھی کبھی قیصر صاحب سے بات ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ انہیں کمپیوٹر کے معاملے میں میری مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔ جیسے ونڈوز یا کوئی سافٹ ویئر انسٹال کرنا ہو یا پھر کوئی مسئلہ ہو تو اسے حل کرنا ہو۔ وہ اپنی عادت کے مطابق مجھ سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے مگر میں حفظِ مراتب کے پیشِ نظر ان سے ہمیشہ ایک خاص احترام سے ملتا تھا۔

قیصر صاحب کمپیوٹر، ٹی وی اور موبائل کے شوقین تھے۔ ان کے پاس اس وقت چالیس انچ کا نیا ایل سی ڈی ٹی وی تھا۔ اپنا لیپ ٹاپ الگ تھا۔ گھر کے لیے جدید ترین کمپیوٹر رکھا ہوا تھا اور ان کے اور ان کی بیگم کے پاس آئی فون تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس قسم کے آلات کے کتنے شوقین تھے۔ اکثر ان پر ہی مجھ سے بات کرتے تھے خاص طور سے کمپیوٹر پر کیونکہ یہ میری فیلڈ تھی۔ اس شام میں آفس سے آ رہا تھا کہ قیصر صاحب اپنے گیٹ پر دکھائی دیے۔ وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہے تھے اور انہوں نے بات کرتے ہوئے مجھے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔ وہ بات کر کے میری طرف آئے۔ "اچھا ہوا یار تم مل گئے... میرا لیپ ٹاپ تھوڑا مسئلہ کر رہا ہے اسے دیکھ لو۔"

"کیا مسئلہ کر رہا ہے؟"

"ڈیسک ٹاپ پر موجود فولڈرز اوپن کرنا چاہوں تو وہ نہیں کھل رہے ہیں۔ ہاں ڈرائیو میں جا کر اوپن کروں تو کھل رہے ہیں۔ بڑی مشکل ہوتی ہے بار بار ڈرائیو میں گھسنا پڑتا ہے۔"

"فوری دیکھنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یار فریش ہو کر آ جاؤ۔" وہ بولے۔ "میں گھر پر ہی ہوں۔"

"میں آتا ہوں۔" میں نے کہا اور بائیک کھڑی کر کے اندر چلا گیا۔ راحیلہ کو بتایا اور پھر فریش ہو کر چینج کر کے آدھے گھنٹے بعد قیصر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے کال بیل بجائی تو ان کے بڑے بیٹے ثمر نے دروازہ کھولا۔

"جی انکل۔"

"قیصر صاحب نے بلایا تھا لیپ ٹاپ میں کوئی مسئلہ ہے۔"

"آپ آ جائیں ابو تو گئے ہوئے ہیں۔" اس نے کہا۔

"گئے ہوئے ہیں تو میں پھر آ جاؤں گا۔"

"آپ آ جائیں انکل... ابو کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔ ان کا فون آیا تھا۔"

میں نے سوچا اور اندر چلا گیا۔ ثمر نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کچھ دیر بعد لیپ ٹاپ لے آیا۔ اس نے لیپ ٹاپ سامنے میز پر رکھا اور بولا۔ "امی پوچھ رہی ہیں کیا لیں گے؟"

"تکلف نہ کریں میں بس یہ دیکھنے آیا ہوں۔" میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ثمر اندر گیا تو میں نے لیپ ٹاپ اٹھا کر آن کیا۔ یہ ڈیل کا جدید لیپ ٹاپ تھا اور خاصا مہنگا بھی تھا۔ قیصر صاحب نے مسئلہ بتا دیا تھا میں اسی لحاظ سے چیک کرنے لگا۔ فولڈرز سیٹنگ میں گڑبڑ ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کا ہڈن آپشن ختم کیا جس میں فولڈرز چھپا دیے جاتے ہیں پھر سیٹنگ چینج کی اور اس کے بعد ڈرائیو کے اندر جا کر فولڈرز کھول کر چیک کرنے لگا۔ سی ڈرائیو میں مائی ڈاکومنٹس اوپن کی تو اس میں ایک چھپا ہوا فولڈر موجود تھا۔ اس پر مائی لو لکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ فولڈر نہیں کھولنا چاہیے تھا مگر نہ جانے کیوں میں نے کھول لیا۔ اس میں تصاویر تھیں۔ میں نے پہلی تصویر پر کلک کی تو وہ ونڈو فوٹو ویور میں کھل گئی اور یہ شگفتہ کی تصویر تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں اور بغیر دوپٹے کے بے تکلفانہ سا پوز تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ صاف لگ رہا تھا یہ تصویر قیصر صاحب نے کھینچی تھی۔ میں نے تصویر بدلی اور پھر بدلتا چلا گیا۔ اچانک ایک ایسی تصویر آئی کہ مجھے پسینا آ گیا۔ اس میں شگفتہ نے بہت مختصری نائٹی پہنی ہوئی تھی۔ جس میں ان کا جسم جھلک رہا تھا اور بہت سا جسم تو نائٹی سے باہر ہی تھا۔ میں نے آج تک ان کا چہرہ ہی دیکھا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ بہت خوب صورت اور معصومانہ سے نقوش رکھتی تھیں۔ جسم پہلی بار دیکھا تھا اور وہ جسمانی طور پر بھی بہت پرکشش تھیں۔ میں نے گھبرا کر فائل بند کر دی اور پھر فولڈر بھی بند کر دیا۔ سیٹنگ ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے دوبارہ ہڈن آپشن سیٹ کر دیا۔ اب فولڈر لیپ ٹاپ سے بھی کھل رہے تھے۔ میں نے کمپیوٹر بند کیا اور ثمر کو آواز دی۔ وہ شربت کا گلاس ٹرے میں رکھے ہوئے آیا۔ "جی انکل۔"

"ہو گیا۔" میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی، انکل شربت تو پی لیں۔"

مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی گلا خشک ہو رہا تھا میں نے گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور ٹرے پر رکھتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ گلی میں نکل کر میں نے کچھ دیر وہیں رک کر اپنی حالت درست کی۔ امی ابو نے ہم بہن بھائیوں کی پرورش اس طرح کی تھی کہ اگر کبھی برائی کی طرف قدم اٹھیں بھی تو مارے شرمندگی کے فوراً واپس آ جائیں۔ میں میٹرک کے زمانے سے کمپیوٹر استعمال کر رہا ہوں۔ لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ میں نے اس کا غلط استعمال کیا ہو جو ہمارے ملک میں بہت عام ہے۔ اگر کبھی کیا بھی تو اس سے خوشی نہیں ہوئی بلکہ بے چینی سی ہوئی اور پھر میں نے آیندہ ایسا نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ خوش قسمتی سے دوست بھی ایسے ملے تھے جو پڑھنے لکھنے والے اور سلجھے ہوئے ذہن کے تھے۔ اس لیے ہم بھائیوں میں تینوں بڑے اور کمپیوٹر کا مثبت استعمال کیا تھا۔

میں انٹر کے دوران ہی چھوٹے موٹے سافٹ ویئر بنانے لگا تھا۔ پھر بی سی ایس کیا تو اپنی اسی صلاحیت کی وجہ سے مجھے اس آئی ٹی فرم میں جاب مل گئی جس کا شمار پاکستان کی بڑی آئی ٹی کمپنیز میں ہوتا ہے۔ ہیڈ آفس لاہور میں ہے لیکن کراچی کا آفس بھی خاصا بڑا ہے۔ میں اس کے سافٹ ویئر ڈیولپر اینڈ سروس کے شعبے میں کام کرتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جاب کے کچھ عرصے بعد ایم سی ایس کروں گا۔ مگر جاب میں ایسا لگا اور پھر شادی ہو گئی تو اب تک موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اپنی معلومات اپ ڈیٹ کرتا رہتا تھا۔ دراصل یہ فیلڈ ہی ایسی ہے کہ اس میں روز ہی کوئی نہ کوئی اپ ڈیٹ آتی ہے۔ اس لیے کمپیوٹر سے متعلق کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں میری معلومات نہ ہوں۔ سافٹ ویئر سے لے کر ہارڈ ویئر تک اور نیٹ ورکنگ سے لے کر انٹرنیٹ تک سب کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے؟

میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے نوجوان دوسری ٹیکنالوجی کی طرح کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا بیشتر وقت نام نہاد سوشل نیٹ ورکس اور غلط سلط ویب سائٹس دیکھنے میں گزرتا ہے۔ اس سے صرف ان کا قیمتی وقت اور پیسا ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنا دماغ اور جسم بھی بگاڑ لیتے ہیں۔ پہلے انٹرنیٹ کیفے برائی کا گڑھ بنے ہوئے تھے لیکن جب سے کمپیوٹرز سستے ہوئے اور خاص طور

سے لیپ ٹاپ اور اسمارٹ فون آئے تو یہ سب اتنا آسان ہو گیا کہ اب انڈر ایج بچے بھی سب جانتے ہیں کیونکہ وہ سب دیکھتے ہیں اور ماں باپ یا ان کے بڑوں کو پتا ہی نہیں چلتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اتنی تیزی سے بگاڑ کی طرف جا رہا ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تصور تو اس وقت کیا جائے گا جب لوگ یا معاشرے کے ٹھیکیدار اس بارے میں سوچیں اور لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی کوئی مہم چلائیں یہاں تو سب سوئے ہوئے ہیں۔

میرے ایک کولیگ نے اتفاق سے اپنے تیرہ سالہ بیٹے کا اسمارٹ فون چیک تو اس میں ایسی چیزیں نکلیں کہ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ آٹھویں میں پڑھنے والا بچہ نہ صرف فحش ویب سائٹس کا باقاعدہ وزٹ کرتا تھا بلکہ اس نے کچھ ایسے سوشل نیٹ ورک بھی جوائن کیے ہوئے تھے جہاں لائیو سب کچھ دکھایا جاتا ہے۔ اس نے بیٹے کو مارا اور اس کا اسمارٹ فون توڑ دیا۔ مگر وہ پریشان تھا جو اس کا بیٹا دیکھ چکا تھا اسے تو اس کے ذہن سے نہیں نکال سکتا تھا۔ ایک دن وہ دفتر میں سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا تو پھٹ پڑا... اس نے مجھے بیٹے کے بارے میں سب بتایا۔ میں سوائے افسوس کے اور کیا کرسکتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دے۔ ابو نے ہمارے ساتھ یہی کیا تھا کاروباری ہونے کے باوجود وہ ہمیں پورا وقت دیتے تھے اور ہماری ہر سرگرمی پر نظر رکھتے تھے۔ والدین بچوں کی جاسوسی نہ کریں صرف ان کے معمولات پر نظر رکھیں تو اس سے ہی انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا بچہ کیا کر رہا ہے؟

مگر یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارے ہاں میچور اور اتنی عمر و سمجھ والے لوگ بھی ایسی حرکتیں کرسکتے ہیں۔ قیصر صاحب کے لیپ ٹاپ کے اس چھپے فولڈر میں بلا مبالغہ سیکڑوں تصاویر تھیں، میں نے چند ایک ہی دیکھی تھیں اور یقیناً آگے اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز تصاویر ہو سکتی تھیں... یہ بہت آسان کام تھا آئی فون یا ڈیجیٹل کیمرے سے تصویر لے کر اسے لیپ ٹاپ میں منتقل کر دیتا۔ یقیناً یہ سب وہ اپنی کسی حس کو تسکین پہنچانے کے لیے کرتے تھے۔ دوران طالب علمی اگر وقت ملتا تھا تو میں ڈائجسٹ پڑھ لیتا تھا اور ان میں ایسی کہانیاں بھی پڑھیں کہ شوقین مزاج لوگ اپنی بیویوں کی خاص تصاویر بناتے تھے اور انہیں چھپا کر رکھتے تھے۔ وہ سب دولت مند اور ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ہماری ایلیٹ کلاس تو شروع سے آزاد خیال رہی ہے۔

مگر میں نے سوچا نہیں تھا کہ مڈل کلاس بھی ایسے شوق رکھتی ہے۔ شاید یہ سب انسان کی فطرت میں ہے۔ دولت مندوں کو ذرائع میسر تھے تو انہوں نے بہت پہلے یہ سب کر لیا تھا۔ مڈل کلاس کو ٹیکنالوجی کی ترقی سے یہ موقع ملا ہے تو وہ اب یہ سب کر رہے ہیں۔ میں نے بتایا نا کہ قیصر صاحب ذرا آزاد خیال شخص تھے مگر مجھے شگفتہ پر حیرت تھی، وہ تو ڈھکی چھپی رہنے والی خاتون تھیں، انہوں نے ایسی تصاویر بنوانے پر آمادگی کیوں ظاہر کی؟ مجھے یاد ہے شادی کے ابتدائی دنوں میں جب انسان کو ویسے ہی شوق ہو رہے ہوتے ہیں تو میں نے راحیلہ کی ایک تصویر لی تھی۔ جس میں وہ بنا دوپٹے کے تھی تو اس نے جب تک وہ تصویر ڈیلیٹ نہیں کرالی اسے چین نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایک تصویر ہی تو ہے۔"

"ہاں لیکن میں اس طرح تصویر بنوانے کی قائل نہیں ہوں اسے کوئی اور بھی دیکھ سکتا ہے۔"

راحیلہ گھر سے باہر مکمل عبایا اور نقاب کے ساتھ جاتی تھی۔

"کیسے یہ میرا موبائل ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے سوا کون دیکھے گا؟"

"کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کسی کے ہاتھ لگ جائے وہ کھول لے یا آپ سے خدانخواستہ چھن جائے تو کوئی اور نہیں دیکھ لے گا۔"

میں کسی قدر قائل ہوا تھا مگر اسے چھیڑنے کے لیے بحث جاری رکھی۔ "تو میں اس پر سیکیورٹی کوڈ لگا دوں گا۔"

"آپ ہی نے بتایا تھا کہ سیکیورٹی کوڈ صرف دل بہلانے والی چیزیں ہیں، ماہرین ایک سیکنڈ میں انہیں کھول لیتے ہیں۔" اس نے لاجواب کرتے ہوئے کہا۔ میں ہنس دیا تھا۔

"اچھا بابا اب خیال رکھوں گا آئندہ ایسی تصاویر نہیں لوں گا۔"

"ضرورت بھی کیا ہے، میں آپ کی ہوں جیسے چاہیں جب چاہیں دیکھیں۔" اس نے کہا تو میں نے شرارت سے پوچھا۔

"جیسے اور جب چاہوں۔"

راحیلہ شرما گئی۔ "میں ایک بات کر رہی ہوں، زیادہ فری ہونے کی نہیں ہو رہی۔"

راحیلہ امی ابو کی پسند تھی اور شادی کے بعد میری پسند

بن گئی۔ اس میں حسن اور دل کشی سے زیادہ اس کی سوچ اور سلیقے کا دخل تھا۔ وہ اتنی اچھی سوچ کی مالک ہے کہ میں اس سے سیکھتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے نہ جانے میری کس نیکی کے بدلے مجھے ایسی بیوی دی ہے۔ میں اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا ہوں لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں اس سے کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ مجھے تو خود اس کے بارے میں سوچتے یا تصور کرتے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور میں بار بار سوچ رہا تھا کہ کاش میں نے وہ فولڈر کھولا ہی نہ ہوتا۔ مگر یہ سچ ہے کہ شیطان انسان کے اندر لہو کی طرح رہتا ہے اور اسے ایک لمحے میں گمراہ کر دیتا ہے۔ اگر میں ایک لمحے کو سوچتا تو شاید کبھی اسے نہ کھولتا مگر مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی اور اس سے پہلے میں فولڈر کھول چکا تھا۔ اس کے بعد بھی میں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مکمل ہوئی تصویر سامنے نہیں آئی تھی اور یہ میری غلطی تھی۔

میں گھر آیا تو راحیلہ نے کھانے کا پوچھا مگر مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے بہانہ کر دیا کہ آج شام آفس میں پزا کھایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہر عورت راحیلہ کی طرح مضبوط اور سمجھدار کیوں نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح راحیلہ نے مجھے سمجھایا تھا کیا اسی طرح شگفتہ اپنے شوہر کو نہیں سمجھا سکتی تھیں۔ مگر کیا کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سمجھایا ہو اور قیصر صاحب نہ مانے ہوں۔ بعض شوہر اپنی خواہشات کے آگے بیوی کی بات کو اہمیت نہیں دیتے ہیں اور انہیں مجبوراً شوہر کی خواہش پر سر جھکانا پڑتا ہے۔ شاید یہ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ ایک غیر مرد نے ان کی بیوی کو اس حال میں دیکھ لیا جس میں دیکھنے کا حق صرف شوہر کا ہوتا ہے۔ قیصر صاحب تصاویر ایک خفیہ فولڈر میں چھپا کر مطمئن ہو گئے تھے حالانکہ اسے تو ایک بچہ بھی کھول سکتا ہے۔ پھر بھی کمپیوٹر میں ایسا مسئلہ ہو کہ وہ آن ہی نہ ہو اور اسے کسی کے پاس لے جانا پڑے تو اس کا بھی بہت امکان ہوتا ہے کہ وہ یہ فولڈر اور اس میں موجود تصاویر دیکھ لے گا۔

میرے اسکول کے زمانے کا ایک دوست فراز ہے۔ اس نے آگے پڑھنے کے بجائے ہارڈ ویئر کورس کر کے اپنی شاپ کھول لی تھی۔ وہ سامان بھی فروخت کرتا تھا اور ونڈوز کے ساتھ دوسرے سافٹ ویئر بھی انسٹال کر کے دیتا تھا۔ پھر اس نے موبائل ریپئرنگ بھی شروع کر دی۔ فراز خود سلجھے ہوئے ذہن کا آدمی ہے مگر اس کی شاپ پر جو لڑکے کام کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔ فراز کو اکثر سامان لینے کے لیے جانا پڑتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں یہی لڑکے شاپ دیکھتے ہیں۔ ایک دن وہ سامان لینے کے لیے نکلا تھا مگر کچھ دور گیا تھا کہ حالات خراب ہو گئے اور وہ واپس آ گیا۔ مارکیٹ بند ہو گئی تھی اس لیے اس نے لڑکوں کی چھٹی کر دی۔ خود رک گیا کیونکہ اسے کچھ کام تھا۔ دونوں لڑکے جو آپس میں دوست بھی تھے عجلت میں جاتے ہوئے اپنی یو ایس بی وہیں بھول گئے۔ فراز نے ایسے ہی یو ایس بی چیک کی کیونکہ اسے علم نہیں تھا کہ وہ یہاں یو ایس بی بھی لاتے تھے۔

جب اس نے یو ایس بی کمپیوٹر سے لگا کر اوپن کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ اس میں ایسی تصاویر اور ویڈیوز بھری ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ وہ یہاں آنے والے کمپیوٹرز اور موبائل فونز سے نکالی گئی ہیں۔ ان میں بعض افراد تو فراز کے جانے پہچانے تھے اور ان میں سے بیشتر تصاویر اور ویڈیوز دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ اتفاق کی بات ہے اگلے ہی دن میں فراز کے پاس گیا تو وہ ان دونوں لڑکوں کو پھٹکار رہا تھا اور پھر اس نے ان کی چھٹی کر دی۔ یو ایس بی اس نے پہلے ہی صاف کر دی تھی۔ میں نے پوچھا تو اس نے ان کے کرتوت بتائے۔ اس پر ایک لڑکا ڈھٹائی سے بولا۔ ”ہمارا کیا قصور ہے لوگ کیوں بناتے ہیں ایسی تصویریں اور ویڈیوز... اب بھگتیں۔“

فراز نے ان کی چھٹی کرنے کے بعد مجھے سب بتایا تو میں بھی حیران ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ایسی بات ہے جس سے کوئی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والا ناواقف ہو ہی نہیں سکتا مگر میں اسے بہت چھوٹے پیمانے پر سمجھتا تھا۔ یہاں فراز نے جو بتایا اس سے تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ وبا کس قدر پھیل چکی ہے۔ صرف ایک موبائل اور کمپیوٹر شاپ پر ایک یو ایس بی میں ایسی درجنوں مختلف جوڑوں کی تصاویر اور ویڈیوز تھیں جو مجموعی طور پر یہ کتنی ہوں گی اس کا تصور بھی محال ہے۔ فراز نے بتایا کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو میچور اور شادی شدہ لگ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تصاویر اور ویڈیو بنا رکھی تھیں۔ پھر ان کو اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ اسے کمپیوٹر اور موبائل سے ڈیلیٹ کر دیں۔ اکثر بے پروائی کرتے ہیں اور یہ چیزیں غیر متعلقہ لوگوں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں یا وہ انہیں دیکھ لیتے ہیں۔

اگرچہ قیصر صاحب کے ساتھ دوسرا معاملہ تھا۔ ان کا کمپیوٹر میں نے ہی دیکھا تھا اور وہ بھی اتفاقاً۔ اس لیے یہ امکان تو نہیں تھا کہ وہ چیزیں لیک کر جائیں۔ وہ واپس آئے تو انہوں نے مجھے کال کی۔ میں اس وقت بھی گھبرا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ انہوں نے جان لیا ہے کہ میں نے خفیہ فولڈر کھول لیا تھا مگر وہ میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ "تھینک یار تم نے مسئلہ حل کر دیا ورنہ بہت مشکل ہو رہی تھی۔"

"ویلکم قیصر صاحب۔" میں نے کہا۔

"شرمندہ ہو رہا تھا تم مشکل سے پانچ منٹ بیٹھے تھے۔"

"کام ہو گیا تھا اور آپ تھے نہیں اس لیے میں بیٹھ کر کیا کرتا۔"

"ٹھیک ہے ایک بار پھر شکریہ۔"

کال بند کر کے میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ راحیلہ پاس موجود تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ "آپ ٹینشن میں کیوں ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"دیکھیں نا آپ کو اے سی میں بھی پسینا آ رہا ہے۔" اس نے میرا ماتھا چھوا۔ "آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری طبیعت ٹھیک ہے۔

اگلے دن چھٹی تھی اور میں چھٹی والے دن ذرا دیر سے اٹھتا ہوں۔ البتہ راحیلہ جلدی اٹھ جاتی ہے کیونکہ ناشتا وہی بناتی ہے۔ میں واش روم سے ہو کر آیا تو ڈرائنگ روم کی طرف سے بولنے کی آواز آئی۔ پھر راحیلہ شگفتہ کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلی۔ وہ جا رہی تھیں اور انہیں دیکھ کر مجھے بے اختیار وہ تصویر یاد آ گئی۔ وہ رکی نہیں تھیں فوراً ہی چلی گئی تھیں مگر جب تک میرے سامنے رہیں میں انہیں ہی دیکھتا رہا۔ راحیلہ دروازے تک چھوڑ کر آئی اور مجھ سے کہا۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو آپ نے سلام کیا نہیں اور انہیں گھور رہے تھے۔"

میں چونکا۔ "سوری میں کسی سوچ میں تھا اور مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔"

راحیلہ سمجھتی تھی کہ میں کس فطرت کا آدمی ہوں اس لیے وہ مطمئن ہو گئی۔ "شگفتہ باجی کہہ رہی تھیں کہ آپ اتنی اجنبی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں، کیا پہچانا نہیں تھا۔"

"نہیں یار دفتر کے ایک معاملے میں سوچ رہا تھا۔ ان سے میری طرف سے سوری کر لینا اور اب ناشتا دو۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا مگر ناشتے کے دوران میں سوچتا رہا کہ میں نے انہیں ایسے کیوں دیکھا کیا اس لیے کہ میں انہیں تقریباً بے لباس دیکھ چکا تھا۔ بے شک تصویر میں دیکھا تھا مگر تصویر تو ان کی ہی تھی۔ اس سے پہلے ان کے لیے میرے اندر جو عزت و احترام تھا‘ میں نے خود کو ٹٹولا تو اس کا شائبہ بھی اب باقی نہیں پایا تھا۔ ایک ذرا سی بے احتیاطی نے ایک شریف عورت کو میری نظر میں بے عزت کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس میں ان کا کتنا قصور ہے لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا سامنا نہیں کروں گا اور اگر وہ سامنے آئیں بھی تو ان کی طرف نہیں دیکھوں گا۔

اگرچہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ وہ دن میں ہمارے ہاں ایک دو چکر لگاتی تھیں۔ اسی طرح میں آفس سے آنے کے بعد تین چار بار ضرور باہر جاتا تھا اور اکثر وہ دروازے پر بچوں سے کچھ کہہ رہی ہوتی تھیں یا خود کہیں آ جا رہی ہوتی تھیں۔ گھر کا روزمرہ کا سودا وہ خود لے کر آتی تھیں۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے سامنا ہو جاتا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ اس دن کے بعد سے میں نے ان کے گھر جانا بند کر دیا۔ اگر قیصر صاحب بلاتے تو کوئی بہانہ کر دیتا تھا۔ ان کو کوئی کام ہوتا تو اپنے ہاں سیٹ منگوا کر ٹھیک کر دیتا تھا۔ قیصر صاحب نے بھی اس گریز کو محسوس کر لیا اور انہوں نے ابو سے شکایت کی تو ابو نے مجھے بلا لیا۔ "کیا بات ہے برخوردار‘ تم قیصر صاحب کے ہاں کیوں نہیں جا رہے ہو؟"

"ابو جاتا ہوں لیکن اکثر مصروفیت ہوتی ہے؟" میں نے بہانہ کیا۔

"بیٹا بلائیں تو چلے جایا کرو، پڑوسیوں کے بہت حقوق ہوتے ہیں۔" ابو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

میں ان کو کیا بتاتا کہ پڑوسیوں کے حقوق کا مجھے بھی پتا تھا اور میں اسی وجہ سے وہاں جانے سے گریزاں تھا۔ جو ہو چکا تھا اسے لوٹایا تو نہیں جا سکتا تھا مگر میں اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ مزید سوچنے اور دیکھنے سے گریز کروں جو میرے تصور کو خراب کرے۔ دیکھا جائے تو قصور نہ میرا تھا اور نہ ہی شگفتہ کا تھا، یہ سراسر قیصر صاحب کا قصور تھا۔ اول تو انہیں اپنی بیوی کی ایسی تصاویر لینی ہی نہیں چاہیے تھیں۔ اگر لی تھیں تو ان کو اتنی بے پروائی سے کمپیوٹر میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ میں اسے بے پروائی ہی کہوں گا۔ ونڈوز کا استعمال کرنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کسی کمپیوٹر میں کسی چیز کو تلاش کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اگر صرف سرچ کے آپشن میں تصویر لکھ کر تلاش کیا جاتا تو یہ ساری تصاویر سامنے آ جاتیں۔ اس سے

کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ چھپے ہوئے فولڈر میں تھیں۔

شگفتہ کا سامنا کرنا اور ان کے بارے میں سوچنا چھوڑا تو رفتہ رفتہ میں سکون میں آگیا مگر اب مجھے قیصر صاحب سے چڑ ہوگئی تھی۔ ان کا سامنا ہوتا تو میرے دل میں آتا کہ یہ شخص کسی قسم کی عزت کے قابل نہیں ہے۔ جس نے اپنی عزت کو یوں تماشا بنا دیا۔ اتنی عمر، تجربے اور سمجھ بوجھ کے باوجود وہ نفس کے ہاتھوں ایسا غلام بنا کہ آگے پیچھے کے نتائج کا بھی نہیں سوچا۔ اسے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ یہ تصاویر اس کے بچوں نے ہی دیکھ لیں تو ان پر کیا اثر پڑے گا؟ یا جیسے میں نے دیکھا تھا اسی طرح ان کے گھر میں آنے والا کوئی اور فرد دیکھ لے تو؟ کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں انہیں مشورہ دے دوں کہ خدا کے لیے یہ سب ختم کردیں اس سے پہلے کہ یہ سب انہیں ختم کردے مگر میں بس سوچ کر رہ جاتا تھا۔ کہنے کی ہمت تو میں قیامت تک نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں ان سے بھی گریز کرنے لگا تھا مگر اس طرح کہ انہیں احساس نہ ہو اور وہ پھر ابو سے شکایت نہ کریں۔

ایک دن انہوں نے بچے سے کہلوایا کہ لیپ ٹاپ پھر وہی مسئلہ کررہا تھا۔ میں آکر دیکھ لوں۔ میں نے کہلوایا کہ میں آرہا ہوں لیکن گیا نہیں۔ انہوں نے دوبارہ کہلوایا اور میں پھر نہیں گیا۔ اس کے بعد انہوں نے نہیں کہا۔ ابو تو نہیں لیکن راحیلہ نے میرا گریز محسوس کرلیا تھا۔ ایک دن اس نے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے قیصر صاحب سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں تو؟"

"جب شگفتہ باجی آتی ہیں تب آپ کمرے سے نہیں نکلتے اور قیصر صاحب کی طرف سے بلاوا آئے تو کوئی بہانہ کر دیتے ہیں۔"

"بس یار وہ عمر میں بڑے ہیں اور میرے خیال میں آدمی کو اپنے ہم عمر لوگوں سے ملنا جلنا چاہیے۔"

"مگر وہ پڑوسی ہیں ان کے کام تو آنا چاہیے۔"

"کیا کام آؤں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "ان کے کمپیوٹر کا مسئلہ ہوتا ہے وہ ٹھیک کردیتا ہوں، اب ضروری ہے کہ ان سے گپ شپ کروں یا ان کے گھر آؤں جاؤں۔"

راحیلہ سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا، اس لیے وہ خاموش ہوگئی۔ اب میں قیصر صاحب سے اتنا بیزار ہوگیا تھا کہ مجھے یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ کسی اور نے وہ تصاویر دیکھ لیں تو کیا ہوگا۔ میری بلا سے جو بھی ہوتا رہے۔ میں نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا کہ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر جو ہوا اس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بھی چھٹی کا دن تھا۔ میں سو رہا تھا کہ راحیلہ نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ "عمیر اٹھیں غضب ہوگیا ہے۔"

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ "کیا ہوا گھر میں سب خیریت ہے نا؟"

"گھر میں سب ٹھیک ہے۔ شگفتہ باجی کے بیٹے ثمر نے خودکشی کرلی ہے۔"

"میرے خدا..... کب..... کیسے؟"

"ابھی پتا چلا ہے۔ ان کے گھر تو رونا پیٹنا مچا ہوا ہے۔ اس نے اپنے کمرے میں پنکھے سے رسی باندھ کر خود کو پھانسی دے لی۔" راحیلہ روہانسی ہورہی تھی۔ "پتا نہیں شگفتہ باجی کا کیا حال ہوگا؟"

میرا بھی دماغ گھوم گیا تھا یہ خبر سن کر اور مجھے فوراً خیال آیا کہ شاید ثمر نے بھی ماں کی تصویریں دیکھ لیں اور اس نے مارے شرم کے خودکشی کرلی۔ وہ چودہ کا ہونے والا تھا اور عملاً وہ بالغ تھا اسے سب معلوم تھا۔ وہ ماں کی یہ بے عزتی برداشت نہیں کرسکا اور اس نے خودکشی کرلی۔ میں جلدی سے باہر آیا تو قیصر صاحب کے گھر کے سامنے محلے والوں کا ہجوم تھا اور اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ابو اندر ہی تھے اور انہوں نے لوگوں کو اندر آنے سے روکا تھا۔ اس پر کچھ محلے والے برا مان کر چلے گئے تھے کہ کیا ہمی محلے والے تھے اور ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر ابو نے ٹھیک کیا تھا۔ انہوں نے قیصر صاحب کو ثمر کی لاش بھی پھندے سے اتارنے نہیں دی تھی۔ کچھ دیر میں پولیس آگئی اور پھر ضروری کارروائی کے بعد لاش اتار کر پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کردی گئی۔

تب میں نے..... قیصر صاحب اور شگفتہ کو دیکھا۔ وہ لاش کے ساتھ باہر آگئے تھے۔ شگفتہ کو پہلی بار یوں بغیر دوپٹے کے اور کھلے بالوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا جوان بیٹا مر جائے تو ماں کو کہاں ہوش رہتا ہے۔ یہی حال شگفتہ کا تھا۔ انہیں دیکھ کر میں پیچھے ہٹ گیا۔ سچی بات ہے اس وقت مجھے یہ دونوں میاں بیوی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ثمر کی موت کے ذمہ دار وہی تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں قیاس آرائی کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے ثمر کی خودکشی کی وجہ کچھ اور ہو۔ اگر اس نے ماں کی ایسی تصاویر دیکھ بھی لی تھیں تو یہ اس کے باپ کے کمپیوٹر میں تھیں اور باپ نے ہی لی تھیں۔ یہ یقیناً اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ذرا بے پروا قسم کے میاں بیوی کے بچے بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں اور وہ

اسے فطری سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید قیصر صاحب نے اسے کسی وجہ سے ڈانٹا ہو یا اس کا کسی دوست سے جھگڑا ہوا ہو۔ آج کل نا سمجھ بچے معمولی سی بات پر زندگی ختم کر لیتے ہیں۔ آئے دن ٹی وی اور اخبار میں ایسی خبریں آتی ہیں۔ بچے اسے معمولی بات سمجھتے ہیں اور جب انہیں کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔

شام تک ثمر کا پوسٹ مارٹم ہو گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس نے خودکشی کی تھی اور دم گھٹنے سے موت واقع ہوئی تھی۔ لاش رات گئے ملی تھی اس لیے تدفین اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دی تھی۔ قیصر صاحب کے گھر والے نہیں تھے۔ مطلب ماں باپ گزر چکے تھے اور بہن بھائی نہیں تھے۔ دور کے کچھ رشتے دار تھے جو حیدر آباد میں رہتے تھے، انہیں آنا تھا۔ وہ بھی رات تک پہنچ گئے۔ پڑوسی اور قریب ہونے کے ناتے ہمارا سارا گھر قیصر صاحب کے غم میں شریک تھا۔ سارے معاملات ابو نے اپنے ذمے لے رکھے تھے اور بڑا بیٹا ہونے کے ناتے میں برابر کا شریک تھا۔ قبر اور کفن کا بندوبست میں نے ہی کیا تھا۔ پھر لاش لانا اور غسل اور دوسرے مراحل سے گزرنا، میں ان سب میں شامل رہا تھا۔ اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد ثمر کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ اس کی عمر تو نہیں تھی مگر موت عمر دیکھ کر نہیں آتی ہے۔ پھر اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ وہ بچہ اور نا سمجھ تھا جو اپنی زندگی ہار گیا۔

ایسا سانحہ ہو جائے تو گھر والوں کو سنبھلنے میں دیر لگتی ہے ایسا ہی قیصر صاحب کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ ہفتوں ان کے ہونٹوں سے ہنسی غائب رہی تھی۔ کبھی مسکراتے بھی تو یوں چونک جاتے جیسے کوئی جرم کر گئے ہوں۔ پولیس نے تفتیش کی اور سب کے ذہنوں میں یہ سوال تھا کہ آخر ثمر نے کیوں خودکشی کی۔ قیصر صاحب قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک دن پہلے ثمر خوش باش تھا۔ شام تک وہ بھائیوں اور محلے کے لڑکوں کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیلتا رہا اور پھر وہ اپنے دوست سے ملنے گیا۔ دوست اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا اور پھر وہ رات نو بجے واپس آیا۔ شگفتہ نے اس سے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے دوست کے گھر کھا لیا ہے پھر وہ کمرے میں چلا گیا۔ بڑا ہونے کے بعد اسے الگ کمرا دے دیا تھا۔ پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا اور صبح جب شگفتہ اسے اٹھانے گئیں تو اس کی لاش پھندے سے جھول رہی تھی۔ وہ تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ قیصر صاحب نے دیکھا تو ان کے حواس بھی گم ہو گئے تھے پھر انہوں نے ابو کو کال کی تو وہ فوراً آ پہنچ گئے تھے اور انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ابو نے قیصر صاحب کو لاش اتارنے سے روکا ورنہ وہ جذباتی ہو کر لاش اتارنے جا رہے تھے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ اس لیے ابو نے انہیں روک دیا۔

گویا میرا اندازہ غلط تھا اگر اس نے لیپ ٹاپ میں ماں کی تصویریں دیکھی ہوتیں تو سارا دن اتنا خوش نہ رہتا۔ میں نے ابو سے کہا۔ ”یہ دوست کے پاس گیا تھا اسی دوران میں کچھ ہوا ہے جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی ہے۔“

”دوست کا کہنا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے اور وہ اس کے پاس سے بھی ٹھیک ٹھاک گیا تھا۔“

”ممکن ہے وہ غلط بیانی کر رہا ہو۔“

”ہو سکتا ہے۔“ ابو نے تائید کی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ”پر اب وجہ جو بھی ہو جانے والا تو واپس نہیں آئے گا۔“

”ابو وجہ جاننا بھی ضروری ہے۔“ میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”جس وجہ سے ایک فرد خودکشی کر سکتا ہے اسی وجہ سے کوئی دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ اتنا سا لڑکا تھا اسے کیا ذاتی مسئلہ ہو سکتا تھا۔“

ابو نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”ابو ممکن ہے مسئلہ ان کے گھر کا ہو۔“

”اگر گھر کا ہے تب بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کسی کے گھر کے مسئلے میں کس طرح دخل دے سکتے ہو؟“

ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگرچہ آثار ایسے نہیں تھے کہ ثمر نے اسی وجہ سے خودکشی کی ہو مگر نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا اس میں قیصر صاحب اور شگفتہ کا کسی نہ کسی طرح کردار ہے۔ ایک ڈیڑھ مہینے بعد وہ لوگ معمول پر آ گئے تھے۔ بچوں نے کھیلنا اور تفریح کرنا شروع کر دیا تھا۔ ثمر کے چالیسویں کے بعد قیصر صاحب اہلِ خانہ کے ہمراہ پکنک یا باہر ہوٹلنگ پر گئے تھے۔ اسی طرح شگفتہ نے ہمارے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ درمیان میں بھی وہ ایک دو بار آئیں مگر راحیلہ اور امی سے مل کر روتی رہی تھیں۔ اب آئیں تو معمول کی بات ہوتی تھی۔ راحیلہ مجھے ان کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ ان دنوں وہ امید سے تھی اور ایسی حالت میں عورت حساس ہو جاتی ہے اور اس کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں...

دلچسپی لیتا تھا اور سنتا تھا۔ ایک رات اس نے بتایا۔

"شکر ہے شگفتہ باجی نارمل ہو گئی ہیں ورنہ ان کا بہت برا حال ہو گیا تھا شہر کی جدائی میں۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ شہر نے کیوں خودکشی کی؟"

"پوچھا مگر ان بے چاری کو بھی کچھ نہیں معلوم۔" راحیلہ نے تاسف سے کہا۔ میرا دل چاہا کہ اسے اپنے قیاس سے آگاہ کروں لیکن پھر میری زبان رک گئی۔ راحیلہ مجھ پر پورا اعتماد کرتی تھی اور پھر اس معاملے میں میرا قصور بھی نہیں تھا اس کے باوجود کسی عورت کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا شوہر کسی اور کو دیکھے اور وہ بھی کسی واقف کار عورت کو۔ اس لیے میں چپ رہا۔

قیصر صاحب بھی معمول پر آ گئے تھے۔ اب پہلے کی طرح ہنسی مذاق اور گلی میں چہلیں کرنے لگے تھے۔ میں نظر آتا تو گھیر لیتے تھے۔ اب میں کتنا بچتا۔ ابو سے قریبی تعلق کی وجہ سے ان سے ایک حد سے زیادہ گریز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قیصر صاحب کی حد تک ٹھیک تھا مگر جب شگفتہ سامنے آتیں یا آس پاس ہوتیں تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ ان کی نازیبا تصویر میرے ذہن میں آ جاتی۔ جب کہ میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میں جھنجلا جاتا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے آفس کی طرف سے کچھ ٹریننگ کے لیے لاہور بھیجا گیا۔ جب مجھے بتایا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے تبدیلی چاہیے تھی جو اس طرح مل گئی۔ یہ تین ہفتے کا کورس تھا۔ ہمیں باہر سے بعض ہارڈ ویئر کمپنیوں نے ایک بڑا سافٹ ویئر آرڈر دیا تھا اور یہ ٹریننگ اسی کے سلسلے میں تھی۔ میں تین ہفتے لاہور میں رہا۔ پھر دفتر والوں کی طرف سے ایک گروپ ناردرن ایریا جا رہا تھا مجھے بھی اس میں شامل کر لیا گیا اور میں تقریباً پانچ ہفتے بعد واپس آیا۔ گھر والے اور خاص طور سے راحیلہ بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ کبھی اتنے عرصے مجھ سے دور نہیں رہی۔ میکے بھی جاتی تو مشکل سے دو دن میں لوٹ آتی تھی۔ اس عرصے میں جو باتیں جمع تھیں کرنے کی وہ کر رہی تھی۔ حالانکہ روز ہی فون پر بات ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس کا دل نہیں بھرا تھا۔ اچانک وہ بولی۔ "ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ شگفتہ باجی یہاں سے چلی گئیں۔"

میں چونکا۔ "وہ لوگ چلے گئے.... کب.... کہاں؟"

"گئے ہوئے آج چار دن ہو گئے ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں گئے ہیں۔ ابو کو بھی نہیں معلوم... انہوں نے گھر ہی نہیں کاروبار بھی فروخت کر دیا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ "ایسا کیا کہ وہ اچانک یوں چلے گئے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ابھی ایک ہفتے پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔"

"ہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔" "پھر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"خاص بات یہ ہے کہ قیصر صاحب ابو کے بہت نزدیک تھے اس کے باوجود انہوں نے ابو کو بھی نہیں بتایا کہ وہ کیوں سب بیچ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔"

اس طرح اچانک جانے میں کوئی بات تو ہے۔ ورنہ کون یوں اپنا بسا بسایا گھر ترک کر کے جاتا ہے۔ جن صاحب نے ان سے یہ مکان خریدا تھا ان کی بتائی قیمت اس علاقے میں اتنے بڑے مکان کی قیمت سے پندرہ فیصد کم تھی اور شاید اسی وجہ سے راتوں رات مکان بکا تھا۔ قیصر صاحب نے کاروبار بھی اسی طرح فروخت کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے کسی کو علم نہیں تھا۔ ابو اور ہمارے گھر والوں کے پاس ان کے جتنے کانٹیکٹ نمبر تھے وہ سب آزما لیے تھے مگر سب بند جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ماضی سے ہر تعلق توڑ کر یہاں سے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ہر نشان اور پتا مٹا کر گئے تھے۔ کوئی نقشِ قدم نہیں تھا جو بتاتا کہ وہ کس طرف گئے تھے۔ بہت دن تک ہم حیران رہے تھے کہ وہ کہاں چلے گئے۔ ان کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ انسانی نسیان نے ان کی یاد دھندلی کر دی اور بالآخر وہ تقریباً بھول ہی گئے تھے۔ اب شاذ ہی ان کا ذکر ہوتا تھا۔

راحیلہ نے بیٹے کو جنم دیا تو سب بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں ابو نے شاندار عقیقہ کیا۔ سارے خاندان اور جاننے والوں کی دعوت کی تھی۔ اس میں ابو کے وہ واقف کار بھی آئے تھے جو اُن کے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ تقریب ایک لان میں تھی۔ میں سب سے مل رہا تھا اور مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ جب اس میز کے پاس پہنچا جس پر ابو کے واقف کار بیٹھے تھے تو نعمان انکل نے اچانک کہا۔ "یار وہ قیصر صاحب نہیں تھے جو اچانک کاروبار بیچ کر چلے گئے۔"

"ہاں وہ تو میرے پڑوسی تھے؟" ابو چونکے۔

"یار ان کو پچھلے دنوں لاہور میں دیکھا۔"

"تم ملے ان سے؟"

"نہیں.... میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کے سامنے سے بائیک پر جا رہا تھا۔ حلیہ خراب لگ رہا تھا شیو بھی بڑھی

ہوئی تھی۔"

"یار تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے آج تک قیصر کو خراب حلیے میں نہیں دیکھا۔" ابو نے کہا۔

"تم جانتے ہو مارکیٹ میں میرا اس کا کئی گھنٹوں کا ساتھ ہوتا تھا۔ ہم ایک ہی کام تو کرتے تھے۔ میں اسے نہیں پہچانوں گا۔ پھر میں نے اسے آواز بھی دی تھی اور اس نے جاتے ہوئے سر گھما کر دیکھا بھی تھا۔ اگر وہ قیصر نہیں تھا تو نام پر سر کیوں گھما کر دیکھا۔" نعمان انکل نے دلیل سے کہا۔

"بھئی وہ جس طرح گیا ہے لگتا تو ایسا ہے کہ شہر یا ملک ہی چھوڑ گیا ہوگا۔" ابو کے ایک اور دوست نے کہا۔ "اسی شہر میں رہتے ہوئے چھپنا آسان نہیں ہے۔ وہ قیصر ہی ہوگا۔"

اس کے بعد اس پر بات شروع ہو گئی کہ قیصر صاحب اس طرح کیوں گئے تھے۔ اکثر کی رائے تھی کہ انہوں نے کوئی چکر چلایا تھا یا ان سے کوئی گھپلا ہو گیا تھا۔ وہ آنے والی مصیبت یا قانونی کارروائی سے بچنے کے لیے اس طرح روپوش ہو گئے۔ مگر ان کے جانے کے بعد مفروضہ گھپلا سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ یہ تقریب کا موقع تھا اس لیے موضوع زیادہ طول نہیں کھینچ سکا اور کچھ دیر میں کھانا لگ گیا تو لوگ سب بھول کر کھانے میں لگ گئے تھے۔ بعد میں ابو نے کہا کہ انہیں یقین نہیں آرہا کہ نعمان صاحب نے قیصر صاحب کو دیکھا ہوگا۔ "وہ اپنا نک سک سے خیال رکھنے والا شخص ہے، مارکیٹ میں جہاں گرد اڑتی اور سب ہی میلے حلیے میں بیٹھتے ہیں وہ صاف ستھرا رہتا تھا۔"

"ابو صاف ستھرے تو آپ بھی رہتے ہیں۔"

"ہاں صاف ستھرے جاتے ہیں آتے ہوئے ویسے نہیں رہتے ہیں۔ وہ تو جیسا جاتا تھا ویسا ہی آتا تھا۔"

یہ تو ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ شام کو قیصر صاحب آتے تو لگتا جیسے کسی اے سی آفس سے اٹھ کر آرہے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ سچ تھا یا نعمان انکل کو دھوکا ہوا تھا۔ اس کے بعد شاذ ہی ان کا ذکر ہوتا تھا۔ ننھا شامیر کیا آیا کہ راحیلہ سب کو بھول کر اس میں ہی لگ گئی۔ دوسروں کا کیا کہنا کبھی کبھی مجھے بھی نظر انداز کر جاتی تھی۔ میں نے ان ہی دنوں ایک یونیورسٹی سے ایوننگ میں ایم سی ایس شروع کر دیا۔ ویسے میں نے کورس بھی کیے تھے اور میرا تجربہ بھی خاصا ہو گیا تھا مگر آگے جانے کے لیے ڈگری لازمی ہونی چاہیے اس لیے میں نے ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔ آنے والے دو سال بہت سخت گزرے تھے۔ صبح سے شام تک آفس اور پھر وہاں سے یونیورسٹی اور وہاں سے رات گئے واپسی پر تھکن اتنی ہو چکی ہوتی تھی کہ راحیلہ اور شامیر سے بس دو باتیں کرتا اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ اتوار یا چھٹی کا دن مخصوص مصروفیتوں میں گزر جاتا۔ بعض اوقات تو خود اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا تھا۔

شروع میں تو راحیلہ نے اتنا محسوس نہیں کیا مگر جب شامیر چلنے پھرنے لگا۔۔۔۔ اور اس کا بیشتر وقت دادا دادی اور پھوپی کے پاس گزرتا تو وہ اب بور ہونے لگی تھی اور اس کا ہر دوسرا سوال اسی بارے میں ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔ میں اسے بہلاتا تسلی دیتا کہ جلد ختم ہو جائے گا۔ سچی بات ہے کہ خود میرا دل بھی اوب گیا تھا۔ آدمی کام بھی کرے اور پڑھے بھی تو یہ کام اس صورت میں آسان نہیں ہے جب آدمی اکیلا ہو، میرے ساتھ تو بیوی اور بچہ تھا۔ بہرحال خدا خدا کرکے یہ دو سال گزرے اور میرا ایم سی ایس مکمل ہو گیا۔ میں نے اور راحیلہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شامیر خوش تھا کہ اب پاپا آفس سے جلدی آجاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات کہ مجھے اس محنت کا فوری صلہ بھی ملا تھا اور مجھے اپنے شعبے میں منیجر کی پوسٹ پر ترقی دی گئی تھی۔ تنخواہ تقریباً دوگنی اور دوسری مراعات بھی تھیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا مجھے لاہور جانا تھا۔ یعنی یہ ترقی ہیڈ آفس تبادلے سے مشروط تھی۔ میں ہچکچا رہا تھا۔ راحیلہ کا خیال تھا کہ مجھے مان لینا چاہیے۔ میں نے ابو سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی کہا اور میں نے ہاں کر دی۔

گھر والوں سے دور جانا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا جب میں کورس کے لیے لاہور گیا تھا۔ امی ابو سے دور نہیں رہا۔ شادی کے بعد بھی ان کے ساتھ رہا تھا اس لیے لاہور جانے کے بعد بہت دنوں تک اداس رہا تھا۔ اگر راحیلہ اور شامیر نہ ہوتے تو شاید میں یہ ترقی ٹھکرا کر بھاگ آتا۔ پہلے میں خود گیا تھا اور جب رہائش کا بندوبست ہو گیا تو میں نے راحیلہ اور شامیر کو بلوا لیا تھا۔ رہائش کرائے کی تھی مگر اس کا کرایہ کمپنی دے رہی تھی۔ اسی طرح مجھے گاڑی بھی دی گئی تھی۔ تنخواہ ویسے ہی اچھی تھی اب دوگنی ہو گئی تھی۔ رہائش گلبرگ میں ایک چھوٹی کوٹھی کا نچلا پورشن تھا۔ اوپر مالک مکان رہتا تھا۔ اس میں دو بیڈ روم کے ساتھ لاؤنج اور ڈرائنگ روم تھا۔ علاقہ بہت اچھا تھا اور یہاں سارے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگ رہتے

تھے۔ راحیلہ نے چند دنوں میں محلے والوں سے اچھی خاصی سلام دعا کر لی تھی اور اس کا وقت اچھا گزرنے لگا تھا۔ چھٹی والے دن ہم خریداری کے لیے جاتے تھے کیونکہ نیا نیا گھر تھا تو کسی نہ کسی چیز کی کمی سامنے آتی رہتی تھی۔ اس دن بھی ہم شاپنگ کے لیے نکلے تھے مگر راحیلہ کو اپنی شاپنگ کرنی تھی۔ گرمیوں کی آمد تھی اور وہ گرمی کے لحاظ سے کپڑے لینا چاہتی تھی۔ ہم انارکلی مارکیٹ میں تھے۔ راحیلہ ایک شاپ پر کپڑے دیکھ رہی تھی اور میں شامیر کو لیے باہر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اچانک ہی سامنے ایک بائیک رکی اور اس سے کرتے شلوار میں ایک باریش شخص اترا..... بال سفید ہو رہے تھے اور چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا کیونکہ وہ قیصر صاحب تھے۔

میں بے اختیار ان کی طرف بڑھا۔ "قیصر صاحب یہ آپ.....؟"

انھوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور ایک بڑا سا پرانا شوز کا بیگ اتار کر آگے بڑھے۔ میں ان کے راستے میں آ گیا۔ "قیصر صاحب آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ میں شمس احمد ہوں، حمزہ احمد کا بیٹا۔"

"میں نے پہچان لیا ہے۔" انھوں نے کہا اور مجھ سے کترا کر آگے بڑھے میں نے پھر راستے میں آ کر انھیں روکا۔ وہ مجھ سے نظریں ملانے سے گریز کر رہے تھے۔

"آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں کیا ہمارے درمیان وہ تعلق ختم ہو گیا ہے۔"

"ہاں کیونکہ اب میں کسی سے تعلق رکھنے اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا ہوں۔"

"لیکن کیا بات ہو گئی قیصر صاحب؟"

"کیا تم نہیں جانتے یا جان بوجھ کر میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو۔" انھوں نے تلخ لہجے میں کہا اور میرے پاس سے ہو کر آگے چلے گئے تھے۔ اس بار میں انھیں نہیں روک سکا تھا۔ اسی لمحے راحیلہ آ گئی۔ وہ مجھے تلاش کر رہی تھی۔

"واہ میں دکان میں تھی اور آپ غائب ہو کر یہاں ٹہل رہے ہیں۔"

"راحیلہ میں نے ابھی قیصر صاحب کو دیکھا ہے؟"

"شگفتہ باجی کے شوہر؟" وہ بھی حیران ہوئی تھی۔ "وہ یہاں کہاں سے آ گئے؟"

"شامیر کے عقیقے میں نعمان انکل نے کہا تھا کہ انھوں نے قیصر صاحب کو لاہور میں اور بہت برے حال میں دیکھا اور آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ وہ قیصر صاحب ہی تھے اور ان کی حالت اچھی نہیں تھی۔ یہ کھٹارا بائیک دیکھ رہی ہو یہ ان ہی کی ہے۔"

> ابن الہیثم نے بتایا کہ روشنی سیدھے خطوط میں سفر کرتی ہے اور اسے گزرنے کے لیے کسی نہ کسی واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ واسطے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ شفاف، نیم شفاف اور غیر شفاف۔ ابن الہیثم نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ جب روشنی کسی سوراخ میں سے گزرتی ہے تو وہ سامنے کے پردے پر اس جسم کا الٹا عکس بناتی ہے جس میں سے کہ وہ آ رہی ہو گویا اس نے سوئی چھید کیمرے کا تصور پیش کیا۔
>
> اقتباس: تاثرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

"واقعی وہ تو بہت برے حال میں ہیں۔"

"ایک بیگ اٹھائے اندر مارکیٹ کی طرف گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

راحیلہ کو بھی تجسس ہو رہا تھا اس لیے ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ وہ واپس آئیں۔ مگر آدھا گھنٹا گزر گیا اور ان کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ راحیلہ تھک گئی تھی اور اب شامیر بھی ضد کر رہا تھا۔ اسے آئس کریم کھلانے کا دلاسا دے کر لائے تھے۔ مجبوراً ہمیں وہاں سے روانہ ہونا پڑا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر قیصر صاحب کا تلخ لہجہ گونج رہا تھا۔ ایسی کیا بات تھی جو میرے علم میں ہونی چاہیے تھی مگر نہیں تھی۔ ذہن پر بہت زور دیا مگر سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم واپس گھر آ گئے تب بھی یہ بات میرے ذہن پر سوار رہی تھی۔ بلکہ اگلے دن جب میں دفتر میں تھا تب بھی سوچتا رہا تھا۔ میرے ساتھ دو نوجوان لڑکے کام کرتے تھے۔ وہ میرے ماتحت تھے اور میں انھیں کام دیتا تھا۔ میں کام بھی کرتا تھا اور ان کے کام کی نگرانی اور پھر ویریفکیشن بھی کرتا تھا اس لحاظ سے میری ذمے داری دوہری تھی مگر یہ میری پوسٹ کا تقاضا تھا اور اسی کی مجھے تنخواہ دی جاتی تھی۔ ہمیں ایک بڑا کمرا دیا گیا تھا۔ اس میں پارٹیشن کی مدد سے میرا کیبن الگ تھا اور ان دونوں کا حصہ الگ تھا۔ میں شام کے وقت نکل رہا تھا اور کیبن سے باہر آیا تو وہ دونوں مانیٹر پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا اور اس پر جو منظر تھا وہ اس چھوٹے سے حصے سے بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ مقامی لڑکیوں اور عورتوں کی نازیبا تصاویر

تھیں۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا تو انہوں نے ہڑبڑا کر سائٹ بند کر دی اور مجھ سے معذرت کرنے لگے۔ میں نے ان کو کچھ سنائیں اور پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کچھ کہنا بیکار تھا۔ انہیں کرنا وہی تھا جو ابھی کر رہے تھے۔ مگر اس واقعے سے اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ جیسے جیسے میں اس پر سوچتا رہا مجھے لگا کہ یہی بات ہے۔ میں گھر آیا تو راحیلہ ڈنر تیار کر رہی تھی اور شامیر بہت خوش گھوم رہا تھا میں نے پوچھا۔

"یہ کس چکر میں ہے؟"

"شازیب کی سالگرہ ہے۔" راحیلہ نے کہا۔ "محلے کے بچوں کو بلایا ہے۔" "میں اور شامیر بھی جائیں گے۔"

"ابھی؟"

"ہاں بس کیک کاٹنے کی تقریب ہے۔" وہ بولی۔ "آدھے گھنٹے میں آ جائیں گے۔"

مجھے خیال آیا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ راحیلہ اور شامیر کی غیر موجودگی میں، میں آرام سے کام کر سکوں گا۔ کھانے کے بعد راحیلہ بھی ہلکا پھلکا تیار ہوئی، شامیر پہلے سے تیار تھا۔ شازیب مالک مکان کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ وہ شامیر کا ہم عمر ہی تھا۔ ان کے جاتے ہی میں نے اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور انٹرنیٹ پر سرچنگ کرنے لگا۔ یہ آسان نہیں تھا کیونکہ اس قسم کا اتنا مواد آ گیا ہے کہ اس میں کوئی خاص چیز تلاش کرنا محنت والا کام ہے پھر یہ سب دیکھنا بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے سائٹس کا پتا نہیں تھا اس لیے میں سرچنگ کی مدد لیتا رہا۔ مگر آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تھک ہار کر چھوڑنے والا تھا کہ آخری ویب سائٹ پر مجھے ایک لنک نظر آیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ پاکستانی ہاؤس وائف پکچرز (پاکستانی بیویوں کی تصویریں) میں نے اس لنک کو اوپن کیا۔ یہ ایک پرانی سائٹ تھی جسے اپ ڈیٹ ہوئے بھی تین سال سے زیادہ وقت ہو رہا تھا۔ اس میں تصویروں کے فولڈرز تھے۔ فولڈر پر نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ پھر ایک فولڈر دیکھ کر مجھے لگا کہ میں کامیاب ہو رہا تھا اس پر شگفتہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لکھے الفاظ نہایت واہیات اور ناقابل بیان تھے۔

میں نے فولڈر اوپن کیا تو اندر درجنوں تصاویر تھیں۔

پہلی تصویر کھولی۔ یہ شگفتہ کی ہی تھی۔ مگر اس تصویر سے کہیں زیادہ عریاں تھی جو میں نے چار سال پہلے دیکھی تھی اور پھر میں ایک کے بعد ایک تصویر دیکھتا رہا۔ آگے ناقابل بیان قسم کی تصاویر تھیں اور بعض میں قیصر صاحب بھی تھے۔ یہ تصویریں اب سے چار سال پہلے اپ لوڈ کی گئی تھیں۔ میں نے سائٹ کی ریٹنگ چیک کی۔ اب تو خاص نہیں تھی مگر چار سال پہلے اس کی ریٹنگ بہت زیادہ تھی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں روزانہ آتے تھے۔ یہ ایک سائٹ تھی۔ میں نے چیک کیا کہ یہ تصاویر مزید کتنی سائٹس پر تھیں تو ایسی درجنوں سائٹس نکل آئیں۔ ان سب پر یہ تصاویر چار سال پہلے لوڈ کی گئی تھیں۔ میں نے سر تھام لیا۔ اب میں جان گیا تھا کہ ثمر نے کیوں خودکشی کی تھی۔ اس نے یقیناً یہ تصاویر دیکھ لی تھیں اور شاید اپنے اسی دوست کے ساتھ دیکھی تھیں جس کے گھر وہ گیا تھا۔ اس سے یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی اور اس نے گھر آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

میں نہیں جانتا کہ یہ تصاویر کیسے قیصر صاحب کے لیپ ٹاپ سے نکلیں اور انٹرنیٹ پر آ گئیں مگر یہ واضح تھا کہ ان کے گھر کی تباہی اور دربدری میں ان تصاویر کا ہی ہاتھ تھا جو انہوں نے شوقیہ کھینچی تھیں۔ اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور وہ اس کے نتائج کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انٹرنیٹ ایسے مواد سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے لوگوں کو اس حوالے سے اب بھی عقل نہیں آئی ہے۔ میں سرگزشت کے ان صفحات کے توسط سے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں خدارا چند لمحے کی تفریح کے لیے خود کو اور اپنے گھر کو داؤ پر مت لگائیں۔ خاص طور سے شادی شدہ جوڑے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اس لباس کو یوں سرِ عام مت اتاریں۔

شمارہ جولائی 2014ء کی منتخب سچی بیانیاں

ہماری پیش کش ۔۔۔ آپ کا انتخاب

☆ اول: پھر وہی غلطی ..... وکیل (لاہور)
☆ دوم: بے حس ..... شاہد صدیقی (کراچی)
☆ سوم: وارث ..... ثمرینہ (لاہور)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

مجبور

جناب مدیر اعلیٰ سرگزشت!

سلام تہنیت!

میں اپنے ایک دوست کا واقعہ ارسال کررہا ہوں۔ اسے پڑھ کر آپ بھی لطف اندوز ہوں گے۔ اس نے صحافی بننے کے چکر میں کس طرح ٹھوکر کھائی، آج کل کے یہ دونمبری لوگ کس طرح عوام کو بے وقوف بنارہے ہیں۔ سبق حاصل کرنے کے لیے اسے ضرور پڑھیں۔

ابرار احمد

(سیالکوٹ)

میرا تعلق ایک میگزین سے تھا۔

آپ نے بھی اس قسم کے بے شمار میگزین دیکھے ہوں گے۔ میگزین نکالنے والوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ بس کسی طرح ڈکلریشن حاصل کرکے کوئی گھٹیا قسم کا میگزین نکالنا شروع کردیتے ہیں۔

ایسے میگزین میں ہندوستانی اور ہالی ووڈ کے اداکاراؤں کی نیم عریاں تصاویر ہوتی ہیں، ماؤں اور بچوں کو بے وقوف بنانے کے ٹوٹکے ہوتے ہیں۔ اور کچھ الٹے سیدھے مضامین

ہوتے ہیں۔

ان کی نہ تو کمپوزنگ اچھی ہوتی ہے اور نہ پرنٹنگ۔ بس کام چلتا رہتا ہے۔ کسی طرح دو چار ایجنسیوں اور میرج بیوروز کے اشتہارات مل جاتے ہیں اور نام ہوتا ہے کہ فلاں آدمی رسالہ نکالتا ہے۔ صحافی ہے۔ ایڈیٹر وغیرہ وغیرہ۔

تو ان دنوں میں بے روزگار تھا۔ جب مجھے اسی قسم کے ایک میگزین میں جاب مل گئی تھی۔ اس میگزین کا نام "چمک دمک" تھا۔ میں نے جب خورشید صاحب سے اس نام کی وجہ پوچھی تو مسکرا دیے۔

واضح ہو کہ خورشید صاحب ہی اس کے مالک، ایڈیٹر اور کمپوزر بھی تھے۔ ان کے علاوہ ان کی بیگم بھی اس بے کار کام میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔

ایک چھوٹا سا کمرا دفتر کے طور پر استعمال ہوا کرتا۔ یہ کمرا ان کے گھر میں ہی تھا۔ میں نے جب خورشید صاحب سے چمک دمک کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا۔ "میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ اول تو اس نام کا کوئی میگزین پورے پاکستان میں نہیں ہے دوسرے یہ کہ مجھے اس کا مستقبل شاندار نظر آرہا ہے۔ یہ ضرور چمکے اور دمکے گا۔"

اب اس کے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا۔

"بھائی۔ تم کل سے کام شروع کردو۔" خورشید صاحب نے کہا۔

"لیکن میرا کام کیا ہوگا۔ سارا کام تو آپ خود کرلیتے ہیں۔"

وہ بہت زور سے ہنس دیے۔ "نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ ابھی بھی بہت کام ہیں۔ مثال کے طور پر جتنے مضامین اور کہانیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کو سارٹ آؤٹ کرنا۔ فیلڈ میں جا کر لوگوں کے انٹرویوز لینا۔ پریس کاپی لے جانا۔ اپنی نگرانی میں چھپوانا اور ساری کاپیاں اٹھا کر گھر لانا۔"

"اور میری تنخواہ کیا ہوگی۔"

"بھائی۔ جب یہ میگزین خود مجھے کچھ نہیں دے رہا تو پھر تمہیں کیا دے گا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ یعنی میں فری میں کام کروں گا۔"

"نہیں۔ فری میں تو نہیں۔ دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ گے اور چائے چلتی رہے گی۔ اس کے علاوہ آنے جانے کے لیے ہزار روپے دے دیا کروں گا۔"

"یہ تو بہت کم ہیں خورشید صاحب۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے جس بندے کو کل انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ اس نے کیا آفر دی ہے۔"

"نہیں تو۔ آپ ہی بتادیں کیا آفر تھی۔"

"اس نے یہ کہا تھا کہ وہ چھ مہینے تک ایک پیسا نہیں لے گا اور دوپہر کا کھانا اپنی طرف سے کھلائے گا۔"

"یعنی الٹا وہ کھلائے گا۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" خورشید صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ "ہر روز وہی پیسے خرچ کرتا۔"

"تو پھر آپ نے اس کو جاب کیوں نہیں دی۔"

"اس لیے کہ وہ میری بیوی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔" خورشید صاحب نے بتایا۔ "اور مجھے ایسے بدتمیز لوگ پسند نہیں ہیں۔"

ٹھیک اسی وقت خورشید صاحب کی بیگم چائے لے کر آگئیں۔ اور میرا دل چاہا کہ میں اس شخص کو گولی ماردوں جو اسی بے ڈھنگی اور خبیث صورت عورت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کیا گھٹیا ذوق پایا تھا اس نے۔

"آپ نے اچھا کیا جو اسے جاب نہیں دی۔" میری زبان نہیں رک سکی تھی۔

"وہ کیوں۔"

"اس لیے کہ ایسا بدذوق آدمی اس قابل ہی نہیں ہے کہ کہیں نوکری کرے۔" میں نے کہا۔

اس وقت خورشید صاحب کی بیگم چائے رکھ کر واپس جاچکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس بے لاگ تبصرے پر خورشید صاحب غصے سے بھڑک اٹھیں گے، اس کی بجائے انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "میرے عزیز۔ میں خود بھی اس کی بدذوقی پر ماتم کرتا رہا ہوں۔"

خورشید صاحب نے ایسی بات کہہ دی کہ میں ہنس پڑا۔ کیا سچائی تھی۔

"اچھا تو بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے ہمیں جوائن کرنے کے بارے میں۔" خورشید صاحب نے پوچھا۔

"جناب۔ میرے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تیار ہوں۔ آپ یہ بتائیں میرا سب سے پہلا کام کیا ہوگا۔"

"تم کل صبح پیر باگے شاہ کا انٹرویو لوگے۔" خورشید صاحب نے بتایا۔

"میں نے پیر باگے شاہ کا نام بہت سنا تھا۔ ان کے

دربار میں نامی گرامی سیاست داں اور بیوروکریٹس حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک پاورفل قسم کے پیر تھے۔ اور ان کے بارے میں یہ بھی سنا گیا تھا کہ ان کی خبریں تو اخبار میں آتی ہیں۔ لیکن وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیتے۔

"ہاں تو کیا سوچنے لگے۔" خورشید صاحب نے پوچھا۔

"آپ نے پہلا ہی ٹاسک اتنا خطرناک دے دیا ہے کہ میں بوکھلا کر رہ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم اسے اپنے لیے چیلنج سمجھ سکتے ہو۔" خورشید صاحب مسکرا کر بولے۔ "چلو۔ میں یہاں تک کہہ رہا ہوں کہ اگر تم ان کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہوگئے تو میں اسی وقت تمہیں دو ہزار دے دوں گا۔"

یہ ایک بڑی لالچ تھی۔ دو ہزار اس زمانے میں میرے لیے بہت تھے۔ میرے بہت کام نکل سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے چیلنج قبول کرلیا۔ "لیکن اس کے لیے مجھے مہلت درکار ہوگی۔ مجھے ہوم ورک کرنا ہوگا۔"

"کیسا ہوم ورک۔"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ یہ بزنس سیکرٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو یہ بھی منظور۔ اب تم اپنے جوہر دکھاؤ۔"

میں گھر واپس آکر بہت دیر تک پلاننگ کرتا رہا کہ یہ انٹرویو کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ بہت ہی بے ڈھب قسم کا انسان ہے۔

خبروں کے علاوہ کسی صحافی، رپورٹر کو اپنے آستانے میں آنے ہی نہیں دیتا۔ اس کو بہت ہوشیاری سے قابو کرنا تھا۔ بہرحال میں دوسرے دن پیر بابے شاہ کے آستانے پر پہنچ گیا۔ آستانہ کیا اچھی خاصی بڑی کوٹھی تھی جس کے گیٹ پر دو مسلح گارڈ کھڑے ہوئے تھے۔

اور گیٹ پر ہی ایک نوٹس لگا ہوا تھا جس پر پیر صاحب سے ملاقات کے اوقات لکھے ہوئے تھے۔ صبح نو سے گیارہ تک سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے لیے۔ پھر سہ پہر تین بجے سے شام چار بجے تک تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے۔ شام سات سے رات نو تک عام افراد کے لیے۔ اور نو سے دس تک پھر سیاست دانوں کے لیے۔ اس کے بعد پیر صاحب آرام اور اپنے وظائف کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔

میں چونکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے ملنے والا تھا۔ اس لیے مجھے شام سات بجے آنا تھا۔ میں اس شام سات بجے پہنچ گیا۔ گیٹ پر بہت سے لوگ تھے۔ یہ سب عام لوگ تھے چونکہ عام طور پر عام لوگ پریشان حال ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے سب ہی پریشان حال تھے۔

گیٹ کے ساتھ ایک کوٹھری تھی۔ جس کی کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے اندر ایک آدمی بیٹھا ہوا ٹوکن دے رہا تھا۔ پیر صاحب سے ملنے والے باقاعدہ ٹوکن لے کر جایا کرتے تھے۔

گیٹ کے ساتھ ایک بڑا سا شیڈ تھا۔ ٹوکن لے کر اندر جانے والے اس شیڈ کے نیچے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جایا کرتے۔ یہ انتظار گاہ تھی۔

اس کے بعد باقاعدہ اعلان کیا جاتا۔ ٹوکن نمبر 12 ٹوکن نمبر چالیس، وغیرہ وغیرہ۔ جس طرح ڈاکٹرز کے یہاں یا بینکوں میں ہوا کرتا ہے۔

پھر ملاقاتی اندر چلے جاتے۔ یہاں پیر صاحب اسے شرف ملاقات بخشا کرتے۔ میرا نمبر اٹھارہ تھا۔ اس لیے مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔

میں پیر صاحب سے ملنے کے لیے ہوم ورک مکمل کرکے گیا تھا۔ معاملہ چیلنج کا تھا۔ ایک بندے نے اس کمرے تک رہنمائی کی جس میں پیر صاحب اپنی پوری شان کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

وہ خاصے صحت مند انسان تھے۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب نے ایسے بزرگوں کے لیے ایک بہت مزے کا جملہ لکھا ہے کہ ان کی صحت کا راز یہ ہے کہ یہ سادہ کھانے اور ورزش سے پرہیز کرتے ہیں۔

پیر صاحب ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھے تھے۔ جس پر ایک بے داغ سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تحاشا ان کے بھدے، صحت مند ہاتھ چومنے شروع کردیے۔

"بس مل گئی۔ مل گئی۔ اب مجھے کہیں نہیں جانا۔ آپ ہی کے پاس بھیجا گیا ہوں۔ اور برسوں کے بعد روشنی ملی ہے۔ آپ ہی ہیں۔ سو فیصد آپ۔ آپ کے علاوہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"بات کیا ہے۔ کیوں اتنے بے قرار ہورہے ہو۔" پیر صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

"حضور۔ مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔" میں نے بہت مودب ہوکر بتایا۔

"کس نے بھیجا ہے۔"

"حضرت ہوشیار شاہ قلندری نے۔" میں نے بتایا۔ "ناگپور والے۔"

"اوہو۔ ناگپور والے۔" پیر صاحب نے مجھ سے بھی بڑھ کر ڈراما کیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کمرے میں چار پانچ آدمی بھی تھے۔ یا تو وہ سالکین میں سے ہوں گے یا پیر صاحب کے خاص بندے ہوں گے۔ اسی لیے پیر صاحب نے ایسے تپاک کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہاں حضور نے کس لیے بھیجا ہے تمہیں۔" پیر صاحب نے دریافت کیا۔

"خواب میں آکر۔ آپ نے شاید میرے دادا حضور کا نام نہ سنا ہو۔ امجد شاہ بخاری۔ وہ قلندری بابا کے جانشین ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے قلندری بابا سے ہمارے خاندان کا بہت قریبی رشتہ ہے۔"

"تو بابا قلندری تمہارے خواب میں آئے تھے۔" اس بار پیر صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی حضور۔ انہوں نے مجھے آپ کی صورت دکھائی تھی۔ آپ اس وقت الیکٹرک کے کھمبے پر چڑھے ہوئے تھے۔"

"کیا۔" پیر صاحب کچھ جزبز ہونے لگے تھے۔

"جی حضور۔ بابا قلندری نے آپ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا تھا کہ اس کو تلاش کر۔ جو روشنی پھیلانے کا کام کرے گا۔ الیکٹرک کے کھمبے پر چڑھنا اس بات کا اشارہ ہے۔"

"سبحان اللہ، سبحان...." کمرے میں موجود وہ چاروں زور زور سے ورد کرنے لگے۔

خود پیر صاحب بھی اپنی اس بزرگی سے متاثر ہونے لگے تھے۔ اس بار انہوں نے بڑی شفقت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "خدا جنت الفردوس میں جگہ دے قلندری بابا کو، واہ واہ کیا فرما رہے تھے۔"

"انہوں نے مزید فرمایا کہ میں آپ سے جا کر کہوں کہ ہیرا اور پنا سے بہتر الماس ہے۔" میں نے بتایا۔

میں نے دیکھا کہ یہ سن کر پیر صاحب بھک سے رہ گئے تھے۔

"واہ۔" پیر صاحب نے قلندری بابا کے لیے کہا۔ "میں حضرت قلندری بابا کا اشارہ سمجھنے کی کوشش کروں گا۔" پھر انہوں نے کمرے میں موجود افراد سے کہا۔ "آپ حضرات، ذرا باہر تشریف لے جائیں۔ مجھے اس نوجوان سے معرفت کی باتیں کرنی ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد پیر صاحب نے فرمایا۔ "آخر کیا ہے یہ سب۔ یہ ہیرا، پنا اور الماس یہ کیسے اشارے ہیں۔"

"حضور۔ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" میں نے ہاتھ باندھ لیے۔ "مجھے جو حکم دیا گیا تھا وہ میں نے آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ یہ قلندری بابا کا مزار کہاں ہے۔" پیر صاحب نے مجھے کریدنے کی کوشش کی۔

"حضور۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ناگپور کے نواح میں ہے۔" میں نے بتایا۔ "اکثر خواب میں دیکھا کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ قلندر بابا سے بھی خواب میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔"

"قلندری بابا کا حلیہ بتاؤ۔ صورت شکل بتاؤ۔"

"حضور۔ آپ کیوں مجھ ناچیز کا امتحان لے رہے ہیں۔ ایسے قلندر کھلے چہروں کے ساتھ سامنے کہاں آتے ہیں۔ وہ تو جب آتے ہیں ان کے چہرے پر نقاب ہوتی ہے۔"

پیر صاحب واقعی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کون ہوں، اور جو میں کہہ رہا ہوں اس کی کیا حقیقت ہے۔

میں تو اپنا ہوم ورک کرکے گیا تھا۔ اسی لیے میں جانتا تھا کہ ہیرا، پنا اور الماس کون ہیں۔ یہ دراصل بازار حسن کی لڑکیاں تھیں۔

پیر صاحب کے تعلقات ہیرا اور پنا سے تھے۔ جبکہ الماس نے درمیان میں آکر ہلہ کر دیا تھا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ چونکہ پیر صاحب کا تعلق اسی کے گاؤں سے تھا۔ اسی لیے پیر صاحب پر اس کا حق زیادہ تھا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا واقعی قلندری بابا نے ہیرا، پنا، اور الماس کے لیے اشارے دیے تھے۔" پیر صاحب نے پوچھا۔

"ظاہر ہے سرکار۔ ورنہ مجھے کیا معلوم کہ یہ کیسے اشارے ہیں۔ آپ ہی بتائیں یہ کیسے اشارے ہیں۔" میں نے الٹا سوال کر لیا۔

"بھائی۔ یہ معرفت کے درجات ہیں۔" پیر صاحب نے اب اطمینان سے فرمایا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سرکار۔"

"تم بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"قلندری بابا کا حکم ہے کہ میں آپ کے دامن سے وابستہ ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ قلندری بابا کا اشارہ سر آنکھوں پر۔" پیر صاحب کچھ سوچ کر بولے۔ "لیکن کس طرح وابستہ ہو گے۔"

"یہ تو آپ جانیں سرکار۔" میں نے کہا۔ "میں تو حکم کا غلام ہوں۔ جو فرمائیں گے۔ میں وہی کروں گا۔"

"اچھا جاؤ۔ میں تمہارے لیے سوچتا ہوں۔" پیر صاحب نے فرمایا۔ "تم دو دن کے بعد آجانا میرے پاس۔"

میں نے آدھی کامیابی تو حاصل کر ہی لی تھی۔

قلندری بابا در اصل پیر صاحب کا خاص چیلا منصور تھا۔ میں نے کسی طرح اسے توڑ لیا تھا۔ وہ برسوں سے پیر صاحب کی خدمت کیے جا رہا تھا اسی نے یہ بیش بہا معلومات مجھے فراہم کی تھیں۔

میں نے جس ہوم ورک کی بات کی ہے۔ وہ یہی ہوم ورک تھا۔ پیر صاحب سے ملاقات کے بعد میں نے منصور کو فون کر کے اس مخصوص ہوٹل میں بلا لیا۔ جہاں ہماری ملاقات ہوا کرتی تھی۔

منصور کو میں نے رشوت نہیں دی تھی اور نہ ہی میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں اسے کچھ دے سکتا۔ منصور کا یہ المیہ تھا کہ وہ پیر صاحب کا بت گرا کر اس کی جگہ خود اپنے آپ کو رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھ سے معاہدہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"میں اس جعلی پیر کی حرکتوں سے تنگ آچکا ہوں۔ نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کو اس نے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اس کے اندر کا آدمی ہوں۔ اسی لیے اس کے بارے میں سب جانتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو۔ بتاتے جاؤ۔ پھر ہم دونوں مل کر اس کا کباڑہ کر دیں گے۔"

اسی نے مجھے ہیرا پنا اور الماس کے بارے میں بتایا تھا۔ اب میں نے اسے پھر بلایا تھا تاکہ کچھ اور باتیں جان سکوں۔ وہ کام کا آدمی تھا۔

وہ آیا تو میں نے چائے اور بسکٹ وغیرہ کا آرڈر دے دیا۔ چائے پینے کے دوران میں اس نے انکشاف کیا۔ "آپ کو معلوم ہے جناب۔ ہمارے پیر صاحب شراب معرفت کی بھٹی چلا رہے ہیں۔"

"یہ کیا چیز ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یہی شراب۔ بلاول چورنگی سے آگے اس شراب کو بنانے کی ایک خفیہ بھٹی ہے۔ چند ہی لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ جب شراب تیار ہو جاتی ہے تو کچھ بھگتوں کو پیر صاحب اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اور ان میں کوئی خاص دوا ڈال دیتے ہیں۔ جس سے اس کا نشہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ شراب خاص خاص لوگوں کے لیے لائی جاتی ہے۔ جبکہ عام لوگوں کے لیے عام شراب ہوتی ہے۔"

"کمال ہے۔ کیا پولیس کو نہیں معلوم۔" میں نے پوچھا۔

"سب جانتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جن خاص لوگوں کو وہ شراب معرفت پلائی جاتی ہے۔ وہ بڑے بڑے حاکم ہیں۔ اب کس میں اتنی ہمت ہے کہ وہاں چھاپہ مارے۔"

"تو اب بتاؤ۔ کرنا کیا ہے۔ پیر صاحب تو بہت بڑا جرم کر رہے ہیں۔"

"یہ مکار اور جعلی پیر پولیس سے تو نہیں ڈرتا لیکن اپنی بدنامی سے بہت ڈرتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "تم اب اس پر یہ ظاہر کر دو کہ تمہیں اس کا راز معلوم ہو گیا ہے اور وہ سارے اخبارات اور رسالوں کو بتا دیا جائے گا۔ بس اس پیر کو قابو میں کرنے کے لیے تمہارا اتنا کہنا ہی بہت ہوگا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا۔"

"اس کے بعد پیر کے پاس دو تین راستے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ تمہیں خریدنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ تم اس کی باتوں میں نہیں آؤ گے۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ خود کشی کر لے گا۔ جس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ بہت ہی ڈھیٹ قسم کا آدمی ہے۔ اور تیسرا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ راتوں رات یہاں سے بھاگ لے۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ڈھیٹ قسم کا آدمی ہے تو پھر ایسا کیوں کرنے لگا۔"

"اس لیے کہ ہمارے یہاں کے کرپٹ حضرات جرم یا پکڑے جانے سے نہیں ڈرتے۔ جتنا جرم کی پبلسٹی سے ڈرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

اس کی بات معقول تھی۔ میں اس پر تیار ہو گیا۔

یہ دیکھیں کہ یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ میں ایک اخبار میں انٹرویو کے لیے پہنچا۔ اس نے پیر سے میرے انٹرویو کی شرط لگا دی۔ میں نے منصور کو توڑ لیا۔ اور اب میں اس پیر کو بلیک میل کرنے جا رہا تھا۔

دو دنوں کے بعد میں پھر پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

پہلے کی طرح اس دن بھی ان کے کمرے میں ان کے خاص بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے کی طرح ڈرامے کرتے ہوئے ان کے ہاتھ چومے اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

"ہاں اے سعادت مند نوجوان۔ یہ بتاؤ کیا قلندری بابا

پھر آئے تھے تمہارے پاس۔" پیر نے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔ پھر آنا ہوا تھا ان کا۔"

"اوہو۔ تو اب کیا فرمایا انہوں نے۔"

"آپ سے بہت ناراض تھے۔" میں نے بتایا۔

"وہ کیوں؟"

"فرمار ہے تھے کہ اس سے جا کر کہہ کہ شراب معرفت کو خاص کیوں کر رکھا ہے۔ عام کیوں نہیں کرتا۔"

پیر صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے پہلے کی طرح اپنے آدمیوں کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا اور ان کے جانے کے بعد کہنے لگے "تو جوان سچ سچ بتاؤ یہ سب کیا چکر ہے۔"

"کوئی چکر نہیں ہے جناب۔ میں تو قلندری بابا کے حکم کا غلام ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ جو ارشاد فرماتے ہیں میں آپ کو آ کر بتا دیتا ہوں۔"

"یہ تمہارے قلندری بابا میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔" پیر صاحب باقاعدہ کراہنے لگے تھے۔

"میں کیا جانوں سرکار۔ یہ تو معرفت کے رشتے ہیں۔ آپ جانیں اور وہ جانیں۔ ویسے انہوں نے مجھے ایک حکم دیا ہے۔"

"وہ کیا ہے۔"

"وہ یہ ہے سرکار کہ میں آپ کی اس شراب معرفت کا چرچا عام کردوں۔" میں نے کہا۔ "تاکہ خلق خدا کو اس سے فائدہ ہو اور چرچا عام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ میں ایک پریس کانفرنس کر کے سب کو بتا دوں۔ یہ بہت ثواب کا کام ہوگا۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔" پیر صاحب بوکھلا گئے تھے۔

"اب تو میں کر چکا ہوں سرکار۔ میں قلندری بابا کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا۔ "اور ہاں۔ ایک بات اور.... آپ نے مجھ سے یہ پوچھا ہی نہیں ہے کہ میں کون ہوں۔ اور کیا کرتا ہوں۔ آپ قلندری بابا میں الجھے رہ گئے۔"

"چلو اب بتاؤ۔ کون ہو تم۔"

"سرکار۔ میں ایک صحافی ہوں۔" میں نے بتایا۔ "اور میرا کام یہی ہے۔"

پیر صاحب مجھے آوازیں دیتے رہ گئے لیکن میں ان کے حجرے اور ان کے مکان سے باہر آ گیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ پیر صاحب کا اگلا قدم کیا ہوتا ہے۔ خودکشی یا فرار۔

لیکن ہوا یہ کہ پیر صاحب نے نہ تو خودکشی کی اور نہ ہی فرار ہوئے۔ بلکہ الٹا میں ہی پھنس گیا۔ اسی رات علاقے کا تھانے دار میرے گھر آ دھمکا تھا۔ وہ ایک خونخوار صورت انسان تھا اور اس کی آواز اس کے چہرے سے زیادہ خطرناک تھا۔

میں احتجاج کرتا رہ گیا کہ مجھے کیوں اٹھایا جا رہا ہے لیکن وہ مجھے اٹھا کر تھانے لے آئے۔ یہاں پیر صاحب بھی تھے۔ منصور بھی تھا اور میگزین کے ایڈیٹر خورشید صاحب بھی تھے۔ جو مجھے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگے تھے۔ پولیس نے ان کے ساتھ مناسب سلوک نہیں کیا تھا۔

آہستہ آہستہ بہت کچھ پتا چلتا گیا۔

پیر صاحب ایک شاطر انسان تھے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ منصور کو اس کام کے لیے لگا رکھا تھا کہ ان کے پاس اگر کوئی باغی قسم کا بندہ آئے تو بظاہر پیر صاحب کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ تاکہ وہ کھل کر سامنے آ جائے کہ اس کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد اس کو پیر صاحب کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کر کے بھڑکایا جائے اور جب وہ اپنے ارادے کا اظہار کر دے تو اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے۔

ایسے پیروں کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔

کرپٹ پولیس والے ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بااثر لوگ بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور منصور جیسے لوگ جو سازش کی بو سونگھتے رہتے ہیں۔

یہ آمر بھی کرتا ہے۔ اپنا اقتدار بچانے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ورنہ ہر ایرا غیرا ایسے پیروں پر ہاتھ ڈال دے۔

میں تو اس لیے پھنسا تھا اور بے چارے خورشید صاحب اس لیے پھنسے تھے کہ میں ان ہی کے میگزین سے وابستہ تھا اور مجھ پر پیر صاحب کو دھمکی دینے کا الزام تھا۔

مجھے چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ خورشید صاحب کو تھانے میں سے بھگا دیا گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد مجھے یہ سبق مل گیا ہے کہ اس قسم کے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے مکمل ہوم ورک بہت ضروری ہے۔ جبکہ میرا ہوم ورک ادھورا تھا۔

اسی لیے میں اپنے پڑھنے والوں کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اوّل تو اس قسم کے پیروں، فقیروں، سیاست والوں جاگیرداروں وغیرہ کو نہ چھیڑیں اور اگر چھیڑ ہی رہے ہیں تو اپنا ہوم ورک مکمل رکھیں۔ منصور جیسے لوگوں سے بچیں۔

◆

رازداں اپنا

جناب ایڈیٹر سرگزشت!

السلام علیکم!

میں آج اپنی ایک بے وقوفی کا احوال سناتے آیا ہوں۔ گرچہ یہ قصّہ اس طرح رونما نہیں ہوا مگر میں نے اسے لطافت سے آراستہ کردیا ہے لیکن واقعہ ہو بہو یہی ہے۔

اختر
(کراچی)

* * *

میں اس وقت ایک دکان سے باہر نکل رہا تھا جب راحیلہ پر نظر پڑی۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں عام طور پر اس قسم کی حرکتیں بہت پلاننگ کے ساتھ کرتا ہوں۔ چند مخصوص جملے ہیں جنہیں میں نے رٹ لیے ہیں انہیں دہرانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

راحیلہ نے جب یہ دیکھا کہ کوئی شخص اسے گھور گھور کر

سکتے کے عالم میں دیکھے جارہا ہے تو ہنسے سے بھناتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ "کیا بات ہے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔ کیا کبھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔"

"ہزاروں لڑکیاں دیکھی ہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "لیکن خوبصورتی کا یہ معیار میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ معاف کیجیے گا۔ میں ایک مہذب انسان ہوں لیکن اس وقت خود پر قابو نہیں رہا۔ سوری۔ اگر آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئی ہیں تو ویری سوری۔"

یہ ایک ایسا حربہ تھا۔ جس سے بہت ہی کم لڑکیاں بچ نکلتی ہوں گی لیکن وہ صاف نکل گئی بلکہ اس نے منہ بنا کر کہا۔ "بس بس۔ زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری تعریف کا حق صرف اسی کو ہوگا جو میرا جیون ساتھی ہوگا۔"

اس نے ایک اشارہ تو دے دیا تھا۔ "نیک بخت تمہارا جیون ساتھی کون ہوگا؟"

"جس کو میرے ابا چاہیں گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اور تمہارے ابا کا معیار کیا ہے۔"

"وہ آرہے ہیں ابا۔ ان ہی سے پوچھ لو۔"

اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کی فکر کرتا۔ وہاں سے نکل لیتا۔ اس کا ابا وہاں کسی طرف سے نمودار ہوگیا۔ کیا بڑا خطرناک ابا تھا۔

پورا پہلوان تھا۔ یہ قد، یہ پھیلی ہوئی چھاتیاں، یہ گھنی مونچھیں۔ سب کچھ خطرناک۔ بہت بڑے گھیرے کی شلوار اور کرتہ پہنے ہوئے۔ مجھے وہ پروفیشنل ریسلر ہی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہمارے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ "کیا بات ہے بھئی۔ کون ہے یہ۔" اس نے راحیلہ سے پوچھا۔

"ابا۔ وہ جو میری دوست ہے نا شہناز، یہ اس کے پھوپی زاد بھائی ہیں۔" راحیلہ نے مجھے صاف بچالیا۔ "یہ مجھے یہاں مل گئے تو خیریت پوچھنے لگے۔"

"اچھا اچھا۔" ابا نے مصافحہ کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا تو ایسا لگا جیسے میرا کاندھا ہی اتر گیا ہو۔ انگلیاں کڑکڑانے لگی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا گئے تھے۔

"نوجوان۔ کچھ کھایا پیا کرو۔" ابا نے بے تکلفی سے میرے شانے پر ہاتھ مار دیا۔

شانے پر جیسے پہاڑ گر پڑا تھا۔ میں نے دیکھا راحیلہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ اس وقت وہ مجھے اور بھی اچھی لگی۔ اس پہلوان کی بیٹی واقعی بہت شاندار تھی۔

"نوجوان، کبھی ہمارے گھر بھی آؤ۔" اس کے ابا نے کہا۔

"ضرور ضرور۔" میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے گردن ہلا دی۔ "ضرور آؤں گا۔"

"بیٹی۔ اس شریف نوجوان کو ہمارا پتا تو معلوم ہوگا۔" پہلوان ابا نے راحیلہ سے پوچھا۔

"نہیں ابا۔ یہ کبھی ہماری طرف نہیں آئے۔"

"نوجوان، ہمارا پتا ہے۔ الف سترہ، دستگیر کالونی، سمجھ گئے۔"

"جی ہاں سمجھ گیا۔" میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یہ پیغام تھا کہ اے اجنبی نوجوان تم ہمارے یہاں ضرور آؤ اسی لیے اس نے اپنے ابا سے غلط بیانی کی تھی۔

"اچھا بیٹا۔ میں سامنے والی دکان سے اپنے لیے بادام اور چنے لے کر آتا ہوں۔ سب ختم ہوگئے ہیں۔ تم جب تک ان سے باتیں کرو۔"

ابا جلدی سے ایک طرف چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی راحیلہ نے میری طرف دیکھا۔ "اب جلدی سے اپنا نام بتا دو، ورنہ ابا کیا کہیں گے کہ دوست کے بھائی کا نام بھی نہیں معلوم، اور میرا نام تو سن ہی چکے ہو۔ راحیلہ۔"

"میرا نام اختر ہے۔" میں نے بتایا۔ "اختر عالم۔ میں نمبر تھری ناظم آباد میں رہتا ہوں اور ایک فرم میں کام کرتا ہوں۔"

"بس اتنا ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن تم ضرور آنا۔"

اسی دوران میں اس کا ابا بادام اور چنے لے کر آچکا تھا۔ پھر وہ دونوں ایک طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی ہڈیوں کا جائزہ لیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ ویسے اس کا ابا خطرناک آدمی تھا۔

اپنے فلیٹ میں واپس آکر بھی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا ابا چاہے جیسا بھی ہو۔ راحیلہ بہت دل کش تھی۔ اس کے چہرے پر جو ملاحت تھی، وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

اس کے ابا خطرناک ہیں لیکن وہ تو ٹھیک تھی اور میں

نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بھی دیکھے تھے۔ اس کا پتا یاد تھا مجھے۔ ایف سترہ دو گجیر۔

میں دوسری شام کو اس علاقے میں پہنچ گیا۔ وہ ایک اسٹریٹ تھی۔ جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے عام سے مکانات بنے ہوئے تھے۔

یہ سفید پوش لوگوں کی آبادی تھی۔ عام طور پر پڑھے لکھے رہا کرتے۔ مجھے ایف سترہ تلاش کرنا تھا۔ کراچی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ لوگ مکانوں کے گیٹ پر نمبر کے علاوہ سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔ کہاں کے رہنے والے تھے، باپ دادا کے نام کیا تھے۔ کس مہینے میں پیدائش ہوئی۔ کون کون سی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہ سب لکھا ہوتا ہے۔ صرف مکان نمبر نہیں لکھتے۔ خدا جانے یہ کون سا ٹوٹکا ہے یا کسی قسم کی احتیاط۔

مجبوراً ایک دکان کے سامنے بیٹھے کچھ لوگوں سے ایف سترہ معلوم کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک مجھے دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی بدتمیزی پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ "خیریت ہے بھائی۔ یہ تم مجھے دیکھ کر ہنس کیوں رہے ہو۔ کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔"

"نہیں بھائی۔ ابھی نہیں۔ لیکن ایف سترہ سے واپسی پر سینگ ضرور نکل آئیں گے۔" اس نے کہا۔

اب وہ سب کے سب ہنسنے لگے۔ بدتمیز قسم کے لوگ تھے۔ میں بھنا کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اس آدمی نے جو زور زور سے ہنس رہا تھا۔ کونے والے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ مکان دیکھ رہے ہونا۔ وہی ایف سترہ ہے۔"

میں جب اس مکان کی طرف جانے لگا تو اس نے آواز لگائی۔ "بھائی جان۔ واپسی میں اپنی سینگیں ضرور دکھا دینا۔"

میں ان کی بدتمیزی پر انہیں دل ہی دل میں برا بھلا کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ویسے وہ لوگ اس قسم کی جو باتیں کر رہے تھے تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔

بہرحال یہی سب سوچتا ہوا میں ایف سترہ تک پہنچ گیا۔ جس کا گیٹ لوہے کا تھا۔ میں نے گیٹ پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے اسی پہلوان ابا کی غراہٹ سنائی دی۔ "کون ہے بے۔"

"جناب۔ میں ہوں اختر۔"

دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ پہلوان ابا لنگوٹ باندھے میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ بہت خطرناک جسم تھا اس کا۔ ایک دم کسا ہوا۔ ورزشی۔

"ہاں بھائی۔ کون ہے تو۔" اس نے پوچھا۔

"جناب۔ میں اختر عالم ہوں۔" میں نے پریشان ہو کر بتایا۔ "آپ کو یاد ہوگا۔ اس دن مارکیٹ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ بادام لینے گئے تھے۔"

"ابے بادام پستہ تو میں روز لینے جاتا ہوں۔ تو کس خاص دن کی بات کر رہا ہے۔"

"جس دن آپ کی صاحب زادی بھی آپ کے ساتھ تھیں۔"

"وہ تو روز میرے ساتھ ہوتی ہے۔ اب بتا۔"

"جناب۔ اس نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اس کی دوست کا بھائی ہوں۔"

"ابے۔ وہ تو ہر ایک کے لیے یہی کہتی ہے۔ تجھ میں کیا خاص بات ہے۔"

اب اس پہلوان سے بحث کرنی بے کار ہی تھی۔ "ٹھیک ہے صاحب۔ آپ نہیں پہچان رہے ہیں تو جہنم میں ڈالیں۔ میں واپس جا رہا ہوں۔"

"ایسے کیسے واپس چلا جائے گا۔" اس نے جو میری گردن میں ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا ہے تو میں سیدھے لان میں جا گرا۔ جو پوری طرح کھدا ہوا تھا۔ یعنی وہ لان اس پہلوان کے لیے اکھاڑے کا کام کرتا ہوگا۔

اس وقت سمجھ میں آ گیا کہ وہ لوگ ایڈریس پوچھنے پر کیوں میرا مذاق اڑا رہے تھے اور یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ واپسی میں میری سینگیں نکل آئیں گی۔

ایسی بے عزتی تو پہلے کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔

اس نے میرے قریب آ کر میرا گریبان پکڑ کر مجھے اٹھا دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرتا۔ راحیلہ رحمت کے فرشتے کی طرح اندر سے نمودار ہو گئی۔ "ابا۔ یہ کیا کر رہے ہو۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔ "یہ اختر صاحب ہیں۔"

"کون اختر صاحب!"

"ارے وہی جو اس دن ملے تھے۔ میری دوست شہناز کے پھوپھی زاد بھائی۔"

"اچھا اچھا یہ وہ ہے۔ (فاصلہ کم کریں) پہلوان ابا خفیف ہو کر بولا۔ "تو جوان۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"بتایا تو تھا جناب۔ لیکن آپ نے پہچانا ہی نہیں۔"

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے اپنے لباس سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا نوجوان۔ آج کل میری یادداشت کچھ کمزور ہوتی جارہی ہے۔ ایک دن پہلے کے واقعات بھول جاتا ہوں۔"

"جناب۔ آپ اگر ہر بار اسی طرح بھولتے رہے تو پھر میں آئندہ تو آنے سے رہا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" اس نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ "جاؤ بیٹا۔ ان کو اندر لے جاکر چائے وائے پلاؤ۔ میں جب تک بیٹھکیں لگا کرتا ہوں۔"

راحیلہ مجھے مکان کے اندر لے آئی۔ چھوٹا سا تھا لیکن سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ پہلوان ابا سے تو ایسی خوش ذوقی کی امید نہیں تھی۔ یہ سب راحیلہ کا کارنامہ ہو سکتا تھا۔

"اختر مجھے افسوس ہے کہ ابا نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ ابا کی عادت ہے۔ وہ عشق کا امتحان اسی طرح لیا کرتے ہیں۔"

"عشق کا امتحان؟ لیکن میں ان سے عشق کب کر رہا ہوں۔"

"اوہو۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں آنے والا ہر شخص مجھ سے عشق کرنے آتا ہے۔"

"کیا اور بھی کچھ لوگ آچکے ہیں۔"

"دیکھو نا۔ میں ایک ماڈرن لڑکی ہوں۔" اس نے کہا۔ "لڑکوں سے دوستی تو رہتی ہے نا۔ جیسے کالج کے نعمان اور رفیق دونوں کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔ محلے کا ارشد تو گلے پڑ گیا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ بھی ایک دو بار ہوٹل جانا پڑا۔ افضل اور نعیم سے نیٹ پر دوستی ہوئی تھی۔ پھر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ فرخ تو بالکل پڑوس میں ہی رہتا تھا۔ جواد اور ساجد سے مارکیٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ خورشید تو خیر خاندان ہی کا تھا۔"

"ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔" میں جلبلا کر بولا۔ "بہت ہی مختصر فہرست ہے تمہارے چاہنے والوں کی۔"

"اب سب کے نام تو یاد نہیں ہیں نا۔ ڈائری میں لکھے ہوئے ہیں، کہو تو ڈائری لے آؤں۔"

"نہیں رہنے دو۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے کس کھاتے میں ڈال رہی ہو۔"

"پیار کے کھاتے میں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

"پیارے اختر عالم صاحب۔ میں نے جتنے نام بتائے۔ یہ سب میرے دوست تھے۔ صرف دوست۔ جبکہ تم سے پیار کا رشتہ استوار ہونے لگا ہے۔"

"کب سے۔"

"جب سے ابا نے تمہاری ٹھکائی کی ہے۔" اس نے بتایا۔ "تم میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ میں تمہارے لیے واقعی سنجیدہ ہو گئی ہوں۔"

پھر اس نے میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میں اس طرح پگھل گیا جیسے موم کو چولہے پر رکھ دیا گیا ہو۔

"راحیلہ۔ تم یہ بتاؤ۔ تمہارے ابا کو راضی کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"ایک شرط پوری کرنی ہوگی۔" اس نے بتایا۔

"اور وہ شرط ہے کیا۔"

"وہ شرط یہ ہے کہ جو انہیں ریسلنگ میں ہرا دے۔ ابا اسے اپنا داماد بنالیں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے اس دیو ہیکل ابا کو ہرا سکوں گا۔"

"یہ سوچنا تو تمہارا کام ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا پڑے گا۔"

"میں کیوں نہ تمہارے ابا کے لیے کرائے کے کسی ریسلر کا بندوبست کرلوں۔" میں نے کہا۔ "وہ میرے بی ہاف پر لڑے گا۔"

"تو پھر ابا اس سے میری شادی کروا دیں گے۔"

"یہ تو واقعی بہت بڑی مصیبت ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو۔ تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ نہ کچھ سوچتا ہوں۔"

"دیکھو میرا دل مت توڑنا۔ ایسا نہ ہو کہ ابا کے ڈر سے تم غائب ہی ہو جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں اپنی اس زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ لگتا ہے ایسا کوئی نہیں ہوگا جو آکر میرا ہاتھ تھام لے۔"

اس وقت میں اس کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔

اس کا باپ اس کے عشق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ کوئی بھی معقول آدمی اس کے گھر میں اپنا رشتہ لے کر نہیں آسکتا تھا۔

راحیلہ کی آنکھوں میں اگر آنسو تھے تو وہ اپنی قسمت پہ ماتم کرنے کے لیے حق بجانب تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ خوبصورت، سلیقہ مند۔ اس کے گھر کو دیکھ کر اس کے سلیقے کا احساس ہونے لگا تھا۔

اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ باپ ہی نے پرورش کی ہے۔ اس نے بی اے تک تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔

اس نے پھول بنانے اور آرائش کی دیگر چیزوں کے کورسز بھی کر رکھے تھے۔ یعنی وہ ہر طرح اپنائے جانے کے قابل تھی لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس کو باپ ایسا ملا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے وعدہ کرلیا کہ میں ہر قیمت پر اسے حاصل کرلوں گا۔ چاہے کچھ بھی کرنا پڑے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ میں کیا کرتا۔

گھر آکر سوچتا ہی رہا۔ کیسے کروں اس کے باپ پر۔ لیکن کیسے کیا بنے گا کچھ بھی نہیں۔ اگر آنے والے دامادوں سے کچھ لڑتا ہے تو اس میں قانون کیا کرسکتا ہے۔

یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ میں اس کو کرائے کے کسی پہلوان سے لڑوا دوں لیکن ایسی صورت میں خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ اسی پہلوان سے راحیلہ کی شادی نہ کروا دے۔ اس ٹائپ کے آدمیوں کا کوئی بھروسا بھی نہیں ہوتا۔ پھر ایک بات ذہن میں آگئی۔

میرے سامنے ایک پرانا اخبار پڑا تھا۔ اس اخبار کو دیکھ کر ہی وہ بات ذہن میں آئی تھی۔ عامل بابا۔ ناممکن کو ممکن کردینے والے۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔ فلاں سو سالہ سنیاسی بابا۔ برما کے جنگل میں تیس برس تک عبادت کی۔ جنّیش، ورد پڑھی کی طاقت سے کام لینے والا، شرطیہ کامیابی، اور نہ جانے کیا کیا۔ میں کبھی ایسے چکروں میں نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس دن سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ کسی کو آزمایا جائے۔

میں نے وہ اخبار اٹھا لیا۔

اس ٹائپ کے درجنوں اشتہارات تھے۔ اصل کام تھا سلیکشن، پھر ایک اشتہار پر نظر جم کر رہ گئی۔ عامل خرم تسیم، ماڈرن نام تھا۔ اور اس نے زیادہ دعوے بھی نہیں کیے تھے۔ صرف یہ لکھا تھا کہ آپ ایک بار ہمیں بھی آزما کر دیکھیں۔ ایک موبائل نمبر بھی دیا ہوا تھا۔

میں نے اسی وقت موبائل کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب مل گیا تھا اور وہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ بہت خوبصورت اور دلکش آواز۔

"کیا آپ خرم تسیم صاحب کے یہاں سے بول رہی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں۔"

"مجھے ان سے ملنا تھا۔"

"کب ملنا تھا۔"

"آپ جب کہیں۔ ویسے آپ کون ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میں ان کی سیکریٹری ہوں۔" اس نے بتایا۔ "میں آپ کو ایک نمبر دے رہی ہوں۔ یہ آپ کا ٹوکن نمبر ہوگا۔ آپ ہمارے دفتر آکر اس نمبر کے حوالے سے بات کرسکتے ہیں۔"

"چلیں۔ نمبر ہی دے دیں، اور ان کی فیس بتا دیں۔"

"دیکھیں فرسٹ وزٹ کے ہزار روپے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہر وزٹ کے تین سو۔" اس نے بتایا۔

"اوکے۔ آپ نمبر دیں۔"

اس نے مجھے نمبر دیا۔ میرا نام پوچھا اور شاید کوئی ڈائری وغیرہ دیکھنے کے بعد بتایا کہ میں کل شام کو خرم صاحب سے ملنے آسکتا ہوں۔"

واہ۔ کیا سروس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے رہا ہوں۔ خرم تسیم نے اپنے ساتھ بابا

Alternative & Integrated medicine

جڑی بوٹیوں اور قدرتی اجزا سے تیار کردہ مندرجہ ذیل میڈیسن اب آپ گھر بیٹھے منگوا سکتے ہیں

فرٹیلٹی کورس برائے مرد حضرات

مردوں میں جرثوموں کی کمی اور کمزوری کو دور کرکے اولاد پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقوی و مثولد ہے

شادی کورس

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے زائل شدہ توانائی کی بحالی کا مستقل اور مکمل کورس۔ انشاءاللہ کسی قسم کی کمی اور محرومی محسوس نہ ہوگی

ازدواجی کورس

شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی قوت کا فوری اور مستقل علاج۔ کامیاب اور ازدواجی زندگی کے لئے موثر ترین کورس

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
[illegible]

نزد ریلوے کراسنگ گوجرہ روڈ جھنگ صدر
03216528001, 03008652456
email. [illegible]

وغیرہ کا دم چھلا نہیں لگایا تھا۔ بالکل جدید اسٹائل پر کام کرنے والی پارٹی معلوم ہوتی تھی۔

میں دوسری شام اس کے دفتر پہنچ گیا۔

جی ہاں۔ وہ کسی بابا وغیرہ کے آستانے جیسا نہیں تھا۔ بلکہ باقاعدہ آفس تھا۔ بہت شاندار شیشے لگے ہوئے۔ کمپیوٹرز پر کام کرتے ہوئے لوگ۔ ایک کاؤنٹر جس کے پیچھے ایک اسمارٹ سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے رجسٹر کھول کر بتایا۔ ”آپ کو ٹوکن نمبر بارہ دیا گیا ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے گردن ہلائی۔ پھر پوچھ لیا۔ ”شاید کل آپ ہی سے میری بات ہوئی تھی۔“

”جی ہاں۔ میں ہی سر کی سیکریٹری ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ تشریف رکھیں۔“

سامنے دیوار کے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں انتظار کرنے والے خاصے ماڈرن اور پڑھے لکھے لوگ معلوم ہو رہے تھے۔

یعنی عام روایتی باباؤں کے پاس جس قسم کے لوگ جایا کرتے ہیں۔ یہ ان سے بہت مختلف تھے۔ دو عورتیں بھی تھیں اور وہ بھی پڑھی لکھی دکھائی دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک ٹوکن نمبر پکارا گیا۔ اور ایک آدمی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی پندرہ منٹ کے بعد ہوئی تھی۔ پھر دوسرا۔ اس کے بعد ایک عورت، پھر میری باری آئی۔

میں اس کے کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کمرا جدید انداز سے سجا ہوا تھا۔ دیوار پر بڑی سی پینٹنگ، دیوار کے ساتھ خوبصورت صوفے، شیشے والی بڑی سی میز اور ایک ماڈرن سا آدمی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا۔

یہ سب دیکھ دیکھ کر مجھے حیرانی ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”سب کچھ میرے اندازے کے بالکل برعکس ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ میں روایتی باباؤں کی طرح نہیں ہوں۔ یہاں تمہیں اگر بتیاں جلتی ہوئی، اور شیر کی کھال اور گیدڑ کی کھوپڑی نہیں ملے گی۔“

”وہی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“ اب میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”ہمارے یہاں ہر کام جدید انداز سے ہوتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”دعا، تعویذ اور چلہ وغیرہ کا ہمارے پاس رواج نہیں ہے۔“

”تو پھر کیسے کرتے ہیں۔“

”جدید علوم کے ذریعے۔ جو جدید نہیں۔ بہت قدیم ہیں۔ لیکن سائنٹفک ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”جیسے ٹیلی پیتھی، مسمریزم، ریکی وغیرہ۔“

”ہاں۔ میں نے بھی ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ان سے کام ہو جاتا ہے۔“

”سو فیصد۔“ اس نے کہا۔ ”ان کے اثرات تعویذ گنڈوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنا مسئلہ بتائیں۔“

”بہت ہی بے ڈھنگا مسئلہ ہے۔“

”کوئی دل کا معاملہ ہے کیا؟“

”ہاں۔ دل ہی کا معاملہ ہے۔ لیکن کیس بہت بے تکا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ بتائیں مجھے۔“

میں نے اسے راحیلہ اور اس کے باپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت دیر تک ہنستا رہا تھا۔ ”واقعی بہت دلچسپ کیس ہے۔ ایسا باپ تو لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہوگا۔“

”جی جناب۔ لاکھوں میں ایک ہے۔“

”چلیں۔ اس کا ایڈریس لکھوا دیں۔ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ اس نے کہا۔

”حل ہو جائے گا؟ کیسے۔ کیا آپ مجھے ٹارزن بنا دیں گے کہ میں اس سے کشتی لڑ سکوں۔“

”جی نہیں۔ میں ٹیلی پیتھی اور مسمریزم کی طاقت سے اس شخص کو آپ کے لیے ہموار کر دوں گا۔“ اس نے بتایا۔ ”اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ناممکن کو ممکن بنایا جاتا ہے۔“

”مگر ایسا ہو جائے تو پھر کمال ہو جائے گا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کیس ہمارے پاس آچکا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے۔“

”آپ کی فیس کتنی ہوتی ہے۔“

”سیکریٹری نے بتا دیا ہوگا۔ پہلی وزٹ کے ہزار۔ اس کے بعد تین تین سو۔“

”جی ہاں۔ اس نے بتایا تھا۔“

”آپ جاتے ہوئے کاؤنٹر پر پیسے جمع کروا دیجیے

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلبہری

قابل علاج مرض ہے

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر

اجمل زیدی

کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام

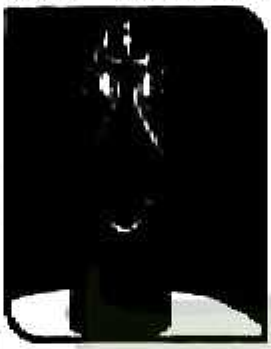

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

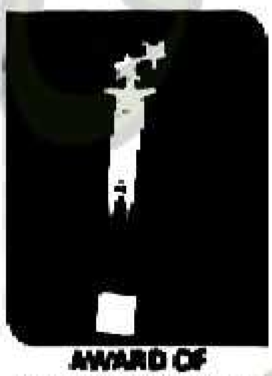

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

[illegible] G-6/1
[illegible]
فون (051) 2264506 - 2256080
موبائل 0300-8566186
فیکس 2261636

لاہور

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
[illegible]
[illegible]
موبائل 0300-8566186

پشاور

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر

[illegible]
[illegible]
فون (0521) 2218215-6
موبائل 0300-8566186

ملتان

28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

[illegible]
[illegible]
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566186)

کراچی

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

[illegible] سینٹر
آفس 706، 7 [illegible]
[illegible] KFC [illegible] کراچی
فون 021-7012088-9
موبائل 0300-8566186

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

گا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اور مجھے ایڈریس لکھوا دیں۔‘‘

میں نے اس کو راحیلہ کا ایڈریس لکھوا دیا۔

’’آپ ایک ہفتے کے بعد آجائیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ایک ہفتے کے بعد آپ کو رپورٹ مل جائے گی۔‘‘

میں نے کاؤنٹر پر ہزار روپے دے دیے۔ دل کچھ مطمئن بھی تھا۔ اور کچھ بے اطمینانی بھی ہو رہی تھی۔ پتا نہیں۔ یہ سب کیسے ہوتا۔

میں راحیلہ کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا کہ کہیں اس کے باپ سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ تھا اور میں فی الحال پٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اتنی مشکلوں سے تو پچھلی پٹائی کے اثرات کم ہوئے تھے۔

ایک ہفتہ میں نے بڑی بے قراری میں گزارا تھا۔ پتا نہیں۔ ایک ہفتے بعد کیا ہوتا۔

اس کی سروس بہت ہی پراپر تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اس کی سیکریٹری کا فون آگیا۔ ’’سر۔ آپ کو خرم صاحب نے یاد کیا ہے۔ ٹھیک چار بجے آپ کی میٹنگ ہے۔‘‘

دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے یقیناً کوئی کارنامہ دکھا دیا ہوگا۔

میں ٹھیک چار بجے اس کے دفتر پہنچ گیا۔

انتظار کے مرحلوں سے گزرے بغیر ہی اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

’’آئیں جناب۔ آئیں۔‘‘

’’آپ نے خود ہی بلا لیا مجھے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ورنہ میں شاید کل آتا۔‘‘

’’جی ہاں۔ میں نے سوچا کہ آپ کو وہ خبر سنا ہی دوں۔‘‘

’’ضرور سنائیں جناب۔ میں تو بے چین بیٹھا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’جناب۔ میں خود آپ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر گیا۔ پہلے تو اس پہلوان ابا سے ملاقات ہوئی۔ پھر اس کی بچی سے ملا۔‘‘

’’کیسا پایا آپ نے اسے؟‘‘ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

’’بہت اچھی لڑکی ہے۔ اپنے باپ کے بالکل برعکس۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’ایسی لڑکی کسی بھی شخص کے لیے مبارک ثابت ہو سکتی ہے۔‘‘

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ راحیلہ کی تعریف مجھے اچھی لگی تھی۔

’’پھر کیا ہوا جناب۔‘‘

’’میں نے اس کے پہلوان ابا پر اپنے حربے آزمائے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’میں نے پہلے اسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی قوت ارادی بہت مضبوط ہے۔ اسی لیے یہ حربے کام نہیں آئے۔‘‘

’’مجھے بھی ایسا ہی اندازہ تھا۔ وہ آدمی اس طرح قابو نہیں آنے والا۔‘‘

’’اس کے بعد میں نے اپنا دوسرا خطرناک ہتھیار یعنی ٹیلی پیتھی استعمال کیا۔ اور اس میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔‘‘

’’واہ۔ یہ بات ہوئی نا۔‘‘

’’میں نے اس کو اپنی اس طاقت سے زیر کر لیا۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’بہت بہت شکریہ خرم صاحب۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یعنی اب میں اس کے گھر جا سکتا ہوں۔‘‘

’’کیا کریں گے وہاں جا کر کیونکہ راحیلہ اب میری منگیتر ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’کیا؟‘‘ میں تو بھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ ’’تمہاری منگیتر ہے۔‘‘

’’ہاں جناب۔ چونکہ میں نے اس کے باپ کو زیر کر لیا تھا۔ اس لیے اس نے خود ہی راحیلہ کی بات کر لی، اور راحیلہ تو پہلی ہی نظر میں خود مجھے بھی پسند آگئی تھی۔ اسی لیے میں نے فوراً ہاں کرنے میں دیر نہیں لگائی۔‘‘

’’لعنت ہو تم پر ذلیل انسان۔‘‘ میں غصے سے بھڑکتا جا رہا تھا۔

’’دیکھیں گالیاں نہ دیں۔ اس کی جو شرط تھی۔ وہ میں نے پوری کر دی۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے۔‘‘

’’اور وہ۔ وہ راحیلہ۔‘‘

’’وہ بھی اس رشتے پر بہت خوش ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

میں اسے برا بھلا کہتا ہوا جب کمرے سے جانے لگا تو اس نے آواز لگائی۔ ’’سنیں۔ چونکہ آپ کا کام نہیں ہوا ہے اس لیے کاؤنٹر سے اپنی فیس واپس لے لیجیے گا۔‘‘

میں فیس لیے بغیر ہی واپس آگیا۔

اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ کبھی زبان غیر سے شرح آرزو نہ کریں۔ ورنہ بھی کہنا پڑے گا کہ ’’رقیب بن گیا آخر کو تھا جو راز داں اپنا۔‘‘

◆ ● ◆

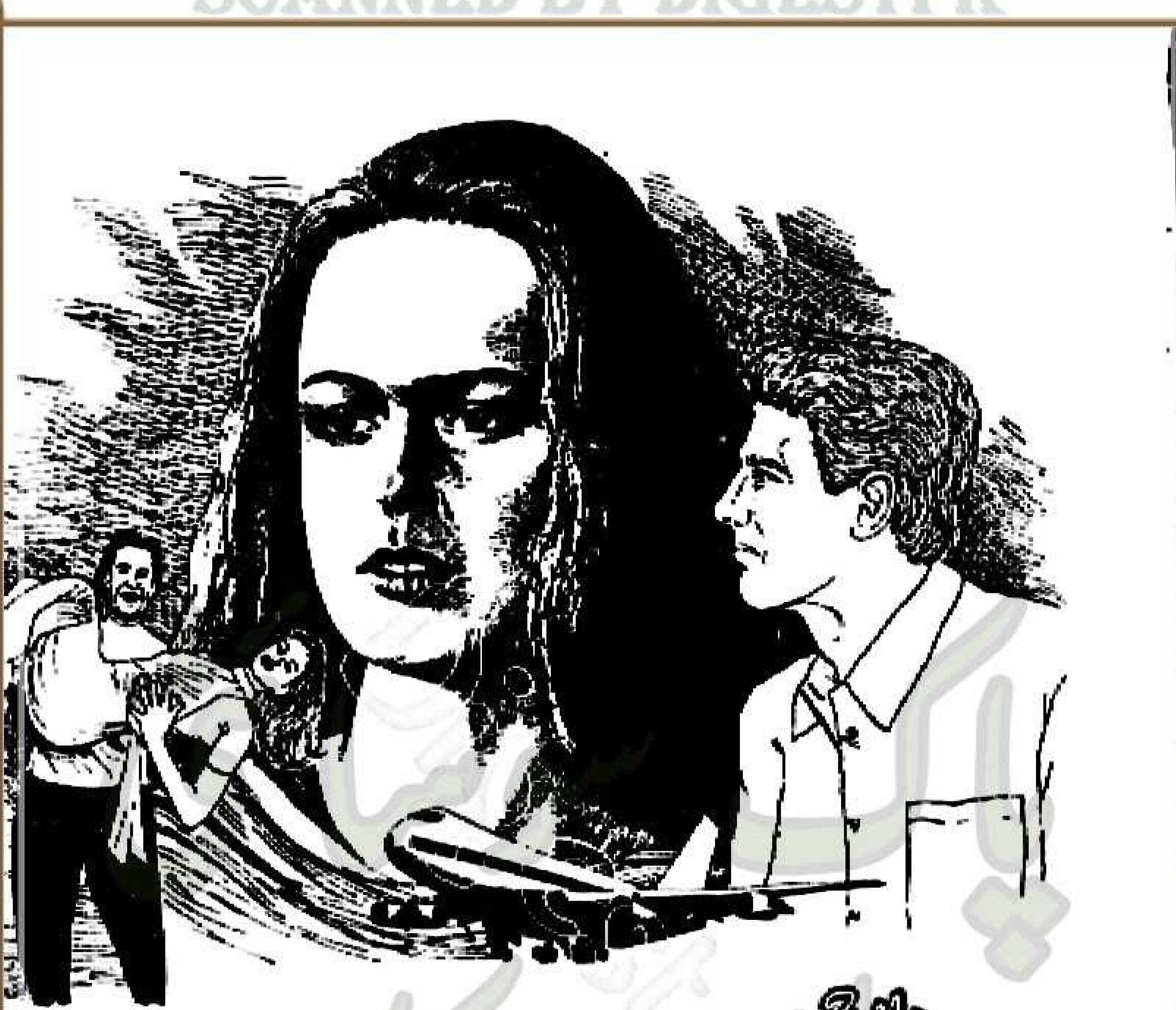

علاج

محترمہ عذرا رسول !

السلام علیکم !

میں سرگزشت کی بہت پرانی پڑھنے والی ہوں۔ کافی عرصہ سے سوچ رہی ہوں کہ سرگزشت کے قارئین کو اپنی انوکھی داستان سناؤں لیکن حوصلہ نہیں ہورہا ہے۔ کسی بھی ڈائجسٹ یا اخبار میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ تعلیمی دور میں بھی مضمون لکھنے سے جان جاتی تھی، پھر بھی تھوڑا تھوڑا کرکے اپنی داستان لکھ لی ہے۔ امید ہے یہ انوکھی داستان بلکہ یوں کہیں کہ یہ انوکھا مگر سائیکلوجیکل طریقہ علاج آپ کو بھی پسند آئے گا۔ اگر ممکن ہو تو ضرور شائع کریں۔

نائلہ

(فیصل آباد)

نہ جانے کیا ہوا تھا۔

میں نے آوازیں سنیں جیسے کوئی زور زور سے دروازے پر لاتیں مار رہا ہو۔ میں اس وقت کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ بوکھلا کر دروازے کی طرف بھاگی لیکن آوازیں تو اندر سے آرہی تھیں۔

اوخدا۔ یہ آوازیں تو غسل خانے سے آرہی تھیں جہاں میرے شوہر محسن نہانے کے لیے گئے تھے۔ وہ دفتر جانے سے پہلے ضرور نہایا کرتے۔ چاہے کوئی بھی موسم ہو۔

میں نے غسل خانے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ ”محسن۔ محسن۔ دروازہ کھولیں۔ کیا ہوا۔“

لیکن جواب میں دروازے پر لاتیں پڑتی رہیں اور ساتھ ہی محسن کے ہکلانے کی آوازیں آئیں۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

میں پریشان ہوکر اپنے فلیٹ سے باہر آگئی۔ برابر کا فلیٹ ارشد صاحب کا تھا۔ میں نے زور زور سے دستک دے دی۔ ارشد بوکھلائے ہوئے باہر آئے تھے۔ ”کیا ہوا بھابی۔ خیریت تو ہے۔“

جلدی آئیں۔ خدا جانے محسن کو کیا ہوا ہے۔ وہ باتھ روم میں ہیں۔“

ارشد بھی میرے ساتھ آگئے۔ ان کی بیوی بھی ساتھ ہی آگئی تھی۔ دروازے پر ابھی تک لاتیں پڑ رہی تھیں لیکن ان کی قوت بہت کم ہوگئی تھی۔ جیسے محسن تھک گئے ہوں۔

ارشد نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اس دوران میں ارشد کی بیوی فلیٹ کے ایک اور آدمی کو بلا کر لے آئی تھی۔ چوکیدار بھی آگیا تھا۔ اب تینوں مل کر دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”نزہت“ ارشد نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ ”بھابی کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔“

میں وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی لیکن نزہت مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔ اس دوران میں، میں مسلسل کانپتی رہی۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ میں نے رونا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے کمرے سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آرہی تھی۔ ساتھ ہی وہ لوگ کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ارشد کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ”بھابی۔ ہم نے محسن صاحب کو ڈرائنگ روم میں لٹا دیا ہے۔“

”خدا کے لیے بتائیں تو سہی کیا ہوا ہے ان کو۔“

”فالج۔“ ارشد نے بتایا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ دائیں طرف ہے۔ بایاں حصہ ٹھیک ہے۔ اسی ٹانگ سے وہ دروازے پر ٹھوکر مار رہے تھے۔“

میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔ محسن جیسے جوان، خوش مزاج اور اسمارٹ شخص پر فالج ہوگیا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ میں دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

جس کے ایک صوفے پر محسن بے بسی کی تصویر بنے لیٹے تھے۔ میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن ان کی زبان ہی ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

دایاں حصہ فالج سے بری طرح متاثر تھا۔ اس دوران میں ارشد نے فون کر کے ایمبولینس منگوالی تھی۔ میں نے محسن اور اپنے گھر والوں کو فون کر دیا۔ ذرا سی دیر میں سب ہی جمع ہوگئے اور محسن کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسپتال پہنچتے ہی محسن کا علاج شروع ہوگیا تھا۔

میں صرف رو رہی تھی۔ محسن کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ تو صحت مند آدمی ہیں۔ چلتے بولتے ہوئے۔ مکمل تندرست۔ انہیں فالج کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بے رحم حقیقت ہمارے سامنے تھی۔

☆☆☆

ہماری شادی کو ابھی صرف ایک سال ہوا تھا۔

ایک سال ہوتا ہی کیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ یہ ہماری ارینج میرج تھی۔ دونوں کے گھر والوں نے یہ رشتہ لگایا تھا۔

محسن کے ابو میرے ابو کے دوست تھے۔ بس یہ تعلق تھا اور شادی طے ہوگئی تھی۔ ہم دونوں ہی اس معاملے میں خوش نصیب تھے کہ محبت ہمیں شادی کے بعد ہی ملی تھی۔ نہ تو کوئی محسن کی زندگی میں آئی تھی اور نہ ہی کوئی میری زندگی میں آیا تھا۔

میرے گھر کی تربیت ہی ایسی تھی کہ ادھر اُدھر دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور محسن اپنی تعلیم کے بعد اپنا کیریئر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔

لیکن شادی کے بعد ہم دونوں نے ٹوٹ کر ایک دوسرے سے محبت کی تھی۔ محسن نے شادی سے کچھ پہلے ایک جدید خوبصورت سا فلیٹ خرید لیا تھا۔

ہم دونوں میں جمالیاتی حس موجود تھی۔ اسی لیے ہم نے بہت خوبصورتی سے اپنے فلیٹ کو ڈیکوریٹ کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان مکمل ذہنی ہم آہنگی تھی جس پر ہم دونوں ہی خدا کے شکر گزار تھے۔

میرا سارا وقت فلیٹ کی دیکھ بھال میں گزر رہا تھا۔ ہم بہت خوبصورت پینٹنگز خرید لائے تھے۔ جنہوں نے اس گھر کی خوبصورتی میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔

ہمارا معمول تھا کہ شام کے وقت ہم آؤٹنگ پر نکل

www.paksociety.com www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز

✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت

✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی

✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج

✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک

✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ

✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی

✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج

✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن

✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ

✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

جاتے۔ رات کا کھانا عام طور پر باہر ہی کھایا جاتا۔ یعنی خدا نے ہر طرح کی خوشیاں دے رکھی تھیں اور ہم بہت خوش تھے کہ اچانک یہ حادثہ ہو گیا۔

یہ ایک قیامت تھی۔ قیامت۔

محسن بستر کا ہو کر رہ گئے تھے۔ میں ہی ان کی ساری ضروریات کا خیال رکھا کرتی۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ کسی بچے کی طرح ہو گئے تھے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ہم اس قابل تھے کہ ان کا علاج کروا سکتے۔ محسن اور میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی رقم تھی۔ اس کے علاوہ دونوں کے گھر والے بھی اس مشکل وقت پر ہمارے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس طرف سے تو کوئی پریشانی نہیں تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اچانک ہو کیا گیا ہے؟ محسن کو ہمت کیسے ہو گی۔ خدا نہ کرے کیا وہ اسی طرح ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑے رہیں گے۔

اسپتال سے فارغ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ "اب ان کو اسپتال میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایسا مرض ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ٹھیک ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ برسوں لگ جائیں۔"

"ڈاکٹر صاحب کیا بیرونِ ملک بھی ان کا علاج نہیں ہو سکتا۔"

"میرے خیال میں نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اب اصل امتحان آپ کا ہے۔ میری مانیں تو آپ ان کے لیے مستقل نرس رکھ لیں۔ ان کو سنبھالنا آپ کے بس کا روگ نہیں ہو گا۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ کیا یہ پھر سے چلنے پھرنے اور بولنے کے قابل ہو جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"چلنے پھرنے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کچھ دنوں کے بعد زبان کی اینٹھن ختم ہو جائے گی۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "کم از کم بولنا تو شروع کر دیں گے اور ویسے بھی اس قسم کے مریضوں کا علاج خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ایسے مریض اپنی قوتِ ارادی ختم کر کے اپنے آپ کو اپنے مرض کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ لڑنا نہیں چاہتے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔"

"ابھی نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد انہیں نفسیاتی علاج کی ضرورت ہو گی۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "تاکہ ان میں پھر سے جینے کا حوصلہ اور خواہش پیدا ہو جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بے شمار ہدایات اور نصیحتوں کے بعد ہمیں اسپتال سے فارغ کر دیا۔ ہم محسن کو لے کر گھر آ گئے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر دل خون کے آنسو رویا کرتا۔

زندگی سے بھرپور کسی شخص کے ساتھ ایسا ہو جائے تو پھر جو کچھ نہ کیا جائے، وہ کم ہے۔ اسپتال میں کچھ دنوں رہنے کے بعد کم از کم اتنا تو ہو گیا تھا کہ محسن کی زبان کی لکنت بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ اب وہ جو بولتے وہ کم از کم سمجھ میں آ جایا کرتا۔ ویسے تو ہم نے ان کے لیے ایک مستقل نرس بھی رکھ لیا تھا لیکن عام طور پر میں ہی ان کی خدمت میں لگی رہتی۔

محسن ایسے موقعوں پر آنسو بہایا کرتے۔ "نائلہ۔ میں تمہیں زندگی کا کوئی سکھ نہ دے سکا۔" وہ کہا کرتے۔ "ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ تم پر یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تم صرف میری خدمت کی ہو کر رہ گئی ہو۔"

"محسن نہ کریں ایسی باتیں۔" میں خود پر جبر کرتے ہوئے کہتی۔ "خدا نے چاہا تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"نہیں نائلہ۔ اب کوئی اُمید نہیں ہے۔ میں نے اس مرض سے کسی کو شفا پاتے ہوئے نہیں دیکھا۔" محسن کے لہجے میں بے پناہ مایوسی ہوتی۔

اس وقت میں اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے کسی کام کا بہانہ کر کے محسن کے پاس سے ہٹ جاتی اور وہ حسرت سے مجھے دیکھتے رہتے۔

میں سمجھ گئی تھی کہ محسن نے آس چھوڑ دی ہے۔ وہ زندگی اور موت کی اس جنگ میں سرینڈر کرنے لگے ہیں اور یہ بہت خطرناک علامت تھی۔

میں نے ان ہی ڈاکٹر سے مشورہ کیا جس کے وہ زیرِ علاج تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "ہاں ایسا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مریض مایوس ہو جاتے ہیں۔ ان میں بقا کی جنگ لڑنے کی طاقت نہیں رہتی۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب ایسی کیفیت شروع ہو جائے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کریں۔ اب آپ کے شوہر کا نفسیاتی علاج شروع ہو گا۔ یہ بھی بہت اہم

مرحلہ ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ میں تو کسی سائیکاٹرسٹ کو نہیں جانتی کیونکہ کبھی ایسا مرحلہ سامنے نہیں آیا تھا۔" میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو ڈاکٹر ذیشان کے پاس بھیج رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ میرے جاننے والے ہیں۔ باہر سے تعلیم حاصل کرکے آئے ہیں اور اب پاکستان میں پریکٹس کر رہے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے علاج وغیرہ کا دستور نہیں ہے اسی لیے ڈاکٹر ذیشان کے پاس بہت کم مریض ہوں گے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

زیادہ تر پوش علاقوں کے رہنے والے دکھائی دے رہے تھے۔ کھاتے پیتے لوگ۔ ان کو دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسے لوگ بھی نفسیاتی مریض ہوسکتے ہیں۔

بہرحال بہت دیر کے بعد میری باری آئی۔ ڈاکٹر ذیشان کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ میری توقع کے برعکس نوجوان آدمی تھے۔

اسمارٹ اور خوش لباس۔ میں نے جب محسن کے بارے میں بتایا تو بہت دیر تک سوچنے کے بعد بولے۔ "دیکھیں۔ ان کا ٹریٹمنٹ گھر پر ہی کیا جائے گا کیونکہ آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ وہ تو اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرسکتے۔"

"تو پھر ایسی صورت میں مجھے آپ کے گھر آنا پڑے گا اور ایسے مریضوں کا علاج ایک دو ہفتوں میں نہیں ہوتا۔ بلکہ کئی سیشن کرنے پڑتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں۔"

"اوکے۔ تو پھر میں آپ کے گھر آرہا ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس دے دیں۔"

ڈاکٹر ذیشان نے جو وقت دیا تھا وہ اسی وقت پہنچے۔ انہوں نے کمرے سے مجھے ہٹا دیا تھا اور بہت دیر تک محسن سے باتیں کرتے رہے تھے۔

پھر جب وہ اس کمرے سے باہر آئے تو میں ان کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ "جی ڈاکٹر صاحب۔ کیا اندازہ لگایا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھیں۔ میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گا آپ کے شوہر زندگی سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ان میں مثبت تحریک، نئے حوصلے اور ولولے کی ضرورت ہے۔ وہ حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ کوئی شدید جذبہ۔ کوئی شدید خواہش۔ ویسے میڈیکلی وہ بہت حد تک ٹھیک ہوچکے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر انہوں نے اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا ہے۔"

"خدا کے لیے کچھ کریں ڈاکٹر صاحب۔"

"کوشش کرنا میرا کام ہے۔" ڈاکٹر ذیشان نے کہا۔ "اس کے بعد جو خدا کی مرضی۔"

ڈاکٹر ذیشان کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک محسن کو سمجھاتی رہی کہ وہ خود میں حوصلہ پیدا کرے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ وہ ہمت کرے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

ڈاکٹر ذیشان نے باقاعدگی سے آنا شروع کردیا تھا۔ اب وہ مجھے بھی محسن کے ساتھ کمرے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیا کرتے۔

اس کے بعد باتیں شروع کردیتے۔

ان کی باتیں ہی بہت دلچسپ ہوا کرتیں۔ حس مزاح بھی بہت زبردست تھی۔ ان کی باتیں سن کر میں بے تحاشہ ہنستی رہتی۔ کبھی کبھی محسن بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑتے تھے۔

یہ سب تو تھا لیکن ابھی تک محسن میں بہتری کی خاص علامات ظاہر نہیں ہوئی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کا علاج ہے۔

کیا صرف باتوں کے ذریعے محسن کا علاج ممکن ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات تھے۔ دوسری طرف میں ایک عجیب بات محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ بات جس کا احساس عورت کو بہت جلد ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر ذیشان میرے شوہر سے زیادہ اب مجھ میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

وہ جب میری طرف دیکھتے تو بس دیکھتے ہی رہ جاتے جبکہ میں شرما کر اپنی گردن ادھر ادھر کرلیتی۔ جب مجھ سے باتیں کرتے تو ان کی آواز میں خاص قسم کی مٹھاس شامل ہوجاتی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مجھے پسند نہیں تھا لیکن میں محسن کی وجہ سے مجبور تھی۔ میں ہر صورت میں ان کی صحت یابی چاہتی تھی۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس لیے مجھے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑ رہا تھا ورنہ ڈاکٹر ذیشان کی تیز نگاہوں کی تپش میری برداشت سے باہر تھی۔ کئی بار سوچا کہ انہیں ٹوک دوں کہ ڈاکٹر صاحب آپ مریض پر توجہ دیں۔ میری طرف دھیان نہ دیں تو بہتر ہے۔

لیکن پھر وہی خوف کہ اگر ڈاکٹر نے برا مان لیا تو پھر کیا ہوگا۔ محسن کا علاج رک گیا تو میں کسی اور سائیکاٹرسٹ کو تو جانتی بھی نہیں تھی۔ اسی لیے دل پہ جبر کرتی رہی۔

ایک دن حسب معمول ڈاکٹر ذیشان نے جب مجھے بھی ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تو محسن بول پڑے۔ ”نہیں نائلہ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

میں سمجھ گئی تھی کہ محسن کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اب اس کے سامنے بھی مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔

وہ اپاہج سہی لیکن ذہنی معذور تو نہیں تھے۔ وہ سب سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے مجھے کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔

اس کمرے سے باہر جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ تاریک سا ہو گیا تھا۔

پھر ڈاکٹر صاحب دو دنوں تک نہیں آئے۔ تیسرے دن جب وہ آئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب۔ اس دن محسن نے آپ سے کیا باتیں کی تھیں؟“

”ارے کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”وہ کہہ رہے تھے نا کہ انہیں کوئی ضروری بات کرنی ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہاں کہا تو تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں کی۔“

اب پتا نہیں وہ سچ بول رہے تھے یا محسن نے واقعی کوئی بات نہیں کی تھی۔

لیکن اسی دن اس کہانی کا اختتام بھی ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک ایسی حرکت کی۔ جس کا میں نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی جب اس نے مجھے اس کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا تو محسن نے بہت تلخ ہو کر پوچھا۔ ”آخر چکر کیا ہے۔ تم میرا علاج کرنے آتے ہو یا میری بیوی کی صورت دیکھنے۔“

”حق یہ ہے کہ میں تمہاری بیوی کی صورت ہی دیکھنے

لکیروں کے اسیر

اکثر ہاتھ کی ریکھائیں قدموں تلے ایسے رستے بچھا دیتی ہیں کہ ٹھوکر لگنے کے باوجود چلنا مجبوری بن جاتا ہے۔ آخری صفحات پر **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کا نیا انداز

فقیر دوست

تاریخ کے سمندر سے واقعات کی سرکش موجوں کا احوال..... ابتدائی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کی روانی

ستاروں پر کمند

بعض اوقات لرزیدہ قدموں کو محبت ایسا استحکام بخشتی ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ **طاہر جاوید مغل** کا دلربا انداز

ماروی

ہم شکل، ہم مزاج مگر تقدیر کی انفرادیت کا الجھا تماشا کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے..... **محی الدین نواب** کے خیالات کی اڑان

اگست 2014ء..... کا شمارہ

رمضان اور عید کے لمحات کے ساتھ۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن

ملک صفدر حیات کی عرق ریزی

اس کے علاوہ

کاشف زبیر، ڈاکٹر شیر شاہ سید، تنویر ریاض، منظر امام اور سلیم انور کی دلچسپ تحاریر

آتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا؟" محسن کے ساتھ ساتھ میں بھی حیران رہ گئی تھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" محسن نے غصے سے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم ایک اپاہج انسان ہو۔ تمہاری بیوی جوان اور خوبصورت ہے۔ یہ کب تک تم جیسے کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتی ہے۔ اسے آزاد کر دو تا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔"

"خاموش ذلیل انسان۔ خاموش۔" محسن دہاڑنے لگے تھے۔

ڈاکٹر نے اس کی پروا کیے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "جان من میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔"

"تیری تو۔" محسن نے ایک موٹی سی گالی دی۔

اور اچانک وہ بستر سے نیچے اتر آئے۔ اسی حال میں ہی۔ وہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن وہ بستر سے اتر کر ڈاکٹر پر جھپٹ پڑے تھے۔

ڈاکٹر ذیشان یہ سب دیکھ کر فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ محسن کمرے کے درمیان آ کر لڑکھڑا کر گر پڑے تھے۔

میں نے انہیں سہارا دے کر بڑی مشکل سے بستر پر لٹایا تھا۔

"یہ تم کس کمینے کو لے آئی تھیں۔" محسن نے مجھ سے کہا۔

"میں کیا جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی نکلے گا۔"

"تم اس ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ جس نے اس کو بھیجا تھا بلکہ کل مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

"ہاں۔ آپ بھی چلیں میرے ساتھ۔ لعنت ہے ایسے ڈاکٹر پر۔"

دوسرے دن میں کسی نہ کسی طرح محسن کو اس ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جس نے محسن کے فالج کا علاج کیا تھا اور یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے کہ وہاں ڈاکٹر ذیشان بھی موجود تھے۔

اس کو دیکھتے ہی میں برس پڑی تھی۔ "کمینے انسان۔ تم جیسے ڈاکٹروں نے اس پیشے کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔"

"مسز محسن آپ کیوں بلاوجہ بے چارے پر ناراض ہو رہی ہیں۔" پہلے والے ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھیں کہ اس نے کل کیا حرکت کی تھی۔"

"مسز محسن۔ آپ کو میری حرکت یاد ہے لیکن بھول گئیں کہ اسی جوش میں محسن صاحب بستر سے اتر کر کئی قدم چل پڑے تھے۔" ڈاکٹر ذیشان نے کہا۔

"ارے۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

"یہ ڈاکٹر ذیشان کا ٹریٹمنٹ تھا مسز محسن۔" پہلے ڈاکٹر نے کہا۔

"جی ہاں۔" ڈاکٹر ذیشان نے بتایا۔ "میں نے کہا تھا کہ شدید قسم کا کوئی جذبہ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دے گا اور وہ جذبہ یا تو محبت ہو سکتا تھا یا شدید نفرت۔ انہوں نے مجھ سے شدید نفرت محسوس کی۔ ان میں تحریک پیدا ہوئی اور یہ کئی قدم اپنے پیروں پر چل پڑے۔"

"او خدا۔" محسن نے ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ علاج تھا آپ کا۔"

"ہاں۔ آپ میں زندگی کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں، میں پوری طرح کامیاب رہا اور اب کچھ دنوں کے علاج کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پہلے کی طرح اپنے پیروں پر چلنے لگیں گے۔"

"میرے خدا۔" محسن نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید۔"

"شاید میں آپ کی مسز کو پسند کرنے لگا ہوں۔" ڈاکٹر ذیشان ہنس پڑے۔ "ویسے پسند تو کرتا ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔"

"نہیں۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" محسن بھی مسکرا دیے۔

اور اب محسن بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں۔ اپنے پیروں پر چلنے لگے ہیں۔ ان کی دوائی جاری ہیں، مزید فزیوتھراپی بھی ہو رہی ہے۔ اور سب کچھ ٹھیک ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں جینے کی امنگ پیدا ہو چکی ہے۔

اور ہاں ڈاکٹر ذیشان اب ہمارے فیملی فرینڈ بن چکے ہیں۔ ان کی بہت ہی پیاری بیوی عظمیٰ میری بہت اچھی دوست بن گئی ہیں۔

اور میں یہ سوچتی ہوں کہ اچھا ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جو نبض پر صحیح ہاتھ رکھ دے۔ ڈاکٹر ذیشان نے محسن کی نبض پر بالکل صحیح ہاتھ رکھا تھا۔

◆

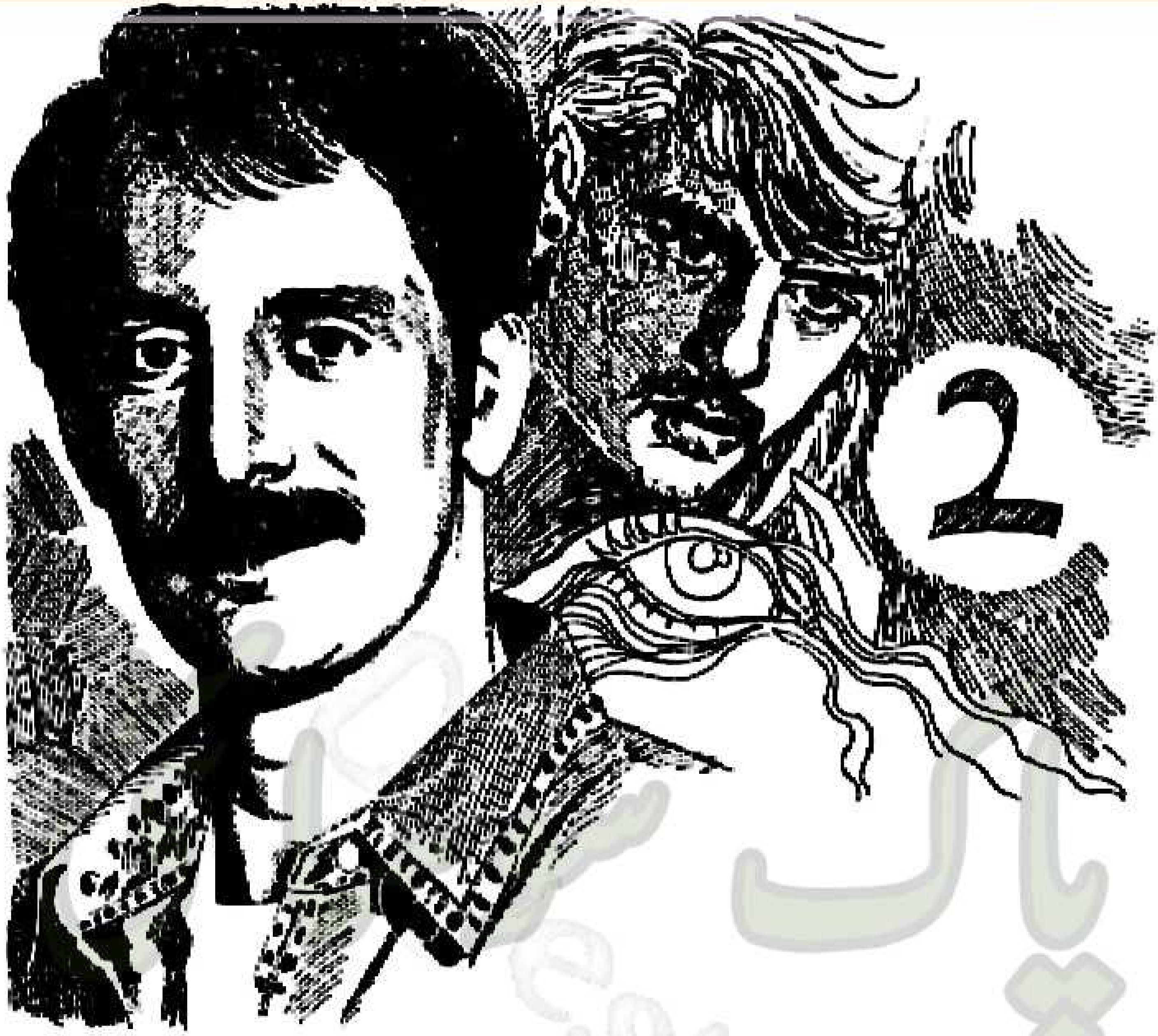

چھوٹا آدمی

جناب ایڈیٹر صاحب!

آداب و نیاز!

ایک معمولی سے آدمی کی سرگزشت بھیج رہا ہوں کہ عشق انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ وہ ایک معمولی سا آدمی تھا مگر اس نے عشق کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عزیز ہمدانی

(ملتان)

اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی اداسی کی کیفیت رہا کرتی۔

ایسے لوگوں پر کون دھیان دیتا ہے۔ کس کو اتنی فرصت ہوتی ہے۔ لیکن میرا کام ہی ایسا تھا کہ میں ایسے کرداروں کی تلاش میں رہا کرتا۔

میں ان کے چہرے کی کتاب پڑھتا۔ ان کو غور سے دیکھتا۔ ان کا مشاہدہ کرتا۔ ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا اور جب کچھ معلوم ہو جاتا تو پھر ان کی کہانیاں

لکھ لیا کرتا۔

جی ہاں۔ میں کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اسی لیے کرداروں کی تلاش رہا کرتی اور چہرے دیکھتا رہتا۔ اس مشغلے نے انسانوں کو پڑھنا سکھا دیا تھا۔

کیسے کیسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی کیسی کیسی کہانیاں ہوتی ہیں۔ پریشان کردینے والی، خوفزدہ اور مایوس کردینے والی کہانیاں۔

خدا جانے ہماری دنیا میں اتنے دکھ کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ آج تک کسی ایسے انسان سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ جس کی زندگی میں مکمل خوشیاں بھری ہوں۔ جس سے بات کرو۔ اس کے ساتھ دکھ ہوتے ہیں۔ شاید خوشیوں کی کہانیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بلکہ کہانیاں بنتی ہی اس وقت ہیں جب زندگی میں دکھ شامل ہوجائیں۔

تو مجھے اس کے چہرے پر بھی کئی کہانیاں دکھائی دے گئی تھیں۔

انسانوں کو پڑھنے کا یہ ہنر مجھے بتا دیا کرتا تھا کہ کس نے اپنے سینے میں طوفان چھپا رکھا تھا۔

وہ ایک ہوٹل کا ویٹر تھا۔

یہ ہوٹل اس محلے میں تھا جہاں پچھلے دنوں میں کرائے کے فلیٹ میں گیا تھا۔ ہوٹل کا نام ہی بہت اچھا تھا۔ پکوان گھر۔ صاف ستھری میزیں اور کرسیاں۔ باقاعدہ چھپا ہوا مینو۔ کھانے بھی بہت لذیذ اور صاف ستھرے ہوا کرتے۔ چونکہ یہ ہوٹل میرے مزاج اور جیب دونوں کے مطابق تھا۔ اسی لیے عام طور پر رات کا کھانا میں اسی ہوٹل میں کھایا کرتا۔

میرے فلیٹ سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دس منٹ کی واک پر تھا۔

میں اکیلا رہا کرتا تھا۔ والدین کا انتقال ہوچکا تھا۔ صرف بیوی تھی۔ وہ بھی دوسرے شہر میں۔ یہاں میں اپنے روزگار کے سلسلے میں رہتا تھا۔

دن بھر ایک آفس میں کام کرتا اور جو وقت ملتا۔ اس میں کہانیاں لکھا کرتا۔ ان کہانیوں کی وجہ سے میری پذیرائی ہوا کرتی۔ لوگ مجھے جاننے لگے تھے۔

بہرحال وہ ویٹر مجھے اس پکوان گھر میں دکھائی دیا تھا۔

ایک شریف سا انسان جس کے چہرے پر کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے مسکرا کر سلام کرتا اور میرا آرڈر لینے کے بعد فوراً ہی آرڈر کی تکمیل کردیا کرتا۔

چونکہ میں تقریباً ہر رات وہاں آنے لگا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ کبھی کبھی کچھ باتیں بھی کرلیا کرتا۔ میں بھی اس کی خیریت معلوم کرتا۔

ایک دن میں نے اس کا نام پوچھ لیا۔ "نمبر دو ہوں جناب۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ دیکھیں۔" اس نے اپنے سینے پر لگے بلے کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر دو لکھا ہوا تھا۔ "یہ میرا نمبر ہے جناب۔ ہم جیسوں کے نمبر ہی ہوا کرتے ہیں۔ نمبر ایک، نمبر دو، نمبر گیارہ وغیرہ۔"

اس کی باتوں نے مجھے چونکا دیا تھا۔

اس کی باتیں تلخ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سچی اور فلسفیانہ بھی تھیں۔ سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہوئی باتیں تھیں۔ اس نے اپنی باتیں جاری رکھیں۔ "یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں جناب کہ یہاں کوئی ہمیں نام سے نہیں پکارتا ہے۔ بس یہی آوازیں آتی ہیں۔ دو نمبر ادھر آؤ۔ دو نمبر کولڈ ڈرنک لے آؤ۔ دو نمبر جلدی سے بل لے آؤ۔ ہم چھوٹے لوگ ہیں صاحب۔ ہمارے نام نہیں ہوتے۔ نمبر ہوتے ہیں۔"

اس کی باتوں نے اور بھی متاثر کردیا تھا۔

"نہیں بھائی۔ دنیا میں کوئی بھی شخص چھوٹا نہیں ہوتا۔ اس کی حرکتیں اسے چھوٹا یا بڑا بناتی ہیں اس کا کام نہیں۔ کام تو پیغمبروں کی میراث ہوا کرتا ہے۔"

"آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں صاحب۔ دل میں اثر کرتی ہیں۔ ویسے صاحب آپ خود کیا کرتے ہیں۔"

"میں کہانیاں لکھتا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اس لیے تو۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اسی لیے آپ ایسی باتیں کررہے ہیں۔ کیونکہ لکھنے والے بہت دردمند دل رکھنے والے ہوا کرتے ہیں۔"

"لگتا ہے تم پڑھے لکھے بھی ہو۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں صاحب۔ میں نے انٹر کررکھا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور باتیں کرتا۔ کسی نے اسے دو نمبر کہہ کر آواز دی اور وہ بے چارہ اس کی میز پر چلا گیا۔

بہرحال اس کے بعد آہستہ آہستہ اس سے میری باتیں ہونے لگیں۔ اس نے اپنا نام نذیر بتایا تھا۔ ایک دن

اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بھی میری کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ "نذیر۔ تم کسی اور جگہ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ یا تم نے کوشش ہی نہیں کی۔"

"کوشش کی تھی جناب، اور ایک دفتر میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔"

"تو پھر یہاں کیوں آ گئے۔" میں نے پوچھا۔

"کیا آپ میری کہانی لکھیں گے صاحب۔ میں نے یہاں ایک خاص مقصد سے ملازمت کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ سب سن کر حیرت ہو۔ لیکن کیا کروں صاحب۔ مجبوری اس ہوٹل تک لے آئی ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ آج کل زندگی بہت دشوار ہونے لگی ہے۔"

"نہیں صاحب۔ وہ پیسوں والی مجبوری نہیں۔ بلکہ کوئی اور مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔"

"اور کون سی مجبوری رہ جاتی ہے۔"

"محبت کی مجبوری صاحب۔" اس نے بتایا۔

"محبت کی مجبوری!" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں سمجھا۔ محبت نے کیسے مجبور کیا تم کو۔"

"بتاتا ہوں صاحب۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "رات گیارہ بجے میں یہاں سے چھٹی کر جاتا ہوں صاحب۔ آپ مجھ سے گیارہ کے بعد ملیں۔ پھر میں آپ کو اپنی مجبوری بتا دوں گا۔"

چونکہ میں بھی تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس لیے رات گیارہ کے بعد میں نے اس سے ملاقات کر ہی لی۔ میں اسے اپنے ساتھ اپنے فلیٹ میں لے آیا تھا جو کہ ہوٹل سے قریب ہی تھا۔ وہاں اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

"وہ بہت ہی خوبصورت ہے صاحب۔" اس نے بتایا۔ "اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی جاذبیت پائی جاتی ہے، اور اس کی آنکھیں۔ بس صاحب ایسی آنکھیں، جن کے بارے میں شاعروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان آنکھوں کے لیے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔"

"واہ نذیر۔ تم تو شاعری کرنے لگے۔" میں نے کہا۔

"ہاں صاحب۔ آپ ایک نظر اسے دیکھ لیں تو آپ کو میرے جنون کی اصلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے صاحب۔ بہت ہی خاص ہے۔ کم از کم میرے لیے تو بہت خاص ہے۔"

وہ جتنی روانی سے ایسی سلجھی ہوئی باتیں کر رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صرف انٹر تک ڈگری یافتہ نہیں بلکہ تعلیم یافتہ بھی ہے۔

"میں اس زمانے میں اس ہوٹل میں ملازم نہیں تھا صاحب۔" اس نے کچھ دیر بعد پھر بولنا شروع کر دیا۔ "آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس ہوٹل کے سامنے ایک فاسٹ فوڈ بھی ہے۔ برائٹ فاسٹ فوڈ کارنر۔"

"ہاں دیکھا ہے میں نے۔"

"تو میں اس کے کاؤنٹر پر بیٹھا کرتا تھا اور وہ لڑکی عام طور پر اپنے گھر والوں یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس ہوٹل میں آیا کرتی تھی۔"

اس کے آنے کا وقت نو اور دس کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ اس وقت میری نگاہیں اسی ہوٹل کی طرف لگی رہتی تھیں۔ سامنے ہی تو ہے۔ جب وہ دکھائی دیتی تو میں سراپا شوق بن جاتا تھا۔ میری نگاہیں صرف اور صرف اس کو دیکھتی رہتیں۔"

"یعنی تم اس سے محبت کرنے لگے تھے۔"

"محبت تو ایک عام سا لفظ ہے صاحب۔" اس نے کہا "میں اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ عشق کی تو کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ محبت میں تو پھر بھی کچھ حاصل کر لینے کا شوق ہوتا ہے۔ جبکہ عشق ایسی باتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ چاہے محبوب کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ اس کو کوئی اس طرح بھی چاہنے والا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو نذیر۔ عشق میں محبوب سے کچھ مانگا نہیں جاتا بلکہ اسے سب کچھ سونپ دیا جاتا ہے۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے صاحب۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔" اس نے کہا۔ "میں صرف اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اور اس کے گھر والے عام طور پر آیا کرتے اور جب دو چار دنوں تک وہ لوگ نہیں آتے تو میں بے چین ہو جایا کرتا۔ بہت اداس ہو جاتا۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا صاحب، اور جب وہ دکھائی دے جاتی تو جیسے ہر طرف پھول بکھر جاتے۔"

"واہ نذیر۔ تم تو میری بھی ایک مشکل آسان کرتے جا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا صاحب۔"

"تم اتنے اچھے اور خوبصورت انداز میں اپنی کہانی سنا رہے ہو کہ مجھے اس میں اپنی طرف سے کچھ لگانے اور اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ارے صاحب محبت نے بولنا سکھا دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ورنہ میں تو ایک جاہل سا انسان ہوں۔ ایک ہوٹل کا معمولی سا ویٹر۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔"

"نہیں نذیر۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم میں جو سلیقہ ہے نا۔ وہ میں نے بہت کم لوگوں میں پایا ہے۔ خیر، آگے سناؤ۔"

میں نے اپنی ڈائری اور قلم سنبھال لیا تھا اور وہ جو بول رہا تھا۔ وہ میں لکھتا جا رہا تھا۔

"پھر یہ ہوا صاحب کہ میرا جنون اس حد تک بڑھ گیا کہ میں اس سے صرف دو باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوتا رہا۔ اگر وہ ہمارے فاسٹ فوڈ سینٹر کی طرف آتی تو شاید اس سے بات کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن وہ تو سیدھی ہوٹل کی طرف چلی جاتی تھی اور اس سے بات کرنے کی خواہش پوری کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ میں خود اسی ہوٹل میں کام کرنے لگ جاؤں۔"

"اوہ۔" میں مسکرا دیا۔ "اب سمجھا۔ تو تم نے اس لیے ہوٹل کی نوکری کر لی۔ ایک ویٹر بن گئے۔"

"جی صاحب صرف اسی لیے۔ اس سے بات کرنے کی خواہش میں۔ اسے قریب سے دیکھ لینے کی آرزو میں۔ ہوٹل والے بھی مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ انہیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن انہوں نے مجھے نوکری دے دی تھی۔"

"جی ہاں صاحب۔ وہ جب بھی آتی۔ اس کو میں ہی سرو کیا کرتا۔ کسی دوسرے ویٹر کو اس کی طرف جانے نہیں دیتا تھا۔ اس طرح اس سے بات ہونے لگی۔ وہ اور اس کے گھر والے بھی مجھے نام سے جان گئے تھے۔ میرا نام لے کر بلایا کرتے۔"

"آپ تو جانتے ہیں صاحب کہ ایسے موقع پر لڑکیوں کی حسیں کتنی کام کرتی ہیں۔ انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ کون ان کی طرف کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے بھی اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ اس لیے وہ مسکرا کر دیکھا کرتی۔ کبھی کبھی خیریت بھی معلوم کر لیتی۔ میرے لیے تو اتنا ہی بہت تھا صاحب۔ وہ دل کی بھی بہت اچھی ثابت ہوئی تھی۔"

"کیا تم نے اس سے کھل کر بات نہیں کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب۔ میری اتنی ہمت کہاں تھی۔" اس نے کہا۔ "میری کیا حقیقت تھی صاحب۔ میں تو ایک ہوٹل کا معمولی سا ویٹر تھا اور وہ کسٹمر تھی۔ میں اس سے کیسے کوئی بات کر سکتا۔ لیکن خاموشی کی تو اپنی زبان ہوا کرتی ہے صاحب اور خاموشی کی زبان بہت کچھ کہہ دیا کرتی ہے۔"

میں اس کی باتیں سنتے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس کم بخت محبت کے بھی کھیل نرالے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کیسے کیسے خواب دکھایا کرتی ہے۔ انسان اس کے ہاتھوں میں آ کر کٹھ پتلی بن کر رہ جاتا ہے۔

"تو صاحب ایک بار ایک بہت اچھا موقع مل گیا۔" نذیر نے بات آگے بڑھائی۔ "اس رات وہ اکیلی آئی تھی۔ اس کے گھر والے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ "بی بی۔ آج آپ اکیلی آئی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ مسکرا دی۔ "گھر والے راستے میں ہیں۔ میں کہیں اور سے ہوتی ہوئی آئی ہوں۔"

"فرمائیں۔ کیا پیش کروں۔" میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"اوہ۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "نذیر۔ تم تو بہت پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ پھر اس ہوٹل میں ویٹر کیوں ہو گئے۔"

دل چاہا کہ اسے بتا دوں کہ میں نے یہ ملازمت صرف اسی کے لیے کی ہے۔ اس سے قریب ہونے کے لیے۔ اس سے دو چار باتیں کرنے کے لیے۔ لیکن پھر وہی اپنی حیثیت کا خیال آ گیا صاحب۔ اس لیے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ "بعض مجبوریاں بھی انسان کو اِدھر سے اُدھر کر دیتی ہیں بی بی۔ میں سامنے والے فاسٹ فوڈ میں ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ میں نے تمہیں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔" اس نے بتایا۔

"بی بی۔ پھر کوئی طاقت مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی۔" میں نے کہا۔ "بعض حالات بہت بے رحم ہوتے ہیں بی بی۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا ہے۔ وہاں وہ اپنی مراد حاصل کر سکے گا یا نہیں۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے صرف ایک بار مجھے دیکھا اور اپنی گردن جھکالی۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے میری بات سمجھ لی ہو۔ یا بالکل نہیں سمجھی ہو۔ انسان تو ایسا ہی خوش فہم ہوتا ہے صاحب۔ وہ بہت الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگتا ہے۔"

"خیر کچھ دیر بعد اس نے اپنی گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ "کیوں نذیر۔ ایسی بات نہیں ہے۔ انسان کا ارادہ اگر پختہ ہو اور اس کی طلب سچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔"

"میں تو یہ سن کر نہال ہوگیا تھا صاحب۔ کیونکہ اس نے نہ صرف میری بات سمجھ لی تھی۔ بلکہ مجھے اشارہ بھی دے دیا تھا۔ اس نے میرا دل نہیں توڑا تھا۔ بلکہ حوصلہ افزائی کی تھی صاحب۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "اس کی اس بات سے تو یہی اندازہ ہورہا ہے۔"

"جی صاحب۔ بالکل یہی بات تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کچھ اور باتیں کروں۔ کچھ اور پوچھوں۔ لیکن اسی دوران میں اس کے گھر والے بھی آگئے اور میں ان کی خدمت میں مصروف ہوگیا۔

خیر صاحب اس کے بعد وہ چار دنوں تک نہیں آئی۔ ظاہر ہے۔ کوئی بھی ہو بار بار ہوٹل تو نہیں آسکتا۔ یہ تو ایک طرح کی آؤٹنگ ہوتی ہے صاحب۔ جی چاہا اور فرصت ہوگی تو چلے آئے۔ اس لیے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔"

"حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ فیملی کہاں رہتی ہے۔ اس لڑکی کا نام کیا ہے۔ اس نے میرا نام تو جان لیا تھا۔ لیکن میں اس کا نام نہیں معلوم کرسکا تھا۔ آخر کس طرح اس سے نام پوچھتا۔"

تین چار دنوں کے بعد پھر آگئی۔ اس بار بھی وہ اکیلی آئی تھی۔ اس نے بتایا۔ "آج میرے گھر والے نہیں آئیں گے۔ میں اکیلی آئی ہوں۔"

"بی بی۔ کیا آپ کہیں قریب رہتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا نام بی بی نہیں رائمہ ہے۔ بتاؤ کیسا نام ہے۔"

"بہت خوبصورت۔" میں دھیرے سے بولا۔ "آپ کے حوالے سے جو کچھ بھی ہے۔ وہ خوبصورت ہی ہوگا۔"

"ارے واہ۔" وہ چونک پڑی۔ "یہ تم نے کیسی بات کردی۔ یہ تو بہت فلسفیانہ اور شاعرانہ جملہ ہے۔"

"بس بی بی۔"

"بی بی نہیں۔ رائمہ۔" اس نے کہا۔ "میرے گھر والوں کے سامنے تم بی بی کہہ سکتے ہو۔ اس کی اجازت ہے۔ لیکن جب میں اکیلی آؤں تو پھر نام سے پکارا کرو۔"

"یہ آپ بہت بڑی بات کی اجازت دے رہی ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ تم بھی انسان ہو۔" اس نے کہا۔ "تم بھی اس معاشرے کے لیے اتنے ہی اہم ہو جتنے دوسرے ہوسکتے ہیں۔ تم میں خوبیاں ہیں۔ تو پھر کس بات کی احساس کمتری۔"

"اپنی حیثیت کو دیکھتا ہوں تو شرم آنے لگتی ہے۔"

"پاگل ہو تم۔" وہ ہنس پڑی۔ "کیا کمی ہے تمہاری حیثیت میں۔ محنت کرتے ہو۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور رزق حلال کماتے ہو۔ ایک انسان میں اس کے علاوہ اور کیا خوبی ہوتی ہے۔"

"واللہ آپ دوسروں سے الگ باتیں کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے اس طرح کی باتیں کسی نے نہیں کیں۔"

"لیکن میں تو کررہی ہوں نا۔"

"اسی بات پر تو حیران ہورہا ہوں۔"

"خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ اب جلدی سے کچھ لے کر آؤ۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی۔"

"ارے۔ تمہاری بات کا برا کیا ماننا۔"

"آج کا بل میں دوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" وہ ہنس دی۔ "لیکن اب لے کر آجاؤ۔"

"واہ نذیر۔" میں نے کہا۔ "یعنی تم اپنے مقصد میں کامیاب ہونے لگے تھے۔"

"ہاں صاحب۔ میری سب سے بڑی آرزو پوری ہوتی جارہی تھی۔ یعنی اس سے بات کرنا۔ اس کو قریب سے دیکھنا۔ اس کی باتیں سننا۔ ورنہ میرے نصیب ایسے کہاں تھے۔ میرے لیے تو وہ شوکیس میں لگی ہوئی کسی خوبصورت چیز کی طرح تھی۔ جس کو صرف دیکھا جاسکتا ہے۔ خریدا نہیں

جا سکتا۔"

اس نے پھر ایک ایسی بات کہہ دی تھی۔ جس سے اس کے ذہنی معیار کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہمارا بھی کیا معاشرہ ہے۔ کیسے کیسے لوگ اس طرح بے وقعت ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی گفتگو تو بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کی گفتگو سے بھی اچھی تھی۔

"وہ دن میری خوش نصیبی کا تھا صاحب۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں نے تو صرف یہ خواہش کی تھی کہ اس کے قریب ہو سکوں۔ اس سے دو چار باتیں کر سکوں اور قسمت نے اتنی بڑی مہربانی کر دی تھی کہ اس نے میری پیشکش قبول کر لی تھی۔ آپ کو میری خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا صاحب۔"

"نہیں نذیر۔ اندازہ کر سکتا ہوں میں۔ تم نے جس انداز کی بنجر زندگی گزاری اس میں اگر بارش کے چھینٹے پڑ جائیں تو ایسی ہی خوشی ہوتی ہے۔"

"جی ہاں صاحب۔ یہی بات ہے۔ لیکن صاحب۔ اس کے بعد وہ کچھ ہو گیا۔ جس نے مجھے آسمان سے لا کر زمین پر پھینک دیا۔"

"وہ کیا ہو گیا تھا۔"

وہ کچھ بتانے سے پہلے سوچتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "صاحب۔ وہ اس دن کے بعد سے کئی دنوں تک نہیں آئی۔ آپ سوچ لیں کہ میری بے قراری کا کیا عالم ہوگا۔ نگاہیں سامنے تک رہتیں کہ شاید وہ کہیں سے آ رہی ہو۔ اکیلی نہ سہی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی۔ آ تو جائے۔"

"تو کیا وہ پھر نہیں آئی۔" میں نے پوچھا۔

"آئی صاحب۔ وہ آئی۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی طرح اسمارٹ اور خوبصورت۔ دونوں بہت بے تکلفانہ انداز میں ہوٹل میں داخل ہوئے تھے۔ ہنستے بولتے ہوئے۔ نہ جانے کیوں صاحب، یہ دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ بہت برا لگ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ لیکن نظر انداز کر گئی تھی۔ اس نے آرڈر دیا تھا صاحب لیکن میرے نام سے نہیں صاحب۔ دو نمبر سے۔ دو نمبر ادھر آؤ اور میں دو نمبر ویٹر بن گیا تھا صاحب۔ ایک معمولی سا ویٹر۔"

پھر یہ ہوا کہ اس نوجوان نے اس کے کان میں کوئی بات کہی اور وہ زور سے ہنس پڑی۔ اس وقت وہ دونوں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ شخص میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ میرا دل ٹوٹ گیا تھا صاحب۔ اس کو کیا حق پہنچتا تھا کہ میرا مذاق اڑاتا، اور یہ تو دیکھیں کہ وہ لڑکی اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک مغرور سی کنسٹر بن گئی تھی۔ اس کے نزدیک میری تو اب کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

"تمہاری کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"صاحب میں بے بس آدمی تھا۔ لیکن میرے اندر لاوا ابلنے لگا تھا۔ غم اور غصے کی ایسی کیفیت تھی کہ بتا نہیں سکتا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا مجھے۔ شاید ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے آرڈر سرو کرتے ہوئے ایک پلیٹ اس آدمی پر اس طرح گرا دی جیسے اتفاقاً گر گئی ہو۔"

"پھر کیا تھا صاحب۔ اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جاہل، بدتمیز، دو کوڑی کا انسان۔ اندھا، اس نے اتنی باتیں سنائی صاحب کہ خود مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اس کی بات کا جواب اسی تلخی سے دیا۔ اس کو تو اور آگ لگ گئی۔ شاید اس نے مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ اس لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک بات کہی اور وہ بات ایسی ہے صاحب کہ اس کے بعد شاید مجھے زندہ نہیں رہنا چاہیے تھا۔"

"کیا کہہ دیا تھا اس نے۔"

اس نے کہا تھا۔ "جانے دو خرم۔ چھوٹے آدمیوں کے منہ نہیں لگتے۔"

اتنا بتا کر اس نے گردن جھکا لی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ہاں صاحب۔ میں تو چھوٹا آدمی ہوں۔ اور ایک چھوٹے آدمی کو ایسے خواب دیکھنے کا، ایسی محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسے تو مر جانا چاہیے۔ لیکن میں مرا نہیں۔ زندہ ہوں صاحب۔ اور اب تک اسی ہوٹل میں ویٹر ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر آج تک نہیں آئی۔ لیکن وہ چھوٹا آدمی اسی جگہ اسی ہوٹل میں ہے۔ اس کی راہ دیکھتا ہوا ایک بے حیثیت انسان۔"

یہ تھی اس کی کہانی۔

میں جب یہ کہانی لکھ رہا تھا تو یہی خیال آ رہا تھا کہ محبت پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ پھر کوئی انسان کیا محبت کے بازار میں بھی چھوٹا بڑا، کم قیمت یا بیش قیمت ہو سکتا ہے۔

◆

چھپا رستم

محترم مدیر سرگزشت !

السلام علیکم !

ایک سچا واقعہ جس میں کہانیت لانے کے لیے میں نے کچھ لوازمات شامل کردیے ہیں آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ اگر یہ سرگزشت میں شائع ہوجائے تو بہت سے لوگوں کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ جائے گا۔

سید طاہر شاہ طاہری

”چھوٹے شاہ جی! ہاسو کمہار قتل ہوگیا ہے۔“ میں نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں امام صاحب کو خبر دی۔

”کب اور کیسے؟“

”اس کا تو پتا نہیں... البتہ اس کی لاش آج سویرے پیپل کے درخت سے لٹکی ہوئی ملی ہے۔ خنجر کے پورے چھ زخم تھے پیٹ پر۔“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

”چلو اچھا ہوا...... خس کم جہاں پاک۔ اب اس کی

لاش کہاں ہے؟" امام صاحب نے پوچھا۔

"وہ تو پولیس لے گئی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں.... اور کچھ پتا چلے تو بتانا۔" اتنا کہہ کر امام صاحب نے تپائی پر کھلے قرآن پاک پر نگاہ جمالی، رمضان کا مہینا تھا اور انہیں رات کو تراویح میں سنانا ہوتا تھا اس لیے میں جب بھی مسجد میں آیا انہیں قرآن پاک کی تلاوت کرتے پایا۔

میں نے سلام کیا اور الٹے قدموں واپسی کی راہ لی۔

گھر پہنچنے سے پہلے سارے راستے میرے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ آخر کس نے اتنی جرأت دکھائی اور ایک بے غیرت سے اس زمین کو پاک کر دیا پھر خود ہی جواب دیا۔۔ کسی غیرت مند کی بہن بیٹی پر نگاہ ڈالی ہوگی تو اس نے بھی اسے راہ جہنم پر ڈال دیا ہوگا لیکن گھوم پھر کر سوال یہی تھا کہ اتنا غیرت مند اور جرأت مند ہے کون؟؟ اس پورے گاؤں میں تو کوئی نہیں تھا، یہاں تک کہ گاؤں کا بچہ بچہ بھی باسو سے ڈرتا تھا... شاید کسی ساتھ والے گاؤں کا۔ جو بھی ہوگا پولیس پتا لگا لے گی مجھے اپنا دماغ کھپانے کی کیا ضرورت۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔

ابا جی کے ساتھ جھوٹوں کو چارا ڈالنے کے بعد میں ایک بار پھر جائے وقوعہ پر تھا۔

"اوئے گامے پتر!" مجھے عقب سے چاچے غلام رسول کی نقاہت بھری آواز سنائی دی۔ میرا نام تو غلام محمد تھا لیکن گاؤں والے سارے مجھے گاما ہی کہتے تھے۔

"جی چاچا!" میں نے جواب دیا۔

"او پتر مجھے تو کمر کی پیڑ (درد) نے چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ وہ تیری بہن زینت ڈاکٹر کے پاس گئی تھی میری دوائی لینے، ابھی تک واپس نہیں آئی، اس کا تو پتا کر دے۔ کتھے رہ گئی۔"

پہلے تو زینت کو میری بہن کہنے پر میں نے دل ہی دل میں چاچے کو پانچ سات سنائیں۔ بچپن سے نہ جانے میں اس کے بارے میں کون کون سے خواب دل میں سجائے بیٹھا تھا اور چاچا جب بھی ملتا تھا سارے خوابوں پہ اوس ڈال دیتا تھا۔ میں "اچھا چاچا" کہہ ڈاکٹر کے کلینک کی طرف چل پڑا۔

دو کھیت عبور کرنے کے بعد سیدھی گلی ڈاکٹر کے کلینک کو جاتی تھی۔ ابھی میں گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ مجھے اسلم منشی کی حویلی میں زینت کی جھلک نظر آئی۔ اس کی عمر سولہ سال ہوگئی تھی جبکہ اپنی عمر سے وہ دو تین سال بڑی ہی لگتی تھی لیکن ابھی تک وہ اپنے بچپن سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہی الہڑ پن، وہی شرارتیں اور وہی معصومیت، کچھ بدلا تھا تو صرف اس کا قد کاٹھ ورنہ ابھی تک وہ وہی بچی تھی جو کھیتوں میں ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی یا گلیوں میں گلی ڈنڈا۔ بیری کی ایک لمبی شاخ سے وہ جامن جھاڑ رہی تھی اور جو جامن زمین پر گرتا اسے اٹھا کر اپنی جھولی میں سمیٹ لیتی تھی۔

"زینو!" میں نے آواز لگائی۔

"کیا ہے۔" اس کی بپھری ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ ہر ایک سے اسی لہجے میں بات کرتی تھی اسی لیے زیادہ تر لوگ اس سے دور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔

"تیرا ابا تجھے بلا رہا ہے۔ اس نے تجھے دوائی لینے بھیجا تھا اور تو یہاں جامن اکٹھے کر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے! آتی ہوں میں تو جا... اسے کہہ دے آرہی ہے۔"

کوئی اور بات کرنے کی بجائے میں نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی... ورنہ اس کا کیا پتا بیری کی شاخ سے میرے ہی لتے لینے لگ جاتی۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے باسو کے ایک ڈشکرے کی دھولی پاٹ کر کے ٹانگ توڑ دی تھی۔ باسو تلملایا تو کافی تھا لیکن اس کے بھائی رفیق عرف فیکے نے اسے ٹھنڈا کر لیا تھا۔

باسو دو سال پہلے ہمارے گاؤں "بسم اللہ گڑھ" میں آیا تھا۔ یہ شکر گڑھ کے نواح میں بارڈر کے قریب واقع ہے۔ یہاں بجلی تو کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گئی ہے لیکن گیس ابھی تک بیس پچیس کلومیٹر دور ہی ہے، پچھلے کئی سالوں سے سن رہے ہیں کہ گیس آرہی ہے، پتا نہیں اب آ کیسے رہی ہے۔ شاید خود ہی آرہی ہے اور راستے سے بھی بے خبر ہے۔

باسو ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ جو بھی جانتا تھا بس اتنا کہ یہ جو کہتا ہے سر جھکاؤ اور مان لو... ابتداء میں یہ صرف بھتا لیا کرتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ گاؤں والوں کی لڑکیوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ اگر کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا تو اگلے دن کسی کھیت میں اس کی لاش ملتی تھی۔ پولیس میں کئی دفعہ رپورٹ درج کروائی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، پولیس کو ہر مہینے ان کا حصہ پہنچتا رہتا تھا، انہیں کیا تکلیف تھی بلاوجہ ٹانگ اڑانے کی اور اگر کسی کو ایمانداری کا بخار چڑھ بھی جاتا تو چند دن بعد وہ کسی اور شہر میں بیٹھا ہوتا تھا۔ فیکا اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ اس سے چار

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

قدم آگے تھا لیکن ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا۔ شکار کو اس طریقے سے گھیرتا تھا کہ شکار کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ دو سال میں کئی لڑکیوں کی آبرو ریزی ہوئی اور کئی لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے... لیکن ان دو بھائیوں کی صحت پر کیا اثر پڑنے والا تھا چاہے پورا گاؤں ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل جاتا۔ سارے گاؤں کی غیرت جو سوئی ہوئی جن میں میں بھی شامل تھا۔

اور آج دو سال بعد باسو کی لاش پیپل پر ٹنگی ہوئی ملی تھی... گاؤں والوں کے چہرے سے خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے لیکن وہ کھل کر خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کرتے تو شاید کل اسی جگہ ان کی اپنی لاش ٹنگی نظر آتی کیونکہ ٹیکا تو ابھی زندہ تھا۔

اگلے دن لاش واپس آ گئی۔ ٹیکے امام صاحب کے پاس پہنچا کہ وہ جنازہ پڑھا دیں... اور اس وقت پورے گاؤں نے ایک حیرت کن منظر دیکھا جب امام صاحب نے کمال اطمینان سے کہا... "میں کسی کافر کا جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔" جس کے سامنے کسی کی اونچی آواز نہیں نکلتی تھی اس کے سامنے کل کا یہ لڑکا اس کے بھائی پر کفر کا فتویٰ لگا کر جنازے سے انکار کر رہا تھا۔

ٹیکے کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا... اس نے دانت پیسے اور امام صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گرجا۔ "کیا کہا دوبارہ بول ذرا۔"

"میں نے کہا میں کسی کافر کا جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔ بہرہ ہو گیا ہے تو جا اپنے کان کا علاج کروا۔" امام صاحب نے دوسری بار گرج کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

ٹیکے کا دایاں ہاتھ گھوما اور امام صاحب کے منہ پر پڑا۔ امام صاحب کے قدم ڈگمگا گئے اور باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ ٹیکے نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ انہیں روئی کی طرح دھن کے رکھ دیا اور ہم اسی بے حسی کی تصویر بنے کھڑے رہے... ہم میں سے کوئی آگے نہ بڑھا کہ اس کا ہاتھ روک لے۔

"اسے اٹھا کر ڈیرے پر لے جاؤ، دیکھتا ہوں میں یہ کیسے جنازہ نہیں پڑھاتا... اس کا تو باپ بھی جنازہ پڑھائے گا۔" اس نے اپنے ایک گرگے کو اشارہ کیا۔

باسو کا جنازہ ہو گیا... جنازہ کسی اور مولوی نے پڑھایا تھا۔ تین دن گزر چکے تھے چھوٹے شاہ جی کا کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ سارے گاؤں والے پریشان تھے کیونکہ چھوٹے شاہ جی کو وہ سب اپنے سگے بیٹوں کی طرح ہی سمجھتے تھے۔

چھوٹے شاہ جی کا اصل نام تو عبدالباسط تھا لیکن سب اُن کو اُن کے بچپن سے ہی چھوٹے شاہ جی کہا کرتے تھے۔ وہ اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عالم تھے۔ وہ نہایت شفیق، نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ گاؤں والے آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد کرتے تھے، ان کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے جن میں کبھی خیانت نہیں ہوئی۔ چھوٹے شاہ جی کی والدہ اُن کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ اور ان کی پرورش ان کے والد کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔

میں نے اور چھوٹے شاہ جی نے دس جماعتیں گاؤں کے اسکول میں اکٹھی پڑھی تھیں۔ ہم بچپن سے ہی اچھے دوستوں کی طرح تھے۔ بے تکلفی کی کئی حدیں عبور کرنے کے باوجود ان کا ایک احترام تھا جو ہمیشہ میرے دل میں رہا... اور ویسے بھی وہ اتنے سلجھے ہوئے اور شریف النفس تھے کہ کوئی کچھ کہہ بھی دیتا، چاہے غلطی دوسرے کی ہوتی یہ معذرت کر لیا کرتے تھے۔ میٹرک کے بعد میں ابا جی کے ساتھ کھیت اور جانور سنبھالنے لگا اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ پڑھائی بھی جاری رکھی جبکہ چھوٹے شاہ جی شہر کے ایک بڑے مدرسے میں داخل ہو گئے۔

باسو کمہار ابھی گاؤں میں نیا نیا ہی وارد ہوا تھا کہ چھوٹے شاہ جی کے والد صاحب فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد چھوٹے شاہ جی پکے ہی شہر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ کالج میں بھی پڑھ رہے ہیں۔ جس کے بعد میں انہوں نے خود تصدیق کر دی تھی اور پھر پورے دو سال بعد وہ اچانک گاؤں میں لوٹ آئے۔ ان کی آمد پر گاؤں والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور پھر گاؤں والوں نے اس مولوی کو فارغ کر دیا اور چھوٹے شاہ جی نے اپنے والد صاحب کی مسند سنبھال لی۔

چھوٹے شاہ جی کو یہاں آئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے والد ہی کی طرح شفیق، مہربان اور نیک تھے۔ انہوں نے گریجویشن کے ساتھ مدرسے کی تعلیم بھی پوری کر لی تھی اور پھر اسی زمین کی طرف لوٹ آئے تھے جہاں انہوں نے پہلی بار آنکھ کھولی تھی... اور آج اسی شریف النفس نے ایک بدمعاش کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ جہاں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سب حیران تھے وہیں ان کی سلامتی کی دعائیں بھی کر رہے تھے۔ قرین از قیاس تھا کہ ٹیکے نے کہیں ان کو مروا ہی نہ دیا ہو۔

بالو کی لاش لے جانے کے بعد پولیس دوبارہ گاؤں میں نظر نہیں آئی۔ لوگوں کا یہی کہنا تھا کہ ٹیکے نے پولیس کو تفتیش کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اب حقیقت کیا تھی، اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

چوتھے دن شام کے وقت اقبال عرف بالا مجھے ملا۔ میں اس وقت سائیکل کے پیچھے ڈول لادے ساتھ والے گاؤں میں دودھ دینے جا رہا تھا۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے بولا "گامے تجھے پتا ہے پھر نے شاہ جی ڈیرے سے بھاگ گئے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا "تجھے کس نے کہا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تجھے پتا ہے نا دینے مسلی سے میری تھوڑی گل بات ہے... وہ ٹیکے کا بندہ ہے، اسی نے بتایا ہے... پر تو آگے کسی کو نہ بتانا، ٹیکے نے یہ بات سب سے چھپا کر رکھی ہے۔ تجھے بھی اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ تو اپنا پکا یار ہے۔" اس نے اپنی آواز کو دباتے ہوئے منہ میرے کان کے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ بات پکی ہے نا... یہ نہ ہو کہ ٹیکے نے امام صاحب کو مروا دیا ہو اور دینا تجھ سے جھوٹ بول رہا ہو۔" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سولہ آنے پکی بات ہے۔"

اس کی بات نے میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑا دی... "واہ بالیا کیا خبر سنائی ہے... دل کرتا ہے کہ تیرا منہ چوم لوں۔" میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

بس بس... اتنا بھی خوش نہ ہو کہ لوگ تیرا منہ چومنے کی آرزو کرنے لگیں۔

اس کی بات کا واضح مطلب تھا کہ میں کہیں بات آگے نہ کر دوں۔

"میں نے آج تک کوئی بات آگے کی ہے؟" میں نے خفگی سے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"جان من! اسی لیے تو تجھے بتائی ہے کیونکہ تیرا پیٹ اتنی باتیں تو مہینے سے بھی زیادہ برداشت کر جاتا ہے۔" اور پھر ہنستا ہوا وہ دوسری گلی میں مڑ گیا۔

اس دن میں بہت خوش تھا... خوشی ایسی تھی کہ چھپائے چھپ نہیں رہی تھی... حالانکہ ابھی تک اس بات کی کوئی پکی تصدیق نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ امام صاحب ٹیکے کی قید سے بھاگ گئے ہیں... جب میں دودھ دے کر واپس لوٹا تو دھیمی آواز میں سیٹی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا سامنے ہی اماں چولہے کے سامنے بیٹھی انگاروں پر خشک لکڑیاں رکھ کر پھونکنی سے پھونک کر انہیں بھڑکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "بڑا خوش نظر آ رہا ہے۔" اماں کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "کچھ نہیں اماں بس ایویں ای۔" کہتا ہوا میں اپنے کمرے میں گھس گیا۔

رات دو بجے کا وقت ہو گا، ابا جی نے مجھے جگایا۔ "گامے پتر اٹھ بڑے زور کا مینہ (بارش) آیا ہوا ہے... میں رات ڈنگر باہر ہی باندھ آیا تھا... جا انہیں ورانڈے (صحن) میں کر آ... بے چارے پوری رات ٹھنڈ میں کھڑے بددعائیں ہی نہ دیتے رہیں۔"

"اچھا ابا جی۔" کہہ کر میں نے گرم بستر چھوڑا، برساتی لی اور حویلی کی طرف چل دیا۔ ابھی میں حویلی سے کچھ دور ہی تھا کہ میں نے کسی کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ہمارے گاؤں میں ڈیروں پر رفع حاجت کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے لوگ کھیتوں کا رخ ہی کرتے ہیں... اگر موسم خوشگوار ہوتا تو میں ایسا ہی سمجھتا لیکن اتنے خراب موسم میں کسی کا اتنی دور کھیتوں میں آنا خلاف عقل تھا۔ میں تجسس سے مجبور اس کے پیچھے چل دیا۔ مخصوص فاصلہ رکھ کر میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کھیت عبور کر کے اس نے اپنا رخ ٹیکے کے ڈیرے کی طرف موڑ لیا۔ کچھ دیر وہ ٹیکے کے ڈیرے کے پاس کھڑا سن گن لیتا رہا پھر وہ گھوم کر ڈیرے کی پچھلی جانب مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا لیکن اتنی دیر میں وہ کھیت عبور کر کے ایک گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے پہنچتے پہنچتے اس کا نام و نشان ناپید ہو چکا تھا۔

پتا نہیں وہ کون تھا... کہاں سے آیا اور کہاں غائب ہو گیا... ٹیکے کے ڈیرے کے پاس وہ کیا لینے گیا تھا... انہی سوچوں میں غلطاں میں حویلی پہنچا۔ ڈنگر کھول کر اندر باندھے اور گھر لوٹ آیا۔ نیند کی آغوش میں گم ہونے سے پہلے مختلف قسم کے کئی سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

اگلے دن وہی معمول کے کام نمٹانے کے بعد میں چاچا غلام رسول کے گھر چلا گیا۔ زینو گھر میں جھاڑو دے رہی تھی اور چاچا چارپائی پر بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا۔

چاچے کا حال احوال پوچھنے کے بعد میں زینو کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولی۔ "گامے چھوٹے شاہ جی کا کچھ پتا چلا؟"

"نن... نہیں... مجھے تو کچھ نہیں پتا تجھے کچھ پتا ہے تو بتا؟" ... میری زبان لڑکھڑائی لیکن پھر میں نے اسے قابو کر لیا۔ وہ واحد شخصیت تھی جس کے سامنے مجھے جھوٹ بولنا مشکل ہو جاتا تھا۔

"وہ بالا کہہ رہا تھا کہ چھوٹے شاہ جی ٹیکے کے ڈیرے سے بھاگ گئے ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"کک... کیا، کب اور بالے کو کس نے کہا۔" مجھے اُمید تو تھی کہ بالے کے پیٹ میں بات نہیں رہے گی لیکن یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ اس کو بھی بتا دے گا۔ زینو کا پیٹ اتنا ہلکا تھا کہ اگلے چند گھنٹوں میں پورے گاؤں میں یہ بات پھیل جانی تھی۔

"اسے دیپے نے بتایا ہے... وہی جس کی پچھلے مہینے میں نے ٹانگ توڑی تھی۔"

"چل میں پتا کرتا ہوں بات سچی ہے یا کسی نے ایویں ہی پھیلا دی ہے۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے اٹھا اور سیدھا بالے کے گھر کے سامنے بریک لگائی۔

بالا گھر میں ہی تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اس کے لتے لینے شروع کر دیے۔ "مجھے تو بڑا کہہ رہا تھا کہ بات پیٹ میں رکھ خود جا کے زینو کو بتا دی۔ اب پورے گاؤں کو پتا چل جائے گا۔" میں نے غصے اور خفگی کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

"تجھے بتا دیا اس نے۔" اس نے حیرانگی سے کہا۔

"نہیں! مجھے تو الہام ہوتا ہے... سویرے جاگا تو الہام ہوا کہ تو نے زینو کو بتایا ہے۔" میں نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

"چل چھوڑ یار... اب بندہ کس پر اعتبار کرے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو نہیں بتائے گی۔"

"اور تو اس کے وعدے پر اعتبار کر گیا... واہ واہ... اوئے دماغ کے فارغ اس نے کبھی اپنے ابے کی بات بھی چھپائی ہے۔ اُس دن گاؤں میں اعلان کرتی پھرتی تھی "ابے کی سوتے میں دھوتی کھل گئی"... جس کو ابھی تک یہ نہیں پتا کہ کیا بتانا ہے اور کیا نہیں اسے تو جا کے سب بتا آیا ہے... چل پتر اب تو بھی تیار ہو جا اسو والی جگہ ٹھکنے کے لیے۔"

"چل اب تو غلطی ہو گئی آئندہ میری توبہ جو اسے کوئی بات بتائی۔"

"آئندہ کے لیے اگر تو بچا تو پھر سوچیں گے۔"

"یار ڈرا تو نہیں نا۔"

"میں ڈرا نہیں رہا حقیقت بتا رہا ہوں... چل اب مجھے اجازت دے ابے نے آج شہر جانا تھا... گھر میں اماں اکیلی ہو گی کوئی کام ہی پڑ جاتا ہے تو وہ کہاں ڈھونڈتی پھرے گی مجھے۔" میں نے اجازت طلب کی اور گھر آ گیا... ابا جی شہر جا چکے تھے... اماں چارپائی پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی... میں گھر میں داخل ہوا تو اماں کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "گامے پتر تیرا ابا کہہ گیا تھا کہ آج وہ ڈنگروں کا ڈاکٹر آئے گا اس بھوری گاں (گائے) کو ٹیکا لگوا لینا... تین دن ہو گئے ہیں دودھ کم دے رہی ہے۔"

"اچھا اماں۔" کہہ کر میں چھت پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر آیا تو میں اسے لے کر حویلی چلا گیا۔

یہ رات کے غالباً ڈھائی تین بجے کا وقت ہو گا... جب کسی نے دروازے پر زور دار دستک دی... میرا کمرا کیوں کہ دروازے کے ساتھ ہی تھا اس لیے میں فوراً اٹھ گیا... اس کے ساتھ ہی چاچے غلام رسول کی آواز سنائی دی۔ "او گامے پتر!" میں تیزی سے بستر چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا کہ چاچے کو اتنی رات میں کوئی مشکل ہی ہو گی جو بیماری کے باوجود خود ہی آ گیا... اتنی دیر تک ابا جی بھی جاگ چکے تھے۔

میں نے دروازہ کھولا... چاچا فوراً آگے بڑھا اور روتے ہوئے بولا۔ "پتر وہ کمینہ زینو کو اٹھا کر لے گیا ہے۔"

میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی... مجھے نہیں پتا کہ کس نے مجھے روکا بھی ہے... ابا میرے پیچھے لپکا لیکن میں اپنے ہوش کھو چکا تھا... میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا... میرا رخ ٹیکے کے ڈیرے کی طرف تھا اور مجھے اس کی خبر نہیں تھی کہ میں کیا کر سکتا ہوں... ذہن میں بس یہی تھا کہ وہاں زینو ہے اور آج مجھے غیرت مند بننا ہے... زینو کو اس درندے کے ہاتھوں بچانا ہے یا خود مر جانا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں ڈیرے پر پہنچتا میں نے چیخ سنی... آواز ڈیرے کے اندر سے آئی تھی اور کسی مرد کی معلوم ہوتی تھی... میں سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر تیزی سے ڈیرے کی طرف بھاگا۔

ڈیرے میں داخل ہو کر میری سب سے پہلے جس شخص

پر نظر پڑی وہ ونیکے تھا... اس کی قمیص خون میں لتھڑی ہوئی تھی اور وہ پشت کے بل زمین پر پڑا تھا۔ اسی اثناء میں میری نظر ایک سائے پر پڑی جو دیوار پھاند کر ڈیرے سے باہر جا رہا تھا... میں اس کے پیچھے لپکا اتنی دیر میں وہ دیوار پھاند چکا تھا... میں نے جونہی دیوار پھاندی وہ میرے سامنے آ گیا... اس کا چہرہ دیکھ کر میری زبان گنگ رہ گئی وہ چھوٹے شاہ جی تھے۔

"چھ... چھوٹے شاہ جی آپ...؟" میرے منہ سے پھنس پھنس کر الفاظ نکلے۔

"ہاں میں... اب جلدی کرو زینت کو لو اور گھر جاؤ... اور کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں... سویرے میں خود سارے گاؤں والوں کے سامنے بتا دوں گا کہ ونیکے کو میں نے مارا ہے۔"

"ل... لیکن آپ نے......؟" میں بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔

"ہاں غلام محمد میں نے... تم سوچ رہے ہو گے کہ ایک ایسا شخص جو دوسروں کی غلطیوں پر بھی خود معافی مانگا کرتا تھا آج قاتل بنا سامنے کھڑا ہے۔" ایک زخمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر لہرائی اور پھر معدوم ہو گئی۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے... "غلام محمد تمہیں پتا ہے باسو کو کس نے مارا تھا...؟"

"نہیں چھوٹے شاہ جی!" میں نے جواب دیا۔

"اسے بھی میں نے مارا تھا" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"ک... کیا... ا... اسے... بھی آپ... نے مارا تھا؟"

"ہاں! اسے بھی میں نے ہی مارا تھا لیکن کیوں مارا تھا یہ میں سویرے گاؤں والوں کے سامنے بتاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ مڑے تھے اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے۔

میں ڈیرے میں واپس آیا۔ زینو چارپائی سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھولا اور سہارا دے کر گھر لے آیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی اس ڈیرے سے صحیح سلامت واپس نکل آئی تھی۔ سب حیران تھے اور یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔ چاچے غلام رسول کے لبوں سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ ساری دعائیں قبول کروا کر ہی چھوڑتے۔

زینو بھی پہلے سے کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ کیونکہ حقیقت حال کا اسے بھی نہیں پتا تھا... سارے گاؤں والے جان چکے تھے کہ ونیکا مر چکا ہے اور یہی سمجھ رہے تھے کہ اسے میں نے مارا ہے لیکن حقیقت کیا تھی یہ صرف میں جانتا تھا اور وہ جس نے اسے مارا تھا... انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ پولیس مجھے لے جائے گی۔ اسی بات نے کئی لوگوں کے چہرے پر سوگواری طاری کر رکھی تھی لیکن جب میں نے انہیں حقیقت حال سے روشناس کر دیا تو وہ سب پہلے سے زیادہ حیران نظر آنے لگے۔

صبح کے آٹھ بجے تھے۔ پنچائیت لگی ہوئی تھی۔ پولیس موجود تھی۔ یہ انسپکٹر نیا نیا آیا تھا اور سنا تھا کہ ایمان دار بھی ہے۔ سب کو کسی کا انتظار تھا اور آخر وہ آ گیا۔ جونہی چھوٹے شاہ جی نے پنچائیت میں قدم رکھا ہر چھوٹے بڑے کی نگاہ ان پر جم گئی۔

"اسلام علیکم!" چھوٹے شاہ جی نے سلام کیا اور ایک خالی نشست پر بیٹھ گئے۔

سلام کا جواب دینے کے بعد سب سے پہلے انسپکٹر نے ہی ان سے سوال کیا۔ "مولوی صاحب کیا آپ نے ہی ونیکے اور باسو کو قتل کیا ہے؟"

"جی!" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"کیوں...؟"

بختیار کو جانتے ہو...؟ اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ کہا۔

"ایم این اے بختیار کی بات تو نہیں کر رہے؟"

"ہاں وہی... یہ دونوں بھائی اسی کے لیے کام کرتے تھے... اور مولوی صاحب بھی طبعی موت نہیں مرے انہیں بھی ان دونوں نے قتل کیا تھا۔" انہوں نے انکشاف کیا اور پنچائیت میں موجود گاؤں کے لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

"یہ مولوی صاحب کون ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

وہ ان کے والد صاحب تھے... شیخ نے جواب دیا۔

گاؤں والے شروع سے ہی چھوٹے شاہ جی کے والد کو مولوی صاحب ہی کہا کرتے تھے جن کی دیکھا دیکھی چھوٹے شاہ جی نے بھی ان کو مولوی صاحب کہنا شروع کر دیا تھا۔

"وہ کب فوت ہوئے...؟" انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

"تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔" شیخ نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ بختیار کے بندے ہیں اور انہوں نے ہی تمہارے باپ کو قتل کیا ہے...

جبکہ سارے گاؤں والے جانتے ہیں کہ وہ طبعی موت مرے تھے۔" انسپکٹر نے چھوٹے شاہ جی سے پوچھا۔

چھوٹے شاہ جی کے آنے سے پہلے ہی پنچ انسپکٹر کو ان کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔

"جو میں جانتا ہوں وہ گاؤں والے نہیں جانتے... سب سے پہلے مجھے تب شک پڑا تھا جب میں شہر سے لوٹا تھا اور مولوی صاحب کی چارپائی کے سرہانے دائیں پائے کے ساتھ ان کی تسبیح گری دیکھی تھی... مولوی صاحب سوتے وقت تسبیح ہمیشہ تکیے کے نیچے رکھ کر سوتے تھے اور آج تک ان کی تسبیح کبھی چارپائی سے نیچے نہیں گری... مطلب بات ہے کہ کسی نے ان کے سر کے نیچے سے تکیہ نکالا تو تسبیح نیچے جا گری اور پھر اس تکیے کے ساتھ ان کا منہ بند کر دیا" اور دوبارہ اسی طرح تکیہ ان کے سر کے نیچے رکھ دیا... دوسری بات یہ کہ سب سے پہلے انہیں دیکھنے والا چاچا اللہ بخش تھا، ان کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب سر تک چادر اوڑھے سو رہے تھے جبکہ میں نے اپنی چوبیس سالہ زندگی میں آج تک انہیں چہرے سے اوپر چادر لے کر سوتے نہیں دیکھا... اور تیسری بات شاید کسی نے بھی غور نہیں کیا کہ دروازہ اندر سے کھلا تھا... جبکہ کوئی بھی رات کو اپنے گھر کا دروازہ کھول کر نہیں سوتا۔" چھوٹے شاہ جی اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

"گاؤں والے جانتے ہیں کہ تمہارے والد صاحب ان دنوں بیمار تھے اور اسی بیماری کی وجہ سے ہی ان کی موت ہوگئی... اور باقی سب تو اتفاقات میں آتا ہے، یہ تو کوئی ثبوت نہ ہوا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بھی یہیں ہیں ان سے پوچھ لیں کیا مولوی صاحب اتنے بیمار تھے کہ وفات پا جاتے...؟ چلیں ان سب کو اتفاق مان لیا لیکن یہ تو اتفاق نہیں ہے نا۔" چھوٹے شاہ جی نے ایک موبائل فون نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے...؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"موبائل فون ہے جی۔"

"وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ یہ موبائل فون ہے... میں اتنا بھی گھامڑ نہیں ہوں... اس میں کیا ثبوت ہے۔" انسپکٹر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

چھوٹے شاہ جی نے موبائل واپس لے کر ایک ویڈیو چلائی اور انسپکٹر کے سامنے کر دی... انسپکٹر نے ویڈیو دیکھنے کے بعد چھوٹے شاہ جی کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولا "یہ ویڈیو تمہیں کہاں سے ملی اور یہ بنائی کس نے ہے...؟"

"ویڈیو کس نے بنائی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے... البتہ مجھے یہ باسو کے ڈیرے سے ملی ہے اور موبائل بھی باسو کا ہی ہے۔"

"اس ویڈیو میں کیا ہے انسپکٹر صاحب۔" پنچ نے پوچھا۔

"آپ خود ہی دیکھ لیں۔" انسپکٹر نے موبائل ان کی طرف بڑھا دیا اور پھر وہ ویڈیو بہت سے لوگوں نے دیکھی... اس ویڈیو میں باسو کمہار مولوی صاحب کے منہ پر تکیہ رکھ کر ان کو مار رہا تھا۔

"لیکن باسو کی تمہارے باپ سے کیا دشمنی تھی۔" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"باسو کی مولوی صاحب سے کوئی دشمنی نہیں تھی... اس کی دشمنی پاکستان سے تھی اور میرے والد صاحب کو پاکستان سے محبت تھی بس یہی عداوت انہیں لے گئی۔"

"تم بات بہت گھما پھرا کر کرتے ہو جو بات ہے وہ صاف صاف بتاؤ۔"

"یہ آج سے ڈھائی سال پہلے کی بات ہے... اس وقت پاکستان میں فرقہ واریت کا عفریت شہروں سے ہو کر سادہ لوح دیہاتیوں کو نگلنے کے لیے لپکا... میں ان دنوں شہر میں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھی ہی گاؤں کی طرف چکر لگتا تھا... ایک دن لوٹا تو مولوی صاحب کافی پریشان تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگ قریہ قریہ اشتہار بانٹتے پھر رہے ہیں جن سے فرقہ واریت کو ہوا ملے گی اور گھر گھر فساد پھیلے گا... اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ انہیں بھی اس بات پر مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ بھی اس مہم میں شامل ہو جائیں... جب کہ ان کی ساری زندگی سب کو ایک کرتے گزری ہے... اور اس سب کے پیچھے مختیار تھا... جو کہ اسلام مخالف ملکوں کا آلہ کار ہے... اسی کی شہ پر جگہ جگہ کفر کے فتووں کا بازار گرم تھا... جب مولوی صاحب نے صاف انکار کر دیا تو انہیں قتل کی دھمکی دی گئی اور ایک دن وہ ایسے سوئے کہ دوبارہ اٹھ ہی نہ سکے۔

ان کے قتل سے دو ماہ پہلے باسو اور اس کا بھائی نیکا اس گاؤں میں وارد ہوئے تھے... باسو اور نیکا نہ بھائی تھے اور نہ ہی مسلمان ہم نے پوری چھان بین کی ہے۔ ان کے نام شروان کمار اور شیوم سنہا ہے، یہ دونوں انڈیا کے ٹاپ کلاس کے غنڈے تھے جنہیں ہائر کر کے تخریب کاری کے مقصد سے پاکستان بھیجا گیا تھا جہاں انہیں مختیار کی معاونت کرنی تھی... اور اس سے اچھی تخریب کاری کیا ہوتی کہ مسلمانوں کو آپس میں ہی لڑا دیا جائے... شروع شروع میں

انہوں نے صرف لوگوں پر اپنی دھاک بٹھائی اور جب وہ جان گئے کہ اس گاؤں کے لوگ اتنے بزدل ہیں کہ اگر ان کی عزتیں بھی خراب کردی جائیں تو یہ چوں بھی نہ کریں گے، تب انہوں نے اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کردیا... جس کی وجہ سے گاؤں کے اکثر لوگ شہروں کی طرف بھاگ گئے۔

پھر گاؤں میں ان کی مرضی کا ایک مولوی آیا وہ وہی کہتا تھا جس کا اسے حکم دیا جاتا تھا۔ شروان اور شیدوم نے صرف اس گاؤں پر ہی بس نہیں کیا تھا بلکہ وہ دوسرے گاؤں پر بھی منہ مارتے تھے اور ان کی پشت پناہی بختیار کرتا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی پولیس والا ان پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتا تھا... اور اگر کسی کو ایمانداری کا بھوت چڑھ بھی جاتا تو اسے اٹھا کر کسی اور شہر میں پھینک دیا جاتا... پھر دو ماہ پہلے میں اس گاؤں میں آیا... گاؤں والوں نے جب دوسرے مولوی کو چلتا کیا تو شروان اور شیدوم میرے پاس آئے اور وہی بات سامنے رکھی جو ڈھائی سال پہلے مولوی صاحب کے سامنے رکھی تھی... اگر میں تب انکار کردیتا تو آج ان دونوں کی جگہ میں اوپر پہنچ چکا ہوتا۔

میں ڈیڑھ مہینے تک راتوں کو جاگ جاگ کر ڈیرے کی ریکی کرتا رہا کہ کوئی موقع ملے اور میں کچھ کرسکوں اور آخر ایک دن مجھے موقع مل گیا... اس دن شروان (ہاسو) ڈیرے پر اکیلا تھا اور شیدوم شہر گیا ہوا تھا... میں دیوار پھاند کر ڈیرے میں داخل ہوگیا عین اسی وقت شروان رفع حاجت کے لیے ڈیرے کے ایک کمرے سے باہر نکلا اور میں اس کمرے میں گھس گیا... وہ دس منٹ بعد لوٹا اتنی دیر میں میں کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا... سرہانے پڑا ایک خنجر بھی میری تحویل میں آچکا تھا اور اب مجھے شروان کا انتظار تھا... جونہی وہ فراغت کے بعد کمرے میں داخل ہوا میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر پہلا وار اس کے سینے پر کیا اور آدھا خنجر اس کے سینے میں ترازو ہوگیا... میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پے در پے پانچ مزید وار کیے اور جب وہ ٹھنڈا ہوگیا تو چارپائی کی نواڑ سے اسے پھندا لگا کر ڈیرے کے اندر ہی پیپل کے درخت سے لٹکا دیا۔

تلاشی کے دوران میں جو چیزیں میرے ہاتھ لگی تھیں ان میں ایک یہ موبائل بھی تھا... جس میں شمر نے ویڈیو بنائی تھی شاید اپنے آقا کو اپنا کارنامہ دکھانا چاہتا ہو... اسے چاہیے تو یہ تھا کہ موبائل ہی ضائع کردیتا لیکن اس نے صرف ویڈیو ڈیلیٹ کرنے پر ہی اکتفا کرلیا... مجھے جب موبائل ملا تو میں نے "ڈیٹا ریکوری" کے ذریعے اس کا سارا ڈیٹا ریکور کیا اور اسی ڈیٹا میں یہ ویڈیو بھی ملی... جس بات کا پہلے مجھے صرف شک تھا اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی... میں کوئی مجرم نہیں تھا لیکن جب انسانیت پر ضرب پڑنے لگی تو تسبیح اور مصلیٰ چھوڑ کر شمشیر تھامنی پڑی۔ جب انسان کسی بات کا مصمم ارادہ کرلیتا ہے تو اللہ خود ہی راستے پیدا کرتا جاتا ہے۔

میرے اناڑی پن کی وجہ سے ارجن کو میری کارکردگی کا علم ہوگیا اور اگلے دن وہ جنازے کے بہانے مجھے اٹھا کر ڈیرے پر لے گیا۔ جہاں سے میں موقع پاکر فرار ہوگیا... تین چار دن میں نے چکر لگائے کہ کوئی موقع ملے اور میں ارجن کا بھی کچھ کرسکوں اسی دوران ہی۔ گاؤں کے ایک شخص نے میرا پیچھا بھی کیا لیکن میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس کے پیچھا کرنے سے واقف ہوں اور اسے جل دینے میں کامیاب ہوگیا۔ چھوٹے شاہ جی کا واضح اشارہ میری طرف تھا۔

"اور کل رات وہ چاچے غلام رسول کی بیٹی زینت کو اٹھا لے گیا... اس وقت اس کے ڈیرے پر اس کے سوا کوئی نہیں تھا... اور اب اس بات کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی کہ اسے اور مہلت دے جائے... لہٰذا کل میں نے اس کو بھی اس کے منہ بولے بھائی کے پاس بھیج دیا۔"

"تم ان کو قانون کے حوالے بھی کرسکتے تھے... قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیا۔"

"جوشِ جذبات میں یہ غلطی ہوئی۔ مجھے قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا۔ میں نے برا کیا۔ اب اسے سنبھالنا آپ کا کام ہے۔"

ٹھیک ہے۔ یہ تین موبائل ہیں، ان میں میسجز اور کالز کے مکمل ریکارڈ موجود ہیں اور کچھ لوگوں کے قتل کی ویڈیوز بھی... جن میں تین بڑے علماء اور دو سیاسی لیڈرز بھی شامل ہیں۔

انسپکٹر ثبوت اور چھوٹے شاہ جی کو لے گیا... چند ماہ بعد وہی ہوا جس کا ڈر مجھے تھا... بختیار کو باعزت بری کردیا گیا اور چھوٹے شاہ جی کو دو بے قصور لوگوں کو قتل کرنے کے جرم میں سزا سنادی گئی... جس دن ان کو سزا ہوئی اس کے ایک ہفتہ بعد سننے میں آیا کہ وہ جیل سے فرار ہوگئے ہیں اور ان کے فرار کے کچھ ہی دن بعد بختیار اپنی حویلی میں مردہ پایا گیا... اس کے جسم پر بھی خنجر کے چھ زخم تھے۔

بختاور کو مرے آج تین سال ہوگئے ہیں لیکن وہ چھپا رستم آج تک پولیس کو نہیں مل سکا... جس کی شرافت کی سارا گاؤں مثالیں دیا کرتا تھا۔

◆

بازی گر

جناب معراج رسول
السلام علیکم
اس دنیا میں کیسے کیسے بہروپیے ہیں اس کا ایک نمونہ حاضر ہے۔
یقین کریں اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں اسے بھول نہیں سکا ہوں۔
نصرت حسین کاظمی
(کراچی)

میں راڈو مارکیٹ میں اسٹیشنری کی دکان کے سامنے لگے بک اسٹینڈ پر نئے مہینے کا سرگزشت تلاش کر رہا تھا۔ رسالہ نظر نہیں آ رہا تھا اور تاریخ ہو چکی تھی۔ اب تک رسالہ لازمی آجانا چاہیے تھا۔ میں رسالوں کے پیچھے دبے ہوئے رسالے نکال کر دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے برابر میں آ کھڑا ہوا۔ سانولا رنگ جو سفید شلوار قمیص میں اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ رخساروں پر معمولی سے بال اور تھوڑی کے نیچے چگی داڑھی اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔ سر پر سفید جالی

دار ٹوپی سے اس کے بال لٹک کر گردن تک آ رہے تھے۔ مخصوص بنگالی نقوش تھے۔ اس نے شانے پر تہ کیے ہوئے تولیہ نما رومالوں کا ڈھیر رکھا ہوا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں مسواک کا گٹھا تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے ایک خاص نوع کی عیاری جھلک رہی تھی۔ یہ عیاری ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں چیلنج کر رہی تھیں کہ میں وہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو مجھ سے بچ کر دکھاؤ۔ مگر وہ بولا تو اس کے لہجے میں مٹھاس اور نرمی تھی۔

"بھائی صاحب اگر آپ مجھ سے کچھ رومال اور مسواک لے لیں تو ایک غریب کی مدد ہو جائے گی۔"

"مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سرگزشت کی تلاش جاری رکھی۔

"ضرورت تو کسی کو نہیں ہوتی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "مگر میں بہت ضرورت مند ہوں۔ کیا آپ ایک منٹ کے لیے میری بات سنیں گے۔"

میں چاہنے کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ اسے ٹالنے کے لیے میں نے کہا۔ "ایک منٹ ذرا میں رسالہ تلاش کر لوں پھر تمہاری بات سنتا ہوں۔"

"مجھے بتائیں میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔"

"اس مہینے کا سرگزشت چاہیے.... لوگ بھی رسالے الٹ پلٹ کر چلے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ لیں۔" اس نے ایک منٹ میں سرگزشت نکال کر مجھے پکڑا دیا۔ میں حیران ہوا تھا۔ میں دس منٹ سے تلاش کر رہا تھا اور دکان والے سے بھی تصدیق کی تھی کہ سرگزشت موجود ہے۔ مجھے نہیں ملا تھا اور اس نے ایک منٹ میں تلاش کر لیا۔ اب میں اس کا زیر بار بھی ہو گیا تھا۔ مجبوراً رسالے کی ادائیگی کر کے میں اس کے ساتھ ایک طرف آیا۔ میرے اندر سے کوئی مسلسل کہہ رہا تھا کہ وہ دھوکے باز ہے فراڈیا ہے۔ میں اس کی بات نہ سنوں۔ ہمارے معاشرے میں تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک عام طبقہ جو سب سے بڑا ہے۔ یہ ذہانت رکھتا ہے مگر اس کے اندر ایک مخصوص قسم کی ہچکچاہٹ اسے صحیح فیصلہ کرنے سے روکتی ہے۔ عام طور سے وہ غلط فیصلہ کرتا ہے اور اس سے نقصان اٹھاتا ہے۔ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ دوسرا طبقہ ان عیاروں کا ہے جن کے پاس عقل ہوتی ہے اور وہ اپنے مقصد کے لیے اسے استعمال کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ یہ ہم جیسے لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہماری ہچکچاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو عقل رکھتا ہے اور ہچکچاتا بھی نہیں ہے اور وہی ان عیاروں سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر یہ طبقہ بھی بہت کم ہے۔

"جلدی بولو میرے پاس وقت کم ہے۔" میں نے عجلت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"میں بنگالی ہوں۔" اس نے یوں آہ بھری جیسے بنگالی ... ہونا کوئی جرم ہو۔ "ماں باپ بنگلہ دیش بننے کے بعد یہاں سے نہیں گئے مگر ہم آج بھی بنگالی ہیں۔"

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ بنگالی تھا اور اگر وہ اب بھی بنگالی تھا تو اس سے میرا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ "بات مختصر کرو مجھے گھر جانا ہے۔"

اس نے بہ ظاہر میری بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں بولا۔ "آپ یہیں پاس رہتے ہیں نا؟"

میں چونکا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے بہت بار آپ کو دیکھا ہے۔ آپ یہاں سے خریداری کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ نے آپ کو بہت دے رکھا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن حالات ٹائٹ چل رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اتنی سمجھ تو مجھے بھی تھی کہ وہ بات کو کس طرف لے جا رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا مدعا بیان کرے اور میں انکار کر کے اپنی راہ لوں۔ مگر وہ اس طرف آ ہی نہیں رہا تھا۔

"مجھ سے زیادہ کون بہتر جان سکتا ہے کہ حالات کتنے ٹائٹ چل رہے ہیں۔" اس نے پھر سرد آہ بھری۔ "جس کے گھر میں کمانے کو تنہا ہو۔ ایک بوڑھی ماں اور چار چھوٹے بہن بھائی سارا دن راہ تکتے ہوں کہ میں کچھ کما کر لاؤں گا تو چولہا جلے گا۔"

"اس شہر کی نصف آبادی اسی طرح روز کماتی اور روز کھاتی ہے۔" میں نے گویا اسے جواب دیا اس دوران میں میرے اندر سے مسلسل آواز آ رہی تھی .....جھوٹ.....جھوٹ۔

"ہاں لیکن آدھی آبادی کی کوئی جوان بہن کینسر کا شکار ہو کر سرکاری اسپتال میں نہیں پڑی ہوتی ہے۔" کہتے ہوئے اس کا لہجہ اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے کہا۔ "آپ شاید میری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔ آج کل کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرتا ہے۔"

دھوکا اور فریب اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ آدمی کیسے کسی کا اعتبار کرے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے رسمی انداز میں کہا۔

"آپ کے افسوس کا شکریہ۔ لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ یقیناً زکوٰۃ خیرات نکالتے ہوں گے۔ میں آپ سے اس سے زیادہ نہیں مانگتا جو آپ نے کسی کو دینا ہی ہے اس میں سے مجھے دے دیں اور چاہیں تو اسپتال چل کر میری بہن کو بھی دیکھ لیں تاکہ آپ کو یقین آجائے کہ آپ کی زکوٰۃ خیرات غلط ہاتھوں میں نہیں جا رہی ہے۔"

"دیکھو میرے پاس وقت نہیں ہے میں جاب کرنے والا آدمی ہوں۔ صبح جاتا ہوں اور شام کو آتا ہوں۔ یہ چھٹی کا دن ملتا ہے تو گھر کے کام دیکھتا ہوں۔ میں کہاں اسپتالوں میں پھرتا پھروں؟"

"میں جانتا ہوں.... میں آپ سے زیادہ توقع بھی نہیں لگا رہا.... آپ کسی دن اپنے قیمتی وقت سے صرف ایک گھنٹا نکال لیں۔ آپ کہاں کام کرتے ہیں۔"

"میں ایک موبائل فون کمپنی میں کام کرتا ہوں جس کا دفتر شاہراہ فیصل پر ہے۔" اس نے اس طرح پوچھا کہ میں نے بے ساختہ بتا دیا۔

اس نے سر ہلایا۔ "یہ تو.... اسپتال کے بالکل نزدیک ہے آپ کو آدھا گھنٹا بھی نہیں لگے گا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ "ابھی تو رمضان میں وقت ہے ہم اپنی زکوٰۃ رمضان میں نکالتے ہیں۔"

"اگر آپ رمضان سے پہلے دے دیں گے تو کسی غریب مجبور کے کام آئے گی۔" الفاظ کی عاجزی سے قطع نظر وہ ایک مخصوص لہجے میں بول رہا تھا اور اس دوران میں اس کی آنکھیں مستقل میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں اندر سے مسلسل پسپا ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنے ٹرانس میں لے رہا ہے۔ اس نے عام دھوکے باز بھکاریوں کی طرح پیچھے پڑے بغیر بہت نرمی اور آہستگی سے میرے قریب جگہ بنالی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"میں سوچوں گا۔"

"ضرور جناب زکوٰۃ بھی ایک عبادت ہے اور اسے پوری چھان بین کرکے ادا کرنا چاہیے۔ آپ کا کوئی موبائل نمبر ہوگا۔"

"تمہارے پاس موبائل ہے؟" میں نے کسی قدر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"یہ ہے۔" اس نے جیب سے ایک نہایت قدیم اور گھسا ہوا موبائل نکالا، یہ ماڈل اب کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر جگہ جگہ ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ "بس گزارے کے لیے ہے.... کبھی کبھی اسکرین پر نمبر آنا بند ہو جاتے ہیں تو اندازے سے ڈائل کرنا پڑتا ہے آج کل اس کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہے۔"

"تمہاری بہن کا کیا نام ہے اور کس وارڈ میں ہے؟"

"میرا نام شمس الدین ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میری بہن کا نام نورانسا ہے اور وہ کینسر کے جنرل وارڈ میں ہے۔ لیڈیز اور بچوں والے وارڈ میں۔ بیڈ نمبر سولہ ہے آپ کا نام کیا ہے؟"

"نصرت نفیسی۔" میں نے نام بتایا۔

"آپ کا سیل نمبر؟"

میں نے اپنا نمبر دینے کی بجائے اس کا نمبر لیا اور کہا۔ "ٹھیک ہے میں فرصت نکال کر دیکھوں گا اور پھر تم سے رابطہ کروں گا۔ اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں تو...."

"ساری بات اللہ کی توفیق کی ہے۔ اگر اس نے آپ کے نصیب میں لکھی ہے تو مجھے ضرور ملے گی۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس سے کچھ مسواک اور رومال لیے۔ یہ ساری چیزیں پچاس کی بھی نہیں تھیں لیکن میں نے اسے سو دے دیے۔ گھر جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ فراڈیا نہیں تھا تو میں سچ مچ اس کی کچھ مدد کروں گا۔ میرے پاس ایک فلیٹ تھا جو کرائے پر دیا ہوا تھا اور میری بیوی زرین کے پاس تقریباً بیس تولے گولڈ تھے۔ پچھلے سال میں نے تقریباً ساٹھ ہزار روپے زکوٰۃ دی تھی۔ اس سال گولڈ کی قیمت بڑھ گئی تھی اور میرا اندازہ تھا اس بار ستر ہزار تک زکوٰۃ جائے گی۔ میں نے گھر جاکر زرین کو ساری بات بتائی تو اس نے کہا۔ "نصرت وہ آپ کو فراڈیا لگ رہا تھا تو آپ نے یہ سب کیوں لیا اور اب آپ زکوٰۃ دینے کی بات کر رہے ہیں۔"

"دیکھو یار بعض اوقات آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے اور میں اچھی طرح تصدیق کرکے ہی زکوٰۃ دوں گا۔"

"مرضی آپ کی، یہ آپ کا شعبہ ہے۔" زرین نے بے نیازی سے کہا تو میں نے اسے گھورا۔

"زکوٰۃ، جناب کے زیورات کی جاتی ہے۔"

"تو یہ زیور آپ اور آپ کے بچوں کے کام آئے گا تا

کون سا میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔" اس نے جھک کر کہا۔ "یہ مکان خریدا تھا تب بھی تو میں نے اپنا آدھا گولڈ دیا تھا کہ نہیں.... آج ہمارا مکان ہے اور آپ کو زکوٰۃ بھی کم دینا پڑتی ہے۔"

"تم لاجواب کر دیتی ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا عظمت جو سات سال کا ہے اور بیٹی رانیا پانچ سال کی ہے۔ دونوں اسکول جاتے ہیں۔ صبح میں دفتر جاتے ہوئے انہیں اسکول چھوڑ جاتا ہوں اور دوپہر میں زرین جا کر انہیں لے آتی ہے۔ اسکول پاس ہی ہے۔ زرین پیدل چلی جاتی ہے یا موسم گرم ہو تو رکشا کر لیتی ہے۔ جب سے اسکول وینوں میں بچوں کے ساتھ آنے والے حادثات دیکھے اور سنے تب سے ہم نے بچوں کی اسکول وین چھڑوا دی تھی۔ بچے بھی خوش تھے کہ آتے جاتے ماں باپ کا ساتھ میسر ہوتا تھا۔ خاص طور رانیا میرے ساتھ جاتے ہوئے خوش ہوتی تھی۔ وہ پاپا کی دیوانی تھی۔ شام کو میں گھر میں داخل ہوتا تو وہ پہلے سے دروازے پر منتظر ہوتی تھی۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہر سہولت اور آسانی دی ہے۔ اس لیے میں اور زرین دوسروں کا خیال کر کے اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پیر سے دفتر جانا شروع کیا اور پیر ہمیشہ مصروفیت لاتا تھا۔ کیونکہ اتوار کو ہونے والی ٹرانسیکشنز بھی اکاؤنٹس میں آتی تھیں اور کام دوگنا ہو جاتا تھا۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور عام طور سے اٹھتے اٹھتے سات آٹھ بج جاتے تھے۔ پیر والے دن میں ہمیشہ لیٹ گھر آتا، باقی دنوں میں چھ بجے تک گھر آجاتا تھا۔ اس روز بھی دفتر سے اٹھتے ہوئے ساڑھے سات بج گئے تھے۔ مجھے باہر نکل کر خیال آیا کہ میں نورالنسا کو دیکھ لوں تصدیق ہو جاتی کہ شمس الدین سچ کہہ رہا تھا یا جھوٹ۔ مگر پھر ہمت نہیں ہوئی۔ تھکن بہت زیادہ تھی، سارا دن کمر سیدھی کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور بڑی مشکل سے لنچ کیا تھا۔ میں نے یہ کام اگلے روز کے لیے ملتوی کیا اور گھر روانہ ہو گیا۔ اب اتفاق کی بات تھی کہ آنے والے ہر روز کوئی نہ کوئی کام یا مصروفیت نکل آتی تھی جس کی وجہ سے اسپتال جانا ملتوی ہو جاتا تھا۔ سچی بات ہے مجھے سرکاری اسپتال جا کر وحشت ہوتی تھی۔ وہاں کا ماحول، گندگی اور سب سے بڑی بات انسانوں سے بےپروائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں جب بھی کسی سرکاری اسپتال گیا دل پر جبر کر کے ہی گیا۔ شاید اس لیے بھی میں روز ٹال جاتا تھا۔

پورا ہفتہ گزر گیا اور اتوار آیا۔ میں عام طور سے شام کے وقت جا کر ہفتے بھر کا سامان لے آتا تھا۔ کچن کا تازہ سامان جیسے گوشت، سبزی اور پھل زرین خود لیتی تھی۔ میں جنرل اسٹور اور دوسری دکانوں سے ملنے والا سامان لاتا تھا۔ بیکری آئٹم ہمارے ہاں کم آتے تھے۔ زرین ناشتا بھی خود بناتی تھی۔ اس لیے مجھے پورے ہفتے میں بس ایک بار جانا پڑتا تھا۔ زرین مجھے فہرست بنا دیتی تھی اور میں چیزیں لے آتا۔ یوں سمجھیں کہ ہمارے ہاں ماہوار کی بجائے ہفتے وار سامان آتا تھا۔ اس بار سامان زیادہ تھا اس لیے میں گاڑی لے گیا۔ رلاوہ مارکیٹ کی پارکنگ میں جیسے ہی گاڑی سے اترا مجھے سامنے سے شمس الدین آتا دکھائی دیا۔ بظاہر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ سر جھکائے آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا وہ میری طرف ہی آ رہا ہے۔ اس نے پاس آ کر سر اوپر اٹھایا اور مجھے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی نظر پڑی ہو۔

"نصرت بھائی۔" اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے.... تم سناؤ۔"

"ویسے تو اللہ کا شکر ہے۔" اس نے سرد آہ بھری جو اصل میں اشارت تھا اور پھر وہ شروع ہو گیا۔ "مگر نور کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے انجکشن کہا ہے اس سے وہ بہتر ہو جائے گی مگر انجکشن پندرہ ہزار کا ہے اور یہاں اتنی رقم نہیں ہے۔"

"سوری مجھے وقت نہیں ملا تھا۔" میں نے معذرت کی۔ "یہ پورا ہفتہ بہت مصروف رہا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں گے۔ زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ یہ زندہ لوگوں کے لیے ہے۔ مگر جن کی جان اٹکی ہو ان کے لیے تو ایک ایک پل صدی بن کر گزرتا ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔ "اللہ مالک ہے۔ اگر نصیب میں ہوا تو نورالنسا کی زندگی میں آپ کو فرصت مل جائے اگر نصیب میں نہ ہوا تو...." وہ بولتے ہوئے چپ ہو گیا اس کا لہجہ آزردہ تھا۔ "معاف کیجیے گا آپ کام سے آئے ہیں اور میں اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ گیا۔"

آج اس نے ازاربند کے پیکٹ تھام رکھے تھے۔ مجھے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں نے اس سے ایک پیکٹ لے لیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم مختلف سامان

کیوں رکھتے ہو؟"

"مسواک تو میں لازمی رکھتا ہوں۔ یہ ہمارے نبی ﷺ کی سنت ہے اور ہر مسلمان کو مسواک کرنی چاہیے، چاہے وہ ٹوتھ پیسٹ کیوں نہ استعمال کرتا ہو۔ باقی چیزیں میں بیگم سے لیتا ہوں جو چیز سستی مل رہی ہو وہ اٹھا لیتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ ان سے ہی خریداری کرنی ہوتی ہے۔ شام تک دو تین سو روپے بچ جاتے ہیں جس سے گھر کا چولہا جلتا ہے۔"

میں نے خریداری کی اور واپس آیا تو میرے اندر افسردگی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ واقعی بہت ضرورت مند ہو۔ زرین ازار بند کا پیکٹ دیکھ کر سمجھ گئی۔ اس نے کہا۔ "آج پھر وہی ملا تھا؟"

"ہاں یار کام کی چیز تھی میں نے سوچا لے لوں... ضائع نہیں جائے گی۔"

"آپ عید بقر عید پر دو تین جوڑے بنواتے ہیں ان کے لیے تو یہ پیکٹ دس سال بھی چلے گا۔" اس نے طنز کیا تو میں مسکرا کر رہ گیا۔

"کوئی بات نہیں یار دوسروں کو بھی بانٹ دیں گے۔ ڈیڑھ سو کا پیکٹ تو ہے۔"

"بات ڈیڑھ سو کی نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے جو ازار بند لاتی ہوں ایک کی قیمت پچاس روپے ہوتی ہے۔ لیکن آپ اس سے ٹھگ کر آتے ہیں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ وہ فراڈیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ "اب اس سے کچھ نہیں لوں گا۔"

"مرضی ہے آپ کی۔" زرین نے منہ بنا کر کہا۔ "پیسے تو آپ کے ہی خرچ ہو رہے ہیں۔"

زرین کی بات نے مجھے اکسایا کہ میں شمس الدین کی اصلیت جاننے کی کوشش کروں اور میں نے سوچ لیا کہ میں کل اسپتال ضرور جاؤں گا چاہے مجھے دیر ہو جائے۔ اگلے دن دفتر سے نکل کر میں اسپتال روانہ ہوا مگر مجھے خیال نہیں رہا کہ سات کے بعد ملاقات کا وقت نہیں ہوتا ہے۔ میں وارڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ البتہ وہاں کاؤنٹر سے تصدیق ہو گئی کہ یہاں انیس سالہ نور النسا نامی لڑکی داخل ہے اسے دوسرے درجے کا کینسر ہے اور اس کا علاج جاری ہے۔ میں نے اس کے ڈاکٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے اس سے نور النسا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے بلڈ کینسر ہے۔ گویا شمس الدین اس حد تک درست تھا کہ اس کی بہن کو کینسر تھا اور اسے علاج کی ضرورت تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"کیا مریضہ کو کوئی انجکشن تجویز ہوا جس کی مالیت پندرہ ہزار ہے؟"

"جی ہاں... ہم نے اس کے بھائی سے کہا ہے کہ وہ بندوبست کرے کیونکہ حکومت کے پاس اس کا اسٹاک نہیں ہے۔"

"اگر اسٹاک نہیں ہے تو مارکیٹ سے خرید کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "یہ حکومت کی ذمے داری ہے۔"

ڈاکٹر مسکرایا۔ "دواؤں کی خریداری کے لیے ہمارے پاس بجٹ محدود ہوتا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ "اس ملک میں عوام کے لیے ہر چیز محدود ہے۔ یہ بتائیں کہ اگر انجکشن مل جائے تو لڑکی پر کیا فرق پڑے گا؟"

"کینسر کے خلیوں کی افزائش کی رفتار کم ہو جائے گی اور ہمیں کیموتھراپی کے لیے زیادہ وقت ملے گا۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو مہینے میں ایک بار کر سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ اب میں مطمئن تھا۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے شمس الدین کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے؟"

"نصرت غنی بات کر رہا ہوں۔"

"نصرت بھائی۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "کیسے مجھ غریب کو کیسے یاد کیا؟"

"میں اسپتال سے آ رہا ہوں تمہاری بہن کو تو دیکھنے نہیں دیا لیکن میری ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی ہے۔"

"وہ کیا کہہ رہا ہے؟" اس نے اسی انداز میں کہا۔

"اس کا کہنا ہے کہ انجکشن سے انھیں نور النسا کے علاج کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ تم ایسا کرو کل مجھ سے آ کر رقم لے لو۔"

"کہاں آنا ہو گا؟" وہ خوش ہو گیا۔

"راز و تن آ جاؤ میں بینک سے نکلوا کر وہیں لے آؤں گا۔"

"کس وقت؟"

"شام میں تم وہیں ہوتے ہو میں آؤں گا تو کال کر

لوں گا سات ساڑھے سات بج سکتے ہیں۔"

"کیا آپ کا نمبر ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ اب یہ کال کرتا رہے گا۔ مگر اس نے کال نہیں کی۔ میں نے رات زرین کو بتایا کہ شمس الدین کی بہن بچی کینسر کی مریضہ ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ اس کے علاج کے لیے پندرہ ہزار کے ایک انجکشن کی ضرورت ہے اور میں نے سوچا ہے کہ میں زکوۃ کی مد میں یہ رقم شمس الدین کو دے دوں۔ زرین بھی متاثر ہوئی تھی اس کے خیال میں شمس الدین فراڈیا تھا مگر اب ثابت ہو گیا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ سچ ضرورت مند تھا۔ زرین نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ اسے پندرہ ہزار روپے دے دیں یا چاہیں تو اور بھی دے دیں اس بار زکوۃ بھی زیادہ جائے گی۔ اگر ہماری زکوۃ سے کسی لڑکی کی جان بچ جائے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"فی الحال تو پندرہ دے رہا ہوں۔ پھر دیکھوں گا۔"

اگلے دن دفتر سے واپسی پر میں نے بینک سے رقم نکلوائی۔ بینک بھی گلستان جوہر میں تھا۔ میں نے سوچا گھر جانے سے پہلے یہ کام نمٹا دوں۔ راؤ مارکیٹ آیا تو شمس الدین مجھے باہر ہی مل گیا تھا۔ کار دیکھتے ہی وہ لپک کر آیا۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اندر آجاؤ... آج کل یہاں لٹیرے گھومتے رہتے ہیں موقع پاتے ہی رقم موبائل چھین لیتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" پہلی بار اس کا لہجہ کسی قدر مضطرب تھا۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ جب میں نے نورالنسا کو بتایا کہ اس کے لیے انجکشن کا بندوبست ہو گیا ہے تو اس کے کیا تاثرات تھے۔ وہ آپ کو دعائیں دیتے نہیں تھک رہی تھی۔"

"اللہ اسے صحت اور زندگی دے۔" میں نے جیب سے رقم نکال کر اس کے حوالے کی۔ "گن لو پورے پندرہ ہزار ہیں۔"

"گنتا تو وہ ہے جو بدلے میں کچھ دیتا ہے۔ میرے پاس تو سوائے دعاؤں کے کچھ نہیں ہے۔" اس نے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر دعا کرنا... انجکشن جلد لگوا لو ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر دیر ہوئی تو انجکشن بیکار جائے گا۔"

"کل صبح دواؤں کی مارکیٹ کھلتے ہی میں سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔ کل ہی اسے لگ بھی جائے گا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ انجکشن بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کے بعد مریض کو طاقتور غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انجکشن اپنا کام ٹھیک سے کر سکے۔ خیر اللہ مالک ہے جیسے انجکشن کا بندوبست ہوا ہے اسی طرح نورالنسا کے لیے اچھی خوراک کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

مجھے زرین کی بات یاد آئی اگر ہماری وجہ سے ایک لڑکی کی زندگی بچ جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے پرس سے ایک ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "یہ رکھ لو... اس کے لیے کھانے پینے کا سامان لے لینا۔"

اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ نوٹ لے لیا۔ "آپ بہت کر رہے ہیں۔ میں تو آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پندرہ ہزار میں نے زکوۃ سے دیے ہیں لیکن یہ ہزار میری طرف سے ہے۔"

اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نیچے اتر گیا۔ میں گھر کی طرف روانہ ہوا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں نے زرین کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ "آپ نے اچھا کیا، واقعی صرف علاج سب کچھ نہیں ہوتا ہے مریض کو اچھی غذا کی ضرورت بھی ہوتی ہے تب ہی وہ بیماری سے لڑ سکتا ہے۔"

"بس یہی سوچ کر میں نے ہزار روپے دیے تھے۔"

آنے والے اتوار میری پھر شمس الدین سے ملاقات ہوئی اور وہ بہت خوش تھا اس نے بتایا کہ نورالنسا کی حالت اچھی ہے۔ دو دن بعد اس کی اگلی کیموتھراپی ہے۔ "اب امید ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے کہا۔

"آپ نے جو رقم دی تھی اس سے اسے اچھی خوراک دی ہے۔ رقم تو نہیں لیکن اب ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کیموتھراپی کے بعد وہ دو تین دن ویسے ہی کچھ نہیں کھا سکے گی۔"

"تم اگلے اتوار کو ملنا شاید میں تمہارے لیے اور کچھ کروں۔"

وہ خوش ہو گیا۔ "میں یہیں ہوں گا۔"

شروع میں مجھے لگا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ایک بار کچھ دو تو پھر وہ جان کو آجاتے ہیں اور اس

وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک آدمی اپنی طبیعت پر جبر کر کے انہیں دھتکار نہ دے۔ مگر خلافِ توقع وہ ایسا ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ پیچھے تو لگا رہا لیکن ایسے طریقے سلیقے سے کہ ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ اپنی ضرورت مہذب انداز میں پیش کی اور پیشہ ور بھکاریوں والا رویہ نہیں اپنایا تھا۔ جس سے چڑ آتی ہے۔ اس نے میرا نمبر پاس ہونے کے باوجود ایک بار بھی مجھے کال نہیں کی تھی۔ اب تو زرین بھی اس سے متاثر ہو چلی تھی۔ اسے شمس الدین اور نورالنسا سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا ارادہ شمس الدین کو مزید مدد دینے کا ہے تو وہ نہ صرف متفق ہو گئی۔ بلکہ اس نے نورالنسا کے لیے اپنے کچھ پرانے لیکن اچھے جوڑے بھی نکالے۔ ساتھ ہی کچھ چیزیں اور بھی تھیں۔

"یہ سب بھی اسے دے دیجیے گا۔" زرین نے کہا۔ "اچھا ہے نا کسی کے کام آ جائے گا۔"

شمس الدین کے بارے میں ابتدائی تاثر جو تھا لیکن اس کی بات سچی ثابت ہونے کے بعد ہمارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ آ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی ہم دل سے اس کی مدد کرنا چاہ رہے تھے۔ اگلے اتوار کو میں مارکیٹ پہنچا تو وہ وہاں موجود تھا۔ میں نے کپڑوں اور سامان کا شاپر دیا اور ساتھ ہی اس کی بہن کے لیے کچھ رقم دی تھی۔ وہ بہت شکر گزار ہوا تھا۔ ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ "نصرت بھائی، مدد تو بہت سے لوگوں نے کی لیکن آپ نے جس طرح اپنائیت کے ساتھ کچھ کیا ہے اس کے لیے میں اپنے جذبات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"حالانکہ تم بہت اچھا بولتے ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے بہت کم لوگوں کو تمہاری طرح اتنا نپا تلا بولتے سنا ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو؟"

"اسکول تک پڑھا ہے اور یہ تو آپ جیسے مہربانوں کا ساتھ ہے جو مجھے چند الفاظ بولنا آ گئے ہیں۔"

شمس الدین سے بات کر کے میں اندر آیا۔ زرین نے کاسمیٹکس شاپ سے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔ اس کے مالک توقیر سے میری بہت اچھی سلام دعا بلکہ گپ شپ تھی۔ اگر وہ فارغ ہوتا تو ہم بات کر لیتے تھے۔ میں اس کی شاپ پر پہنچا تو جیسے وہ میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد چھوٹتے ہی کہا۔ "نصرت یار، یہ کس کے چکر میں پڑے ہو؟"

میں چونکا۔ "چکر میں اور میں؟"

"ہاں تم اس بنگالی کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ مجھے پہلے بھی کسی نے بتایا تھا لیکن آج تو میں نے خود اسے آپ سے بات کرتے دیکھا اور آپ نے اسے کچھ دیا بھی تھا۔"

"ہاں یار وہ ضرورت مند ہے۔"

"ضرورت مند۔" توقیر ہنسا۔ "نصرت بھائی وہ ایک نمبر کا فراڈیا ہے۔"

"نہیں یار سچ مچ ضرورت مند ہے اس کی بہن کینسر کی مریضہ ہے اسپتال میں داخل ہے۔"

توقیر نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا چکر ہوگا لوگوں سے اسی قسم کی کہانیوں کی مدد سے رقم ٹھگتا ہے۔ اس مارکیٹ میں آنے والے بہت لوگوں کو ٹھگ چکا ہے۔ دکاندار تقریباً سب جانتے ہیں۔ اس لیے دوسروں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔"

"دکانداروں کو کون لوٹ سکتا ہے اس ملک کی سب سے بڑی ڈکیت ایسوسی ایشن تم لوگوں نے بنا رکھی ہے دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹ رہے ہو۔"

"مگر بدلے میں چیز تو دیتے ہیں۔ اس جیسے لوگ تو دھوکے کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ یہ بتاؤ کہ آپ نے کچھ دیا تو نہیں ہے۔"

اگر میں توقیر کے سامنے اقرار کر لیتا کہ میں اسے نہ صرف اٹھارہ ہزار سے اوپر رقم دے چکا ہوں بلکہ میری بیوی نے خاصا سامان بھی دیا ہے تو یہ بے وقوف بننے کا اقرار کرنے والی بات ہوتی۔ دوسرے مجھے توقیر کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ کم سے کم نورالنسا نام کی لڑکی اسپتال کے کینسر وارڈ میں تھی اور اس کی وہی کیفیت تھی جو شمس الدین نے بیان کی تھی۔ اس نے اس بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اب مجھے فکر لگ رہی تھی کہ کہیں میں سچ مچ تو دھوکا نہیں کھا گیا تھا۔ میں گھر آیا تو زرین نے پوچھا۔ "آپ نے سامان دیا اسے۔"

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ بہت شکریہ ادا کر رہا تھا۔"

"اللہ کرے اس کی بہن ٹھیک ہو جائے۔" زرین نے خلوص سے کہا تو میں نے سوچا کہ وہ اس کی بہن تھی بھی یا نہیں؟ لیکن میں نے یہ بات زرین کو نہیں بتائی۔ پہلے میں اس معاملے میں پوری چھان بین کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دن میں دفتر سے ذرا جلدی اٹھا تھا۔ میں آج نورالنسا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ چھ بجے ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا تھا اس

کے بعد کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ ٹریفک کے باوجود میں خوش قسمتی سے چھ بجنے میں دس منٹ پہلے پہنچ گیا۔ وہاں بے شمار لوگ اپنے اپنے عزیزوں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے مجھے بھی نہیں روکا۔ مجھے بیڈ نمبر یاد تھا۔ بیڈ پر دو طرف اسکرین کھڑی ہوئی تھی اور ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ میں اندر آیا تو بیڈ پر ایک نوجوان اور سانولی بنگالی نقوش والی لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ بیماری نے اسے گھلا دیا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ کیموتھراپی کی وجہ سے اس کے بال جھڑ گئے تھے اور سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ وہ غنودگی میں تھی یا اسے کوئی دوا دی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو میں چونکا کیونکہ اس کے جسم پر زرین کا ایک سوٹ تھا اور یہ باقاعدہ فٹنگ کر کے پہنا ہوا تھا۔ میں اس سوٹ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں واپس پلٹنے لگا تھا کہ لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر چونکی۔

"آپ..... آپ ڈاکٹر ہیں؟"

میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ "ہاں بیٹا میں آپ کو دیکھنے آیا تھا آپ سو رہی تھیں۔"

"میں اب بہتر ہوں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ڈاکٹر صاحب میں ٹھیک ہو جاؤں گی؟"

"کیوں نہیں....." میں نے تسلی دی۔ "تمہارا علاج اتنا اچھا چل رہا ہے اُمید ہے چند ہفتوں میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"سچ ڈاکٹر صاحب؟" اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

میں نے سر ہلایا اور پوچھا۔ "شمس الدین تمہارا کیا لگتا ہے؟"

"بھائی۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "میرا بہت خیال رکھتا ہے بہت اچھا ہے۔"

"ہاں وہ بہت اچھا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں نادم ہوتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ ایک تو میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا لیکن اصل ندامت مجھے شمس الدین پر شک کی ہو رہی تھی۔ میں تو قیصر کی باتوں میں آ گیا تھا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ ایسے لوگ عام طور سے دھوکے باز اور بھکاری سمجھے جاتے ہیں جو کمانے کے لیے ایسی چھوٹی موٹی چیزیں لیے بیچ رہے ہوتے ہیں ان میں سے اکثر بھکاری ہی ہوتے ہیں۔ بہت بار میں نے ایسے لوگوں سے خاص طور سے بچوں سے کچھ لیے بغیر انہیں رقم دی تھی۔ کیونکہ میں انہیں بھکاری ہی سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ شمس الدین دھوکے باز نہیں نکلا تھا ورنہ اس کو دی جانے والی زکوٰۃ بھی ضائع جاتی۔ اس سے زیادہ مجھے زرین کا خطرہ تھا۔ وہ مجھے اس حماقت پر آسانی سے معاف نہ کرتی جیسا کہ بیویوں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ سالوں تک مجھے اس کے طعنے سننا پڑتے۔ اب میں مطمئن تھا۔

اگلے اتوار کو مجھے مارکیٹ میں شمس الدین نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ آج نہیں آیا تھا۔ دوسرے ہفتے بھی نظر نہیں آیا تو وہ میرے ذہن سے نکلنے لگا تھا۔ ایک مہینے بعد میں نے اس کا نمبر بھی صاف کر دیا تھا۔ اس لیے جب چند دن بعد اس کی کال آئی تو میں نمبر سے شناخت نہیں کر سکا میں نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو....."

"نصرت بھائی۔" ایک بھنچی سی آواز آئی تو میں پہچان نہ سکا۔

"ہاں میں نصرت ہوں کون بات کر رہا ہے؟"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں..... شمس الدین ہوں۔"

میں حیران ہوا تھا۔ "تمہاری آواز بالکل نہیں پہچانی جا رہی ہے۔"

"میری تو آواز بھی نہیں نکل رہی ہے۔" اس نے رندھے لہجے میں کہا۔ مجھے کھٹکا ہوا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے..... نورالنسا کئی دن سے بہت بیمار تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔"

مجھے جھٹکا لگا تھا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "مگر کیسے اس کی حالت تو ٹھیک ہو رہی تھی۔"

"بس جی اللہ کی مرضی۔" وہ رونے لگا۔ "ہم بھی خوش تھے..... مگر ایک ہفتے پہلے اس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ آج اس نے آخری سانس لی....." وہ اب زور و شور سے رونے لگا تھا۔

"شمس الدین مت رو..... مرد بنو یار....." میں اسے تسلی دینے لگا۔ اس وقت میں گھر میں تھا بیوی بچوں کے ساتھ رات کے کھانے کے بعد ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ زرین نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اسے بتایا۔

"نورالنسا کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"اوہ۔" وہ بھی دکھی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں شمس الدین کو چپ کرا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا اور پھر بھرائی آواز میں بولا۔

"نصرت بھائی... اللہ گواہ ہے... ابھی میں اسپتال میں اس کی لاش کے ساتھ ہوں اور میری جیب میں اتنے پیسے نہیں ہیں کہ اسے ایمبولینس میں گھر لے جاؤں... ایک ہفتے سے کام پر نہیں گیا۔ صبح شام اس کے سرہانے رہا۔ آپ میری پوزیشن کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ابھی تو نورالنسا کو آخری آرام گاہ تک پہنچانا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں تو آپ کو کال کردی... اگر آپ کو برا لگا ہو...."

"نہیں یار۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم ایک منٹ رکو میں تمہیں کال کرتا ہوں۔"

میں زرین کو دوسرے کمرے میں لایا۔ بچوں کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنا مناسب نہ تھیں۔ میں نے زرین کو مختصر الفاظ میں شمس الدین کے بارے میں بتایا۔ "وہ مجھ سے توقع لگا رہا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گا اس کا کہنا ہے کہ اس کے پاس کفن دفن تو کیا لاش گھر لے جانے کے لیے ایمبولینس کا کرایہ بھی نہیں ہے۔"

زرین نے جلدی سے کہا۔ "نصرت ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

"میرے پاس دس ہزار ہیں... وہ دے آتا ہوں... آج کل کفن دفن بھی سستا نہیں ہے۔"

"ایک منٹ میرے پاس بھی کچھ رقم ہے۔" زرین نے کہا اور الماری سے رقم نکال لائی۔ یہ کھلے نوٹوں پر مشتمل تھی اس نے گنی۔ "سات ہزار دو سو روپے ہیں... سودے سے جو بچ جاتے ہیں وہ میں ایک طرف رکھ دیتی ہوں۔"

میں سترہ ہزار روپے لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں میں نے شمس الدین کو کال کردی کہ میں آرہا ہوں۔ اس نے بتایا۔ "ڈاکٹر نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ تیار کردیا ہے۔ لاش ابھی سردخانے میں ہے۔ میں بھی وہیں ہوں۔"

"بس میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

شمس الدین مجھے سردخانے کے باہر مل گیا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے میلی سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ مجھے سردخانے میں لے گیا۔ وہاں نورالنسا کی لاش پتھر کی سل پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر رو دیا تھا۔ میں اسے تسلی دیتا رہا اور صبر کی تلقین کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے رقم دی۔ "اب تم ڈیڈ باڈی ریلیز کراؤ۔"

"میں ڈاکٹر سے اجازت نامہ لے کر آتا ہوں۔" شمس الدین نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں نے اپنا کام کردیا تھا اس لیے اب میں چلتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں اس کی اور کیا مدد کرسکتا تھا۔ اس لیے میں واپس چل پڑا۔ گھر آکر زرین کو بتایا تو وہ بھی افسردہ ہوگئی تھی۔ اس رات ہم بہت بوجھل دل سے سوئے۔ رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ جب جوان لڑکی کی لاش گھر پہنچے گی تو شمس الدین کے گھر والوں پر کیا گزرے گی؟ اگلے دن بھی میں دفتر جاتے ہوئے افسردہ تھا۔ پھر دفتر کی مصروفیت میں ذہن سے نکل گیا اور میں کام کررہا تھا کہ زرین کی کال آگئی۔ وہ ہیجان میں تھی۔

"نصرت ہم بے وقوف بن گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ دھوکے باز تھا... میں نے ابھی اخبار میں خبر پڑھی ہے۔ نورالنسا نامی لڑکی کا سرکاری اسپتال میں کینسر کی وجہ سے انتقال ہوا ہے۔ وہ لاوارث تھی کیونکہ اس کے ورثا اسے داخل کرا کے غائب ہوگئے تھے اور لڑکی نے جو پتا بتایا تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پولیس تفتیش کررہی ہے اور لڑکی کی تدفین ایک خیراتی ادارے نے کی ہے۔"

میں نے سر تھام لیا تھا۔ آج کے دور میں کوئی اتنی دیدہ دلیری سے آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دفتر سے چھٹی کے بعد میں اسپتال پہنچا تو وہاں تین افراد اور بھی موجود تھے جو اسپتال انتظامیہ سے جھگڑ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شمس الدین نامی شخص اس لڑکی کا بھائی بن کر ان سے لاکھوں روپے بٹور کر لے گیا۔ انتظامیہ کا ایک آدمی ان سے کہہ رہا تھا کہ یہ ان کی غلطی ہے اس میں اسپتال انتظامیہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکی لاوارث تھی اور شدید بیمار تھی۔ وہ مہینے سے وہ اسپتال میں داخل تھی۔ جھگڑا بڑھ گیا کیونکہ شمس الدین ان لوگوں کو آزادانہ اسپتال میں لاکر لڑکی سے ملوا رہا تھا اور یہ اسپتال کے عملے کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ جھگڑا بڑھے گا یا ختم ہو جائے گا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیونکہ شمس الدین اپنا کام کرکے جاچکا تھا۔ اب وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

* * *

ڈھونگی

محترم معراج رسول!

السلام علیکم!

پرانے کاغذات سے میاں صاحب کا ایک اور واقعہ نکل آیا۔ یہ روشن واقعہ لوگوں کی اصلاح کی خاطر میں بھیج رہا ہوں۔ جو لوگ خدا کے حضور سجدہ کرنے کی بجائے شیطان کو اپنا مددگار بناتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوجائے گا۔

عنایت حسین چشتی
(حیدر آباد)

حسبِ معمول میں عصر کی نماز سے فارغ ہوکر حجرے میں داخل ہوا تو سکندر علی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میرا روزمرہ کا معمول بھی یہی تھا کہ جب میں اپنے تخت پر بیٹھ جاتا تو سکندر علی سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد ہی اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ وہ ضرورت مندوں کو ترتیب وار انداز میں بھیجنا شروع کرے۔

آنے والے حاجتمندوں میں عورتوں کے ضمن میں میری خاص ہدایت تھی کہ انہیں مغرب سے پہلے فارغ کردیا جائے۔ سکندر بھی اسی ہدایت کے پیشِ نظر عمل کرنے کا عادی تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدت مند بھی سکندر کی عزت کرنے لگے تھے اس لیے اگر کسی مرد کے نمبر پر کسی عورت کو مغرب کے پیشتر فارغ کرنے کی ہدایت کے پیشِ نظر حجرے میں بھیجا جاتا تو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا تھا۔

بہرحال، میں نے تخت پر بیٹھنے کے بعد سکندر علی سے آنے والوں کی تعداد کے بارے میں اور ایک دو ہی بات کی جس کے بعد سکندر علی نے باہر بیٹھک میں جاکر ضرورت مندوں کو اندر بھیجنا شروع کیا۔ پہلا نمبر ایک نوجوان کا تھا جس کی عمر بھی کوئی سترہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لباس اور صورت شکل کے اعتبار سے وہ بس اوسط درجے کا نظر آرہا تھا۔ حجرے میں داخل ہوکر اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا پھر فرش پر بچھی ہوئی چاندنی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے برخوردار؟" میں نے اسے بزرگانہ انداز میں مخاطب کیا۔

"خادم کو عبدالستان کہتے ہیں۔ میں حیدر آباد میں پرانے قلعے کے قریب بستی میں رہتا ہوں۔"

"میرے پاس آنے کا سبب کیا ہے؟"

"اس سال میں میٹرک کے امتحان دے رہا ہوں میاں صاحب۔" اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "ششماہی امتحان میں بس گرتے پڑتے پاس ہوا تھا اس لیے آپ دعا کردیں کہ اب سالانہ امتحان میں ناکامی نہ ہو۔" عبدالستان نے مودبانہ انداز میں درخواست کی۔ "اگر ناکام ہوگیا تو پھر تعلیم کا سلسلہ بھی جاری نہ رکھ سکوں گا۔"

"سلسلہ ختم ہوجانے کا کوئی سبب بھی ہوگا؟" میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے سر سے والد صاحب کا سایہ اٹھ گیا ہے میاں صاحب۔ ماں کے علاوہ ایک دس سال کی بہن ہی ہے۔" عبدالستان نے رک رک کر بات جاری رکھی۔ "والد صاحب کے مرنے کے بعد ان کے دفتر والوں نے جو رقم دی تھی اسی سے اونے پونے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ میں نے ایک جنرل اسٹور میں شام کے اوقات میں ملازمت کررکھی ہے۔ سالانہ امتحان میں پاس ہونے کی صورت میں والد صاحب کے دفتر والوں نے کلرکی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ناکام ہوگیا تو مجھے جنرل اسٹور پہ صبح سے رات تک ڈیوٹی دینی ہوگی..... تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکوں گا۔"

"تمہاری بہن کیا کرتی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ

بھی تعلیم حاصل کر رہی ہے؟"

"جی نہیں..... حالات کی تنگی نے گھر کی چار دیواری تک قید کر رکھا ہے۔" اس بار عبدالمنان نے تھوڑے توقف سے اپنی کیفیت بتائی۔ "ماں نے کہہ دیا ہے کہ آنے والے وقتوں کے پیش نظر آمنہ کے لیے کچھ رقم بھی جوڑنی ہوگی..... میری ناکامی کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس غریب کو بھی آس پڑوس میں گھر کے اوپری کام کرنے کی ملازمت کرنی پڑے جو میری عزت گوارا نہیں کرے گی اسی لیے کسی کے مشورے پر آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی نظر کرم ہوگی تو میرا مستقبل بھی سنور جائے گا۔"

عبدالمنان کی معصوم باتیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ سترہ سال کی عمر میں قدرت نے اس غریب کو باپ کے سایہ سے محروم کر کے جس امتحان سے دوچار کیا تھا وہ ہر اعتبار سے ایک آزمائش تھی۔ حجرے میں کچھ دیر خاموشی رہی' میں نے آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا پھر دوبارہ آنکھیں کھول کر عبدالمنان سے کہا۔

"برخوردار..... سماوی قانون اٹل ہوتے ہیں۔ لوح محفوظ پر ازل سے جو رقم کر دیا جائے اس کو تبدیل کرنا انسان کے اختیار میں نہیں..... ہوتا وہی ہے جو اسے منظور ہو لیکن صدق دل سے جو دعا مانگی جائے وہ بھی اسے قبول کرنے سے گریز نہیں کرتا۔" میں نے عبدالمنان کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ "میں تمہیں ایک وظیفہ بتا رہا ہوں، اسے کم از کم چالیس روز تک بلا ناغہ پابندی سے پڑھتے رہنا۔ میں بھی تمہارے حق میں دعا کروں گا۔ خدا نے چاہا تو تمہاری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔"

"میاں صاحب....." عبدالمنان نے پہلو بدل کر شرمندگی کا اظہار کیا۔ "میں نے قرآنی تعلیم نہیں حاصل کی اس لیے وظیفہ کیسے یاد کروں گا۔"

"یہ بھی انسان کی بدنصیبی ہے کہ وہ دنیا کے عیش و عشرت کے لیے تو سارے پاپڑ بیل لیتا ہے لیکن آخرت کے لیے اس کتاب کو سینے سے نہیں لگاتا جو قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ بہرحال وظیفہ آسان ہے جو تم یاد کر سکتے ہو..... اوّل اور آخر گیارہ گیارہ بار درود شریف اور درمیان میں گیارہ سو بار "رب زدنی علما (اے رب میرے علم کو زیادہ کر) پڑھنا ہے۔" میں نے عبدالمنان کو یاد کراتے ہوئے کہا۔ "روز رات کو سونے سے قبل اسے پابندی سے

پڑھنا..... خدا نے چاہا تو وہ تمہیں کامیابی سے ہم کنار کرے گا۔ ایک بات اور یاد رکھو..... مجھ سے برابر ملتے رہنا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں اسے پورا کرنے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔"

عبدالمنان نے مجھے تشکرانہ نظروں سے دیکھا پھر ادب سے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں یہاں قارئین کے لیے عرض کر دوں کہ مراقبے کے دوران میں مجھے محض ایک اشارہ ملا تھا کہ عبدالمنان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی ورنہ..... غیب کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتا۔ جو پیر و فقیر ہو کر بھی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ محض اپنی دکان چمکانے کی خاطر ضرورت مندوں کی جیب پر ڈاکا مارتے ہیں۔ قادرِ مطلق ایسے رنگے سیاروں کو بھی معاف نہیں کرے گا جو اس کی مخلوق کو فریب میں مبتلا کر کے اپنی روزی کماتے ہیں!

عبدالمنان کے جانے کے بعد دوسرے نمبر پر ایک برقع پوش خاتون نے حجرے میں قدم رکھا۔ مجھے سلام کرنے کے بعد اس نے از خود چہرے کا نقاب الٹ دیا! میں نے ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کی عمر کا تخمینہ تیس اور چالیس کے درمیان لگایا تھا۔

"کیسے زحمت کی بی بی؟ میں نے اس کے بیٹھنے کے بعد حسبِ معمول کاروباری انداز میں سوال کیا۔

"پہلی بات یہ عرض کر دوں میاں صاحب کہ میں حیدرآباد کی رہائشی نہیں ہوں۔" اس نے سنبھل سنبھل کر گفتگو شروع کی۔ "فیصل آباد سے آئی ہوں۔ کسی نے یہی کہا تھا کہ بس آپ تک پہنچ جاؤں تو میری ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

"ہر حاجت مند یہی کہتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہوتا وہی ہے جو مشیتِ ایزدی کو منظور ہے؟ میں بھی اسی کے دربار سے ہاتھ جوڑ کر مانگتا ہوں۔ اس کی مرضی جسے چاہے نواز دے۔"

"اب میں اتنی دور سے آپ کے در سے آس لگا کر آئی ہوں تو خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی۔ خاتون جنہوں نے میرے دریافت کرنے پر اپنا نام حسنہ بی بی بتایا تھا پہلو بدل کر اپنی امارت کا اظہار کر دیا۔ "اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ میرے حق میں دعا کرنے کی خاطر جو نذرانہ طلب کریں گے میں اس سے زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔"

"ایک بات میری بھی سن لو حسنہ بی بی۔" میں نے پہلو بدل کر بے حد صاف گوئی سے عرض کیا۔ "جس کام کی بنیاد لالچ سے وابستہ ہو وہ کبھی حسبِ توقع پورا نہیں ہوتا۔ نذرانہ کے بارے میں تم سے جس نے کہا ہے، غلط بیانی کی ہے، لین دین کا کام محض دنیا میں ہوتا ہے۔ اس کے دربار سے مانگنا ہے تو پھر دل کے سارے میل دور کرنے پڑتے ہیں۔ ریاکاری کسی کام نہیں آتی۔"

"میں معافی چاہتی ہوں میاں صاحب۔" حسنہ نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "میں نے نذرانہ کی بات اس لیے کی تھی کہ کسی کا مقصد پورا ہو جائے تو بعد میں غربا میں نذر و نیاز بھی دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی یہی دستور ہے۔"

"میرے پاس وقت کم ہے حسنہ بی بی!" میں نے اس بار قدرے بے رخی سے کہا۔ "باہر بیٹھک میں اور بھی حاجت مند اپنی باری کے منتظر ہوں گے۔ تم کھل کر اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

"مجھ سے کوئی بھول ہو گئی تو معاف کر دیں میاں صاحب۔" حسنہ ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ "میں پہلے ہی نصیبوں جلی ہوں۔ آپ نے بھی نظریں پھیر لیں تو بالکل ہی در بدر ہو جاؤں گی۔ قادرے بھی لات مار کر الگ کر دے گا۔"

"یہ قادرے کون ہے؟" حسنہ موم کی طرح نرم پڑ گئی تو میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"نام تو اس کا قدیر احمد ہے لیکن پیار سے سب اسے قادرے ہی کہتے ہیں۔" حسنہ نے کسمسا کر اپنی بپتا کا آغاز کیا۔ "چار سال پہلے میری مالا جپتا تھا لیکن اب ایسی آنکھیں دکھاتا ہے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ آپ ہی بتائیں میاں صاحب..... اگر قدرت ہی کو منظور نہ ہو تو پھر میں غریب کیا کر سکتی ہوں۔"

حسنہ روانی میں اپنا جملہ کہہ گئی جب احساس ہوا تو نظریں جھکا لیں۔ میں اس کے آنے کا مقصد سمجھ گیا۔

"قدیر احمد کرتا کیا ہے؟" میں نے دیدہ و دانستہ ایک فالتو سوال کر لیا۔

"جدی پشتی جاگیردار ہے۔" حسنہ نے کسمسا کر کہا۔ "اوپر والے نے بھی چھپر پھاڑ کر دے رکھا ہے مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے اس کے کارندے دن بھر خون پسینا ایک کرتے ہیں۔ خود وہ شام ڈھلے حویلی نما مکان کے سامنے نیم کے جھاڑ تلے تخت پر نوابوں کی طرح بیٹھ کر دن بھر کا حساب کرتا ہے۔ ایک ایک پیسے پر نظر رکھتا ہے۔ کسی کی

بھول چوک بھی معاف نہیں کرتا اور.....“

”تم بتا رہی تھیں کہ چار سال سے قدیر احمد تمہاری مالا جپتا تھا۔“ میں نے اصل مقصد کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی تو سنبھل کر بیٹھ گئی۔ نظریں جھکا کر دبی زبان میں اپنے آنے کا مدعا بھی بیان کر دیا۔

”قادرے سے میری شادی کو چار سال ہو گئے میاں صاحب لیکن ہماری کھیتی ہری نہیں ہوئی۔ اسی لیے آپ کی چوکھٹ پر بڑی آس لگا کر آئی ہوں۔“

”کسی دائی یا لیڈی ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا ہوگا؟“

”سارے جتن کر چکی ہوں لیکن شاید نیلی چھتری والے ہی کو.....“

”نہیں بی بی..... نہیں۔“ میں نے حسنہ کو ٹوکا۔ ”اس کے نظام میں کہیں کوئی بھول یا کمی نہیں ہوتی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کے حکم کے بغیر کوئی سوکھا پتا بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔“

”میں نے بھی قادرے کو یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کمبخت کے دل میں یار دوستوں نے یہ بات بٹھا دی کہ میرے اندر ہی کوئی کمی ہے۔“ حسنہ نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”دو چار گھر کی عورتیں بھی اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی خاطر قادرے پر نظریں جمائے بیٹھی ہیں۔ آج میرا کانٹا درمیان سے نکل جائے تو کل وہ قادرے کو رشتہ دینے میں دیر بھی نہیں کریں گی۔“

”میں تمہاری مجبوری سمجھ گیا ہوں بی بی۔“ میں نے حسنہ سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے تسلی دی۔ ”تم اتنی دور سے چل کر آئی ہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس بھی نہیں لوٹاؤں گا۔ آج منگل ہے اور تمہارا مطلوبہ تعویذ میں جمعرات کو تیار کر دوں گا۔ تم جمعہ یا سنیچر کو کسی وقت بھی آ کر لے جانا لیکن ایک بار پھر یہ یاد کرا دوں کہ ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہو اس لیے تم بھی اللہ سے نہایت عاجزی اور انکساری سے ہاتھ اٹھا کر برابر دعا مانگتی رہنا۔“

حسنہ چلی گئی تو میں نے سکندر علی کو بلا کر دوسرے ضرورت مندوں کو بلانے کو کہا..... یہاں ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ حسنہ کی موجودگی میں، میں نے اس کے بارے میں مراقبہ بھی کیا تھا۔ جو اشارے ملے وہ بھی یہی تھے کہ حسنہ بی بی اور اس کی اولاد کی خواہش کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ ضرور تھی جس کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد ہی اس کی اور قدیر احمد کی خواہش پوری ہو سکتی تھی..... وہ رکاوٹ کیا تھی؟ اس بارے میں مجھے کوئی واضح اشارہ نہیں ملا تھا۔

اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو سکندر علی حسب معمول میرے لیے پانی کا جگ اور گلاس رکھنے کی خاطر آیا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں موند لیں، کچھ دیر تک میں حسنہ بی بی کے بارے میں ملنے والے اشاروں پر غور کرتا رہا۔ خاص طور پر میرا ذہن اس رکاوٹ کے لیے ذہنی گھوڑے دوڑاتا رہا جس کی وجہ سے حسنہ اور اس کے شوہر کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی لیکن کوشش بسیار کے باوجود جب کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا تو میں نے بتی بجھا کر سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے خواب گاہ میں کوئی ذی نفس بھی موجود ہے۔

فوری طور پر میرے ذہن میں ارسلان نامی جن کا خیال ابھرا جو دلی والے حضرت خواجہ کے حوالے سے بھی اکثر و بیشتر میرے کام آتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ جس حصہ میں تھا اس میں بارہا آ چکا تھا اس لیے میں نے مسکرا کر حسب معمول بڑی اپنائیت سے دریافت کیا۔ ”اس وقت کیسے زحمت کی برخوردار؟“

”سب سے پیشتر اس بات کی معذرت چاہوں گا محترم کہ اس وقت مخل ہوا۔“ ارسلان نے ادب سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ محسوس کر کے آیا ہوں کہ شاید آپ کو خاکسار سے کوئی خدمت درپیش ہو؟“

”میں انکار نہیں کروں گا برخوردار۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”ایک گتھی ہے جو رہ رہ کر ذہن میں الجھ رہی ہے۔“

”سمجھ گیا۔ آپ شاید حسنہ بی بی اور قدیر احمد کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔“ ارسلان نے سنجیدگی سے کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس ضمن میں خادم صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ حسنہ کو جو مشکل درپیش ہے اس میں حسنہ بی بی سے زیادہ قدیر احمد کی ایک غلطی کو دخل ہے جو راستے کی رکاوٹ بن گئی ہے۔“

”اس غلطی کی کوئی تفصیل بھی ضرور ہوگی.....؟“

”جی ہاں لیکن آپ جانتے ہیں کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جس کے سلسلے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

”تمہارے اس جواب سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں؟“

"حضرت خواجہ کی جوتیوں کے طفیل مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کے پیش نظر فی الحال یہی عرض کروں گا کہ آپ حسنہ کو اس کی خواہش کے مطابق تعویذ لکھ دیں یہ بھی تاکید کردیں کہ قدیر احمد کو اولاد کے سلسلے میں کسی خوشخبری کے لیے چار پانچ ماہ انتظار کرنا لازم ہے اور اس عرصہ میں وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔"

"غلط قدم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے وضاحت چاہی تو ارسلان نے کچھ توقف سے دبی زبان میں پھر اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک تعویذ قدیر احمد کے سلسلے میں بھی لکھ کر حسنہ بی بی کے حوالے کردیں۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کردیں کہ وہ پانی یا شربت میں گھول کر شوہر کو اس طرح پلادے کہ اسے پتا بھی نہ چلے ورنہ سارا کھیل خراب ہوسکتا ہے۔"

"اوہ......" میں نے ارسلان کی تجویز پر ایک قہقہہ کرتے ہوئے کہا۔ "گویا جو غلطی حسنہ کے آڑے آرہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔"

"ہو بھی سکتا ہے......" ارسلان نے اس بار بھی کھل کر جواب دینے سے گریز کیا تو میں نے دوسرے رخ سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے میں تمہاری تجویز اور قدیر احمد کے لیے بھی ایک موثر تعویذ لکھ دوں گا لیکن تم حسنہ کے سلسلے میں کیا کہو گے؟"

"میں سمجھا نہیں میاں صاحب......" ارسلان چونکا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جو غلطی قدیر احمد سے سرزد ہوئی، کیا کسی نہ کسی زاویے سے حسنہ بھی اس کی ذمہ دار ٹھہرائی جاسکتی ہے؟"

"حضرت خواجہ کی خاص نظر کرم آپ پر ہے تو پھر میری کیا حقیقت؟" ارسلان نے بڑی انکساری سے مگر سنبھل کر جواب دیا۔ "ویسے یہ بات دنیا جانتی ہے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

میں ارسلان کی مجبوری کے علاوہ اس کے جوابات پر بھی بطور خاص غور کر رہا تھا چنانچہ جب اس نے ایک ہاتھ سے تالی نہ بجنے والی مثال کے ساتھ حضرت خواجہ کا حوالہ بھی دیا تو مجھے تعجب ہونا قدرتی امر تھا اس لیے کہ مراقبے کے بعد مجھے جو اشارے ملے تھے اس میں کم از کم ایسی بات واضح طور پر نظر نہیں آئی تھی جس کی بنیاد پر میں حسنہ کے کردار میں کوئی عیب محسوس کرسکتا۔ میں اسی نکتے پر غور کر رہا تھا جب ارسلان نے دبے لہجے میں کہا۔

"خاکسار کا وہ مطلب نہیں تھا میرے محترم جو آپ کے زیر غور ہے۔ مرد اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے عورت کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ جس عورت کو دل و جان سے چاہے اور اس کے حسن پر فریفتہ ہو تو درگزر سے بھی کام لیتا ہے لیکن عورت کی زبان اگر تیز سے تیز تر ہوتی جائے تو مرد کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک بھی جاتا ہے۔ حسنہ کے سلسلے میں بھی اس کی زبان اور بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے کا کچھ مسئلہ درپیش تھا جس کو قدیر احمد سال دو سال سے برداشت کرتا رہا...... پھر جو کمی درمیان میں آڑے آئی اس کی بنیاد سے فائدہ اٹھا کر کسی نے ایسی ڈگڈگی بجائی کہ سب ہی بے بس ہو کر رہ گئے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بھی یقین ہے کہ آپ نے اگر خدا کے حکم سے نظر کرم کردی تو حسنہ کی الجھی ڈور بھی سلجھ جائے گی۔"

کچھ دیر بعد ارسلان چلا گیا تو میں نے بتی بجھائی پھر کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔ یہ بھی عرض کردوں کہ ارسلان کے جانے کے بعد بھی حسنہ بی بی کا مسئلہ خاصی دیر تک میرے ذہن میں چکراتا رہا۔ خاص طور پر جو اشارے دبی زبان میں ارسلان نے دیئے تھے وہ بھی میری رہنمائی کے لیے یقیناً مفید تھے لیکن ایک اہم بات جو میرے لیے بطور خاص قابل توجہ تھی وہ اس فریق کی تھی جس نے قدیر احمد اور حسنہ بی بی کے درمیان ہونے والی رسا کشی سے فائدہ اٹھا کر ڈگڈگی بجانی شروع کردی تھی۔ ارسلان نے ڈگڈگی کا حوالہ بھی ایسے انداز میں دیا تھا جس کے کئی پہلو نکلتے تھے۔ بہرحال خاصی دیر تک ان ہی باتوں پر غور کرتے کرتے میں سو گیا۔

میں نے حسنہ بی بی کو تعویذ کے سلسلے میں جمعہ یا سنیچر کو آنے کا کہا تھا لیکن جب وہ نہیں آئی تو میرے ذہن میں یہی خیال ہوا کہ یا تو قدیر احمد آکر اسے سمجھا بجھا کر لے گیا ہے یا پھر اس نے پیر فقیر کے چکروں میں وقت خراب کرنے کی بجائے کسی اور راستے پر قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ میں نے بہرحال حسب وعدہ اس کے لیے ایک آزمودہ تعویذ جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد لکھ کر محفوظ کرلیا تھا۔

اس دن اتوار تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر حسب معمول ہوا اڈے میں آکر بیٹھا تو کچھ دیر بعد سکندر علی بھی آگیا۔ میں اخبارات کی الم غلم خبریں پڑھنے کا عادی نہیں تھا

اس لیے سکندر علی نے بطور خاص از خود اتوار کے دن مجھے پورے ہفتے کی خاص خاص خبریں سنانا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ جتنی دیر وہ خبریں سناتا رہتا میں آنگن میں ہی کیاری کے پودوں کو دیکھتا رہتا۔ وہ کیاری بھی سکندر علی نے ہی بنائی تھی۔ ان کو پانی دینا اور تراش خراش کا سارا کام بھی وہ بے حد دلچسپی سے کرتا تھا۔ ان پودوں میں خاص طور پر موتیا کا پودا تھا جس کی بیل اب منڈیر تک پہنچ گئی تھی۔ موسم کے اعتبار سے اس میں کلیاں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔ میری نظریں اس وقت بھی اسی پودے پر مرکوز تھیں جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اتوار کے دن میں کسی ضرورت مند سے نہیں ملتا تھا۔ یہ بات میرے عقیدت مندوں کو معلوم تھی۔ چنانچہ دستک کی آواز پر سکندر علی کے علاوہ میں بھی چونکا۔ ایک خیال یہ بھی گزرا کہ ممکن ہے کہ میرے پڑوسی افضال احمد جو ہفتے دو ہفتے میں ایک آدھ چکر ضرور لگاتے تھے۔ ان سے میری یاد اللہ کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے گھر پر فون موجود تھا جس سے میں بھی کبھی کبھی استفادہ کرلیا کرتا تھا۔ کبھی کوئی خاص آدمی مجھے فون کرتا تو افضال احمد کا بیٹا ابرار مجھے بلانے آجاتا۔ باپ بیٹے دونوں ہی نہ صرف نہایت مہذب اور ملنسار تھے بلکہ بیماری وغیرہ میں بھی ہر طرح سے میری دیکھ بھال کا پورا خیال رکھتے تھے۔

"اس وقت کون آگیا؟" سکندر علی نے اٹھتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ "کیا حکم ہے میاں جی کوئی ضرورت مند ہو تو اسے ٹال دوں.....؟"

"دیکھو تو کون ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر تم سمجھو کہ وہ واقعی مستحق ہے تو اسے اندر ہی بلا لینا۔"

سکندر علی چلا گیا تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دو منٹ کے بعد اس نے واپس آکر مجھے حسنہ بی بی کے آنے کی اطلاع دی تو میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ قارئین کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ میں حجرے میں بھی خواتین کو اول وقت ہی فارغ کردینے کا عادی تھا۔ پہلے بھی میں نے کسی خاتون کو گھر بلانے یا آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بہرحال حسنہ بی بی کے سلسلے میں چونکہ ارسلان بھی مجھ سے رابطہ کرچکا تھا اس لیے میں نے فوراً ہی کوئی فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا۔

"وہ تنہا آئی ہے میاں جی اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو حجرہ کھول کر ادھر ہی بٹھا دوں۔" سکندر علی نے میری خاموشی کو غالباً نیم رضامندی جان کر پوچھا تو میں نے بادل ناخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

پندرہ منٹ بعد میں نے حجرے میں قدم رکھا تو حسنہ بی بی، میری منتظر تھی۔ میں نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

"بی بی..... میں اتوار کے دن کسی سے نہیں ملتا اور..... تمہیں میں نے جمعہ یا سنیچر کو آنے کی تاکید کی تھی۔"

"میں ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتی ہوں میاں صاحب۔" حسنہ بی بی نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اتوار کے دن آنے کی وضاحت بھی کردی۔ "کچھ ضروری باتیں تھیں جو میں... آپ کو تفصیل سے بتانا چاہتی تھی اس لیے آج ہی آگئی اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو پھر کل....."

"اب آگئی ہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس بھی نہیں کروں گا۔" میں نے تیار شدہ تعویذ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو اگر ممکن ہو تو کسی ہرے بھرے تناور درخت کے نیچے اس طرح دبا دینا کہ نہ کسی کی نظر پڑے نہ ہی بے حرمتی کا کوئی اندیشہ ہو۔"

"جیسا آپ کا حکم ہے ویسا کروں گی میاں صاحب۔"

پہلا تعویذ حسنہ بی بی کے حوالے کرنے کے بعد میں نے دوسرا تعویذ نکالا جو ارسلان کے اشارے پر قدیر احمد کے لیے تیار کیا تھا "یہ ایک اور تعویذ ہے جو میں نے خاص طور پر قدیر احمد کے لیے لکھا ہے۔ میں نے ہدایت کی۔ اسے پانی یا شربت میں گھول کر اس طرح اسے پلا دینا کہ اسے کسی قسم کا پتا نہ ہو۔"

"یہ کام بھی میں آسانی سے کرلوں گی میاں صاحب لیکن..... کچھ باتیں اور ہیں جو میں آپ کو تفصیلاً بتانا چاہتی ہوں۔ اسی لیے اتوار کے دن آپ کو زحمت دینے آئی ہوں۔"

"تم شاید یہ بتانا چاہتی ہو کہ گزشتہ دو سال سے قدیر احمد اور تمہارے درمیان پیدا ہونے والے کھنچاؤ کی کیا وجہ ہے؟" میں نے ارسلان کی گول مول باتوں کی روشنی میں ایک ممکنہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے حسنہ بی بی کو متاثر کرنے کی خاطر کہا۔ "کوئی فتنہ ہے جو تم دونوں کے درمیان آڑے آگیا ہے؟"

"آپ نے اصل بات کی جڑ کو پکڑ لیا ہے میاں صاحب۔" حسنہ بی بی نے چونک کر جواب دیا پھر اپنی نفرت

کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”اس بدذات فتنے کا نام نور جمال ہے لیکن قادرے سارے بڑے لاڈ سے نور جمال کہہ کر لگاوٹ کی باتیں کرتا ہے۔“

”یہ نور جمال غالباً تمہارے قادرے کی کوئی قریبی عزیزہ ہے؟“

”نہ ہوتی تو میرے سامنے بتیسی نکال کر قادرے سے کوئی گل بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔“ اس بار حسنہ بی بی نے اپنی زبان کی تیز طراری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ”قادرے کی خالہ کی بیٹی نہ ہوتی تو میں اس حرافہ کی منڈیا اپنی جوتیوں تلے رگڑنے میں دیر بھی نہ کرتی...... ساری جوانی کا نشہ نکال کر رکھ دیتی اس کی ہتھیلی پر۔“

”بری بات ہے حسنہ بی بی۔“ میں نے اسے سرزنش کی۔ ”اپنی زبان پر قابو رکھنے کی عادت ڈالو۔ تم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کسی عورت کی زبان سے بھلے نہیں لگتے۔“

”ہم...... ہم...... میں معافی چاہتی ہوں میاں صاحب لیکن وہی بس کی گانٹھ بھی ہے۔“

”ایک بات اور معلوم کرنا چاہوں گا۔“ میں نے ارسلان کی کہی ہوئی باتوں کی روشنی میں حسنہ بی بی کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کیا تم نے قدیر احمد کو اپنے قابو میں کرنے یا نور جمال اور اس کے درمیان جدائی پیدا کرنے کی خاطر کسی تعویذ گنڈے کرنے والے سے بھی رابطہ قائم کیا تھا؟“

”میں انکار نہیں کروں گی۔“ حسنہ بی بی نے کچھ توقف سے بدستور زہر بھرے لہجے میں اقرار کیا۔ ”اپنے سہاگ کو برقرار رکھنے کی خاطر میں نے جو جتن کیے وہ نیلی چھتری والا بھی جانتا ہے...... مگر...... پہل میں نے نہیں کی تھی۔ فلیتے اور تعویذ گنڈوں کا کام بھی پہلے نور یا اس کے گھر والوں نے شروع کیا تھا...... میں خاموش بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی تو شاید وہ کم ذات لوگ کامیاب بھی ہو جاتے۔“

”قسمت میں ایک بار کاتب تقدیر کی جانب سے جو رقم کر دیا جائے وہ اٹل ہوتا ہے۔ کوئی تعویذ یا گنڈا کسی کام نہیں آتا۔“

”میاں صاحب......“ میرا جواب سن کر حسنہ بی بی نے اپنی تجربہ کاری کی بناء پر دبی زبان میں کہا۔ ”اگر اوپر والے کا لکھا اٹل ہے تو پھر آپ کے تعویذ بھی کیا کر سکیں گے؟“

”میرے تعویذ اور دعائیں نیک مقصد اور صرف اور صرف اس ذوالجلال والاکرام کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہوتے ہیں بی بی...... اس کے عوض میں کسی سائل کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتا......“ اس بار میں نے قدرے خشک لہجہ اختیار کیا۔ ”تم نے بھی پہلی ملاقات میں یہی کہا تھا کبھی کسی بزرگ یا اللہ والے کو خریدنے کی بھول نہ کرنا۔“

جواب میں حسنہ بی بی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں ایک بار پھر معافی کی درخواست کروں گی میاں صاحب۔ آپ بس کچھ ایسا کر دیں کہ میرا قادرے مجھے واپس مل جائے...... اس کے سوا مجھے کچھ اور نہیں چاہیے......“

”اس کے لیے تمہیں خدا پر توکل کرنا پڑے گا جو سزا اور جزا کا مالک ہے۔ صبر و ضبط اور برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“ میں نے حسنہ بی بی کی آنکھوں کو نمناک ہوتے دیکھ کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس مالک دو جہاں نے بندوں کی قسمت میں جو لکھ دیا وہی اٹل ہے۔ انسان زندگی میں جو عمل کرتا ہے اس کا مکمل اختیار بھی اسے محض اس لیے دیا گیا ہے کہ قدرت کو اس کی آزمائش مقصود ہے۔ نیکی اور بدی کے فرشتے شب و روز ہماری ایک ایک نقل و حرکت بلا کم و کاست رقم کرتے رہتے ہیں۔ اسی کی روشنی میں روز قیامت جنت و جہنم کا فیصلہ بھی صادر ہوگا۔ دنیا میں جو ناعاقبت اندیش پیر و فقیر اور تعویذ گنڈا کرنے والے تقدیر کے لکھے کو بدلنے کا دعویٰ کرتے ہیں روز قیامت ان کا انجام بھی قابلِ عبرت ہوگا اس لیے اب تم تعویذ گنڈوں کے لیے ان لوگوں سے دور رہو جو محض دولت سمیٹنے کے لیے اپنی طاقت کے ساتھ ساتھ بے گناہ ضرورت مندوں کو بھی فریب میں مبتلا کرتے ہیں۔ اپنی زبان پر بھی قابو رکھنے کی کوشش کرو...... خدا نے چاہا تو تمہاری مراد بھی ضرور پوری ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں ہے۔“

”آپ نے جیسا کہا ہے اب میں ویسا ہی کرنے کی کوشش کروں گی۔“ حسنہ نے مجھ سے وعدہ کیا پھر دونوں تعویذ لے کر رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے میں نے احتیاطاً حسنہ بی بی کو اپنا پتا لکھوا دیا۔ یہ تاکید بھی کرائی کہ اگر کوئی قابلِ ذکر بات ہو تو وہ مجھے فوری طور پر بذریعہ ڈاک آگاہ کر دے......!!

دوسرے روز سے میں حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے میرے حجرے میں روزانہ پندرہ بیس حاجتمند آتے جاتے ہیں اس لیے ہر

ایک کو یاد رکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے البتہ کچھ معاملات ایسی خاص نوعیت کے ہوتے ہیں جو ذہن میں کہیں نہ کہیں اپنی جگہ بھی بنا لیتے ہیں۔ میں بطور خاص قارئین کے لیے بھی عرض کردوں کہ میرے حجرے تک جو لوگ آتے ہیں ان میں ہر کوئی کھرا نہیں ہوتا۔ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ مظلوم سمجھتا ہے اور دوسرے فریق کو ظالم ظاہر کرنے کی خاطر تصویر کا ایک ہی رخ پیش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر وہ کذب بہتان کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا۔ جعلی اور دو نمبر کے عامل ایسے لوگوں کی حجامت الٹے استرے سے کرنے کے فن سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا گزارا بھی نہ ہو۔

قسمت کا حال تو خدا کے سوا اور کسی کو نہیں معلوم ہوتا لیکن خدا کا کرم ہے..... بزرگوں کی صحبت اور حضرت خواجہ کی جوتیوں کی طفیل مجھے کشف اور مراقبے کے ذریعے ہر آنے والے کے حالات کا تھوڑا بہت علم ضرور ہوجاتا ہے۔ میں اس اصلیت کا اظہار کرکے کسی سائل کو شرمندہ نہیں کرتا۔ اصل صورت حال کو ٹھونک بجا کر دیکھ لینے کے بعد ہی کوئی ایسا قدم اٹھاتا ہوں جو روز قیامت خدا کے حضور میری پکڑ کا باعث نہ بنے۔ اس ضمن میں مجھے ارسلان جن کی حمایت بھی حاصل تھی جو حضرت خواجہ کے اشارے پر اکثر و بیشتر میرے کام آتا رہتا تھا۔ اسی نے مجھے اس اہم بات سے آگاہ بھی کیا تھا کہ حسنہ بی بی اور قدیر احمد کے درمیان رسہ کشی کی ایک وجہ خود حسنہ بی بی کی زبان تھی۔

قدیر احمد کے بارے میں حسنہ بی بی نے جو تفصیل بتائی تھی اس کے مطابق وہ خاصہ دولت مند تھا چنانچہ اس کی خالہ نے حالات سے فائدہ اٹھاتے اور اپنی بیٹی نور جہاں کا مستقبل بنانے کی خاطر ایک طرف بیٹی کو قدیر احمد سے گھلنے ملنے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف اس نے کسی تعویذ گنڈا کرنے والے سے رابطہ کرکے حسنہ بی بی اور قدیر احمد کے درمیان مستقل جدائی کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کردیے جس کو بہرحال نیک قدم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ بھی اس قادر مطلق کا کرم تھا جو حسنہ بی بی اور قدیر احمد کے درمیان جدائی کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ میں نے جو تعویذ حسنہ بی بی کو دیا تھا وہ بھی میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی خلا کو پُر کرنے اور قائم و دائم رکھنے کی خاطر دیا تھا۔

حسنہ بی بی کے جانے کے تقریباً چار ماہ تک کوئی ایسی قابلِ ذکر بات میرے علم میں نہیں آئی جسے بیان کرنا ضروری ہے لیکن اس کے بعد حالات نے عجیب انداز میں جو رخ اختیار کیا اس کی تفصیل بھی ضروری ہے۔

اس روز مغرب کی نماز میں نے حسبِ معمول اپنے حجرے میں ادا کی۔ نماز کے دوران میں سکندر علی اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ میری عبادت میں کوئی خلل نہ پیدا ہو..... نماز ادا کرنے کے بعد میں اٹھا تو حجرے میں ایک بوڑھا شخص اس انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آرہا تھا۔ سکندر علی نے اس سائل کو کب اور کن حالات میں آنے کی اجازت دی مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میں نے براہ راست اس بوڑھے کو مخاطب کرنے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اس نے چہرہ اٹھا کر بڑی معصومیت سے کہا۔

"میرے محترم---- میں ادھر سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ کچھ وقت آپ کی صحبت میں بھی گزار لوں۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں۔ میں مخل ہونے کی گستاخی نہیں کروں گا۔"

"برخوردار----" میں نے ارسلان کو پہچان کر کہا۔ "تمہاری آمد بھی خالی از مصلحت نہیں ہوتی، خاص طور پر حجرے میں تم جب بھی آتے ہو اس کی پشت پر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جو میری رہنمائی بھی کرتا ہے۔"

"آپ مجھے گنہگار کررہے ہیں میرے عزیز----" ارسلان نے انکساری سے جواب دیا۔ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

ارسلان سے ایک دو بات کرنے کے بعد میں نے سکندر علی کو بلا کر حاجتمندوں کو حجرے میں بلانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس بار پہلے نمبر پر جو شخص اندر آیا وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ حجرے میں آنے کے بعد اس نے مجھے سلام کیا پھر میرے قدموں کو ہاتھ لگانے کے ارادے سے آگے بڑھا تو میں نے اسے روک کر سنجیدگی سے ہدایت کی۔

"ایسی فضول رسموں سے پرہیز کی عادت ڈالیں جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔"

آنے والا جس نے بعد میں اپنا نام نوازش علی بتایا تھا خفیف سا ہو کر میرے سامنے چاندنی پر بیٹھ گیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں بزرگو....." اس نے دوبارہ انکساری سے کہا۔ "آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

"فرمائیں..... آپ نے اس وقت میرے پاس آنے کی زحمت کیسے کی؟"

"ایک کام الجھ گیا ہے بزرگو..... ضرورتمند ہوں اس لیے راستہ تلاش کرتے ہوئے آپ کے حجرے تک بھی پہنچ گیا۔"

"مشکل پوری کرنا خداوند کریم کا اختیاری کام ہے۔۔۔ بندہ صرف دعا کر سکتا ہے۔"

میرا جواب سن کر اس نے پہلو بدلا پھر دبی آواز میں بولا۔

"میری ایک ہی بچی ہے بڑے صاحب، ہم نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اب خدا کے فضل سے اس کے ہاتھوں میں مہندی رچانے کا وقت بھی آ گیا ہے لیکن..... ایک مشکل درمیان میں آڑے آ رہی ہے۔"

"کچھ مالی پریشانی یا کوئی اور بات ہے؟"

"اللہ کا دیا سب کچھ ہے بزرگو..... اس کی ماں نے تھوڑا تھوڑا جوڑ کر سارا سامان بھی تیار کر رکھا ہے۔" نوازش علی نے رک رک کر دوبارہ بات شروع کی۔ "رشتہ بھی خاندان میں موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے تھے لیکن ایک کالی بلی راستہ کاٹ رہی ہے۔ آپ ایسا تعویذ عطا کر دیں کہ ساری رکاوٹیں درمیان سے ہٹ جائیں۔"

"کالی بلی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ہے ایک آفت کی پرکالہ جو ہماری معصوم بچی اور لڑکے کے درمیان آنے کی خاطر سارے جتن کر رہی ہے۔" نوازش علی نے بڑی عاجزی سے استدعا کی۔ "آپ کوئی تعویذ دیں یا ایسا عمل کر دیں کہ اس کا کانٹا درمیان سے نکل جائے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں نوازش علی۔" میں نے نہایت صاف گوئی سے کہا۔ "میں دونوں کے درمیان جدائی ڈالنے کا عمل نہیں کرتا۔"

"جدائی ڈالنے میں پہل تو دوسری لڑکی نے کی ہے بڑے صاحب۔ میں دو چار چوکھٹوں پر اور بھی ہاتھ پھیلا کر آ چکا ہوں۔ سب نے ایک ہی بات کہی ہے کہ دوسری لڑکی نے کوئی ایسا عمل کرایا ہے کہ لڑکے کا دل میری بچی کی طرف سے اچاٹ ہو گیا۔"

"اگر دوسروں نے ایک بات کھل کر کہی ہے تو پھر تم ان ہی سے کالے عمل کا توڑ کیوں نہیں کراتے؟"

"ان کا مطالبہ پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" نوازش علی نے اپنی تنگ دامنی کا اظہار بڑے دل گرفتہ انداز میں کیا۔ "آپ کے پاس یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ نہ صرف خدا کے نیک بندے ہیں بلکہ فی سبیل اللہ بھی ہم سب کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔"

نوازش علی کا لہجہ میرے دل پر اثر کر گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں میں نادانستگی میں ناحق کسی حقدار کو اپنے در سے خالی ہاتھ تو نہیں لوٹا رہا ہوں میں نے مراقبے میں جا کر اصلیت کی کھوج لگانی چاہی لیکن اس کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ "آپ کے مراقبے اور محنت کسی کام نہ آسکیں گے بزرگو اس لیے کہ میں نے آپ کو اپنا نام اور کام کی نوعیت بتانے میں ایک ذرے برابر بھی راست گوئی سے کام نہیں لیا۔ صرف اس ناپاک ارادے سے آیا ہوں کہ آپ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کر کے کوئی ایسا تعویذ حاصل کر لوں جو حسنہ بی بی کے بسنے والے گھر کو اجاڑ کر کھنڈر بنا دے۔ یہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ اگر آپ نے میری راہ میں ٹانگ پھنسانے کی کوشش کی تو پھر آپ کو بھی یہ سودا مہنگا پڑے گا۔"

میں نے حیرت سے نوازش علی کو آنکھیں کھول کر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ وہ بدستور کسی کی صورت بنائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اچانک کسی خیال سے میں نے نظریں گھما کر ارسلان کی سمت نظر ڈالی تو وہ اپنی جگہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"حضرت خواجہ کی دور رس نگاہوں نے آپ کا انتخاب غلط نہیں کیا تھا۔ خدا کا کرم آپ کے شامل حال ہے لیکن بے عیب ذات خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کو کامل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس عالم رنگ و بو میں سب کچھ سراب ہے۔ جو دامن بچا کر چلتے ہیں وہی کامیاب کہلاتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک ذرہ بھی دوسرے کے کام آ جاتا ہے۔ اس وقت مجھے آپ کے پاس آنے کا حکم بھی حضرت خواجہ نے دیا تھا تاکہ آپ کو بروقت یہ بتا سکوں کہ آپ کے سامنے نوازش علی جو نیکی کا فرشتہ بنا بیٹھا ہے ایک نمبر کا جھوٹا، فریبی اور دغا باز ہے جو آپ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے غلط راستے پر ڈالنے کا منصوبہ بنا کر آیا ہے۔ میں نے اس وقت اس کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کی خاطر وقتی طور پر اس کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی کی زبان سے اس کی اصلیت بھی اگلوا دی۔"

ارسلان کی بات سن کر میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔

یہاں یہ بھی قارئین کی معلومات کے لیے عرض کردوں کہ اجنہ کے گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جس نے خدا کے کسی محبوب بندے کو مقدس کتاب کی تلاوت کرتے سنا اور خدا پر ایمان لے آیا۔ اس گروہ کے جن کسی کے بدخواہ نہیں ہوتے۔ نہ ہی کسی کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے قبیلے سے تعلق رکھنے والے اکثر شیطان کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ان سے ہر قسم کی خباثت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ انتہائی خطرناک اور دغاباز ہوتے ہیں۔ اپنے کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یہ کسی بنی نو انسان کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتے۔

جنوں کے یہ دونوں اقسام اپنی صورت شکل اور وضع و قطع بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ خبیث قسم کے جن زیادہ تر سیاہ بلی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ان کو قابو کرنا اور کسی سائل کو ان خباثتوں سے بچانا بھی بڑے جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے..... خود میں نے بھی اس قسم کا عمل کرنے والے اکثر عاملوں کو دیوانگی کی کیفیت سے دوچار ہوتے دیکھا ہے۔

بہرحال..... نوازش علی کی اصلیت معلوم ہوجانے کے بعد میں نے دل ہی دل میں دوبارہ آیۃ الکرسی پڑھ کر خود اپنے اوپر دم کی۔ حجرے کو حصار میں لیا پھر نوازش علی سے مخاطب ہوا۔

"ایک بات ذہن نشین کرلو کہ جو لوگ غلط بیانی کرکے کسی کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کی حماقت کرتے ہیں ان کا انجام بھی بخیر نہیں ہوتا۔"

"میں اپنی ضرورت لے کر آپ کی چوکھٹ پر حاضر ہوا ہوں تو پھر جھوٹ کیوں بولوں گا بزرگو؟" نوازش علی نے بدستور معصومیت سے کہا۔ "اگر آپ کے اختیار میں بھی میری مشکل آسان کرنی نہیں ہے تو پھر کسی دوسرے در کی تلاش کروں گا۔"

"تم اپنی جس بچی کے راستے کی دوری ختم کرنے کے مقصد سے آئے ہو اس کا نام کیا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے بزرگو۔ کسی خاص وجہ سے میں اس کا نام درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔" نوازش علی نے پھر ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے درخواست کی۔ "معصوم بچیوں کی عزت بھی کانچ کی طرح ہوتی ہے..... ایک بار بال آجائے تو پھر وہ بھی نہیں جاتا۔"

"تم غلط بھی نہیں کہہ رہے ہو۔" میں نے اسے دوسرے طریقے سے ٹٹولا۔ "اگر لڑکی کا نام بتانا مناسب نہیں سمجھتے تو اس لڑکے کا نام بتادو جس لڑکے سے تم اسے بیاہنا چاہتے ہو..... یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر تم نے جسے کالی بلی کہا تھا اسی کا نام بتادو..... نام بتائے بغیر کوئی بھی نہ تو کوئی عمل کرسکتا ہے نہ ہی تعویذ لکھ سکتا ہے۔"

نوازش علی نے اس بار بھی فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک مایوسی کے انداز میں نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر کسمساتے ہوئے کہا۔

"بزرگو۔ اگر میں کالی بلی کے ماں باپ کا نام بتادوں تو کیا کام نہیں بن سکتا؟"

"چلو وہی بتادو۔" میں نے ارسلان کا اشارہ پاکر اپنی آمادگی کا اظہار کیا تو نوازش علی نے اس بار بھی قدرے ہچکچا کر کہا۔

"اس کے باپ کا نام کبیرو دین ہے۔ ماں کو علاقے کی ساری عورتیں صغراں بی بی کے نام سے جانتی ہیں۔"

میں نے نظر کا زاویہ بدل کر ارسلان کی طرف دیکھا تو اس نے بگڑتے ہوئے تیور سے کہا۔

"میرے محترم اگر آپ اجازت دیں تو میں اس خبیث کو گردن سے تھام کر باہر پھینک آؤں اس لیے کہ یہ نابکار جو نام بتا رہا ہے وہ حسنہ بی بی کے والدین کا ہے۔"

"گویا خود اس کا تعلق پھر نور جمال سے ہوگا؟" میں نے دل ہی دل میں ارسلان سے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔ اس بدذات کا تعلق اس کم ذات سے ہے جو کلمہ گو مسلمان ہونے کے باوجود گندگی پھیلانے کا گندا کاروبار کررہا ہے۔" ارسلان کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ "اسی نے قدیر احمد اور حسنہ بی بی کے درمیان جدائی ڈالنے کی خاطر نور جمال کے والد سے اچھی خاصی رقم اینٹھی ہے۔"

ارسلان کی زبانی مجھے تصویر کے دوسرے رخ کے بارے میں علم ہوا تو میں بھی تلملا کر رہ گیا۔ حسنہ بی بی نے بتایا تھا کہ نور جمال قدیر احمد کی خالہ کی بچی ہے۔ ایسی صورت میں محض ایک فریق اگر اپنی کسی لالچ کی غرض سے دوسرے فریق کے حق میں زہر کے بیج بوئے تو اسے خودغرض ہی کہا جاسکتا تھا۔ میرے سامنے ایسی سیکڑوں مثالیں پہلے بھی آچکی تھیں جہاں خونی رشتے بھی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن کر مرنے یا مارڈالنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے عمل کی سزا بھی خاطر خواہ ہونی ضروری ہے۔ وہ فرد بھی زیادہ سزا کا مستحق ہے جو کسی ایک فریق کو نہ صرف

ایسی شرمناک اور معیوب حرکت پر اکسائے بلکہ اس کی مدد کی خاطر خود بھی آمادہ ہو جائے۔

مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے یہی ایک امکانی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میں نے جو تعویذ حسنہ بی بی کو دیے تھے ان کے بارے میں کسی نہ کسی طور نور جمال کے والدین کو بھی علم ہو گیا اور اب شاید انہوں نے ڈگڈگی بجانے والے سے رابطہ قائم کرنے کے بعد اسی کے مشورے پر نوازش علی کی خدمات حاصل کی تھیں جو اس وقت کسی کی صورت بنائے میرے سامنے موجود تھا۔

"آپ کس سوچ میں گم ہیں بزرگو؟" نوازش علی نے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات سے کچھ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مجھے آپ کے در سے بھی خالی ہاتھ ہی جانا پڑے گا؟"

"تم نے غلط اندازہ لگایا ہے۔" میں نے اس بدبخت کو اسی کے حربے سے سزا دینے کا ارادہ کر کے بات بنائی۔ "تم نے اپنی بچی کے سلسلے میں جو دکھ بھری داستان سنائی ہے اسی کے پیش نظر میں تمہیں کوئی ایسی آزمودہ اور موثر تعویذ دینے کے بارے میں غور کر رہا ہوں جس سے سانپ بھی اپنے انجام کو پہنچے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔"

میں یہی آس لگا کر تو آپ کے قدموں میں بیٹھا ہوں۔ آپ کے طفیل میری بچی کا گھر آباد ہو جائے تو جگ جگ دعائیں دوں گا۔"

نوازش علی خاصہ چرب زبان تھا جس کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا۔ چنانچہ اس کی چاپلوسی نے حذر کرنے کی بجائے اور ہوا دی۔ میں نے یہ سوچ کر ایک تعویذ لکھنا شروع کیا سب سے پہلے اسی بدبخت کو تھوڑی بہت سزا دی جائے جو ارسلان کے بیان کے موجب بھس میں چنگاری ڈال کر تماشا دیکھنے کی خاطر درمیانی کردار ادا کر رہا تھا۔ اسی بہانے اس ڈگڈگی بجانے والے کو بھی یہ اندازہ ہو جاتا کہ میں خدمت خلق کے سلسلے میں ان عاملوں میں شمار نہیں کیا جاتا جو کسی معمولی خطرے کو ہی بھانپ کر درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔

میں تعویذ رقم کرنے میں مصروف تھا جب حجرے میں مشک و عنبر کی وہ مانوس خوشبو پھیلنے لگی جو حضرت خواجہ کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ میں نے قلم روک کر احتراماً سر جھکایا اور آنکھیں موند لیں۔ خوشبو آہستہ آہستہ پھیلتی رہی پھر حضرت خواجہ کی ترنم اور سحر کن آواز میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

"میاں ولایت حسین۔ تمہیں قدرت نے جس کام پر معمور کیا ہے اس پر قدم قدم پر تمہارا امتحان بھی مقصود ہے۔ ایک معمولی سی نیکی کا ثواب بھی دس سے سات سو درجے ہے لیکن یہ خیال بھی پیش نظر رکھنا کہ اگر کبھی کوئی لغزش ہو گئی تو پھر اس مالک کون و مکاں کی ابروئے عدالت شکن آلود بھی ہو سکتی ہے۔ جو قدم بھی اٹھانا نہایت غور و خوض کے بعد اٹھانا ورنہ نیکی برباد گناہ لازم والی صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔"

"میری آنکھیں بند تھیں لیکن سرمستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ میری خوش بختی تھی جس نے خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو مجھ پر مہربان کر دیا تھا جو پہلے بھی خاص خاص موقعوں پر میری رہنمائی کر چکے تھے۔ ان کی عنایت کردہ "متبرک سفید دانوں والی تسبیح" ابھی تک میرے پاس محفوظ تھی۔ خدا کے اس ولی صفت اور مقرب بزرگ کی اس وقت آمد میرے لیے یقیناً رہنمائی کا ایک ذریعہ تھی۔

"میں کم نصیب...... آپ کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں میرے محترم۔" میں نے حسب مراتب اور مقام ادب کا خیال ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔ "مجھے اس وقت آپ کی رہنمائی کی ضرورت بھی درپیش ہے۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟" بزرگ نے خلیق انداز میں دریافت کیا۔

"میں اس وقت جو تعویذ رقم کر رہا ہوں اس کا مقصد نوازش علی کو ایک ذرا جھٹکا دینا ہے جو معصوم لوگوں کے درمیان خباثت کے بیج بونے میں پیش پیش ہے۔"

"جو لوگ جوش میں ہوش سے بیگانہ ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔"

"پھر آپ..... آپ میری رہنمائی کر دیں میرے محترم"۔ بزرگ کے جواب نے میرے دل کی حالت غیر کر دی۔ خسارے والی بات سے یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا کہ میں نے نوازش علی کے لیے جو راستہ سوچا تھا وہ راست قدم نہیں تھا۔

"جلد بازی میں فیصلے کرنے سے گریز کی عادت ڈالو ولایت حسین..... کسی مظلوم کی مدد کرنا خداوند کریم کے نزدیک یقیناً پسندیدہ عمل ہے مگر کسی کو ایذا پہنچانا بھی اسے پسند نہیں۔" بزرگ نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ "جو ناعاقبت اندیش اپنی شیطانی قوتوں سے وہ تعویذ

مسلم دنیا میں خصوصی توجہ حاصل کرنے والے شعبۂ طب یعنی علم چشم اور امراض چشم پر لکھنے والے مصنفین میں حنین ابن اسحٰق شاید پہلا مصنف تھا جس نے علم چشم پر مکمل تصاویر و اشکال کے ساتھ ایک باقاعدہ رسالہ تصنیف کیا۔ اس کی تصنیف میں بعد کے لکھنے والوں نے اضافے کیے۔ یہ آج بھی موجود ہے۔

840ء اور 860ء کے مابین لکھے جانے والے دس رسائل ہیں جنہیں اس کے شاگرد اور بھتیجے حبش نے مکمل کیا۔ حنین نے آنکھ، دماغ اور بصری اعصاب، نیز آنکھ کی لطیفیات، امراض اور علاج پر بحث کی ہے۔ اگرچہ اس نے یونانی کتابوں سے بھی بہت کچھ نقل کیا ہے لیکن متعدد نئے ذاتی مشاہدات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ الرازی نے، جس کی تصانیف دسویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں، غالباً سب سے پہلے حدقی اضطرار کا تذکرہ و تشریح کی ہے۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

پڑھ سکتا ہے جو تم نے حسنہ بی بی کو دیا تھا۔ وہ اس تعویذ کو بھی ضرور کھنگالے گا جو تم نوازش علی کے لیے رقم کرنا چاہتے ہو جو قدم بھی اٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔" خدا کے اس برگزیدہ بندے نے کچھ توقف سے کہا۔ "کوئی ایسا راستہ اختیار کرو جو دشمن کو الجھن میں مبتلا کر دے۔ اس سے زیادہ میں تمہاری رہنمائی کا اختیار نہیں رکھتا۔"

حضرت خواجہ کا ہیولا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے نظریں کھول دیں۔ نوازش علی کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ نہ جانے وہ بدبخت میری اس خاموشی اور مدہوشی کو کیا تصور کر رہا تھا۔ میں نے ارسلان کی طرف نظر پھیری تو وہ حجرے میں موجود نہیں تھا۔ حضرت خواجہ کے آخری جملے میرے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔

"بڑے صاحب.....'' نوازش علی نے ایک بار پھر میری خاموشی کو محسوس کر کے دبی زبان میں عرض کی۔ "اگر آپ کو کوئی مشکل پیش آ رہی ہو تو پھر میں اسے اپنی قسمت سمجھ کر کسی اور....."

"تمہارا اندازہ غلط ہے نوازش علی۔" میں نے حضرت خواجہ کی آمد اور ان کی مخصوص رہنمائی کے پیش نظر نوازش علی کو پہلی بار بے حد اپنائیت سے مخاطب کیا۔ "میں بطور خاص تمہاری بچی کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا..... تم خوش نصیب ہو جو ایک انتہائی مناسب طریقہ میرے ذہن میں آ گیا..... میں نے جو تعویذ سوچا ہے وہ تمہارے اور صاحب معاملہ دونوں کے لیے حیرت انگیز طور پر سولہ آنے سود مند ثابت ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ میں جو کہوں تم اس پر عمل بھی کرو۔"

"میری کیا مجال ہے بزرگو کہ میں آپ کی مرضی اور حکم کے بغیر ایک قدم بھی اٹھاؤں۔"

نوازش علی میرا جواب سن کر اپنی کامیابی کے خواب دیکھنے لگا۔ میں نے جو تعویذ تحریر کرنا شروع کیا تو اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ دوسرا ایک کورا کاغذ اٹھا کر اس پر چاروں کونوں پر کچھ ہندسے لکھے پھر درمیان میں الٹی سیدھی لکیروں کے جال بنانے لگا۔ اس قسم کے سمجھ میں آنے والے تعویذ وہ عامل بناتے ہیں جو شیطانی عمل کا توڑ کرتے ہیں کچھ سدھ بدھ رکھتے ہیں۔ کاغذ پر لکیروں کے گول مول اور الٹے سیدھے جال بنا کر میں نے اسے بڑی احتیاط سے کئی تہہ کر کے ایک مختصر تعویذ کی شکل دی پھر اسے سیاہ رنگ کا کورا کپڑا چڑھا کر زرد دھاگے سے خوب اچھی طرح لپیٹا اور نوازش علی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اس تعویذ کو یہاں سے جانے کے دو دنوں کے اندر اندر قبرستان جا کر کسی پرانی قبر کے سرہانے سیدھے ہاتھ کی جانب اس طرح دبا دینا کہ کسی اور کی نظر نہ پڑے..... لوگوں کو دکھانے کی خاطر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ بھی پڑھ لینا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔" میں نے بے حد سنجیدگی سے گفتگو جاری رکھی۔ "یہ ایک آزمودہ تعویذ ہے جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن اس کا نتیجہ چالیس دنوں کے اندر ہی سامنے آ جاتا ہے..... اگر کچھ دیر سویر ہو تو بھی اپنے اعتقاد کو متزلزل نہ ہونے دینا۔"

"آپ نے جیسا کہا ہے میں ویسے ہی کروں گا بزرگو۔" نوازش علی نے اٹھتے ہوئے پھر انکساری سے دروغ گوئی کی۔ "آپ کے حکم سے اگر میری بچی کے نصیب جاگ گئے تو تمام زندگی آپ کو دعائیں دوں گا۔"

نوازش علی کے جانے کے بعد بھی میں اس کی خباثت، حضرت خواجہ کی بروقت آمد کے بارے میں غور کرتا

رہا پھر دوسرے ضرورت مندوں کو حجرے میں بلانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

نوازش علی کے جانے کے دس بارہ روز بعد میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ گزشتہ رات میں روزمرہ کے تمام معمولات کی ادائیگی کے بعد نہایت سکون کی نیند سویا تھا۔ صبح حسبِ معمول تہجد کے نوافل، تلاوت کلام پاک اور پھر فجر کی نماز کے بعد دوبارہ سونے لیٹ گیا تھا۔ بعدازاں تقریباً نو بجے سکندر علی نے باہر سے آواز دی تو میں جاگ گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر میں باہر آیا تو سکندر علی ناشتا لگا چکا تھا۔ ناشتے کے دوران میں ہی مجھے پہلے تو شدید چکر محسوس ہوئے پھر جی متلانے لگا تو ناشتا چھوڑ کر ورانڈے میں آ گیا۔

"خیریت تو ہے میاں جی۔" سکندر علی نے دریافت کیا۔ "آج آپ نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا۔ نصیب دشمناں آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے؟"

میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن یکلخت یوں محسوس ہوا جیسے کوئی زندہ مکھی حلق کے نیچے اتر گئی ہو۔ پھر مجھے الٹی ہوئی تو جو کچھ کھایا ہوا تھا وہ بھی نکل گیا۔ سکندر علی مجھے شانوں سے پکڑے پشت سہلاتا رہا پھر بھاگ کر پانی لے آیا۔ میں نے کلی کی۔ حلق صاف کیا تو سکندر علی نے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میاں جی۔ میرا خیال ہے کہ لپک کر پڑوس کے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کر دوں۔ وہ بھی آپ کے نام کی مالا جپتے ہیں کوئی دوا تجویز کریں گے فوری آرام آ جائے گا۔"

"بلاوجہ انہیں زحمت نہ دو سکندر علی۔" میں نے سکندر کو ٹالنے کی خاطر کہا۔ "قے ہونا معمول کی بات ہے۔ اچھا ہے پیٹ صاف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آرام بھی آ جائے گا۔"

سکندر خاموش ہو گیا۔ "لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ میری طبیعت پر اضمحلالی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ نقاہت بڑھنے لگی تو ورانڈے میں پڑے تخت پر لیٹ گیا۔ سکندر علی کے چہرے پر اضطرابی کیفیت بھی بڑھنے لگی۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر کو اطلاع کرنے کی تجویز پیش کی جسے میں نے ٹال دیا پھر دروازے پر دستک ہوئی تو وہ لپک کر چلا گیا۔ واپس آیا تو میرے پڑوسی افضال احمد کا بیٹا ابرار احمد بھی ساتھ تھا۔

"کیسے ہو برخوردار۔" میں نے پوچھا۔ "تمہارے والد صاحب تو خیریت سے ہیں۔"

"اوپر والے کے کرم اور آپ کی دعا سے اب ٹھیک ہیں۔" ابرار احمد نے کہا۔ "اس وقت آپ کو بلانے آیا تھا۔ فیصل آباد سے کسی حسنہ بی بی کا فون دوبارہ آ چکا ہے۔ پندرہ منٹ بعد انہوں نے پھر کال کرنے کو کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔" میں نے کہا۔ "تم چلو، میں سکندر علی کے ساتھ آتا ہوں۔"

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے حسنہ بی بی کو صرف اپنا ڈاک کا پتا لکھوایا تھا پھر اسے فون کا نمبر کہاں سے مل گیا؟ قبل اس کے کہ میں اس ضمن میں مزید ذہن پر زور دیتا سکندر علی نے نظریں جھکا کر اعتراف کیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں میاں جی۔۔۔۔ دراصل حسنہ بی بی نے جاتے وقت بڑی ہوشیاری سے دریافت کیا تھا کہ اگر اسے کوئی فوری ضرورت پیش آ جائے تو رابطہ کی کیا صورت ... ہو سکتی ہے۔ میں نے ترس کھا کر اسے افضال احمد صاحب کا فون نمبر لکھوا دیا تھا۔"

"تم نے برا کیا سکندر علی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے تاکید کی۔ "آئندہ مجھ سے اجازت لیے بغیر ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو کہ صبح کے وقت ہر گھر میں روزمرہ کی ضروری مصروفیات ہوتی ہیں۔ افضال صاحب بھلے آدمی ہیں جو انہوں نے اس وقت مجھے خبر کرا دی ورنہ دوبارہ وہ بھی حسنہ بی بی کو ٹال چکے ہیں۔"

سکندر علی نے دوبارہ ندامت کا اظہار کیا پھر مجھے سہارا دے کر افضال احمد کے گھر لے گیا۔ وہ بہ نفس نفیس بیٹھک میں موجود تھے۔ میں نے ناوقت تکلیف کے لیے معذرت کی تو انہوں نے انکساری سے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ "پڑوسیوں کا تو ویسے بھی ایک دوسرے پر بڑا حق ہوتا ہے محترم ..... آپ تو اچھے بھی ہیں اور مہربان بھی ہیں۔"

ہمارے درمیان رسمی گفتگو ہو رہی تھی کہ حسنہ بی بی کا فون آ گیا۔ افضال احمد نے کال ریسیو کی پھر ریسیور مجھے دے کر اندر چلے گئے۔ میں نے کال سنی تو حسنہ بی بی نے بغیر کسی تمہید کے بڑی عجلت میں کہا۔

"میں نے اس وقت آپ کو تکلیف دی تو اس کا سبب بھی تھا میاں صاحب۔ کچھ ضروری باتوں سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں سن رہا ہوں بی بی۔۔۔۔" میں نے کہا۔ "کیا کوئی اہم بات تھی جس کا فوری بتانا ضروری تھا؟"

"ایسا نہ ہوتا تو آپ کو کبھی پریشان نہ کرتی ..... سکندر

علی بھائی نے بھی تاکید کی تھی کہ کسی خاص سبب کے بغیر یہ نمبر استعمال نہ کرنا۔"

"اب کیا خاص بات ہوگئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ کا دیا ہوا تعویذ میرے حق میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔ قادرے اب میرے حق میں بہت نرم پڑ گیا ہے..... خوشی کی اُمید کی ایک ٹمٹماتی کرن بھی نظر آ رہی ہے لیکن اس صورت حال کو دیکھ کر دشمنوں کی چھاتی پر پھر سانپ لوٹنے لگے ہیں۔ خاص طور پر نور جمال کو جیسے پتنگے لگ گئے ہیں۔ اس کی ماں بھی الٹے توے کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔"

"تمہیں جو اُمید کی کرن نظر آ رہی ہے بی بی وہ میرے تعویذ کا نہیں بلکہ خداوند کریم کی نظر کرم کا ثمر ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "جو لوگ دوسروں کی خوشی پر نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ کبھی سکون سے نہیں رہتے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔"

"میاں صاحب۔ میں جلنے والوں کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔" حسنہ بی بی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس وقت آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ان جل ککڑی ماں بیٹیوں نے دل کے پھپوڑنے کی خاطر مجھے بھی بات بات پر لعن طعن کرنی شروع کر دی ہے اور خاص طور پر کل نور جمال کی ماں نے مجھ سے کھل کر ایک بات براہ راست بڑے غصے میں کہی تھی کہ بی بی..... تم جس کھونٹے پر اچھل رہی ہو..... ہمیں اس کا پتا بھی چل گیا ہے..... ہم تم کو اور تمہارے ہوتوں سوتوں کو بھی دیکھ لیں گے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔"

"ایک خاموشی سو بلا کو ٹالتی ہے بی بی۔" میں نے اکتا کر پوچھا۔ "اس وقت تمہارے فون کرنے کا مقصد کیا تھا؟"

"میں آپ کو رب نواز کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔" حسنہ بی بی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ "وہی بدذات ہے جو جونک کی طرح میری خوشیوں سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔ سارے فساد کی جڑ بھی وہی ہے۔"

"تم سے اسے کیا پرخاش ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے محلے میں رہا کرتا تھا حرام کا بیج۔" حسنہ بی بی نے حسب عادت غلط زبان استعمال کی۔ "مجھ سے شادی کرنے کے خواب دیکھتا تھا اور مجھے شروع سے اس سے نفرت تھی۔ قادرے سے شادی کے بعد میرا خیال تھا کہ وہ کہیں اور منہ کالا کرے گا لیکن وہ سائے کی طرح میرے پیچھے لگا رہا۔ صرف یہی نہیں میاں صاحب۔ ادھر ایک ڈیڑھ سال سے اس نے نہ جانے کیسے نور جمال کے باپ سے کہیں دور کا رشتہ جوڑ کر آنا جانا بھی شروع کر دیا ہے۔ قادرے بھی اسے پسند نہیں کرتا لیکن خالہ کی وجہ سے چپ ہو گیا۔"

"کیا قادرے کو علم ہے کہ رب نواز تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟"

"نہیں....." حسنہ بی بی نے بڑے یقین سے کہا۔ "میں بھی چپ رہی اس لیے کہ قادرے غصے کا بڑا زہریلا ہے۔ اگر میں اسے بتا دوں کہ اس نے خالہ سے کیوں رشتہ جوڑا ہے تو قادرے گنڈاسے سے اس کا قیمہ بنا کر چیل کووں کو کھلا دے گا۔"

"میں سمجھا نہیں کہ رب نواز اب تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"وہ اب بھی مجھے اپنانے کے خواب دیکھ رہا ہے اسی لیے اس نے نور جمال کی ماں سے رشتے داری نکال لی ہے۔" حسنہ بی بی نے اس بار ذرا تفصیل سے بتایا۔ "مجھے پہلے بھی شبہ تھا کہ نور جمال اور قادرے کا چکر چلوانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے لیکن دو روز پہلے میں نے چھپ کر ان دونوں کی بات سنی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی نے نور جمال اور قادرے کی شادی کے سلسلے میں کسی گندا علم کرنے والے سے فلیتے لا کر دیے ہیں جسے ایک ایک کر کے سات دن جلانا ہے۔ خدا غارت کرے کم ذات کو..... یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میری خوشیاں پوری نہیں ہوں گی..... جس نے فلیتے دیے ہیں اس نے یہ یقین بھی دلایا ہے کہ میری خوشیاں تین ماہ بعد غارت ہو جائیں گی جس کے بعد قادرے..... خدا نہ کرے..... مجھے چھوڑ دے گا لیکن..... اگر ایسا ہوا تو میں اپنے ہاتھوں سے قادرے کو جہنم رسید کر کے خود بھی نیلا تھوتھا کھا کر جان پر کھیل جاؤں گی۔"

"خدا کی ذات سے نااُمید نہ ہو بی بی..... مجھے یقین ہے کہ وہ قادر مطلق رب نواز کو اس کی گندی چال میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے میاں صاحب لیکن رب نواز کا باپ بھی بڑا لگر کا بیج تھا۔ اس جہنم رسید نے بھی ایک عورت کو شادی کا جھانسا دے کر اس کی عزت لوٹ

لی تھی۔ عورت نے بدنامی سے بچنے کی خاطر کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ بعد میں جب یہ راز کھلا کہ اس غریب کو بے آبرو کرنے والا نوازش علی تھا تو اسے بھی مدتیں ہو گئی تھی جہاں وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جہنم رسید بھی ہو گیا تھا۔"

میں نوازش علی کے حوالے پر چونکا۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ رب نواز نے اپنا نام بتانے کی بجائے مجھے اپنے مرحوم باپ کا نام بتایا تھا۔ ارسلان نے دو نمبر کے نوازش علی کی حقیقت ضرور بے نقاب کر دی تھی کہ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اصل نوازش کس قماش کا آدمی تھا۔ حضرت خواجہ کے بروقت آجانے کے بعد میں نے ان ہی کے کہنے کے مطابق ڈگڈگی بجانے (گندا عمل کرنے) والے کو اندھیرے میں رکھنے کی خاطر ایسا قدم اٹھایا تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔

"میاں صاحب....." حسنہ بی بی نے اس بار رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ کی دعاؤں سے مجھے جو روشنی کی کرن نظر آئی ہے اس کو ہمیشہ قائم رکھنے کی خاطر میرے حق میں برابر دعا کرتے رہیے گا اور..... کچھ ایسا کر دیں کہ کسی طرح رب نواز کا میرے گھر آنا جانا بھی ختم ہو جائے۔"

"نیلی چھتری والے کی ذات پر بھروسا رکھو حسنہ بی بی۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "میں اسی کے بھروسے پر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ رب نواز کا انجام بھی اس کے باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔ جو لوگ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں وہ خود اس میں منہ کے بل گرتے ہیں۔"

میں حسنہ بی بی کو تسلی دے کر گھر آیا تو ارسلان وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اپنی طبیعت کے پیش نظر سکندر علی کو کھچڑی اور ساگودانہ تیار کرنے کی ہدایت دی تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ارسلان سے دریافت کیا۔

"اس وقت کیسے زحمت کی؟"

"میں معذرت خواہ ہوں میرے محترم کہ میں نے آپ کو رب نواز کے سلسلے میں صرف اس کی ذاتی حیثیت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا تھا ورنہ حسنہ بی بی نے آپ کو اس کے باپ کے بارے میں جو بتایا ہے..... میں اس سے زیادہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں مگر آپ کا بھی یہی کہنا ہے کہ خداوند کریم عیب جوئی کو پسند نہیں کرتا۔"

"اگر تمہیں میری اور حسنہ بی بی کی باتوں کا علم ہو گیا ہے تو اب تم رب نواز کے سلسلے میں کیا کہو گے؟"

"کل کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں خدا کے سوا اور کوئی کچھ نہیں جانتا۔" ارسلان نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "جو لوگ مستقبل کا حال بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے..... رب نواز جس گندا عمل کرنے والے کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے وہ بھی اس بات سے ناواقف ہوگا کہ آج اگر وہ دوسروں کو ڈگڈگی پر نچانے کی لمبی چوڑی باتیں کر رہا ہے تو ایک روز وہ خود بھی اوپر والے کی ڈگڈگی پر دیوانوں کی طرح ناچتا نظر آئے گا۔"

"یہی ایک سمجھنے کی بات اگر بنی نوع انسان سمجھ لے تو اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔" میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا پھر ارسلان سے دریافت کیا۔ "حسنہ بی بی کے سلسلے میں گندے عمل کرنے والا خباثتیں کر رہا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

"پہلے کی بات اور تھی میرے عزیز۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو اس بدکردار کے جسم میں حلول ہو کر اسے دہکتے تنور میں بھی چھلانگ لگانے پر مجبور کر سکتا تھا مگر جب سے حضرت خواجہ کا دامن تھاما ہے میں نے تمام شیطانی عمل سے توبہ کر لی ہے۔" ارسلان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "حسنہ بی بی ضرور بے قصور ہے لیکن قدیر احمد بھی اگر نور جمال کو قریب آنے کا موقع نہ دیتا تو اس رسا کشی کی نوبت ہی نہ آتی جو اب درپیش ہے۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں برخوردار مگر فی الوقت جو کردار رب نواز ادا کر رہا ہے اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"آپ حکم دیں تو میں اسے تھوڑی بہت سزا دے سکتا ہوں جس سے وہ وقتی طور پر خوفزدہ ہو جائے لیکن سارے فساد کی جڑ وہ ہے جس نے اب آپ کے لیے بھی پلیتے جلانے شروع کر دیے ہیں۔"

"حضرت خواجہ کی دعاؤں سے وہ پلیتے بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکیں گے..... ہاں، اگر قدرت کو کچھ اور منظور ہے تو اسے بھی میں اپنے حق میں بہتری ہی سمجھوں گا اس لیے کہ وہ جو بھی کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور مقصود ہوتی ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"کوشش کرو کہ کسی طرح رب نواز کا نور جمال کی ماں سے ملنا جلنا ترک ہو جائے۔" میں نے پہلو بدل کر

سنجیدگی سے کہا۔ "رہا حسنہ بی بی کے لیے خوشیوں کے بیج بونے کا سوال تو اس کے لیے میں آج ہی سے ایک وظیفہ شروع کردوں گا۔ اوپر والے کی ذات بابرکات ہے۔ اُمید ہے وہ اس نیک کام میں بھی میری مدد ضرور کرے گا۔"

سکندر علی کے واپس آنے سے ارسلان اور میرے درمیان گفتگو کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ جاتے جاتے ارسلان نے دبی زبان میں صرف اتنا کہا تھا کہ وہ رب نواز کو راہ راست پر لانے کی خاطر کوئی ایسا ہی سبق دے گا جو اسے ہمیشہ یاد رہے۔"

اس رات سونے سے پیشتر میں نے بطور خاص حسنہ بی بی کے لیے ایک آزمودہ تعویذ رقم کرکے محفوظ کرلیا۔ یہ تعویذ اس مقصد کے لیے تھا کہ حسنہ بی بی کی خوشیاں ضائع نہ ہونے پائیں جب کہ رب نواز اور بقول ارسلان کے کوئی ڈگڈگی بجانے والا اسی بات کے درپے تھا کہ حسنہ بی بی کا کانٹا کسی طرح درمیان سے نکال کر قدیر احمد اور نور جمال کی شادی کرادے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کی خاطر دوسرے کے لیے برا کرنے میں ذرا نہیں ہچکچاتا۔ ہر ممکن طرح سے حریف کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتا ہے کہ ایسا عمل خداوند کریم کے نزدیک ناقابل معافی ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کا کوئی ذاتی کام بگڑ جائے تو نہ صرف وہ دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتا ہے بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ..... "میں نے برا کرنے والے کو خدا کے حوالے کیا۔ اس نے چاہا تو جس نے میرے ساتھ برا کیا ہے روزِ قیامت اس کا حشر کالا ہوگا اور وہ دوزخ کا کندہ بنے گا۔"

جو لوگ سفلی کا ناپاک اور جان لیوا عمل کرتے ہیں ان کا کوئی دھرم ایمان نہیں ہوتا۔ کسی کو اپنے گندے عمل سے موت سے ہمکنار کرنے کے بعد وہ اس طرح خوشیاں مناتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو دوسرا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بھٹکے ہوئے عاقبت نااندیش لوگ سیاہ قلب ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سزا اور جزا کا حساب بھی اس لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ یہ خود اپنے آپ کو نعوذ باللہ بھگوان اور اس کا اوتار ہی سمجھتے ہیں۔

یہاں میں قارئین کی معلومات کے لیے یہ بھی عرض کردوں کہ ایک دو بار میں بھی خدا کے حکم سے ایسے شیطان صفت لوگوں سے دو دو ہاتھ کرچکا ہوں لیکن میرے بزرگوں نے جن کی جوتیوں کے طفیل آج میں دامے، درمے، سخنے ضرورت مندوں کی خدمت کررہا ہوں انہوں نے مجھے ہمیشہ یہی تاکید کی تھی کہ حتی الامکان سفلی کا عمل کرنے والوں سے پنجہ لڑانے کی غلطی نہ کروں۔

بہر حال رات میں نے حسنہ بی بی کی خاطر جو تعویذ رقم کیا تھا اسے فجر کی نماز کے فوراً بعد ایک پرانے قبرستان کی قدیم قبر کے پاس دفن کرادیا۔ یہ ایک آزمودہ تعویذ تھا اور مجھے اس قادر مطلق کی ذات سے اُمید تھی کہ وہ کم از کم حسنہ بی بی کی خوشیوں کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔

تعویذ دفن کرانے کے تقریباً دو ہفتہ بعد تک مجھے حسنہ بی بی کا نہ تو کوئی فون آیا۔ نہ خط کے ذریعے کسی صورت حال سے آگاہ کیا گیا بہر حال اس روز جمعرات کو عصر کی نماز کے بعد جب میں حجرے میں آیا تو سکندر علی نے میری اجازت حاصل کرنے کے بعد ضرورت مندوں کو حجرے میں بھیجنا شروع کردیا۔ غالباً تیسرے یا چوتھے نمبر پر ایک پستہ قد اور دوہرے بدن کی عورت حجرے میں داخل ہوئی۔ مجھے اشارے سے سلام کرکے وہ چاندنی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے چہرے کو پوری طرح نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ کوئی قابل توجہ بات نہیں تھی اس لیے کہ میرے پاس اپنی کسی ضرورت کی خاطر بیشتر خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اپنے گھر والوں، خصوصاً شوہروں سے چھپ چھپ کر کسی مقصد کے لیے آتی ہیں لیکن، وہ عورت بیٹھنے کے بعد بھی جس انداز میں رو رو کر کسمسا رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی نہ کسی بات سے خوفزدہ ضرور ہے۔

"خیریت تو ہے بی بی؟" میں نے کچھ دیر خاموشی کے بعد اسے از خود مخاطب کیا۔ "یہاں تک آئی ہو تو اس کا کوئی مقصد بھی ضرور ہوگا۔"

"م..... میں آپ سے تخلیے میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"پریشان مت ہو..... جب تم یہاں موجود ہو تو کوئی دوسرا میری اجازت کے بغیر مخل نہیں ہوگا۔"

میرا جواب سن کر عورت سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چہرے سے نقاب بھی ہٹادی۔ میں نے پہلی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ لگایا جو پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ اس نے جو ہار سنگھار کر رکھا تھا اس سے غالباً اس کا مقصد دوسروں کو متاثر کرنا ہوگا۔ مجھے ان فضولیات سے کوئی غرض نہیں تھی البتہ اس کی آنکھوں میں جو چمک مجھے نظر آئی وہ کسی ناگن سے مشابہت رکھتی تھی۔ میرے دل نے بھی یہی گواہی دی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کہ وہ میرے حجرے تک اپنی کسی داد فریاد سنانے کی بجائے اپنی چکنی چپڑی باتوں کے سحر میں مبتلا کرکے میرے ہاتھوں کسی بے گناہ کو برباد کرانے کے ارادے سے آئی ہے۔ لہٰذا میں محتاط ہو گیا۔

میں نے خاتون کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ کچھ غلط بھی ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک وہ مجھے اپنا ذاتی دکھڑا سناتی رہی تو میں نے قدرے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بی بی..... میرے پاس وقت کم ہے..... اگر تم براہ راست اپنے آنے کا مقصد کھل کر بتاؤ تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

”میاں صاحب..... میں نے ایک دو نہیں بلکہ اکثر ملنے جلنے والوں سے بھی سنا ہے کہ کوئی سائل آپ کے در سے خالی ہاتھ نہیں جاتا چنانچہ میں بھی بہت آس لگا کر آئی ہوں۔“

خاتون نے جس انداز میں مجھے رام کرنے کی خاطر تمہید باندھی وہ بھی اس کی عیاری کی دلیل تھی۔ میں نے پھر درگزر سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”حاجت روائی کرنا اس مالک دو جہاں کے اختیار میں ہے۔ جس کے حکم کے بغیر ایک سوکھا پتا بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔“

”جانتی ہوں میاں صاحب اور اسی مالک دو جہاں نے آپ کی دعاؤں کو تاثیر بھی عطا کی ہے ورنہ حاجت مند دور دور سے چل کر آپ کے پاس نہ آتے۔“

”تم کس مقصد سے آئی ہو بی بی؟“ میں نے اسے گزرتے وقت کا احساس دلایا تو وہ ایک لمحہ خاموش رہی پھر دبی زبان میں بولی۔

”میاں صاحب..... ایک لڑکی ہے جس نے ہم ماں بیٹیوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں اس کے بارے میں اگر زبان کھول دوں تو وہ منٹوں میں دربدر ہو سکتی ہے۔ میرا بھانجا جو کل تک ہمیں پلکوں پر بیٹھاتا تھا وہ بھی اب ہم سے کترانے لگا ہے۔ ہم پر جو مصیبت ٹوٹی ہے وہ اسی دو کوڑی کی لڑکی کے سبب ٹوٹی ہے۔“

میں نے اس عورت کے بارے میں جو سوچا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ جس انداز میں وہ کسی لڑکی کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی اس پر مجھے شبہ تھا۔ میں نے اس کے انداز گفتگو کو وقتی طور پر درگزر کرتے ہوئے سوال کیا۔

”میں تمہاری کس طور مدد کر سکتا ہوں؟“

”آپ کچھ ایسا کر دیں میاں صاحب کہ اس منحوس کا کانٹا ہماری زندگی سے نکل جائے۔ میں آپ کو منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں۔“

”تم غلط جگہ آئی ہو بی بی۔“ میں نے تیور بدل کر کہا۔ ”یہاں ضرورت مندوں کو رقم کے ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ سب کچھ فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔“

”اوہ.....“ عورت کسمسا کر بولی۔ ”میں معافی چاہتی ہوں میاں صاحب۔“

”تم جو کانٹا درمیان سے نکلوانے آئی ہو۔ اس کا اور تمہارے بھانجے کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“

”میں اس معاملے میں اپنی زبان کھول کر گنہگار نہیں بننا چاہتی لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان کے درمیان کچھ آنکھ مٹکا بھی ضرور ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک دونوں میں کچھ ان بن بھی تھی لیکن اب وہ ایک ہی کمرے میں گھنٹوں بیٹھے نہ جانے کیا کانا پھوسی کرتے رہتے ہیں۔ کل کلاں کو اگر بات ہی ہوئی تو دنیا ہم پر بھی تھو تھو کرے گی۔“ عورت نے گڑگڑا کر کہا۔ ”آپ کے پاس یہی درخواست لے کر آئی ہوں کہ اس سے پہلے کہ ہمارے منہ پر لوگ کالک تھوپیں آپ اس بدقماش کے لیے کوئی ایسا عمل کر دیں کہ وہ کہیں اور چلی جائے۔ میں تمام زندگی آپ کا احسان فراموش نہیں کروں گی۔“

میرے دل میں اس عورت کی جانب سے شدید نفرت کا جذبہ ابھرا۔ جس انداز میں وہ کسی لڑکی کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی اس سے بھی میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ انتہائی مکار، جھوٹی اور دغاباز ہے۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ اسے ٹکا سا جواب دے کر چلتا کر دوں لیکن اسی وقت مشک و عنبر کی تیز خوشبو کا جھونکا میرے وجود کے گرد پھیلنے لگا پھر میری قوت سماعت میں حضرت خواجہ کی مانوس آواز سرسراتی ہوئی گونجی۔

”خداوند کریم جو کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور مضمر ہوتی ہے۔ اچھا ہوا جو یہ عورت خود چل کر تمہارے حجرے تک آگئی۔ میں تمہیں مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ یہی بدبخت نور جمال کی ماں ہے جو حسنہ بی بی کو اس کے شوہر قدیر احمد سے طلاق دلا کر اپنی بیٹی کا گھر آباد کرنے کے درپے ہے۔ ایسے بدکردار کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے جو اپنی خوشی کی خاطر کسی کے آباد آشیانے پر بجلی گرانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ انہیں جتنی بھی سزا دی جائے

کم ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے.... میرے محترم؟" میں نے سرشاری کے عالم میں دریافت کیا۔

"ایک بات اور ذہن نشین کرلو..... اس عورت کا تعلق اس عاقبت نااندیش بدکردار سے بھی ہے جو گندے عمل کرکے دوسروں کا گھر اجاڑتے ہیں.... میرا اشارہ اس مردود کی جانب ہے جس کے بارے میں ارسلان نے بھی تم کو بھی بتایا تھا کہ وہ اپنی ڈگڈگی بجا کر سادہ لوح لوگوں کو گناہ گار کررہا ہے۔ اس کی سرزنش بھی پیش نظر رکھنا۔ یہ عورت بھی اسی کے اشارے پر آئی ہے۔"

"آپ نے مجھے نوازا ہے تو میری مناسب رہبری بھی فرمادیں۔" میری نگاہیں عورت پر مرکوز تھیں لیکن دل و دماغ پر کچھ اور ہی کیفیت طاری تھی۔

"کوئی ایسا تعویذ رقم کرو جو اس عورت ہی کے ہاتھوں سفلی کا عمل کرنے والے کو پلا دیا جائے۔ اس کا ذہن پلٹ جانے کے بعد یہ عورت بھی خدا کے حکم سے حسنہ بی بی کے گھر سے دفع ہوجائے گی۔"

خوشبو کا وہ جھونکا جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے دور ہوگیا۔ میرے اوپر طاری ہوئی کیفیت دور ہوئی تو میں نے عورت کو دوبارہ خشک لہجے میں مخاطب کیا۔

"تم جس کانٹے کو درمیان سے نکالنا چاہتی ہو وہ نکل جائے گا..... میں نے اس کے راز کو پالیا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں رازداری سے میری ہدایتوں پر عمل کرنا ہوگا۔"

"میں [illegible] تیار ہوں میاں صاحب۔" عورت کی باچھیں کھل گئیں۔ "آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔"

میں نے عورت کو متاثر کرنے کی خاطر دو منٹ کے لیے آنکھیں بند کرکے اپنی ٹھوڑی سینے سے لگالی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے خدانخواستہ غیب کی باتیں معلوم کررہا ہوں۔ دوبارہ آنکھ کھول کر میں نے عورت کو قدرے تیز نظروں سے گھور کر کہا۔

"تمہاری اور تمہاری بیٹی کی خوشیوں کے درمیان کوئی ایسا مردود ہے جو دغا بازی سے اپنا اُلو سیدھا کررہا ہے۔ تمہیں اس کا علاج بھی کرانا ہوگا۔"

"میں سمجھی نہیں میاں صاحب کہ آپ کا اشارہ کس کی جانب ہے؟" اس عورت نے پھر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بننے کی اداکاری کی تو میں نے جھنجلا کر کہا۔

"کن فیکون صرف اور صرف اس خداوند قدوس کے اختیار کی بات ہے جو دونوں جہانوں کا مالک ہے۔ ہم صرف کشف اور مراقبے کے ذریعے اس کے اشاروں کو سمجھنے کے محتاج ہیں۔" میں نے پہلو بدل کر عورت کو سرزنش کی۔ "تم میرے حجرے تک آگئی ہو تو پھر کھل کر بات کرو بی بی..... غلط بیانی کروگی تو اس کا نقصان تمہاری بیٹیوں کو ہی ہوگا۔"

"ہم..... میں سمجھی نہیں میاں صاحب کہ وہ کون دشمن ہے جو ہمارے ساتھ دغا بازی کررہا ہے۔" عورت نے قدرے سہم کر جواب دیا۔

"میں اس مردود کی بات کررہا ہوں بی بی جو گندے عمل کرتا ہے۔" میں نے عورت کو جلالی نظروں سے گھورا۔ "کیا اس نے تمہیں میرے پاس آنے کا مشورہ نہیں دیا ہے۔"

"ہم..... ہم..... میں سمجھ گئی میاں صاحب کہ آپ کس کی بات کررہے ہیں۔" عورت نے میری نظروں سے مرعوب ہو کر سچ اگل دیا۔

"ایک بات اور ذہن نشین کرلو..... تم اس وقت میرے حجرے کے حصار میں ہو اس لیے اس بدبخت کی نظریں اور کان بھی یہاں کی سن گن نہیں لے سکتے مگر..... یہاں سے جانے کے بعد تمہیں محتاط رہنا ہوگا..... اگر اس نابکار کو تمہارے دل کا بھید معلوم ہوگیا تو پھر وہ تم کو اور تمہاری بیٹی کو بھی غارت کرنے سے باز نہیں آئے گا۔"

عورت کے چہرے کا رنگ یکلخت خوف سے زرد پڑ گیا۔ بڑی دقت سے گڑگڑا کر بولی۔ "آپ نے اگر فساد کی جڑ پکڑلی ہے تو میری مشکل بھی آسان کردیں۔ میں آپ کے ہر حکم پر عمل کرنے کا وعدہ کرتی ہوں۔"

میں اسے مزید مرعوب کرنے کی خاطر خلاء میں الجھا رہا پھر اسے مخاطب کیا۔ "ایک درمیانی آدمی اور بھی ہے..... رب نواز..... مجھ سے نوازش علی کے نام سے ملا تھا لیکن میں نے اس کی اصلیت بھی جان لی تھی..... وہ بھی بھلا آدمی نہیں ہے۔"

عورت ہونٹ چبا کر چپ رہی تو میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"میں جس بدبخت کی بات کررہا ہوں۔ رب نواز اس کے کہنے سے فلیتے بھی میری بربادی کے لیے جلاتا رہا ہے لیکن خدا کا کرم ہے کہ میں تمہارے سامنے زندہ سلامت بیٹھا ہوں اور وہ..... وہ بھی....." میں نے دیدہ و دانستہ خاموشی اختیار کی تو عورت نے کسمسا کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

"اس بدکردار کو بھی شاید آپ کی بددعا لگ گئی ہے...... کھٹیا پر پڑا موت کا انتظار کر رہا ہے۔"

"ایسا مت کہو بی بی...... کسی کی موت کی دعا کرنا خداوند کریم کو پسند نہیں۔ زندگی اور موت اسی کے اختیار میں ہے لیکن جو کسی کا برا چاہتے ہیں وہ بھی اس کے عذاب سے محفوظ نہیں رہتے بہرحال......!!" میں نے قدرے توقف سے کہا۔ "میں نے جس بدکردار کا حوالہ دیا ہے کیا وہ تمہارے ہاتھ سے شربت یا دودھ کا گلاس پی لے گا؟"

میرا سوال سن کر عورت کا سر ندامت سے جھک گیا تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ارسلان نے جس ڈگڈگی بجانے والے کا حوالہ دیا تھا اس کے اور عورت کے درمیان ذاتی میل جول بھی شرافت کی حدود پھلانگ چکے تھے۔ میں نے اسے شرمندگی سے بچانے کی خاطر سنجیدگی سے مطلب کی بات کی۔

"میں تمہیں ایک زعفرانی نقش دے رہا ہوں۔ کوشش کرنا کہ اسے پہلی فرصت میں کسی بھی میٹھے مشروب میں ملا کر اس بدکردار کو پلا دو۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے گا مگر...... یہ خیال رہے کہ اسے تمہارے ارادے کی بھنک بھی نہ ملے ورنہ بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں میاں صاحب۔" عورت نے سنبھل کر بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں گھر پہنچتے ہی آپ کا تعویذ اسے گھول کر پلا دوں گی اور...... آپ کی دعاؤں سے اگر میرا کام ہو گیا تو بڑے پیر کی نیاز بھی ضرور بانٹوں گی۔"

"اس کے بھید وہی جانتا ہے بی بی...... قسمت میں جو لکھ دیا گیا وہی اٹل ہے۔"

میں نے حضرت خواجہ کے ارشاد کے مطابق زعفران کا ایک نقش تیار کر کے عورت کے حوالے کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "ایک بات اور یاد رکھنا...... اب کسی ڈگڈگی بجانے والے کے چکر میں نہ پڑنا ورنہ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بزرگوں کے اٹھائے ہوئے کسی غلط قدم کی سزا ان کے بچوں کو بھی جھیلنی پڑتی ہے۔"

عورت جو نور جمال کی ماں کے سوا کوئی اور نہیں تھی مجھے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ میں نے دوبارہ ضرورت مندوں کو حجرے میں بلانا شروع کر دیا۔

ایک ہفتے بعد میں حسب معمول خدمت خلق کے کام میں مصروف تھا جب میں نے ارسلان کو دیکھا جو ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"خیریت تو ہے برخوردار؟ اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے؟" میں نے نکلتے ہوئے ہی اسے مخاطب کیا۔

"آپ کی بزرگی اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔" ارسلان نے دوزانوں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کے حکم کے موجب میں نے رب نواز کی ایسی گوشمالی کر دی ہے کہ اب وہ کسی کے راستے میں اڑنگا لگانے کی بھی بھول...... نہیں کرے گا۔ نیلی چھتری والے نے اس مردود کو جس موذی مرض میں مبتلا کر دیا ہے وہ آسانی سے اس روگ سے چھٹکارا نہیں پا سکے گا۔"

"اور کوئی نئی خبر......؟" میں نے ارسلان کو ٹٹولا تو اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"حضرت خواجہ کے حکم پر میں نے خود کو ہمیشہ آپ کے قدموں کی دھول ہی سمجھا ہے میرے محترم۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ بزرگوں کی دعاؤں نے آپ کو نواز رکھا ہے۔" ارسلان نے سنبھل کر جواب دیا۔ "آپ نے کیا عمل کیا؟...... میں اس بات سے ناواقف ہوں لیکن جو منظر اپنی نظروں سے دیکھ کر آیا ہوں اس نے دوسروں کو بھی انگشت بدنداں کر دیا ہے...... کل تک جو بدبخت دوسروں کو اپنی ڈگڈگی پر نچایا کرتا تھا آج وہ خود پاگلوں کی طرح گلیوں اور بازاروں میں چلتا پھر رہا ہے...... اس کے علاوہ ایک اہم بات قابلِ ذکر یہ بھی ہے کہ نور جمال کی ماں اپنی بیٹی کو لے کر فیصل آباد سے اور کہیں چلی گئی ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حسنہ بی بی اور قدیر احمد نے بھی سکون کا سانس لیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ نور جمال کی ماں بھی آپ سے ملی تھی اور اب جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ بھی یقیناً آپ کے کسی تعویذ ہی کا کرشمہ ہوگی۔"

"مجھے گنہگار نہ کرو برخوردار...... ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو۔ تم نے بھی ایک بار یہی کہا تھا کہ آج جو ناعاقبت اندیش دوسروں کو اپنی ڈگڈگی پر نچاتے ہیں۔ ایک دن وہ بھی اوپر والے کی ڈگڈگی پر پاگلوں کی طرح اچھلتے نظر آتے ہیں۔ انسان اگر صرف اسی ایک نکتے کو سمجھ لے تو اس کے دلدر دور ہو سکتے ہیں۔"

ارسلان کچھ دیر بعد چلا گیا تو میں نے اٹھ کر حسب عادت دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر کار خیر میں مصروف ہو گیا۔

* * *

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 | f PAKSOCIETY

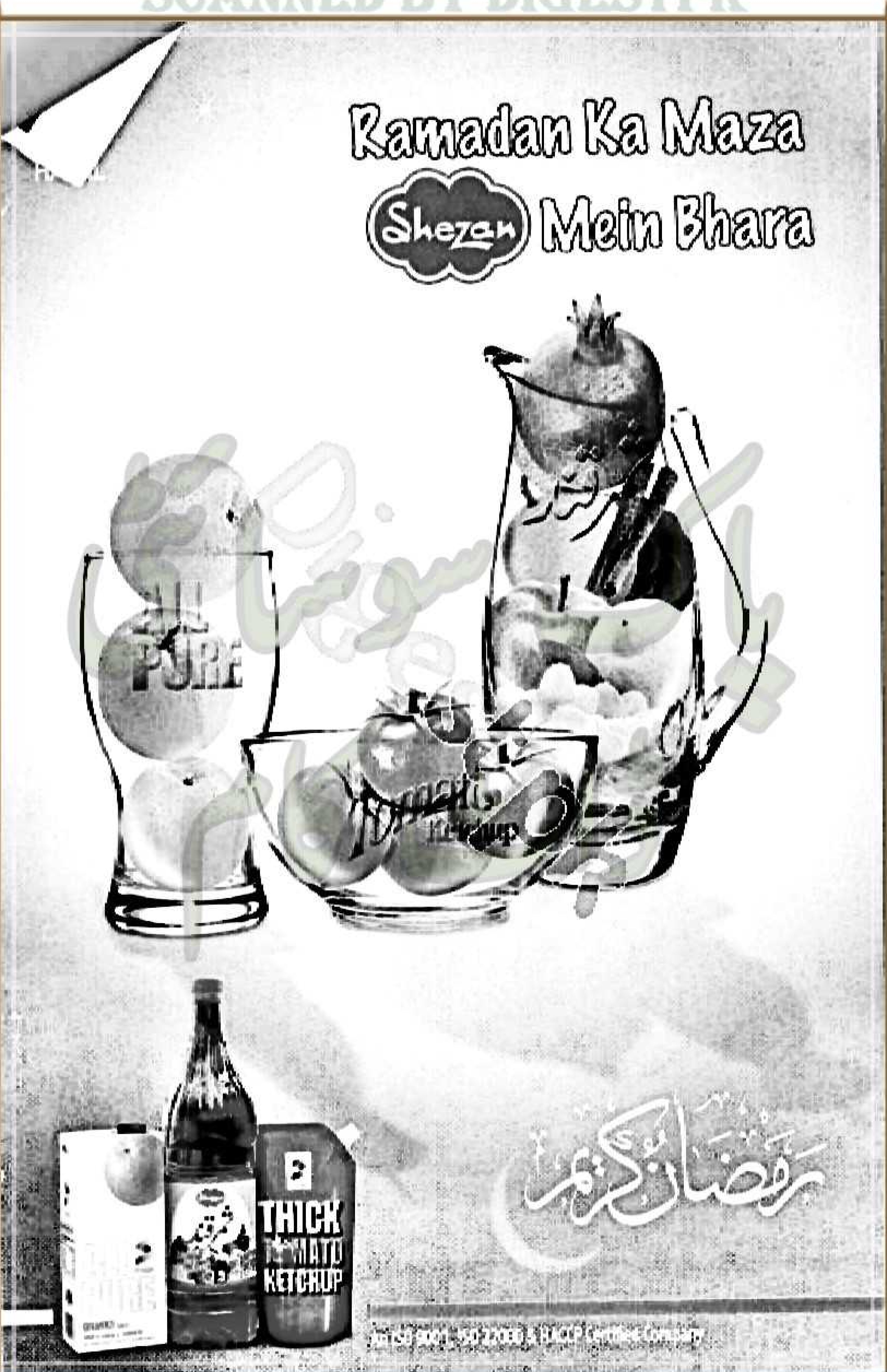
Ramadan Ka Maza
Shezan Mein Bhara
ALL PURE
Tomato Ketchup
THICK TOMATO KETCHUP
رمضان کریم
An ISO 9001, ISO 22000 & HACCP Certified Company

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ھر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مُکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1